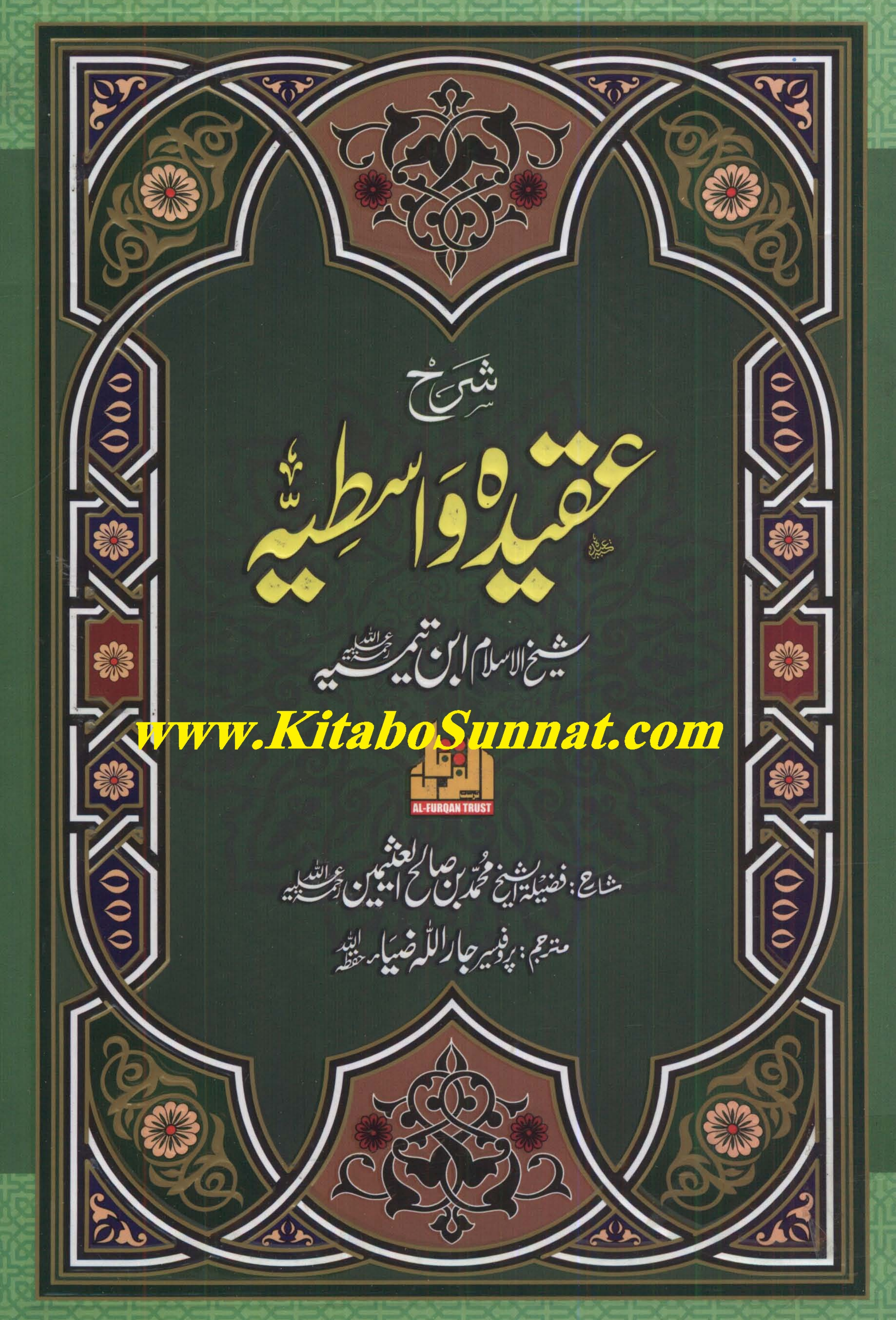
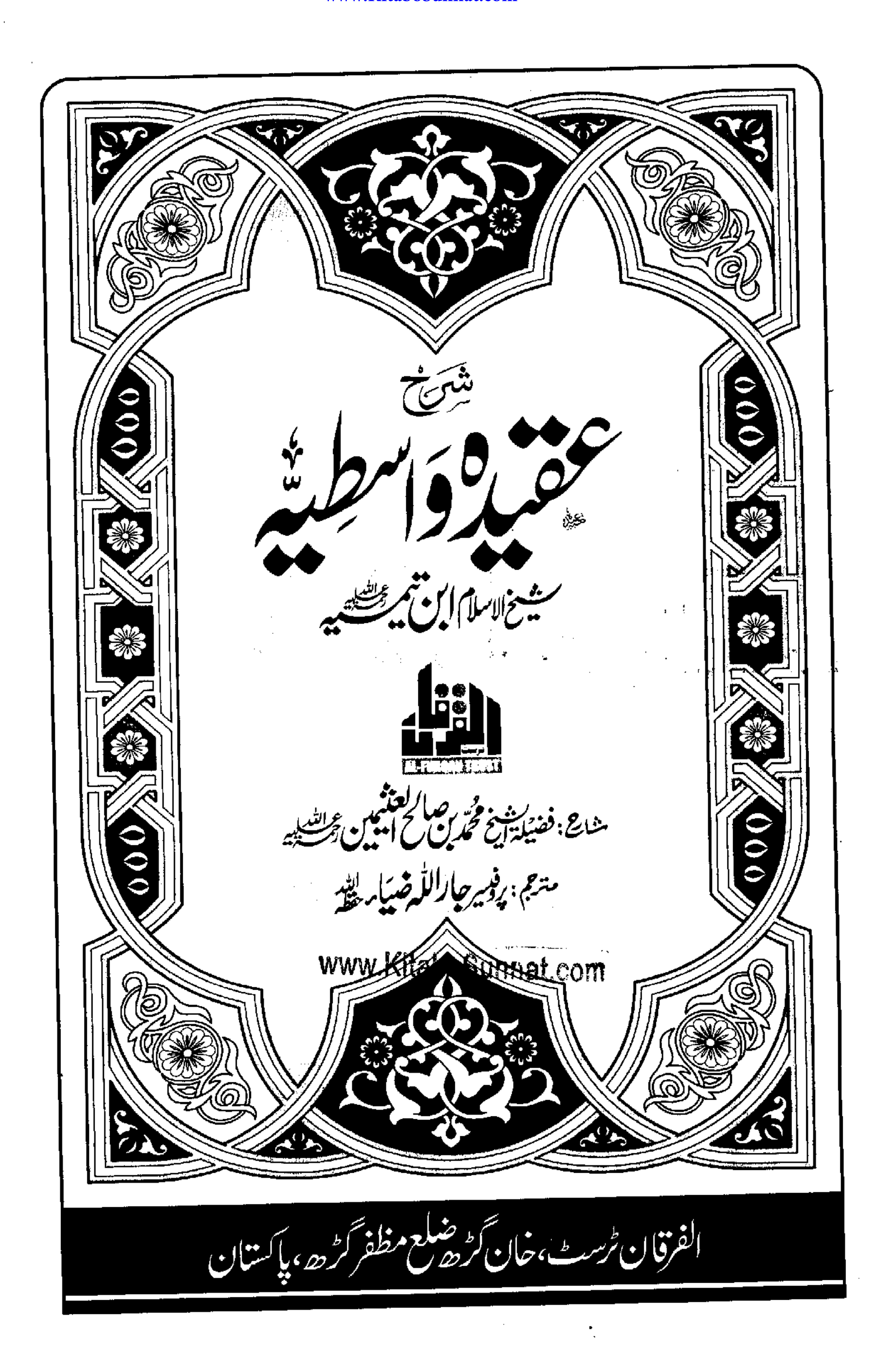
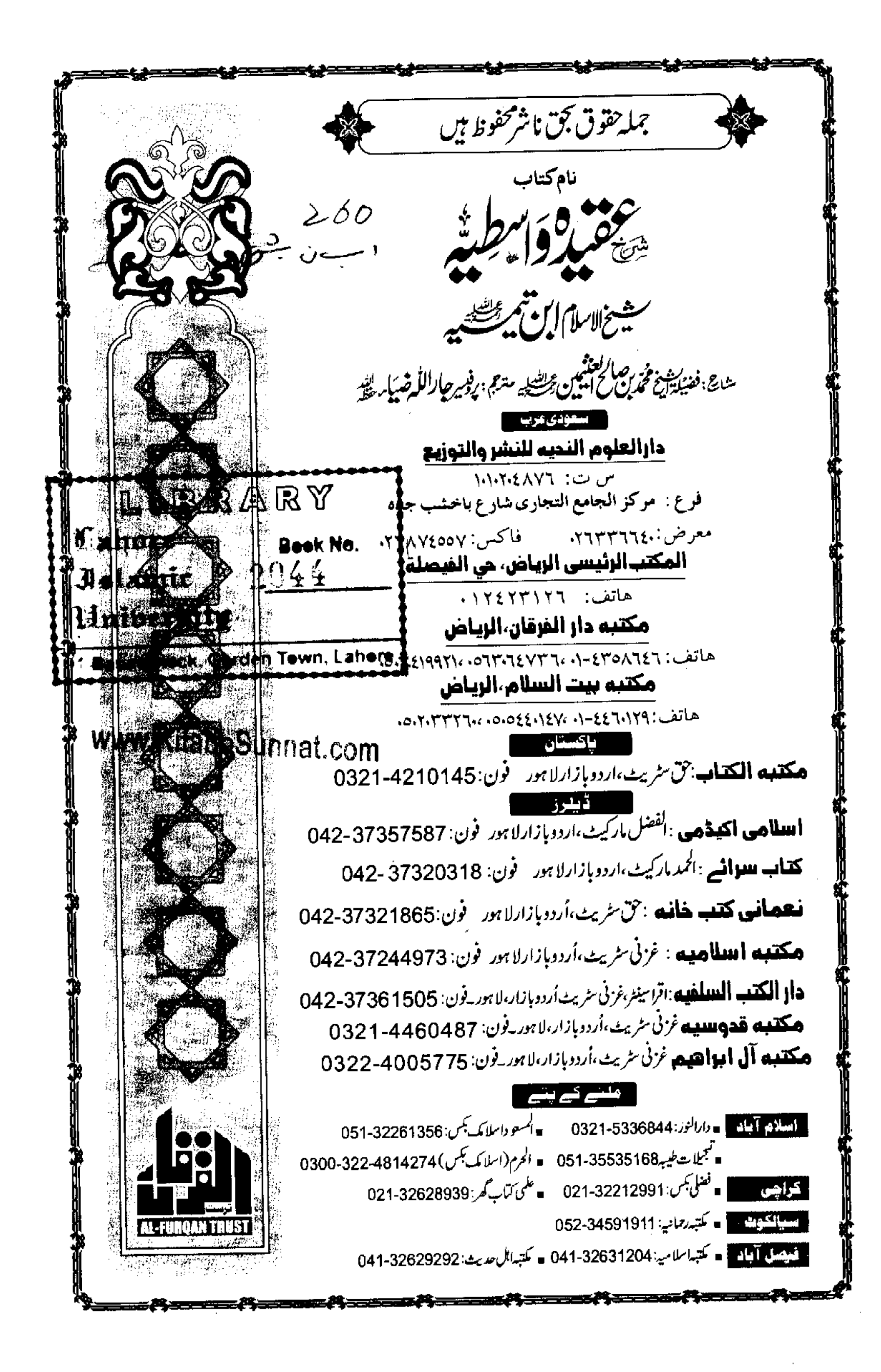

شرح
عقیدہ واسطیہ
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ
www.KitaboSunnat.com
AL-FURQAN TRUST
شارح: فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ
مترجم: پروفیسر جار اللہ ضیاء حفظہ اللہ


شرح
عقیدہ واسطیہ
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ
AL-FURQAN TRUST
شارح: فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ
مترجم: پروفیسر جار اللہ ضیاء حفظہ اللہ
الفرقان ٹرسٹ، خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ، پاکستان



نام کتاب

شرح عقیدہ واسطیہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

شارح: فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ مترجم: پروفیسر جار اللہ ضیاء حفظہ اللہ

سعودی عرب

دارالعلوم النحيه للنشر والتوزيع

س ت: ١٠١٠٢٠٤٨٧٦

فرع: مركز الجامع التجارى شارع باخشب جده

معرض: ٠٢٦٣٣٦٦٤٠ فاكس: ٠٢٦٨٧٤٥٥٧

المكتب الرئيسى الرياض، حي الفيصلة

هاتف: ٠١٢٤٢٣١٢٦

مكتبه دار الفرقان، الرياض

هاتف: ٠١-٤٣٥٨٦٤٦، ٠٥٦٣٠٦٤٧٣٦، ٠٥٤١٩٩٢١

مكتبه بيت السلام، الرياض

هاتف: ٠١-٤٤٦٠١٢٩، ٠٥٠٥٤٤٠١٤٧، ٠٥٠٢٠٣٣٢٦٠

پاکستان

مکتبہ الکتاب: حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0321-4210145

ڈیلرز

اسلامی اکیڈمی: الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون: 042-37357587

کتاب سرائے: الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون: 042- 37320318

نعمانی کتب خانہ: حق سٹریٹ، اُردو بازار لاہور فون: 042-37321865

مکتبہ اسلامیہ: غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور فون: 042-37244973

دار الکتب السلفیہ: اقرا سینٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: 042-37361505

مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4460487

مکتبہ آل ابراھیم غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0322-4005775

ملنے کے پتے

اسلام آباد ▪ دارالنور: 0321-5336844 ▪ المسعود اسلامک بکس: 051-32261356

▪ تسجیلات طیبہ 051-35535168 ▪ الحرم (اسلامک بکس) 0300-322-4814274

کراچی ▪ فضلی بکس: 021-32212991 ▪ علمی کتاب گھر: 021-32628939

سیالکوٹ ▪ مکتبہ رحمانیہ: 052-34591911

فیصل آباد ▪ مکتبہ اسلامیہ: 041-32631204 ▪ مکتبہ اہل حدیث: 041-32629292

AL-FURQAN TRUST



فہرست مضامین

فصل: ......سنت رسول اللہ ﷺ

فصل: ......احادیث صفات

فصل: ......قرآن کے حقیقتاً کلام اللہ ہونے پر ایمان لانا

فصل: ......روزِ قیامت اہل ایمان کا

فصل: ......قیامت کے دن پر ایمان لانے کے بارے میں

فصل: ......قیامت کبریٰ کے بارے میں

فصل:......تقدیر پر ایمان

فصل:......تقدیر پر ایمان کے درجات کے بارے میں

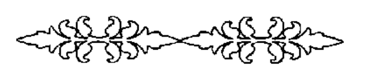
فصل: ......ایمان کے بارے میں

فصل: ......اصحاب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اہل سنت کا موقف

فصل: ......کرامات اولیاء کے بارے میں

فصل: ......اہل سنت کا عملی طریقہ

فصل: ......امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں





مقدمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ، اَمَّا بَعْدُ!

''عقیدہ واسطیہ'' کے نام سے موسوم یہ کتاب اپنے زمانے کے شیخ الاسلام ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن تیمیہ حرانی متوفی ۷۲۸ء کی تالیف لطیف ہے۔

شیخ الاسلام کی تالیفات و تصنیفات کی ورق گردانی کرنے والے اور ان کا گہرا مطالعہ کرنے والے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ انھوں نے حق کے دفاع اور اہل باطل کی تردید میں گراں قدر اور لائق صد ستائش خدمات سرانجام دی ہیں، اللہ تعالیٰ سے اُمید واثق ہے کہ ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں وہ انہیں گراں قدر اجر وثواب سے نوازے گا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا وجود مسعود امت محمدیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔اس لیے کہ اس نے آپ کی وجہ سے اسلامی عقیدہ پر یلغار کرنے والے انتہائی خطرناک امور کا راستہ روک دیا۔

''عقیدہ واسطیہ'' کے نام سے شیخ الاسلام کی یہ مختصر کتاب ہے، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ''واسط'' شہر کے قضاۃ میں سے ایک قاضی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے ان امور کی شکایت کی، جن کا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں مذاہب باطلہ ومنحرفہ کی طرف سے انہیں سامنا کرنا پڑ رہا تھا، چنانچہ آپ نے صحیح اسلامی عقیدہ پر مشتمل یہ کتاب لکھی جو کہ اہل السنہ والجماعہ کے عقیدہ کے ان مختلف پہلوؤں کے لیے جو ہر خالص کی حیثیت رکھتی ہے جن میں لوگوں نے بدعات کی بھر مار کر دی اور ان میں موشگافیوں اور قیل وقال کی بہتات ہوگئی۔

اس گراں قدر رسالہ کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل ہم یہ امر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر سلسلہ انبیاء ورسل کی آخری کڑی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام فرستگان رب کائنات توحید کی دعوت دیتے رہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء : ۲۵)

''اور ہم نے آپ سے قبل کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل : ۳٦)

''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا یہ کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور بتوں سے بچو۔''

یہ اس لیے کہ سب لوگ ایک اللہ کے لیے پیدا کیے گئے، اور ان کی تخلیق اسی کی عبادت کے لیے عمل میں آئی تا کہ ان کے دل از راہ عبودیت و تعظیم، خوف ورجار، رغبت ورہبت اور توکل اس کے ساتھ متعلق ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ ہر اس دنیوی چیز سے کنارا کشی اختیار کر لیں جو اُن اُمور میں عقیدہ توحید باری تعالیٰ میں ان کے معاون ومددگار نہ بن سکیں، اس لیے کہ آپ مخلوق ہیں اور اس اعتبار سے آپ کے لیے ضروری ہے کہ ہر چیز میں قلب وقالب کے اعتبار سے اپنے خالق کے بن کر رہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء ورسل کی دعوت اس اہم اور امر عظیم کی طرف ہی رہی جو کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عباوت سے عبارت ہے۔

جن رسولوں کو اللہ رب العزت نے انسانوں کی رشد وہدایت کے لیے مبعوث فرمایا وہ توحید الوہیت کی دعوت، توحید ربوبیت کے مقابلہ میں زیادہ زور وشور کے ساتھ دیا کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید ربوبیت کے منکرین کی تعداد بہت کم رہی ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں نے بظاہر اس سے انکار کیا وہ بھی دلی طور پر اس کا انکار نہ کر سکے۔ بجز اس صورت کے کہ ان سے کم از کم ادراک کرنے کی صلاحیت سے متصف عقلیں بھی سلب کر لی جائیں ایسے لوگوں کا یہ رویہ انکار حق کے زمرے میں آتا ہے۔

توحید کی قسمیں

علماء رحمہم اللہ نے توحید کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ **توحید ربوبیت:**...... اس کا مطلب ہے: خلق، ملک اور تدبیر میں اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری ہے: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (الاعراف: ٥٤) ''خبردار اسی کے لیے خاص ہے آفرینش بھی اور حکومت بھی۔''

اس آیت میں اس مفہوم پر وجہ دلالت یہ ہے کہ اس میں خبر کو مقدم کیا گیا ہے جبکہ اس کا اصل حق تاخیر تھا، اور قاعدہ بلاغیہ یہ ہے کہ استحقاق کی رو سے موخر کو مقدم لانا حصر کا فائدہ دیتا ہے، مزید برآں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آیت کا آغاز حرف ''الا'' کے ساتھ کیا گیا جو کہ تنبیہ اور تاکید پر دلالت کرتا ہے، خلق سے مراد آفرینش جبکہ امر سے مراد تدبیر ہے، جہاں تک ملک کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی اور اس جیسی دیگر قرآنی آیات میں ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الجاثیہ: ۲۷) ''اور اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی۔''

یہ آیت کریمہ رب تعالیٰ کے افراد بالملک پر دلالت کرتی ہے اس جگہ بھی گزشتہ آیت کی طرح اَلتقدیم ماحقہ التاخیر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ عزوجل خلق، ملک اور تدبیر کے ساتھ منفرد ہے۔

اس جگہ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں متعدد مقامات پر غیر اللہ کے لیے خلق کا اثبات کیا گیا ہے، مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۝﴾ (المومنون: ۱٤)
''بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

اسی طرح مصورین کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''ان سے کہا جائے گا کہ جسے تم نے پیدا کیا اسے زندہ کرو۔''[1]

حدیث قدسی میں آپ کا ارشاد ہے: ''اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو میری طرح پیدا کرنا چاہے۔''[2]

ان نصوص اور اس قول کے درمیان کہ ''اللہ تعالیٰ منفرد بالخلق ہے'' تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خلق سے مراد کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی چیز کو ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل کرنا حقیقتاً خلق نہیں ہے، اسے صرف تکوین کے اعتبار سے خلق کا نام دیا گیا ہے، فی الواقع وہ خلق تام نہیں ہے۔ مثلاً جب بڑھئی لکڑی کا دروازہ بنائے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے دروازہ خلق کیا، مگر اس صنعت کا مادہ اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ہے، لوگ جس قدر بھی مہارت حاصل کرلیں وہ سب مل کر بھی پیلو کے درخت کی ایک ٹہنی بھی پیدا نہیں کر سکتے، کسی ذرہ بھر چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے، ایک مکھی تک نہیں بنا سکتے۔ ہم آپ کی توجہ اس ارشاد ربانی کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے:

﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهُ وَ إِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ﴾

(الحج: ۷۳)

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو، بے شک جن لوگوں کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی تک بھی تو پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب ہی اس غرض کے لیے جمع ہو جائیں، اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس سے چھڑا تک نہیں سکتے، کمزور ہے ایسا طالب بھی اور ایسا مطلوب بھی۔''

[الَّذِيْنَ] .... اسم موصول ہے جو ہر اس چیز پر مشتمل ہے جسے اللہ کے سوا پکارا جائے، وہ انسان ہو یا فرشتہ، درخت ہو یا پتھر یا کچھ اور۔ اللہ تعالیٰ کے سوا وہ جنھیں بھی پکارتے ہیں وہ ﴿لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِاجْتَمَعُوْا لَهُ﴾ (الحج: ۷۳) ''ایک مکھی تک بھی تو پیدا نہیں کر سکتے، چاہے وہ اس کام کے لیے سارے کے سارے ہی جمع کیوں نہ ہو جائیں۔''

اور اگر کوئی ایک یہ کام کرنا چاہے تو اس کی بے بسی تو بطریق اولیٰ ثابت ہوگی:

﴿وَ إِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ (الحج: ۷۳)

''یہاں تک وہ جنھیں اللہ کے سوا پکارتے ہیں اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس کمزور مکھی سے وہ چیز چھڑا تک نہیں سکتے۔''

اگر مکھی کسی طاقتور ترین حکمران کے جسم پر بیٹھ کر اس کی خوشبو لے اڑے یا اس کے کھانے پر بیٹھ کر اس سے کچھ لے جائے تو وہ اس سے یہ چیزیں واپس لینے کی سکت نہیں رکھتا۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ

[1] صحیح بخاری: ۵۹۶۱، صحیح مسلم: ۲۱۰۷. [2] صحیح بخاری: ۵۹۵۳، صحیح مسلم ۱۱/۲.

اکیلا ہی خالق ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آپ اپنے اس موقف کو کہ اللہ تعالیٰ منفرد بالملک ہیں۔ ان قرآنی آیات سے کس طرح ہم آہنگ کریں گے جن میں مخلوق کے لیے ملک کو ثابت کیا گیا ہے؟ مثلاً یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ﴾ (النور: ٦١) ''یا جس کی چابیوں کے تم مالک ہو۔'' ....نیز

﴿اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ (المومنون: ٦)

''بجز اپنی بیویوں کے یا جن کے مالک بنے ہیں ان کے دائیں ہاتھ۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں ہم آہنگی دو طرح سے پیدا کی جا سکتی ہے:

اولاً:...... کسی چیز کا انسان کی ملکیت میں ہونا عام اور ہمہ گیر نہیں ہوتا، اس لیے کہ میں اپنی چیزوں کا تو مالک ہوں مگر تمہاری چیزوں کا نہیں ہوں، جبکہ اللہ کے ملک میں ہر شے ہے، اللہ تعالیٰ کا ملک زیادہ ہمہ گیر بھی ہے اور زیادہ وسیع بھی، اور اسی کا ملک ہی ملک تام ہے۔

ثانیاً:...... کسی چیز پر میری ملکیت ایسی حقیقی ملکیت نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی مرضی سے جس طرح چاہوں تصرف کر سکوں، میں اس میں اسی طرح تصرف کرنے کا مجاز ہوں جس طرح شرع نے اس کا حکم دیا اور مالک حقیقی نے اس کی اجازت دی، اگر میں ایک روپیہ دو روپوں کے بدلے میں بیچوں تو میں اس کا مالک نہیں ہوں اور نہ ہی میرے لیے یہ حلال ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ میری ملکیت ناقص ہے، نیز میں قدری حوالے سے بھی اس کے بارے میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، اس لیے کہ تصرف کا اختیار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ میرے حکم پر میرا بیمار غلام نہ تو تندرست ہوگا اور نہ ہی تندرست و توانا غلام میرے کہنے پر بیمار پڑے گا۔ جبکہ اگر اللہ تعالیٰ بیمار کو تندرست ہونے یا تندرست کو بیمار ہونے کا حکم دے تو ان کے لیے اس کے حکم کی تعمیل لازمی ہوگی۔ یہ اس لیے کہ حقیقی تصرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے نہ کہ میرے اختیار میں۔ میں تصرف و خلق کا نہ تو شرعاً مالک ہوں اور نہ ہی قدراً، میری ملکیت تصرف کے اعتبار سے بھی ادھوری ہے اور شمول وعموم کے اعتبار سے بھی، یوں ہمارے سامنے یہ امر عیاں ہو جاتا ہے کہ اللہ کس طرح ہر شے کا اکیلا ہی مالک ہے۔

جہاں تک تدبیر کا تعلق ہے تو ہمیں انسان کی تدبیر سے انکار نہیں ہے لیکن اس کی یہ تدبیر بھی اسی طرح ادھوری ہے جس طرح مذکورۃ الصدر وجوہ کی بناء پر اس کی ملکیت ادھوری اور غیر مکمل ہے، میں ہر چیز میں تدبیر کا مالک نہیں ہوں، میں صرف انہی چیزوں میں تدبیر کا حق رکھتا ہوں جو میرے زیر ملکیت ہوں گی۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہمارا یہ کہنا کہ: ''اللہ تعالیٰ خلق، ملک اور تدبیر میں منفرد ہے'' کلیہ عامہ ومطلقہ ہے، اس سے کوئی بھی چیز مستثنیٰ نہیں ہے۔ مذکورہ بالا سطور میں ہم نے جو کچھ بھی عرض کیا ہے وہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت شدہ امور سے متعارض نہیں ہے۔

۲۔ **توحید الوہیت:**...... اس سے مراد یہ ہے کہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کو یکتا مانا جائے اور اس میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ بایں طور کہ آپ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ کسی فرشتے کی اور نہ کسی نبی کی، نہ کسی ولی کی اور نہ کسی شیخ کی، نہ باپ کی اور نہ ہی ماں کی، صرف اللہ کی عبادت کی جائے، الوہیت وتعبد میں اسے اکیلا اور

یکتا تسلیم کیا جائے۔ انہی امور کی بنا پر توحید کی اس قسم کو توحید الوہیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نیز اسے توحید عبادت کا بھی نام دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کے اعتبار سے یہ توحید الوہیت ہے جبکہ عابد کی طرف اضافت کے حوالے سے توحید عبادت۔

عبادت دو عظیم باتوں پر مبنی ہے۔ اور وہ ہیں: محبت اور تعظیم، ان دو باتوں کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کی وضاحت قرآن مجید میں اس طرح سے کی گئی ہے:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا يُسٰرِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا﴾ (الانبیاء: ۹۰)

''بیشک وہ نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اور امید اور خوف سے ہمیں پکارتے تھے۔''

محبت سے رغبت جنم لیتی ہے جبکہ تعظیم سے رہبت اور خوف۔

اس بنا پر عبادت کئی ایک اوامر ونواہی سے عبارت ہے، اوامر رغبت اور آمر تک رسائی کی طلب پر مبنی ہیں جبکہ نواہی تعظیم اور رہبت پر، جب آپ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے تو اس کے پاس موجود اشیاء میں رغبت دکھائیں گے اس تک رسائی میں دلچسپی لیں گے، اس تک رسائی کروانے والے راستے کی جستجو کریں گے اور کامل ترین انداز میں اس کی اطاعت گزاری کا فریضہ سرانجام دیں گے، اسی طرح جب آپ اس کی تعظیم کریں گے تو اس سے خوف محسوس کریں گے، جب بھی کسی معصیت کے ارتکاب کا ارادہ کریں گے تو اس کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے اس گناہ سے نفرت کرنے لگیں گے:

﴿وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ﴾

(یوسف: ۲٤)

''یقیناً اس عورت نے یوسف کا ارادہ کر لیا اور وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتے اگر انہوں نے اپنے پروردگار کی دلیل کو دیکھ نہ لیا ہوتا، ہم نے اسی طرح کیا تا کہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر عظیم احسان ہوگا کہ جب آپ معصیت کا ارادہ کریں تو اللہ رب العزت کو اپنے سامنے پائیں، اور پھر اس کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ارتکاب معصیت سے باز آجائیں، اس لیے کہ آپ رہبت اور رغبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں۔

عبادت سے کیا مراد ہے؟

عبادت کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے، فعل پر بھی اور مفعول پر بھی۔ اس کا اطلاق فعل پر ہوتا ہے جو کہ تعبد سے عبارت ہے، کہا جاتا ہے: عبدالرجل ربه عبادة و تعبداً، تعبد پر اس کا اطلاق، اسم مصدر کے مصدر پر اطلاق کے باب سے ہے، فعل پر اس کے اطلاق کے اعتبار سے اس کی تعریف اس طرح سے ہوئی: اللہ تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل اور اس کے منع کردہ امور سے اجتناب کرتے ہوئے از راہ محبت و تعظیم اس کے سامنے انتہائی درجہ کی ذلت و انکساری کو ظاہر کرنا، اللہ کے لیے ذلیل ہونے والا، اللہ کے ساتھ عزت پاتا ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ﴾ (المنافقون : ۸) ''عزت اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے لیے ہے۔''

اسی طرح عبادت کا اطلاق مفعول یعنی متعبد بہ پر بھی ہوتا ہے، اس معنی میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''عبادت ان جملہ امور کے لیے اسم جامع ہے جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا اور ان سے محبت کرتا ہو وہ اقوال ہوں یا ظاہری اعمال یا باطنی'' [1]

جن اقوال و اعمال کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں ان کے ساتھ صرف اسی ایک کی ہی عبادت کرنا واجب ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعاء نذر، خشیت، توکل اور دیگر جمیع عبادات۔

اگر آپ یہ کہیں کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ اللہ رب العزت الوہیت کے ساتھ متفرد ہے؟ تو ہم بتانا چاہیں گے کہ اس کے دلائل بہت زیادہ ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء : ۲۵)

''اور ہم نے آپ سے قبل کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔''

دوسری جگہ آتا ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ﴾ (آل عمران : ۱۸)

''اللہ گواہ ہے کہ بیشک اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے بھی گواہ ہیں۔''

پھر اس شہادت کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (آل عمران : ۱۸)

''اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ غالب حکمت والا ہے۔''

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ میری بھی یہی گواہی ہے اور تمہاری بھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر خود اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا دیگر معبودوں کا اثبات کیا ہے؟ مثلاً: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (القصص : ۸۸) ''اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود مت پکاریں۔''

﴿وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ﴾ (المومنون : ۱۱۷)

''جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔''

﴿فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ھود : ۱۰۱)

''پس ان کے وہ معبود ان کے کچھ بھی کام نہ آئے جنہیں وہ پکارا کرتے تھے۔''

[1] رسالة العبودية : ۱۰/۱٤۹.

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارشاد:

﴿اَئِفْكًا آلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ﴾ (الصافات: ۸٦)

''کیا تم اللہ کے علاوہ جھوٹے معبودوں کے طالب ہو۔''

تو اس میں اور اس شہادت میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی کہ ''اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں؟''

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر اللہ کی الوہیت، الوہیت باطلہ ہے، اور یہ صرف نام کی مشابہت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ (النجم: ۲۳)

''یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں، ان کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔''

اس بنا پر ان کی الوہیت باطل ہے۔ اگر چہ ان کی عبادت کی گئی اور گمراہ لوگوں نے ان کے سامنے ذلت و انکساری کا اظہار بھی کیا، مگر وہ معبود بنائے جانے کی صلاحیت سے عاری تھے، ان کی پرستش تو کی گئی مگر تھے وہ باطل خدا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ﴾ (لقمان: ۳۰)

''یہ اس لیے کہ اللہ ہی معبود برحق ہے اور جنہیں وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔''

توحید کی ان دو قسموں کا مسلمانوں میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا، ان میں سے ہر شخص اللہ تعالیٰ کو الوہیت و ربوبیت کے ساتھ یکتا تسلیم کرتا ہے۔ البتہ بعد میں کچھ ایسے لوگ ضرور منظر پر آئے جنہوں نے کسی انسان کے الٰہ ہونے کا دعویٰ کر دیا، مثلاً: غالی قسم کے رافضی جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہیں، ان کا زعیم عبداللہ بن سبا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ آپ الٰہ الحق ہیں۔ یہ شخص اصل میں یہودی تھا، جو اہل اسلام کے دین میں بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے اہل بیت کا طرف دار ہونے کا دعویٰ لے کر دین اسلام میں داخل ہوا، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس شخص نے اسلام میں وہی کردار ادا کیا جو پولس نے عیسائیت قبول کر کے اسے بگاڑنے میں ادا کیا۔''[1]

یہودی الاصل عبداللہ بن سباء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے انہیں معبود حقیقی کہنے کی جسارت کی، مگر وہ اس بات کو پسند نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص انہیں ان کے اصل رتبہ سے اوپر اٹھا دے، وہ اپنے علم تجربہ اور عدل و انصاف کی بدولت کوفہ کی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کرتے تھے: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کی بہترین شخصیت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ۔''[2]

آپ اس بات کا اعلان دوران خطبہ فرماتے اور بڑے تواتر کے ساتھ فرماتے۔ اس قسم کی مبنی برحقیقت بات کرنے والے اور اہل فضل کے لیے ان کی فضیلت کا برسر منبر اعتراف کرنے والے بھلا اس بات کو کیونکر پسند کر سکتے تھے کہ انہیں معبود حقیقی کہا

---

[1] اللالكائی: "شرح السنة": ۲۸۲۳، ابن تیمیة: "منهاج السنة" ۲۹/۱ "فتح الباری" میں حافظ نے اسے صحیح کہا ۲۷۰/۱۲۔

[2] مسند امام احمد: ۱۱۰/۱۔ امام احمد: "فضائل الصحابه": ۳۹۷۔ ابن ابی عاصم: "السنة" ۵۷۰/۲۔ ابن ماجه ۱۰٦ عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اصل حدیث صحیح بخاری میں ہے: ۳٦۷۱ جو کہ محمد بن حنفیہ سے مروی ہے۔

جائے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اس قسم کے لوگوں کو سخت ترین سزا دی، چنانچہ آپ کے حکم سے خندقین کھودی گئیں پھر ان میں آگ بھڑکا کر انہیں ان میں پھینک کر زندہ جلا دیا گیا، اور یہ اس لیے کہ انہوں نے سنگین ترین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دوران عبداللہ بن سباء بھاگ گیا مگر لوگ اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہے۔ الغرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن سباء یہودی کے پیروکاروں کو اس جرم کی پاداش میں زندہ جلا دیا کہ انہوں نے ان میں الوہیت کا دعویٰ کیا تھا۔

خلاصہ کلام کے طور پر ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ اہل قبلہ میں سے کوئی بھی شخص توحید الوہیت اور توحید ربوبیت کا انکار نہیں کرتا، اگرچہ اہل بدعت میں سے بعض لوگ بعض انسانوں کو مقام الوہیت پر فائز تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ **توحید الاسماء والصفات:** ......توحید کی اس قسم میں اہل قبلہ کا شدید اختلاف رہا ہے جس کے نتیجے کے طور پر وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے: ممثلہ، معطلہ اور معتزلہ، پھر دوسری قسم کے لوگوں میں کچھ تکذیب کے مرتکب ہوئے اور کچھ تحریف کے۔

اس امت میں جنم لینے والی سب سے پہلی بدعت، خوارج کی بدعت تھی، اس لیے کہ ان کے رئیس ذوالخویصرہ تمیمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خروج کیا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ نے سپاہ اسلام کے ہاتھ لگنے والا کچھ سونا لوگوں میں تقسیم کیا تو یہ کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا محمد! عدل سے کام لیں۔ [1]

شریعت اسلامیہ کے خلاف سر اٹھانے والا یہ پہلا خروج تھا، پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام میں حضرت علی و معاویہ کے مابین پیدا ہونے والے فتنہ کے دوران یہ معاملہ مزید سنگین ہو گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو کافر گردانتے ہوئے ان کے خون کو مباح قرار دیا۔

اس کے بعد قدریہ کی بدعت معرض وجود میں آئی جو کہ اس امت کے مجوسی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو مقدر نہیں کیا، وہ نہ تو اس کی مشیت کے تابع ہیں اور نہ ہی اس کے پیدا کردہ، بلکہ ان کے زعماء اور غالی قسم کے لوگ تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ بندوں کے افعال کا نہ تو اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ یوں لوح محفوظ میں مکتوب ہوتے ہیں، اور یہ کہ جب تک بندے کوئی کام کر نہیں لیتے اس وقت تک اللہ کو ان کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ امور از سر نو معرض وجود میں آتے ہیں۔ ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمر، عبادہ بن صامت اور کچھ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا زمانہ پایا جو کہ عصر صحابہ رضی اللہ عنہم کے آخری ایام تھے۔

اس کے بعد ارجاء کی بدعت منظر عام پر آئی، جس نے تابعین کی اکثریت کا دور دیکھا، مرجیہ کا عقیدہ ہے کہ ایمان کی موجودگی میں کوئی بھی معصیت ضرر رساں نہیں ہوتی، آپ زنا کریں، چوری کریں، شراب نوشی کریں، قاتل بن جائیں، جب تک آپ مومن ہیں ہر معصیت کا ارتکاب کریں، کوئی بھی معصیت آپ کے ایمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور آپ ہر حالت میں کامل الایمان ہی رہیں گے۔

---

[1] صحیح بخاری: ۳۶۱۰۔ صحیح مسلم: ۱۰۶۴۔۱۴۸۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قدریہ اور مرجیہ کی بحث طاعت، معصیت، مومن اور فاسق کے بارے میں ہوتی تھی، انہوں نے رب تعالیٰ اور اس کی صفات کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی، پھر بزعم خویش اذکیاء کی ایک جماعت یہ دعوی لے کر اٹھی کہ عقل وحی پر مقدم ہے۔ چنانچہ انہوں نے خوارج اور مرجیہ کے اقوال کے درمیان ایک تیسرا قول اختیار کیا اور وہ یہ کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب نہ تو مومن ہے جس طرح کہ مرجیہ کہتے ہیں اور نہ ہی کافر جیسا کہ خوارج کا کہنا ہے بلکہ وہ دو منزلوں کی درمیانی منزل میں ہے، اس آدمی کی طرح جس نے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر اختیار کیا اور راستے کے درمیان ہی ٹھہر گیا۔ اس طرح وہ نہ تو اپنے شہر میں ہے اور نہ اس شہر میں جس کی طرف وہ جانا چاہتا تھا، بلکہ وہ ایک درمیانی منزل پر ٹکا ہوا ہے۔ یہ بات تو دنیوی احکام کے حوالے سے ہے، جہاں تک آخرت کا تعلق ہے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا، اس طرح یہ لوگ آخرت کے حوالے سے تو خوارج کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں جبکہ دنیوی حوالے سے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس بدعت کے ظہور اور انتشار کے بعد جہمیہ کی بدعت نے سر اٹھایا جو کہ جہم بن صفوان اور اس کے پیروکاروں کی ایجاد کردہ ہے جنہیں جہمیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ بدعت مسئلہ اسماء وصفات اور احکام کے ساتھ نہیں بلکہ خالق کائنات کی ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ صدرِ اسلام میں بدعات نے کس طرح رواج پکڑا، اور وہ کس طرح آگے بڑھتے بڑھتے خالق کائنات عزوجل کی ذات تک جا پہنچیں۔ ان بدعت پرستوں نے خالق کو مخلوق کی جگہ لا کھڑا کیا، اور اپنے من پسندانہ انداز میں جو چاہا کہتے چلے گئے، انہوں نے خود ہی یہ فیصلہ کر ڈالا کہ یہ چیز اللہ کے لیے ثابت ہے اور یہ غیر ثابت، اللہ تعالیٰ کے اس چیز کے ساتھ متصف ہونے کو عقل قبول کرتی ہے اور اسے قبول نہیں کرتی، جہمیہ اور معتزلہ کی بدعات نے سر اٹھایا اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں متعدد اقسام میں تقسیم ہو گئے:

۱۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وجود یا عدم وجود کے ساتھ متصف کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر اسے وجود کے ساتھ متصف مانا جائے تو وہ موجودات سے مشابہ ہو جائے گا جبکہ اسے عدم کے ساتھ متصف تسلیم کرنے کی صورت میں وہ معدومات کے مشابہہ ہو جائے گا۔ اس بناء پر اس سے معبود اور عدم دونوں کی نفی واجب ہے۔ مگر ان کا یہ قول خالق کائنات کو ممتنعات اور مستحیلات کے مشابہہ قرار دینے کے مترادف ہے: اس لیے کہ وجود اور عدم وجود کا تقابل کروانا نقیضین میں تقابل کروانا ہے اور نقیضین کا ایک ساتھ نہ اجتماع ممکن ہے اور نہ ارتفاع۔ اولاد آدم کی جمیع عقول اس چیز کا انکار کرتی ہیں، اور وہ اسے قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اب آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ ان لوگوں نے ایک چیز سے کس طرح راہ فرار اختیار کی اور پھر کس طرح اس سے بھی بری چیز میں مبتلا ہو گئے۔

۲۔ دوسری قسم کے لوگوں کا قول ہے کہ ہم اسے نفی کے ساتھ موصوف کریں گے اثبات کے ساتھ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ ذات الٰہ سے سلب صفات کو تو جائز قرار دیتے ہیں مگر اثبات صفات کو جائز قرار نہیں دیتے۔ یعنی ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندہ ہے، ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ میت نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کہنا تو جائز نہیں ہے کہ وہ تسلیم



ہے، البتہ یہ کہنا درست ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی چیز کا اثبات کریں گے تو اسے موجودات سے تشبیہ دیں گے، اس لیے کہ ان کے خیال میں تمام موجود اشیاء ایک دوسری سے متشابہ ہیں، آپ اس کے لیے کسی بھی چیز کا اثبات نہیں کر سکتے، جہاں تک نفی کا تعلق ہے تو وہ عدم سے عبارت ہے۔ حالانکہ کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کے لیے جن صفات کا اثبات کیا گیا ہے وہ نفی سے کہیں زیادہ ہیں۔

اگر ان سے یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں خود یہ فرمایا ہے کہ وہ سمیع بصیر ہے۔ یعنی وہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی۔ تو اس کے جواب میں وہ یہ کہیں گے کہ یہ اضافت کے باب سے ہے، یعنی سماعت (سننا) کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ سماعت کے ساتھ متصف ہے اس بناء پر سمیع کا معنی یہ ہے کہ اس کے لیے سمع نہیں لیکن مسموع ہے۔ ان میں سے ہی کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ اوصاف اس کی مخلوقات کے ہیں، اس کے اپنے نہیں، اس کے لیے کسی بھی صفت کا اثبات نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ تیسری قسم کا بدعتی گروہ اللہ تعالیٰ کے لیے اسماء کا اثبات کرتا ہے، یہ گروہ معتزلہ کا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے اسماء کا اثبات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر بھی ہے، قدیر وعلیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ لیکن وہ قدیر بلا قدرت ہے سمیع بلا سمع، بصیر بلا بصر ہے، علیم بلا علم ہے اور حکیم بلا حکمت ہے۔

۴۔ چوتھی قسم کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم حقیقتاً اس کے لیے اسماء کا بھی اثبات کرتے ہیں، اور ان صفات معینہ کا بھی جن پر عقل دلالت کرتی ہو جبکہ ہم باقی صفات کے منکر ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے صرف سات صفات کا اثبات کرتے جبکہ باقی صفات کا تحریفاً انکار کرتے ہیں نا کہ تکذیباً۔ اس لیے کہ ان کا تکذیباً انکار کرنے سے کفر لازم آتا ہے، جبکہ تحریف ان کے نزدیک ''تاویل'' کا دوسرا نام ہے۔ ان سات صفات باری تعالیٰ کو اس شعر میں جمع کر دیا گیا ہے:

لَـهُ الـحياةُ والكلامُ والبَصَرْ　　　سـمـعٌ ارادةٌ وعِـلـمٌ واقتدَرْ

یعنی حیات، کلام، بصر، سمع، علم اور قدرت۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ان صفات کا اثبات اس لیے کرتے ہیں کہ ان پر عقل دلالت کرتی ہے، جبکہ دوسری صفات پر دلالت کرنے سے عقل قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ہم صرف انہی صفات کا اثبات کرتے ہیں جن پر انسانی عقل دلالت کرتی ہے اور جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی ہم ان کے اثبات سے انکار کرتے ہیں۔ یہ اشاعرہ کا گروہ ہے جو کہ بعض صفات کو تسلیم کرتا اور بعض سے انکار کرتا ہے،

اسماء وصفات میں تعطیل کے قائلین کی یہ تمام قسمیں جہم بن صفوان کی بدعت سے متفرع ہیں۔ ''جو شخص بھی اسلام میں برا طریقہ رائج کرے گا اس پر اس کا بھی بوجھ ہوگا اور ان تمام لوگوں کا بھی جو قیامت تک اس پر عمل کرتے رہیں گے۔'' [1]

برادران اسلام! اگر آپ ان کتب کا مطالعہ کریں جو اسماء وصفات باری تعالیٰ کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال کو جمع کرنے کا اہتمام کرتی ہیں تو آپ کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی اور آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ قطع نظر ایک

[1] جابر بن عبداللہ بجلی سے مروی ایک حدیث کا حصہ صحیح مسلم۔ ۱۰۱۷۔

بندہ مومن کے، اس قسم کی باتیں تو کوئی عاقل شخص بھی نہیں کر سکتا لیکن...... جس شخص کو اللہ روشنی نہ دے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں ہو سکتی۔ بصیرت سے عاری اور بصارت سے محروم اندھے انسان جیسا ہے، جس طرح آنکھوں کے اندھے کو سورج کے سامنے بھی کھڑا کر دیں تو وہ اسے دیکھ نہیں سکے گا، اسی طرح اللہ جس کسی سے اس کی بصیرت سلب کر لے اگر وہ حق کے انوار کے سامنے بھی کھڑا ہو جائے تو وہ انہیں دیکھنے سے محروم رہے گا۔ والعیاذ باللہ .

ہمیں ہمیشہ اللہ عزوجل سے دین اسلام پر ثابت قدم رہنے کی توفیق کا خواستگار رہنا چاہیے اور یہ کہ وہ ہمیں ہدایت عطا فرمانے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ فرمائے، اس لیے کہ معاملہ انتہائی سنگین ہے۔ شیطان ابن آدم پر ہر طرف سے اور ہر طرح سے حملہ آور ہوتا رہتا ہے، اسے اس کے دین وعقیدہ اور کتاب وسنت کے حوالے سے شکوک وشبہات میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔

لیکن بحمد اللہ تعالیٰ جب بھی کسی نے دین اسلام میں کسی بدعت کو ایجاد کیا، اللہ رب العزت نے اپنے فضل وکرم سے اپنے کسی بندے کو یہ ذمہ داری تفویض کی کہ وہ حق وصداقت کے ساتھ اس کی تردید کا فریضہ سرانجام دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

''بیشک ہم نے ہی اس ذکر کو اتارا اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ذکر کی حفاظت کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، نیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے، اس لیے کہ اس نے محمد ﷺ کو خاتم النبیین قرار دیا، جب رسالت محمدیہ کو رہتی دنیا تک باقی رہنا ہے تو اس سے یہ لازم قرار پاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق بدعت کے ظہور کے وقت کسی ایسے بندے کی تعیین فرمائے جو بدعت کی حقیقت کو آشکارا کرتے ہوئے اس کے مفاسد کو اجاگر کرے، یہی حاصل زندگی ہے۔ اسی لیے میں آپ سے کہتا رہتا ہوں کہ ہمیشہ علم کی جستجو میں لگے رہا کریں، اس لیے کہ اگر ہم کتاب وسنت پر مبنی علم سے مسلح نہ ہوئے تو مستقبل میں ہمارے اس ملک میں ہم پر بھی وہ آفت ٹوٹ سکتی ہے جو کہ دیگر ملکوں پر ٹوٹ چکی ہے، اس وقت اعدائے اسلام ہمارے ملک کو نشانے پر رکھ کر اس پر مسلسل تیراندازی کر رہے ہیں تاکہ وہ ہمارے ہم وطنوں کو گمراہ کر سکیں۔ دریں حالات تمہارا علم سے مسلح ہونا از حد ضروری ہے، تاکہ تم اپنے دین کے بارے میں مکمل بصیرت حاصل کر سکو اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے اپنی زبانوں اور قلموں کے ساتھ جہاد کر سکو۔

یہ جمیع بدعات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد عام ہوئیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ان امور میں بحث نہیں کیا کرتے تھے، وہ کتاب وسنت کے ظاہری مفہوم کو اپناتے اور فطری تقاضوں کی روشنی میں فہم دین حاصل کرتے بعد ازاں جب یہ امور مبتدعین کے سامنے آئے تو انہوں نے اللہ کے دین میں بدعات کو رواج دینا شروع کر دیا، یہ بدعات سازی یا تو ان کی کم علمی کا نتیجہ تھی، یا ان کے فہم میں کمی تھی یا پھر وہ بدارادہ تھے جس کی وجہ سے انہوں نے دین میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور حکمت بالغہ سے ہر بدعت کی تردید اور اس کی سینہ چاکی کے لیے اپنے بندوں میں سے کسی بندہ خاص کو متعین فرما دیا کرتا ہے۔

جن لوگوں نے ان بدعات کی نقاب کشائی کی اور ان کی تردید کا کما حقہ فریضہ سرانجام دیا، ان میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ میں رب تعالیٰ سے اپنے اور آپ سب کے لیے دست بدعا ہوں کہ وہ ہمیں نعمتوں والے باغات میں جمع فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم شخص کو جس نفع بخش علم وفضل سے نوازا اور جس سے اس نے امت محمدیہ پر احسان فرمایا، اس نے واسط کے ایک قاضی کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے اس کی اس شکایت پر یہ مختصر رسالہ "العقیدہ" تالیف فرمایا کہ لوگ عقدی بدعات میں مبتلا ہو رہے ہیں اور انہیں کتاب وسنت پر مبنی صحیح اسلامی عقیدہ سے روشناس کرانا ضروری ہے۔



شرح مقدمہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ

بسم اللہ کی بحث

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

شرح: ...... جملہ مؤلفین کی عادت رہی ہے کہ وہ افعال خیر کی ابتدا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے کیا کرتے ہیں جس سے مقصود کتاب اللہ کی اقتدا اور سنت رسول ﷺ کی اتباع کرنا ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ہر سورت کی ابتدا میں بسم اللہ کا نزول فرمایا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ کے اعراب و معانی اور اس کے متعلقات کے بارے میں علماء نے بہت کچھ کہا ہے، اس بارے میں سب سے خوبصورت قول یہ ہے کہ یہ موقعہ و محل کی مناسبت سے متاخر فعل محذوف سے متعلق ہے، مثلاً جب اسے کھانا کھانے والا پڑھے گا تو تقدیری عبارت اس طرح ہوگی: "بسم اللّٰه آکل" اور جب اسے قرأت کرنے والا پڑھے گا تو تقدیری عبارت ہوگی: "بسم الله اقرأ" میں اللہ کے نام سے کھاتا ہوں، میں اللہ کے نام سے پڑھتا ہوں۔

اس دوران فعل کو مقدر مانا جائے گا نہ کہ اسم کو اس لیے کہ عمل میں اصل افعال ہیں نہ کہ اسماء، یہی وجہ ہے کہ افعال کسی شرط کے بغیر عمل کرتے ہیں جبکہ اسماء بدون شرط عمل نہیں کرتے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل افعال میں اصل اور اسماء میں فرع ہے۔

فعل کو متاخر تسلیم کرنے کے دو فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: ...... حصر: اس لیے کہ معمول کی تقدیم حصر کا فائدہ دیتی ہے، اس اعتبار سے بسم الله أقرءْ، لا أقرء إلا باسم الله کے مترادف ہوگا۔

دوسرا فائدہ: ...... اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقدس نام کے ساتھ ابتدا سے تبرک کا حصول۔

پھر ہم اسے بطور فعل خاص کے مقدر قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ عام کی نسبت خاص مقصود پر زیادہ دلالت کرتا ہے، میرے لیے یہ کہنا تو ممکن ہے کہ اس کی تقدیری عبارت بسم الله ابتدئ ہے مگر یہ عبارت تعیین مقصود پر دلالت نہیں کرتی۔ جبکہ (بسم الله أقراء) میں فعل خاص ہے اور خاص عام کے مقابلہ میں معنی پر "اللّٰه" زیادہ دلالت کرتا ہے۔ یہ راجح قول کی رو سے مشتق ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ﴾ (الانعام: ۳)

"اور وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور زمین میں۔"

اس لیے کہ "فی السموات" لفظ جلالت سے متعلق ہے، یعنی "وھو المألوہ فی السموات والارض." ......"آسمانوں اور زمین میں اسی کی عبادت کی جاتی ہے۔"

[الرَّحْمٰنُ] .....وہ بڑی وسیع رحمت والا ہے، عربی زبان میں (فعلان) کا وزن وسعت اور امتلاء پر دلالت کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل غضبان۔ جب آدمی غصے سے بھر جائے۔

[الرَّحِيْمُ] ..... یہ اسم فعل پر دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے، لہٰذا فعل پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح "الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" کے ایک ساتھ آنے سے یہ معنی پیدا ہوگا: "رحمت باری تعالیٰ بڑی وسیع ہے اور یہ کہ اس کی مخلوق تک رسائی ہے۔" اور یہ وہی بات ہے جس کی طرف بعض علماء نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ رحمان میں رحمت عامہ ہے، اور رحیم میں رحمت خاصہ جو کہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے۔ پھر جب کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا تک ہی محدود ہے تو گویا ان کے لیے اس کی رحمت سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس لیے کہ جب وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ سے جہنم سے رہائی کا سوال کرتے ہوئے اس کے سامنے اس کی ربوبیت کا وسیلہ پیش کریں گے اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہیں گے:

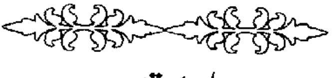
﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ٥﴾ (المومنون: ۱۰۷)

"ہمارے پروردگار! ہمیں (ایک بار) اس سے نکال دے، پھر اگر دوبارہ ہم یہ کام کریں گے تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے۔"

تو اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں رحمت سے نہیں بلکہ عدل سے کام لے گا اور فرمائے گا:

﴿اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ٥﴾ (المومنون: ۱۰۸)

"اس میں ذلت سے پڑے رہو اور مجھ سے بات نہیں کرو۔"



الحمد کی تفسیر

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾

شرح: ...... ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔" اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد اس کے کمال اور اس کے انعام پر کی جاتی ہے، ہم اللہ جل جلالہ کی حمد اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہر اعتبار سے کامل الصفات ہے، اس کی ہم اس لیے بھی حمد کرتے ہیں کہ اس کا انعام بھی کامل ہے اور احسان بھی۔ ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ٥﴾ (النحل: ۵۳) "تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے پھر جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے تو تم اسی کے سامنے روتے چلاتے ہو۔" اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انہیں رشد



وہدایت سے نوازنے کے لیے انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ مولف رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہیں۔

رسول سے مراد

اس جگہ رسول سے مراد جنس ہے، تمام رسولوں کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ ہی مبعوث فرمایا گیا تھا مگر جس ذات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسالت کی تکمیل فرمائی وہ محمد ﷺ ہیں، آپ پر اللہ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تشریف آوری کا سلسلہ ختم فرمادیا، اور اس طرح نبوت ورسالت کی عمارت مکمل ہوگئی۔ نبی کریم ﷺ نے دیگر رسولوں کی نسبت اپنی ذات کے بارے میں فرمایا کہ میری مثال اس آدمی جیسی ہے جس نے ایک محل تعمیر کیا اور پھر ایک اینٹ کی جگہ کے علاوہ اسے مکمل کر دیا لوگ اس محل کو دیکھتے تو بڑے خوش ہوتے بجز اس اینٹ کی جگہ کے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اینٹ میں ہوں، اور میں خاتم النبیین ہوں (ﷺ)۔'' [1]

الہدیٰ اور دین الحق سے مراد

[بِالْهُدٰی] .....اس جگہ ''باء'' مصاحبت کے لیے ہے اور ہدایت سے مراد علم نافع ہے، اس امر کا بھی احتمال ہے کہ ''باء'' تعدیہ کے لیے ہو، یعنی جس چیز کے ساتھ آپ ﷺ کو بھیجا گیا ہے وہ ہدایت اور دین حق ہے۔

[دِیْنِ الْحَقِّ] .....دین حق سے مراد عمل صالح ہے، اس لیے کہ دین عمل اور جزائے عمل سے عبارت ہے۔ عمل پر اس کا اطلاق اس آیہ کریمہ میں کیا گیا ہے: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹) ''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔'' جبکہ جزا پر اس کا اطلاق اس ارشاد باری تعالیٰ میں کیا گیا ہے: ﴿وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ﴾ (الانفطار: ۱۷) ''اور آپ کو کیا معلوم کہ جزا وسزا کا دن کیا ہے؟'' حق باطل کی ضد ہے اور وہ احکام واخبار میں مصالح کے حصول اور مفاسد کے دفع کرنے پر مشتمل ہے۔

[لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ] .....لام تعلیل کے لیے ہے اور ''یُظْهِرَهٗ'' کا معنی ہے: غلبہ عطا کرنا، ظہور، علو کے معنی میں آتا ہے۔

ظهر الدابة: جانور کا بالائی حصہ (پیٹھ، پشت) ظهر الارض: سطح زمین، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (فاطر: ۴۵) ''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو زمین کی پشت پر کسی بھی چلنے پھرنے والی چیز کو نہ چھوڑتا۔'' پھر (یُظْهِرَهٗ) میں ''ھا'' کا مرجع رسول ہے یا دین؟ اگر اس کا مرجع ''دین الحق'' ہے، تو پھر اس کے لیے قتال کرنے والا ہر شخص عالی وغالب ہوگا، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے: تاکہ وہ اس دین کو دیگر تمام ادیان پر غالب کر دے۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں کا کوئی دین ہی نہیں ہے ان پر حق تعالیٰ دین حق کو بطریق اولیٰ غلبہ عطا فرمائے گا۔ اس لیے کہ بے دین انسان دین باطل کے پرستار سے کہیں زیادہ خبیث ہے۔

[1] صحیح بخاری ۳۵۳۵۔ صحیح مسلم: ۲۲۸۶، عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ.



دریں حالات وہ جملہ ادیان جن کے پیروکار اپنے آپ کو حق پر فائز تصور کرتے ہیں، دین اسلام ان پر غالب آکر رہے گا، اور جو کسی بھی دین کو تسلیم نہیں کرتے ان پر بطریق اولیٰ غالب آئے گا، اور اگر یہ ضمیر رسول کی طرف لوٹتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو غلبہ عطا فرمائے گا، اس لیے کہ ان کے ساتھ دین حق ہے۔

الغرض دونوں صورتوں میں اس دین حق کے ساتھ دلی وابستگی رکھنے والے ہی ظاہر و غالب ہوں گے، علاوہ ازیں کہیں سے بھی عزت و غلبہ کے متلاشی ذلت و پستی کے متلاشی ہوں گے، غلبہ اور عزت و کرامت صرف دین حق کے ساتھ وابستگی میں ہے۔

برادران اسلام! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو ظاہری اور باطنی ہر دو اعتبار سے دین حق کو تھامے رکھنے کی دعوت دیتا ہوں، عبادت و اخلاق میں بھی، سیرت و سلوک میں بھی اور اس کی دعوت میں بھی۔ یہاں تک کہ ملت قائم ہو جائے اور امت صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے۔

آیت وَكَفٰى بِاللّٰهِ اور لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ میں مناسبت

[وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا] ...... اہل لغت کہتے ہیں، اس جگہ ''باء'' زائدہ ہے، جس کا مقصد لفظی تحسین وتجمیل اور کفایت کے معنی میں مبالغہ پیدا کرنا ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: "وكفى الله" اور "شهيدا" تمیز محول عن الفاعل ہے، اس لیے کہ اس کا اصل "وكفت شهادة الله" ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے قرآنی آیت ذکر کی ہے اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ﴿كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ کی ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ﴾ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے دونوں میں مناسبت بالکل واضح ہے اس لیے کہ نبی کریم علیہ السلام لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ جہنم میں جائے گا۔'' [1] اور آپ نے زبان حال سے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی میں اس سے صلح رکھوں گا اور جس نے میری نافرمانی کی میں اس سے جنگ کروں گا۔'' آپ ﷺ نے اس دین کے ساتھ محاربہ کیا اور لوگوں کے خونوں، مالوں، عورتوں اور اولادوں کو مباح قرار دیا، اس دوران رب کائنات کی طرف سے آپ کی مدد کی گئی۔ آپ کو تقویت سے نوازا گیا، آپ ہمیشہ غالب رہے اور کبھی مغلوب نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سب کچھ آپ کے لیے تمکین فی الارض ہے اور یہ اس کی طرف سے فعلاً اس امر کی گواہی ہے کہ آپ علیہ السلام صادق ہیں اور یہ کہ آپ کا دین حق ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی کرنے والے کا انجام ذلت و رسوائی، زوال پذیر ہونا اور پھر معدوم ہو جانا ہے، آپ چشم تصور سے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی اور دوسرے مدعیان نبوت کی طرف دیکھیں کہ ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کے نام تک بھی لوگوں کے ذہنوں سے بھی مٹ گئے، اور وہ ہلاکت سے دوچار کر دیئے گئے۔ ان کے دعوے باطل قرار پائے اور وہ صواب و سداد سے محروم رہے۔ اس کے برعکس نبی کریم ﷺ کی دعوت بحمد اللہ تعالیٰ آج تک باقی ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک باقی بھی رہے گی اور ثابت و راسخ بھی۔

---

[1] صحیح بخاری ۷۲۸۰ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری ساری امت جنت میں داخل ہوگی مگر جس نے انکار کر دیا، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! جنت میں جانے سے کون انکار کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کر دیا۔''

آج تک اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ کفار کے خون بھی مباح رہے اور ان کے اموال بھی ان کی عورتوں کو بھی قیدی بنایا جاتا رہا اور ان کے بچوں کو بھی ❶ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کی عزت افزائی اور تصدیق کی، آپ کی تکذیب نہیں کی اور آپ کو رسوا نہیں ہونے دیا، یہ اللہ تعالیٰ کی فعلی شہادت ہے اسی لیے اس کا ذکر ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ﴾ کے بعد کیا گیا۔

شہادت لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا معنی

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ ، لَا شَرِيْكَ لَهُ ، إِقْرَارًا بِهٖ وَ تَوْحِيْدًا .))

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اس کا اقرار کرتے ہوئے اور اس کی توحید کا اعتراف کرتے ہوئے۔''

شرح: ......[اَشْهَدُ] کا معنی ہے: میں اپنے دل سے اقرار کرتا اور زبان سے اس کا اظہار کرتا ہوں، اور یہ اس لیے کہ شہادت دل میں موجود کسی چیز کے نطق واظہار کا نام ہے، آپ قاضی یا جج کے سامنے کسی کے خلاف یا کسی کے حق میں گواہی دیتے ہیں تو اس وقت آپ کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی تعبیر زبان سے کرتے ہیں، جسے شہادت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اقرار سے ہٹ کر شہادت کا انتخاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ شہادت کا اصل معنی ''شهودا لشيئ'' ہے، یعنی کسی چیز کے پاس موجود ہونا اور اسے دیکھنا، گویا کہ جس کے دل میں جو کچھ موجود ہے اپنی زبان سے اس کی خبر دینے والا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

[لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ] ...... یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں اس بنا پر ''لا'' کی خبر محذوف ہوگی اور لفظ ''اللہ'' اس سے بدل۔

[وَحْدَهُ ، لَا شَرِيْكَ لَهُ]...... ''وحده'' من حیث المعنی اثبات کی توکید ہے اور ''لا شريك له'' نفی کی توکید۔

[إِقْرَارًا بِهٖ وَ تَوْحِيْدًا] ...... ''اقرارا'' مصدر ہے، اسے مفعول مطلق بھی کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ ''اشهد'' کا معنوی مصدر ہے، علماء نحو کہتے ہیں: جب مصدر فعل کے معنی میں ہو اور بدون لفظ ہو تو وہ مصدر معنوی ہوتا ہے یا مفعول مطلق، اور اگر وہ فعل کے معنی اور اس کے حروف کے ساتھ ہو تو وہ مصدر لفظی ہوگا، لہٰذا قمت قیاما تو مصدر لفظی ہے، جبکہ قمت وقوفا مصدر معنوی، اس طرح جلست جلوسًا مصدر لفظی ہوگا اور جلست قعودا معنوی اور ''توحیدا''، ''لا اله الا الله'' کے لیے مصدر مؤکد ہے۔

❶ بخاری ۲۵۔ مسلم ۲۲. میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر وہ یہ کام کریں گے تو مجھ سے اپنے خون اور مال بچالیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔



شہادت محمد رسول اللہ کا معنی

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُه .)) ''اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

شرح:...... [وَاَشْهَدُ] سے متعلقہ بحث ابھی اوپر گزری ہے۔

[مُحَمَّدًا]..... آپ کا شجرہ نسب اس طرح سے ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب قریشی ہاشمی، آپ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی اولاد سے ہیں اور سب لوگوں سے زیادہ شریف النسب۔

نبی کریم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، آپ سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے تھے، آپ شب میں اس قدر طویل قیام فرماتے کہ آپ کے قدموں پر ورم آ جاتا۔ آپ سے کہا گیا: جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں تو پھر اس قدر طویل قیام کیوں فرماتے ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا: ''کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' ❶ اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر گزار بندوں کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ اس نے نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ (الاسراء: ۳) ''بے شک وہ شکر گزار بندہ تھا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ میں بھی شکر گزاری کی اس منزل پر پہنچوں اور اس کی عبادت کا حق ادا کروں۔ آپ سب لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے والے، اس سے ڈرنے والے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے حصول کے لیے بڑی رغبت رکھنے والے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے تھے، اور عبودیت کے تقاضے کے تحت آپ نہ تو اپنے لیے اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے نفع یا نقصان کے مالک تھے، آپ کا ربوبیت میں مطلقاً کوئی حق نہیں تھا، آپ اللہ تعالیٰ کے محتاج اور اس کے فقیر تھے، آپ رب تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کرتے، اس سے دعا کرتے، اس سے امیدیں وابستہ رکھتے اور اس سے خائف رہتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ میں ان امور میں سے کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

''آپ کہہ دیں کہ میں نہیں ہوں مالک اپنی جان کے لیے کسی نفع کا اور نہ نقصان کا اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بہت سے فائدے جمع کر لیتا۔''

اور دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الانعام: ۵۰)

''فرما دیں کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ

---

❶ صحیح بخاری: ٤٨٣٧۔ صحیح مسلم: ٢٨٢٠ عن عائشة رضي الله عنها.



کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔"

آپ ﷺ کو یہ کہنے کا بھی حکم دیا گیا:

﴿قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا○ قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا○ إِلَّا بَلَاغًا﴾ (الجن: ۲۱۔۲۳)

"کہہ دیجئے کہ یقیناً میں نہیں اختیار رکھتا ہوں تمہیں نقصان پہنچانے کا اور نہ فائدہ دینے کا، کہہ دیجئے کہ مجھے اللہ سے کوئی بھی پناہ نہیں دے سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پاتا ہوں بجز پہنچا دینے کے۔"

"الا" استثناء منقطع ہے، یعنی اللہ کے احکامات اور اس کے پیغامات پہنچا دینا ہی میرے ذمہ ہے۔

حاصل کلام یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے ہیں اور اس عبودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ربوبیت کے امور میں سے آپ کا کسی بھی چیز میں کوئی حق نہ ہو۔

جب محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ عالم ہے تو پھر ان سے کمتر بندوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ یقیناً وہ لوگ نہ تو اپنے لیے کسی نفع یا نقصان کے مالک ہیں اور نہ ہی دوسرے لوگوں کے لیے۔ اس سے ان لوگوں کی سفاحت وحماقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے جو آلام ومصائب میں اللہ کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مشکل کشائی کے لیے پکارتے ہیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اولیاء اللہ ہیں۔

[وَرَسُولُهُ] ..... یہ بھی وہ عظیم وصف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس سے کوئی بھی متصف نہیں ہوگا، اس لیے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔

آپ اللہ تعالیٰ کے وہ رسول ہیں کہ جس مقام ومنصب پر آپ فائز ہوئے بنی نوع انسان میں سے کوئی دوسرا اس تک رسائی حاصل نہ کر سکا، بلکہ جہاں تک ہمیں علم ہے کوئی فرشتہ بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا، آپ ساتویں آسمان سے بھی اوپر تک پہنچے، اس جگہ تک پہنچے جہاں آپ نے قضا وقدر کے قلموں کے چلنے کی آواز تک سماعت فرمائی، اللہ تعالیٰ براہ راست آپ سے ہمکلام ہوا، آپ کو اپنی ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور ایسے بڑے بڑے معجزات کے ساتھ آپ کی تائید فرمائی جو آپ سے قبل کسی بندہ بشر یا کسی رسول کا مقدر نہ بن سکے۔ وہ معجزہ قرآن عظیم ہے، جس کی انبیاء سابقین کے معجزات میں کوئی نظیر نہیں ملتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ○ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ○﴾

(العنکبوت: ۵۰۔۵۱)

"اور وہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں؟ آپ فرما دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کے لیے یہ (معجزہ) کافی نہیں ہے کہ



ہم نے آپ پر کتاب اتاری جوان پر پڑھی جاتی ہے۔''

یہ ارشاد ربانی ہر چیز سے کفایت کرتا ہے مگر اسے جو صاحب دل ہو یا وہ کان لگائے اور خود بھی متوجہ ہو، رہا روگردانی کرنے والا، تو وہ تو وہی کچھ کہے گا جو گزشتہ لوگ کہتے رہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت دونوں کا خاتمہ کر دیا، جب نبوت کی نفی ہوگئی جو کہ رسالت سے عام ہے تو رسالت کی از خود نفی ہوگئی جو کہ نبوت سے خاص ہے۔ اعم کی نفی اخص کی نفی کو مستلزم ہوا کرتی ہے۔

قول وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا مَزِيْدًا کا مفہوم

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ عَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا مَزِيْدًا.))

''اللہ تعالیٰ آپ پر آپ کی آل اور آپ کے صحابہ پر رحمت نازل فرمائے اور زیادہ سلام بھی۔''

شرح: ...... [صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ] ..... اس جملہ کا سب سے خوبصورت معنی ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے کیا ہے، ان کے نزدیک اس کا مطلب ہے: اللہ عزوجل کا ملاءاعلیٰ میں نبی کریم ﷺ کی تعریف وثناء بیان کرنا، جن لوگوں نے صلاۃ کو رحمت کے معنی میں لیا ہے تو ان کا یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ رحمت ایزدی تو ہر ایک کے لیے ہوتی ہے۔

علماء کا کسی کو رحمہ اللہ کہنے کے جواز پر تو اجماع ہے جبکہ کسی کے لیے ''صلی علیہ'' کہنے میں اختلاف ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صلاۃ اور رحمت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ نیز یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾ (البقرۃ: ۱۵۷) ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اپنے رب کی طرف سے صلوات بھی ہے اور رحمت بھی۔'' عطف مغایرت کا متقاضی ہوتا ہے، بایں صورت صلاۃ رحمت سے خاص ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا صلاۃ بھیجنا ملأ اعلیٰ میں آپ کی تعریف وتوصیف سے عبارت ہے۔

[وَ عَلٰى آلِهِ] ...... اس جگہ آل سے مراد آپ ﷺ کے پیروکار ہیں۔ جب لفظ آل اکیلا یا صحب کے ساتھ استعمال ہو تو اس صورت میں وہ پیروکاروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آل فرعون کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝﴾

(الغافر: ٤٦)

''انہیں صبح وشام آگ پر پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی (تو فرشتوں کو حکم ہوگا) آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کرو۔''

اس جگہ آل فرعون سے مراد اس کے پیروکار ہیں۔



جب لفظ آل لفظ اتباع کے ساتھ مل کر آئے اور یوں کہا جائے: آله واتباعه . تو اس صورت میں آل سے مراد رسول کریم ﷺ کے گھرانے کے اہل ایمان لوگ ہوں گے۔ چونکہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس جگہ اتباع کا ذکر نہیں کیا اور صرف "آله و صحبه" کہنے پر اکتفا کیا، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ (آله) سے مراد آپ کے پیروکار ہیں اور "صحبه" سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہیں ایمان کی حالت میں آپ کی رفاقت میسر آئی اور ایمان کی حالت میں ہی دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس جگہ آل پر صحب کا عطف، عطف الخاص علی العام کے باب سے ہے، اس لیے کہ صحبت مطلق اتباع سے خاص ہے۔

[وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا مَزِيْدًا.] ...... (سَلَّم) میں آفات وبلیات سے سلامتی اور الصلاۃ میں بھلائیوں کے حصول کا معنی ہے۔ اس طرح مولف نے یہ صیغہ لا کر ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ اپنے نبی کریم ﷺ کا دامن خیر وبھلائی سے بھر دے اور خاص طور پر ملا اعلیٰ میں آپ کی تعریف وثناء کے ساتھ اور دوسری طرف یہ سوال کہ وہ آپ اور آپ کے پیروکاروں سے جملہ آفات کو دور رکھے۔

"صَلَّى" اور "سلَّم" میں جملہ لفظا خبریہ ہے اور معنی "طلبیه" اس لیے کہ اس سے مراد دعا ہے۔

مَـــزِيْـــدًا زائد یا زیادہ کے معنی میں ہے، یعنی صلاۃ پر سلام کا اضافہ۔ اس طرح یہ صلاۃ کے بعد سلام کی دوسری دعا ہے۔ اہل علم کے نزدیک رسول وہ ہوتا ہے جس کی طرف شریعت وحی کی جائے اور اسے اس کی تبلیغ کا حکم دیا جائے۔

آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور رسول بھی۔ آپ ان آیات کی روشنی میں نبی اللہ تھے۔ فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ٥ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ٥ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ٥﴾ (العلق: ۱-۵)

"پڑھیں اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا، اس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے، پڑھیں اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے سکھایا قلم کے ذریعے، اس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔"

اور ان آیات کی روشنی میں رسول اللہ: ﴿يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ٥ قُمْ فَاَنْذِرْ ٥﴾ [1] (المدثر: ۱-۲) "اے کپڑا اوڑھنے والے! اٹھیں اور (لوگوں کو) ڈرائیں۔"

کلمہ اَمَّا بَعْدُ کا اعراب

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((اَمَّا بَعْدُ ؛ فَهٰذَا اعْتِقَادُ الْفِرْقَةِ النَّاجِيَةِ الْمَنْصُوْرَةِ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ ؛ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ .))

"یہ فرقہ ناجیہ، اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے جس کی قیامت تک مدد کی جاتی رہے گی۔"

[1] ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری ٤-٣.

شرح:...... [اَمَّا بَعْدُ] ..... (اما) اسم شرط اور فعل شرط کا نائب ہے، اس کی تقدیری عبارت اس طرح ہے، مهما یکن من شیء اور (اما بعد) کی تقدیری عبارت ہے: مهما یکن فی شیء بعد هذا، فهذا.

اس بنا پر فاء جواب کا ربط پیدا کرنے کے لیے ہے اور اس کے بعد کا جملہ جواب شرط کے طور پر محل جزم میں ہے۔ میرے نزدیک اس امر کا بھی احتمال ہے کہ "امابعد، فهذا" میں اما حرف شرط اور تفصیل ہو یا تفصیل سے مجرد صرف حرف شرط ہو، اس طرح تقدیری عبارت ہوگی۔ "امابعد ذکر هذا"

اعتقاد کا لغوی اور اصطلاحی معنی

[فَهٰذَا اعْتِقَادُ] ..... هذا، اسم اشارہ ہے اور اشارہ کسی موجود چیز کی طرف ہونا چاہیے، جب میں (هذا) کہوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں کسی ظاہر ومحسوس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ مگر مؤلف نے تو کتاب لکھنے اور اسے عالم محسوسات میں پیش کرنے سے پہلے اس کا خطبہ لکھا تھا۔ اس کی توجیہ کیا ہے؟

میں اس کے جواب میں یہ کہنا چاہوں گا کہ علماء فرماتے ہیں کہ اگر تو مؤلف رحمہ اللہ نے پہلے کتاب لکھی اور پھر اس کا مقدمہ اور خطبہ رقم کیا، تو اس صورت میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ مشار الیہ موجود بھی ہے اور محسوس بھی، اور اگر انہوں نے کتاب پہلے نہیں لکھی تھی تو اس صورت میں وہ اپنے ذہن میں موجود ان معانی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جنہیں وہ اس کتاب میں لکھنے والے تھے۔ میرے نزدیک اس کی ایک تفسیری وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مولف نے یہ بات مخاطب کے حال کے اعتبار سے کہی، مخاطب کو اس کے ساتھ اس وقت خطاب کیا گیا جب کتاب عالم مشہود میں قدم رکھ چکی تھی، گویا کہ مؤلف کہہ رہے تھے: جو کتاب اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ہے وہ اس قسم کی ہے۔

اِعْتِقَادُ عقد سے افتعال کا وزن ہے جو کہ شد و ربط سے عبارت ہے۔ یہ بات تو تصریف لغوی کے حوالے سے تھی۔ جہاں تک اس کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو اعتقاد ذہن جازم کے حکم سے عبارت ہے۔ کہا جاتا ہے۔ اعتقدت کذا، یعنی میں نے اپنے دل میں اس کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ پھر اگر یہ اعتقاد واقع کے مطابق ہوگا تو صحیح ہوگا اور اگر اس کے خلاف ہوگا تو فاسد ہوگا۔ ہمارا یہ اعتقاد رکھنا صحیح ہے کہ اکیلا اللہ ہی الٰہ ہے، جبکہ نصاریٰ کا یہ عقیدہ فاسد و باطل ہے کہ اللہ تینوں میں سے تیسرا ہے، اس لیے کہ یہ خلاف واقع ہے۔ لفظ اعتقاد کے اصطلاحی مفہوم کا اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ ارتباط ظاہر و واضح ہے، اس لیے کہ جس شخص نے اپنے دل میں کسی چیز کو راسخ کر لیا ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے اس پر اس مضبوطی سے گرہ لگا دی ہو کہ وہ اس سے کہیں اور التفات نہ کرے۔

فرقہ ناجیہ کی تعریف

[الْفِرْقَةِ] ..... فاء کے کسرہ کے ساتھ، بمعنی گروہ۔ فرمان ایزدی ہے: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ﴾ (التوبة: ۱۲۲) ''پس یہ کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہوا کرے۔'' رہا فرقة، فاء کی پیش کے ساتھ، تو یہ افتراق سے ماخوذ ہے، بمعنی جدائی۔



[النَّاجِيَة]..... من نجا سے اسم فاعل ہے۔ سالم و محفوظ رہنا، یہ گروہ دنیا میں بدعات واخرافات سے محفوظ رہتا ہے اور آخرت میں آتش جہنم سے محفوظ رہے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے ایک کے علاوہ باقی سب فرقے جہنم میں جائیں گے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! وہ جماعت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جو اس مثل پر ہو جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔'' ❶

یہ حدیث (الناجية) کے معنی کی وضاحت کرتی ہے، جو شخص اس مثل پر ہے جس پر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام تھے تو ایسا شخص بدعات سے محفوظ رہے گا، جب وہ دنیا میں بدعات سے محفوظ رہے گا تو آخرت میں دوزخ سے محفوظ رہے گا۔

[الْمَنْصُورَةِ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ]..... مؤلف نے یہ تعبیر حدیث کی موافقت میں اختیار کی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا۔'' ❷ ظہور، انتصار سے عبارت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَى عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ﴾ (الصف: ١٤)

''پھر ہم نے ایمان والوں کو ان کے دشمنوں کے خلاف مدد دی تو وہ غالب ہو گئے۔''

اس گروہ کی نصرت اللہ تعالیٰ کرتا ہے، اس کے فرشتے اور اہل ایمان کرتے ہیں، قیامت قائم ہونے تک اس گروہ کی مدد کی جاتی رہے گی، رب تعالیٰ کی طرف سے بھی، ملائکہ کی طرف سے اور مومن بندوں کی طرف سے بھی، حتیٰ کہ ایسے انسانوں کی مدد جنات بھی کیا کرتے ہیں، وہ ان کی مدد کرتے اور ان کے دشمنوں کو خوفزدہ کرتے ہیں۔

إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ یعنی روز قیامت تک اس کی مدد کی جاتی رہے گی، اس جگہ ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت بدترین قسم کے لوگوں پر قائم ہوگی۔ ❸ اور وہ قائم نہیں ہوگی یہاں تک زمین میں اللہ اللہ نہیں کہا جائے گا۔ ❹ آپ کے اس ارشاد اور اس فرمان: "الى قيام الساعة" کے مابین تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے قیامت قائم ہونے کا قرب مراد ہے۔ اس لیے کہ ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد مروی ہے: "حتى ياتي أمر الله" یہاں تک کہ اللہ کا امر آ جائے۔ ❺ یا قیام ساعت سے مراد ان کی ساعت یعنی ان کی موت ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی، مگر پہلا قول زیادہ موزوں ہے۔ اور وہ یہ کہ قیامت برپا ہونے کے قریب تک ان کی مدد کی جاتی رہے

---

❶ ترمذی: ٢٦٤١۔ الالکائی، شرح السنه: ١٤٧۔ حاکم: ١٢٩/١۔ آجری: ١٥، ١٦۔ عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے۔ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی راوی سوء حفظ کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس کا شاہد موجود ہے، جسے طبرانی نے الصغیر: ٧٢٤ میں اور العقیلی نے الضعفاء: ٢/٢٦٢ میں روایت کیا ہے جس کی وجہ سے یہ حسن کے درجہ میں آ جاتی ہے۔

❷ یہ حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے اور متواتر حدیث ہے، اس کی تصریح شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اقتضاء الصراط: ١/٦٩ میں کتانی نے نظم المتناثرہ: ٩٣ زبیدی نے لقط اللالئ المتناثرہ: ٦٨ اور البانی نے صلاة العيدين: (ص ٤٠۔ ٣٩) میں کی ہے۔

❸ صحیح مسلم: ٢٩٤٩۔ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ ❹ صحیح مسلم: ١٤٨ عن انس رضی اللہ عنہ۔

❺ صحیح بخاری: ٧٣١٢۔ صحیح مسلم: ١٩٢٠۔

گی۔ہم نے یہ تاویل دلیل کی بنیاد پر کی ہے جو کہ جائز ہے، اس لیے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

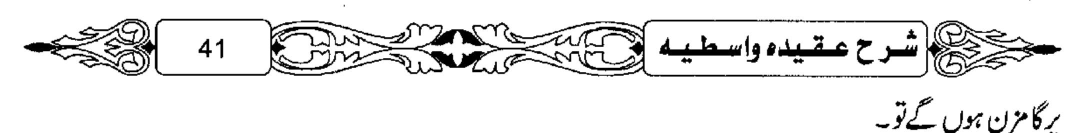
اہل السنۃ والجماعۃ کا معنی

[اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ] ..... انہیں سنت کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ سنت کے ساتھ دلی وابستگی رکھتے ہیں اور جماعت کی طرف منسوب کرنے کی وجہ ان کا سنت پر مجتمع ہونا ہے..... اگر انہیں جماعت کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک جماعت ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک چیز کی اضافت اس کی ذات کی طرف کیسے کی جاسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کلمہ (جماعت) اجتماع کے معنی میں ہے اور یہ اسم مصدر ہے۔ یہ اصل میں ہے، پھر اسے اصل سے نکال کر مجتمع قوم کے معنی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس بناء پر اہل السنۃ والجماعۃ کا معنی ہوگا۔ اهل السنة والاجتماع.

یہی وجہ ہے کہ یہ گروہ اہل بدعت کی طرح افتراق کا شکار نہیں ہوا۔ جہمیہ، معتزلہ، روافض اور دیگر بدعتی گروہ تفرقہ بازی کا شکار ہو گئے جبکہ یہ گروہ حق پر مجتمع رہا۔ اگر چہ ان کے درمیان اختلاف ہوتا رہا مگر یہ اختلاف ضرر رساں نہیں ہے، وہ اس کی وجہ سے ایک دوسرے کو ''گمراہ نہیں'' کہتے اور اس حوالے سے ان کے سینوں میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے، عقیدہ کے متعلق بعض امور میں ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً یہی کہ کیا نبی کریم ﷺ نے اپنی آنکھوں سے رب تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں؟ کیا عذاب قبر بدن اور روح دونوں کو ہوگا یا صرف روح کو؟ اور ان جیسے کچھ دیگر امور جن میں اہل سنت کا اختلاف رہا ہے مگر یہ اختلاف اصولی مسائل میں نہیں بلکہ فروعی قسم کے مسائل میں ہے اور اس اختلاف کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر گمراہی کے فتوے نہیں لگاتے۔

مؤلف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل سنت کے طریقہ میں ان کے مخالفین کو ان میں داخل نہیں کرتے، مثلاً اشاعرہ اور ماتریدیہ کو اہل سنت میں شمار نہیں کیا جاتا، اس لیے کہ وہ اس باب میں نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے طریقہ کے مخالف ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان کی حقیقت پر جاری کیا جائے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اہل السنہ والجماعہ کے تین گروہ ہیں: سلفی، اشعری اور ماتریدی، مگر ان کا یہ کہنا غلط ہے، اس قدر شدید اختلاف کے باوجود ان لوگوں کو اہل سنت میں کس طرح شمار کیا جا سکتا ہے؟ حق کے بعد گمراہی کے علاوہ اور ہے بھی کیا؟ وہ اہل سنت کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ ان میں سے ہر گروہ دوسرے کی تردید کرتا ہے؟ یہ جمع بین الضدین کے مترادف ہے جو کہ ممکن نہیں ہے، اسی میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے صرف ایک گروہ ہی اہل سنت ہے، وہ کون سا گروہ ہے؟ اشاعرہ، ماتریدیہ یا پھر سلفیہ؟ اس بارے میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ صاحب سنت وہی ہے جو سنت سے موافقت کرتا ہو، مخالف سنت کبھی اہل سنت نہیں ہو سکتا، ہمارے نزدیک سلف ہی اہل السنہ والجماعہ ہیں، یہ وصف ان کے علاوہ کسی اور پر کبھی بھی صادق نہیں آ سکتا۔ کلمات کا اعتبار ان کے معانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم مخالفین سنت کو اہل سنت کے نام سے کس طرح موسوم کر سکتے ہیں؟ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، تین مختلف گروہوں کو ایک اجتماع کہنا درست نہیں ہے، کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ وہ اجتماع کہاں ہے؟ اہل السنہ والجماعہ ہی اعتقاداً سلفی ہیں، یہاں تک کہ قیامت تک کے متاخرین بھی سلفی ہی ہوں گے، اگر وہ نبی کریم ﷺ اور آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ



پر گامزن ہوں گے تو۔

ارکانِ ایمان

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ الْإِيْمَانُ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْإِيْمَانُ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ.))

''اور وہ ہے اللہ پر ایمان لانا، اس کے فرشتوں پر ایمان لانا، اس کی کتابوں پر ایمان لانا، اس کے رسولوں پر ایمان لانا، موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان لانا اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لانا۔''

شرح: ...... ہمارے لیے عقیدے کی یہ تفصیل نبی کریم ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے ان سوالات کے جواب میں بیان فرمائی کہ اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ احسان کیا ہے؟ اور قیامت کب آئے گی؟ آپ نے ایمان کے بارے میں اس کے سوال کے جواب میں فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے۔'' [1]

[**اَلْإِيْمَانُ بِاللّٰهِ**] ...... ایمان لغوی اعتبار سے: اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق سے عبارت ہے، اس حوالے سے صَدَّقْتُ اور اٰمَنْتُ لغوی اعتبار سے ایک ہی معنی میں ہیں، مگر ان کا یہ قول درست نہیں ہے، لغۃً ایمان کسی چیز کی تصدیق کرتے ہوئے اس کے اقرار کا نام ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ یہ تو کہتے ہیں: "آمنت بکذا، اقرءت بکذا. وصدقت فلانا. مگر یہ نہیں کہہ سکتے: امنت فلانا، اس اعتبار سے ایمان مجرد تصدیق سے۔ زائد معنی کو متضمن ہے، اور وہ ہے ایسا اعتراف واقرار جو اخبار کو قبول کرنے اور احکام کے سامنے سر جھکانے کو مستلزم ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانا اس وقت تک ایمان نہیں کہلاتا جب تک یہ اخبار کو قبول کرنے اور احکام کی تعمیل کرنے کو مستلزم نہ ہو۔

ایمان باللہ چار امور پر مشتمل ہوتا ہے:

۱۔ وجود باری تعالیٰ پر ایمان لانا۔

۲۔ اس کی ربوبیت پر ایمان لانا، یعنی اس بات پر ایمان لانا کہ وہ ربوبیت میں یکتا ہے۔

۳۔ الوہیت میں اس کے منفرد ہونے پر ایمان لانا۔

۴۔ اس کے اسماء وصفات پر ایمان لانا۔

اس بنا پر وجود باری تعالیٰ پر ایمان نہ رکھنے والا مومن نہیں ہے، جو شخص اللہ کے وجود پر تو ایمان رکھتا ہو، مگر ربوبیت میں اس کے منفرد ہونے پر ایمان نہ رکھتا ہو تو وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ان دونوں باتوں پر ایمان رکھنے والا اور الوہیت میں اس کے

---

[1] صحیح مسلم: ۸ من حدیث عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ.

منفرد ہونے پر ایمان نہ رکھنے والا بھی مومن نہیں ہے۔ اسی طرح ایک شخص کا اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی ایمان ہے وہ ربوبیت والوہیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے واحد و یکتا ہونے پر ایمان رکھتا ہے مگر اس کا اس کے اسماء وصفات پر ایمان نہیں ہے، تو یہ شخص بھی مومن نہیں ہے۔ اسماء وصفات کے انکار کے حوالے سے بعض صورتوں میں ایمان کلیتًا مسلوب ہو جاتا ہے، جبکہ بعض صورتوں میں کمال ایمان سلب ہو جاتا ہے۔

وجود باری تعالیٰ پر ایمان

سوال: وجود باری تعالیٰ کی دلیل کیا ہے؟

جواب: وجود باری تعالیٰ کے دلائل ہیں: عقل، حس اور شرع، یہ تینوں وجود باری تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں، ان پر دلیل فطرت کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ادلہ ثلاثہ میں شرع کو موخر کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ تقدیم کا استحقاق نہیں رکھتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان لوگوں سے مخاطب ہیں جن کا شرع پر ایمان نہیں ہے۔

وجود باری تعالی پر عقلی دلیل:

کیا اس کائنات کا وجود خود متحقق ہوگیا یا یہ اچانک ہی معرض وجود میں آ گئی؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ از خود ہی معرض وجود میں آ گئی تو یہ عقلاً محال ہے، جب یہ معدوم تھی تو پھر وجود میں کیسے آ گئی؟ معدوم جب تک وجود میں نہ آ جائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، جب کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں تھا تو اس کا اپنے آپ کو معرض وجود میں لانا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ اچانک وجود میں آ گئی تو یہ بھی محال ہے۔

وجود باری تعالیٰ کے منکر! کیا یہ میزائل، ہوائی جہاز، گاڑیاں، کاریں اور مختلف قسم کے دیگر آلات اتفاقاً ہی معرض وجود میں آ گئے تھے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر یہ حجر و شجر، شمس و قمر، ندیاں نالے، دریا اور پہاڑ وغیرہا بھی اتفاقاً وجود پذیر نہیں ہو سکتے تھے، یہ نہ پہلے ممکن تھا اور نہ آئندہ کبھی اس کا امکان ہوگا، بیان کیا جاتا ہے کہ اہل ہند سے دہریہ قسم کے کچھ لوگ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے وجود باری تعالیٰ پر مناظرہ کرنے کی غرض سے آئے تو آپ نے انہیں ایک دو دن بعد آنے کو کہا۔ یاد رہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا شمار ذہین ترین علماء میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ آپ نے فرمایا: میں خوردنی اشیاء اور دیگر سامان تجارت سے بھری کشتی کے بارے میں سوچ رہا ہوں، جو پانی کی لہروں کو چیرتی ہوئی آئی اور بندرگاہ پر آ کر ٹھہر گئی۔ سامان نیچے اتار کر وہ واپس چلی گئی اس میں نہ تو اس کا کوئی کپتان تھا اور نہ ہی مزدور۔ وہ کہنے لگے: آپ یہی کچھ سوچ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، وہ کہنے لگے پھر تو آپ میں عقل نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ کشتی کا از خود بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا پھر اس سے از خود سامان کا اتر جانا اور پھر اس کا واپس لوٹ جانا، یہ سب کچھ غیر معقول ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ تو تمہارے نزدیک غیر معقول ہے مگر یہ معقول کیسے ہے کہ آسمان، ستارے، سیارے، پہاڑ، درخت، دریا، سمندر اور لوگ بغیر کسی صانع کے ہی وجود میں آ گئے؟ اس پر انہیں پتہ چل گیا کہ یہ شخص ہماری عقلوں سے مخاطب ہے جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

کسی بادیہ نشیں شخص سے پوچھا گیا: تو نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ اس نے کہا: نشان قدم چلنے پر دلالت کرتا اور مینگنی

اونٹ پر دلالت کرتی ہے، کیا برجوں والا آسمان، راستوں والی زمین اور موجوں والے سمندر سمیع وبصیر ذات پر دلالت نہیں کرتے؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ﴾ (الطور: ۳۵)

''کیا وہ بغیر کسی چیز کے پیدا کیے گئے یا وہ اپنے خود آپ ہی خالق ہیں۔''

الغرض عقل وجود باری تعالیٰ پر قطعی طور پر دلالت کرتی ہے۔

حسی دلیل: وجود باری تعالیٰ پر حسی دلیل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا اور اسے یارب یارب! کہہ کر پکارتا اور اس سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے، پھر اس کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے اور اسے وہ چیز عطا کر دی جاتی ہے، یہ حسی دلالت ہے، بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور وہ اس کی دعا کو قبول کرتا ہے اور وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور خود ہم نے گزشتہ لوگوں سے بھی سنا ہے اور عصر حاضر کے لوگوں سے بھی سنا کرتے ہیں کہ اللہ بندوں کی دعائیں قبول فرمایا کرتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ جمعہ کے دن لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، اس دوران ایک اعرابی مسجد میں داخل ہوا اور کہنے لگا: مال مویشی ہلاک ہوگئے، راستے بند ہوگئے، آپ اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا فرمائیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! اس وقت آسمان پر بادل کا ٹکڑا تک موجود نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ کے دعا فرمانے کی دیر تھی کہ ڈھال کی طرح کا بادل آسمان سے اٹھا اور پھر ادھر ادھر پھیل گیا، وہ کڑکا، چمکا اور پھر موسلا دھار بارش برسنے لگی، آپ منبر سے نیچے اترے تو آپ کی ریش مبارک سے بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ [1] یہ واقعہ وجود خالق پر کائنات کی حسی دلیل ہے۔

قرآن مجید میں اس طرح کی بہت سی آیات ہیں، مثلاً:

﴿وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ﴾ (الانبیاء: ۸۳۔ ۸۴)

''اور ایوب کو یاد کریں جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یقیناً مجھے تکلیف پہنچی ہے جبکہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی۔''

فطرت کی دلیل: فطرت سلیمہ کے حامل اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، یہاں تک کہ حیوانات تک بھی وجود باری تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالے سے مروی چیونٹی کا واقعہ اس کی بہترین دلیل ہے، آپ باران رحمت کی دعا کرنے کے لیے باہر نکلے تو ایک چیونٹی کو دیکھا جو پیٹھ کے بل لیٹ کر آسمان کی طرف ٹانگیں اٹھائے ہوئے کہہ رہی ہے۔ یا اللہ! ہم بھی تیری مخلوق ہیں، ہمیں بھی بارش کی ضرورت ہے اسے ہم سے نہ روکنا۔ یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: واپس لوٹ چلو، تم دوسروں کی دعا سے پانی پلائے جاؤ گے۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری ۱۰۳۳۔ صحیح مسلم: ۸۹۷۔ من حدیث انس.

[2] سیوطی رحمہ اللہ نے درمنثور میں اس روایت کو ابن ابی شیبہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ احمد: "فی الزهد" ابن ابی حاتم عن ابی حاتم عن ابی الصدیق الناجی ملاحظہ فرمائیں: ابن قیم رحمہ اللہ "احتماع الجیوش" ص: ۳۲۸۔ ۳۲۱.



اللہ تعالیٰ کی توحید و معرفت فطری اور جبلی چیز ہے۔ جس کی طرف اس ارشاد باری تعالیٰ میں اشارہ کیا گیا ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ○ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ○﴾ (الاعراف: ۱۷۲۔ ۱۷۳)

''اور جب نکالی تیرے رب نے اولاد آدم سے ان کی اولاد اور گواہ بنایا ان کو ان کی ذاتوں پر کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے بتایا: کیوں نہیں اور یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ یقیناً ہم تو اس سے بے خبر تھے یا یہ نہ کہہ سکو کے شرک تو اس سے پہلے ہمارے آباء واجداد نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد (ان کی) اولاد تھے۔''

یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وجود باری تعالیٰ اور اس کی ربوبیت کی گواہی دینا انسان کی جبلت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو ان کی پیٹھ سے نکال کر انہیں اپنی ربوبیت کا گواہ بنایا ہو یا اس نے اپنی ذات کا اقرار ان کی فطرت میں رکھ دیا ہو، ان دونوں صورتوں میں یہ ارشاد ربانی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے رب کو پہچانتا ہے۔

دلالت شرع: جہاں تک دلالت شرع کا تعلق ہے تو مخلوقات کی ہمہ جہتی اصلاح پر مشتمل انبیاء کرام جو شرائع لے کر آئے وہ طبعی طور اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انہیں بھیجنے والا رب بڑا رحیم و کریم ہے۔ اور خاص طور پر قرآن مجید، فرقان حمید جس نے جن وانس کو اپنی نظیر پیش کرنے سے عاجز کر دیا۔

فرشتوں پر ایمان لانا

[وَمَلَائِكَتِهِ] .....ملائکۃ، ملأك جمع ہے، اس کی اصل مألك ہے، اس لیے کہ یہ الوكة سے ماخوذ ہے جو کہ لغوی اعتبار سے رسالت سے عبارت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى﴾ (فاطر: ۱)

''جو فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جو دو دو پروں والے ہیں۔''

ملائکہ (فرشتے) عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا فرمایا اور انہیں عجز وانکسار کے ساتھ اپنا اطاعت گزار بنایا اور انہیں الگ الگ ذمہ داریاں تفویض کیں، جن میں سے کچھ کی تفصیل اس طرح سے ہے:

۱۔ **جبرئیل:** ان پر وحی کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، جسے وہ اللہ تعالیٰ سے لے کر اس کے رسولوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔

۲۔ **اسرافیل:** ان کی ذمہ داری صور پھونکنا ہے، وہ یکے از حاملین عرش بھی ہیں۔

۳۔ **میکائیل:** بارش برسانے اور نباتات سے متعلقہ ذمہ داریاں انہیں تفویض کی گئی ہیں۔

زندگی سے متعلقہ امور ان تینوں کے سپرد کیے گئے ہیں: وحی جبرئیل کے سپرد کی گئی، جس سے قلبی اور روحانی زندگی وابستہ ہے، بارشوں اور نباتات سے متعلقہ امور میکائیل کے ذمہ ہیں، جن میں زمین کی زندگی ہے، جبکہ اسرافیل کی ذمہ داری صور پھونکنا ہے، جس سے قیامت کے دن جسموں کو نئی زندگی ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز تہجد کی افتتاحی دعا میں



اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ربوبیت کو وسیلہ بناتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کرتے:

''یااللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب! تو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، چھپی اور ظاہری چیزوں کا جاننے والا ہے، تو ہی اپنے بندوں کے مابین ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے، تو اپنے حکم سے اختلافی امور میں میری راہنمائی فرما، تو جس کی چاہتا ہے اس کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرما دیتا ہے۔''❶

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں سے بعض فرشتے اولادِ آدم کی روحیں قبض کرنے پر یا ہر ذی روح کی روح قبض کرنے پر مامور ہیں، اور وہ ہیں: ملک الموت اور اس کے اعوان وانصار، ملک الموت کو (عزرائیل) کے نام کے ساتھ موسوم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ اس کا اس نام کے ساتھ موسوم ہونا ثابت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ﴾ (الانعام: ٦١)

''یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ جاتی ہے تو اسے ہمارے بھیجے ہوئے فوت کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔''

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (السجدة: ١١)

''کہہ دو تمہاری جان نکالتا ہے ملک الموت (موت کا فرشتہ) جو کہ تم پر مقرر کیا گیا ہے۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ (الزمر: ٤٢)

''اللہ قبض کر لیتا ہے (لوگوں کی) روحیں ان کی موت کے وقت۔''

ان تینوں آیات کے مابین کسی قسم کی کوئی منافات نہیں ہے، روحیں قبض کرنے کا فریضہ فرشتے سرانجام دیتے ہیں۔ جب ملک الموت روح کو جسم سے نکالتا ہے تو اس وقت کچھ اور فرشتے اس کے پاس موجود ہوتے ہیں اگر فوت ہونے والا جنتی لوگوں میں سے ہو تو وہ اس پاکیزہ روح کو لے کر اسے اپنے پاس پہلے سے موجود جنت سے لائے گئے حنوط میں بساتے اور جنت سے لائے گئے کفن میں لپیٹ کر اسے اوپر کی طرف اٹھاتے اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو۔ پھر اسے جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ اس سے یہ امتحان لیا جا سکے؟ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟ اور اگر مرنے والا مومن نہ ہو تو اس کے لیے جو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ان کے ساتھ جہنم کا کفن اور جہنم کا صفوط ہوتا ہے، اس کی روح قبض کر کے اسے اس کفن میں لپیٹ دیتے ہیں اور پھر اسے ساتھ لے کر آسمان کی طرف اٹھ جاتے ہیں، مگر اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دیئے

❶ صحيح مسلم: ٧٧٠ عن عائشه رضی اللہ عنہا.



جاتے ہیں اور اسے زمین کی طرف پھینک دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ﴾ (الحج: ۳۱)

''اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا پھر اسے اچک لے جائیں پرندے یا پھینک دے اسے ہوا کسی دور کی جگہ میں۔''

پھر اللہ فرماتا ہے: ''میرے بندے کی کتاب سجین میں لکھ دو۔''

ملک الموت براہ راست روح قبض کرتا جبکہ دوسرے فرشتے اس سے روح وصول کرنے پر مامور ہیں، جبکہ قبض روح کا حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے درحقیقت فوت کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

کچھ ملائکہ زمین میں چلتے پھرتے رہتے اور ذکر کے حلقوں کی تلاش میں رہتے ہیں، انہیں جہاں کہیں علم وذکر کا حلقہ ملتا ہے وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ ❶

اس طرح کچھ فرشتے انسان کے اعمال لکھنے کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ○ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ○ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ﴾ (الانفطار: ۱۰-۱۲)

''اور یقیناً تم پر نگہبان مقرر ہیں، عزت والے، لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''

﴿مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ﴾ (ق: ۱۸)

''وہ کوئی بھی بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بیمار تھے اس دوران آپ کا کوئی ساتھی بیمار پرسی کے لیے آپ کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ آپ بیماری کی وجہ سے کراہ رہے ہیں، وہ کہنے لگا: ابوعبداللہ! آپ کراہ رہے ہیں؟ جبکہ طاؤس رحمہ اللہ کا قول ہے کہ فرشتہ مریض کے کراہنے کی آواز بھی لکھ لیتا ہے، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ﴾ (ق: ۱۸)

''وہ کوئی بھی بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے۔''

یہ سن کر امام احمد رحمہ اللہ نے کراہنا ترک کر دیا اور تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ❷ مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ میں تو کید عموم کے لیے (مِـــنۡ) زائدہ ہے، یعنی انسان جو بھی بات کرے گا اسے لکھ لیا جائے گا اگر وہ بات اچھی ہے تو اس کا بدلہ بھی اچھا ملے گا اور اگر بری ہے تو اس کا بدلہ بھی برا ہی ملے گا۔

کچھ فرشتے اولاد آدم کی حفاظت کے لیے شب وروز میں باری باری ان کے پاس آتے رہتے ہیں۔

﴿لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ....﴾ (الرعد: ۱۱)

---

❶ بخاری: ٦٤٠٨- مسلم: ٢٦٨٩- عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ یہ لفظ بخاری کے ہیں۔ ❷ ملاحظہ ہو: "سیر اعلام النبلاء" ۱۱/ ۲۱۵.

''اس کے لیے باری باری آنے والے پہرے دار فرشتے ہیں جو اس کے آگے اور اس کے پیچھے رہتے اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کی حفاظت کرتے ہیں۔''

جبکہ کچھ ایسے بھی ہیں جو آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکوع وسجود کرتے رہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آسمان کے لیے چڑ چڑانے کی آواز ہے اور اس سے چڑ چڑانے کی آواز آنی ہی چاہیے آسمان میں چار انگلی کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی فرشتہ اللہ تعالیٰ کے لیے کھڑا نہ ہو، رکوع نہ کر رہا ہو سجدہ نہ کر رہا ہو۔''❶ آسمان کی وسعت کے باوجود فرشتوں کی یہ حالت ان کی بھاری تعداد پر دلالت کرتی ہے۔

معراج کی شب جب آپ ﷺ بیت المعمور کے پاس سے گزرے تو آپ نے وہاں جو کچھ دیکھا اس کا اظہار اس طرح فرمایا: ''ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں یا فرمایا: اس میں داخل ہوتے ہیں، پھر ان کی باری دوبارہ کبھی نہیں آتی۔''❷ آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ملائکہ کی کثرت پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ (المدثر : ۳۱) ''اور تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔''

کچھ ملائکہ کا جنت پر اور کچھ کا جہنم پر تعین کیا گیا ہے، جہنم کے خازن کا نام مالک ہے، جہنمی کہیں گے:

﴿يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ (الزخرف : ۷۷) ''اے مالک! تیرا رب ہمارا فیصلہ ہی کر دے۔''

یعنی وہ ہمیں ہلاک کر دے اور ہمیں موت دے دے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا اس لیے کریں گے کہ وہ ایسے عذاب میں گرفتار ہوں گے جس پر ان کے لیے صبر کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ جواب دے گا:

﴿اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ﴾ (الزخرف : ۷۷) ''تمہیں اسی حال میں رہنا ہے۔''

پھر ان سے کہا جائے گا:

﴿لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۝﴾ (الزخرف : ۷۸)

''ہم تمہارے پاس حق لائے تھے لیکن تم میں سے اکثر اسے ناپسند کرتے تھے۔''

الغرض! ہمارے لیے فرشتوں پر ایمان لانا واجب ہے، مگر ان پر ایمان لانے کی کیفیت کیا ہوگی؟

اس حوالے سے ہمیں اس بات پر ایمان لانا ہوگا کہ فرشتوں کا تعلق عالم غیب کے ساتھ ہے جن کا عام طور پر مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا، وہ نوری مخلوق ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مختلف عبادات کا مکلف ٹھہرایا ہے اور وہ بدرجۂ اتم اس کے اطاعت گزار ہیں۔

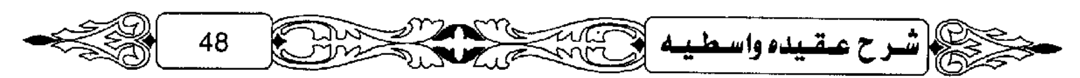
﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝﴾ (التحریم : ۶)

''وہ اللہ کے کسی بھی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔''

---

❶ مسند احمد: ۵/ ۱۷۳۔ ترمذی: ۲۳۱۲۔ ابن ماجہ: ۴۱۹۱۔ حاکم: ۲/ ۵۱۰ اس حدیث کی البانی نے الصحیحہ میں تخریج کی ہے۔ ۱۷۲۲۔

❷ مسلم: ۱۶۲۔ من حدیث انس رضی اللہ عنہ



اس طرح ہم جن ملائکہ کے ناموں اور ان کے وظائف سے آگاہ ہیں، ان کے ان ناموں اور وظائف پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ملائکہ وجود بھی رکھتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری ہے:

﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ﴾ (فاطر: ١)

''وہ فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جو دو دو...... پروں والے ہیں۔''

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام کو اس کی اس صورت میں دیکھا، جس پر اسے پیدا کیا گیا تھا، اس وقت اس کے چھ سو پر تھے اور اس نے افق کو بھر رکھا تھا۔ [1] جبکہ بعض لوگ انہیں ارواح تسلیم کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ کیا ملائکہ ذوی العقول ہیں؟ تو اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا آپ صاحب عقل ہیں؟ یہ سوال تو کوئی دیوانہ شخص ہی کر سکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (التحریم: ٦)

''نہیں وہ نافرمانی کرتے اللہ کی اور اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کرنے کا انہیں حکم ہوتا ہے۔''

اگر وہ عقل سے محروم ہوں تو کیا ان لفظوں سے ان کی تعریف کی جا سکتی ہے؟

﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ۝﴾ (الانبیاء: ٢٠)

''وہ رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں، اکتاتے نہیں۔''

اور جو تبلیغ وحی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ کیا وہ عقل سے محروم ہیں؟ کیا جو شخص خود عقل و شعور سے عاری ہو وہ ان کے بارے میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ وہ ذوی العقول نہیں ہیں؟

اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا

[وَ كُتُبِهٖ] ..... یعنی ہم ان کتابوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر اتارا۔

ہر رسول صاحب کتاب ہوا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ۝﴾ (الحدید: ٢٥)

''یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتابیں اتاریں اور میزان بھی۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر رسول پر نزول کتاب ہوتا ہے، مگر ہم ان تمام کتابوں کا علم نہیں رکھتے، ہم صرف ان کتابوں کا علم رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفے، تورات، انجیل، زبور، اور قرآن۔ بعض علماء کے نزدیک موسوی صحیفوں سے مراد تورات ہے، جبکہ بعض دوسرے انہیں تورات سے الگ تسلیم کرتے ہیں، پہلی صورت میں آسمانی کتابوں کی تعداد پانچ اور دوسری صورت میں چھ ہے، مگر اس کے باوصف ہم ہر ایک کتاب پر اجمالاً ایمان رکھتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بھی رسول پر اتارا اگرچہ ہمیں اس کا علم نہ ہی ہو۔

[1] بخاری: ٧٤٤٠۔ مسلم: ١٩٤۔



اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا

[وَرُسُلِهٖ] ...... یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف اس نے شرائع کو وحی کیا اور پھر انہیں ان کی تبلیغ کا حکم دیا، پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پہلے رسول ہونے کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ (النساء: ۱۶۳)

''یقیناً وحی کی ہم نے آپ کی طرف جس طرح وہی کی تھی ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف۔''

اس وحی سے مراد وحی رسالت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ (الحدید: ۲۶)

''اور یقیناً ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔''

دونوں کی اولاد سے مراد حضرت نوح اور ابراہیم کی اولاد ہے۔ نوح علیہ السلام سے قبل کے لوگوں کا شمار ان کی اولاد میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ قرآنی آیت:

﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ (الذاریات: ۴۶)

''اور قوم نوح کو اس سے قبل (ہلاک کر ڈالا) یقیناً وہ نافرمان قسم کے لوگ تھے۔''

پہلے رسول نوح علیہ السلام تھے

یہ قرآنی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول تھے۔ حدیث شفاعت میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اہل موقف نوح علیہ السلام سے کہیں گے: آپ پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا۔'' یہ حدیث اس امر پر صراحتاً دلالت کرتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں، رہے آدم علیہ السلام تو وہ رسول نہیں بلکہ نبی ہیں۔ جہاں تک حضرت ادریس علیہ السلام کا تعلق ہے۔

تو زیادہ تر مؤرخین اور بعض مفسرین کے نزدیک آپ حضرت نوح علیہ السلام سے قبل ہو گزرے تھے اور یہ کہ ان کا شمار حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں ہوتا ہے، مگر یہ قول بہت ہی ضعیف ہے۔ قرآن وسنت سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ صائب قول وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب: ۴۰) ''لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم المرسلین نہیں کہا، اس لیے کہ جب آپ کی تشریف آوری سے نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو رسالت کا سلسلہ بطریق اولیٰ منقطع ہو گیا۔

اس جگہ یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول آخری زمانے میں ہوگا حالانکہ وہ رسول ہیں؟ [1] اس کا جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کسی نئی شریعت کے ساتھ نزول نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مسند احمد: ۲۹۲۱۔ صحیح بخاری: ۲۲۲۲۔ صحیح مسلم: ۱۵۵۔ تفسیر ابن کثیر، زیر تفسیر سورہ النساء: ۱۵۹۔



اگر یہ کہا جائے کہ یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس امت کے بہترین فرد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، جبکہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نبی مکرم علیہ السلام کی شریعت کے مطابق فیصلے صادر فرمائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے تو اس پس منظر میں ہمارا یہ کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ اس امت کے بہترین فرد ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں؟

اس سوال کا جواب تین طرح سے دیا جاسکتا ہے:

اولاً:...... عیسیٰ علیہ السلام مستقل رسول ہیں اور آپ کا شمار اولوالعزم رسولوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ علیہ السلام اور اس امت کے کسی فرد کے مابین مقارنہ کرانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا جب مقارنہ غیر مقصود ہے تو مفاضلت کا امکان کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اس بنا پر یہ اعتراض سرے سے ہی ساقط ہو جاتا ہے، یہ محض تکلف ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تکلف سے کام لینے والے ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔''[1]

ثانیاً:...... ابوبکر رضی اللہ عنہ خیر الامت ہیں، بجز عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے۔

ثالثاً:...... عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اس امت کے فرد نہیں ہیں، جب آپ نزول فرمائیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی اتباع کریں گے جو کہ قیامت تک باقی رہے گی۔

اگر کوئی یہ اشکال پیش کرے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع کس طرح ہوں گے جبکہ وہ خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب توڑ ڈالیں گے اور اسلام کے علاوہ کچھ بھی قبول نہیں کریں گے۔ حالانکہ اسلام اہل کتاب کو جزیہ کے بدلے تحفظ فراہم کرتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بات سے آگاہ کرنا آپ کی طرف سے اس کے اقرار کے مترادف ہے جو آپ کی شریعت کا حکم قرار پائے گا اور اس سے اسلام کا پہلا حکم منسوخ ہو جائے گا۔

موت کے بعد قبروں سے زندہ نکالنا

[وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ] ...... بعث، اخراج کے معنی میں ہے۔ یعنی مرنے کے بعد لوگوں کو ان کی قبروں سے زندہ نکالنا، یہ اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے، جو کہ کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ بلکہ اس پر یہود ونصاریٰ کا بھی اجماع ہے ان کا عقیدہ ہے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ﴾ (التغابن: ۷)

''کافروں کا خیال ہے کہ انہیں دوبارہ ہرگز نہیں اٹھایا جائے گا کہہ دو کہ کیوں نہیں مجھے اپنے رب کی قسم تم کو ضرور اٹھایا جائے گا۔''

اور دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ o ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ o﴾ (المومنون: ۱۵۔ ۱۶)

---

[1] صحیح مسلم: ۲۶۷۰ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔

''پھر یقیناً تم اس کے بعد مرنے والے ہو، پھر یقیناً تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

احادیث متواترہ سے ثابت ہوتا ہے کہ روز قیامت لوگوں کو ان کی قبروں سے دوبارہ زندہ اٹھایا جائے گا۔ مسلمانوں کا مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر اجماع ہے، لوگوں کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اس دن وہ رب تعالیٰ سے ملاقات کریں گے اور اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗo وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗo﴾ (الزلزال: ۷۔ ۸)

''جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ o﴾ (الانشقاق: ٦)

''اے انسان! یقیناً تو کوشش کرنے والا ہے اپنے رب کی طرف خوب خوب کوشش کر پھر تو اس سے مل کر ہی رہے گا۔''

ابن آدم! تجھے یہ ملاقات یاد رہے تا کہ تو اس کے لیے تیاری کر سکے۔ تجھے یہ خوف دامن گیر رہے کہ مجھے روز قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، جبکہ تیرے پاس نیک عمل نام کی کوئی چیز نہیں ہے، کبھی آپ نے سوچا کہ تم نے نقل مکانی کے دن کے لیے کیا تیاری کی اور ملاقات کے دن کے لیے کیا عمل کیا؟ آج اکثر لوگوں کو یہ فکر تو کھائے جا رہی ہے کہ انہوں نے دنیا کے لیے کیا کیا، حالانکہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ جس دنیا کے لیے وہ اس قدر دوڑ دھوپ کر رہے ہیں وہ اسے حاصل کر بھی پائیں گے یا نہیں؟ انسان دنیوی کام کے لیے منصوبہ بناتا ہے کہ میں یہ کل کروں گا یا پرسوں، مگر وہ نہ اسے کل کر سکتا ہے اور نہ کل کے بعد، مگر جس چیز کا تحقق یقینی ہے اس کے بارے میں اکثر لوگ غفلت کا شکار ہیں۔

﴿بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ (المومنون: ٦٣)

''بلکہ ان کے دل اس سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

دنیوی اعمال کے بارے میں لوگوں کے رویے کی عکاسی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَo﴾ (المومنون: ٦٣)

''اور اس کے علاوہ ان کے کچھ اور بھی اعمال ہیں جنہیں وہ کرتے رہتے ہیں۔''

جملہ اسمیہ (هم لها عاملون) ثبوت اور استمرار کا فائدہ دیتا ہے۔ مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌo﴾ (قٓ: ۲۲)

''تو اس دن سے غفلت میں پڑا تھا، تو اب ہم نے تجھ سے تیری آنکھ کا پردہ اٹھا دیا تو تیری نظر آج بڑی تیز ہے۔''

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھائے جانے پر تمام آسمانی ادیان کا اتفاق ہے، جو کہ ایمان کے چھ ارکین میں سے ایک ہے اور اس کا شمار اہل السنہ والجماعہ کے بنیادی عقائد میں ہوتا ہے۔ کسی بھی ملت سے وابستہ کوئی بھی شخص اس سے انکار نہیں کرتا۔

اچھی بُری تقدیر پر ایمان لانا

[وَالْاِيْمَانُ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ] ..... اچھی بری تقدیر پر ایمان لانا ایمان کا چھٹا رکن ہے۔



تقدیر سے مراد ہے: ''اللہ تعالیٰ کا مختلف اشیاء کو مخصوص مقدار اور مخصوص طرز پر بنانا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کی تقدیر آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھی۔ [1] جیسا کہ اس نے فرمایا:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌo﴾ (الحج: ۷۰)

''کیا تو نہیں جانتا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، یقیناً یہ سب کچھ کتاب میں ہے۔ یقیناً یہ کچھ اللہ کے لیے آسان ہے۔''

خیرہ و شرہ تقدیر کو خیر کے ساتھ متصف کرنے کا معاملہ تو ظاہر اور واضح ہے۔ جہاں تک اسے شر کے ساتھ متصف کرنے کا تعلق ہے تو اس سے مراد مقدور کی شر ہے نا کہ تقدیر کی، جو کہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے جملہ افعال میں خیر و حکمت ہوا کرتی ہے، ان میں شر نہیں ہوتی، شر اس کے مفعولات اور مقدورات میں ہوتی ہے، لہٰذا اس جگہ شر مقدور اور مفعول کے اعتبار سے ہے نہ کہ فعل کے اعتبار سے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''شر تیری طرف نہیں ہے۔'' [2] اس بات کو اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سانپ، بچھو، درندے اور کئی قسم کے موذی جانور پیدا فرمائے، فقر وافلاس، قحط اور کئی بیماریاں پیدا فرمائیں، مگر یہ سب چیزیں انسان کے حوالے سے شر ہیں، اس لیے کہ یہ اس کے مناسب حال نہیں ہیں، اسی طرح اس کی مخلوقات میں فسق و فجور بھی ہے، معاصی و کفر بھی اور قتل وغیرہا بھی، یہ سب چیزیں شر اور برائی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے اعتبار سے یہ خیر ہیں؟ اس لیے کہ اس نے انہیں کسی حکمت بالغہ کے تحت مقدر فرمایا ہے۔ جس سے کچھ لوگ واقف ہیں اور کچھ ناواقف۔

اس بنا پر ہمارے لیے اس بات سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ تقدیر کی برائی مقدورات کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس تقدیر کے اعتبار سے جو کہ اللہ کا فعل اور اس کی تقدیر ہے۔ پھر اس امر سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے کہ جس مفعول کو شر سے تعبیر کیا گیا ہے وہ فی نفسہ تو شر ہوتا ہے مگر دوسری جہت سے خیر بھی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَo﴾ (الروم: ٤١)

''لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل چکا ہے تا کہ وہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں۔''

اگرچہ ان کے اعمال فی حد ذاتہا برے ہیں مگر ان کا نتیجہ اچھا ہے اس بنا پر اس مقدور میں موجود شر اضافی ہے نہ کہ حقیقی، اس لیے کہ اس کا نتیجہ خیر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اسی طرح زانی کی حد کا معاملہ ہے کہ اگر وہ غیر شادی شدہ ہو تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اسے ایک سال

[1] ملاحظہ ہو: صحیح مسلم: ٢٦٥٣.

[2] صحیح مسلم میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ایک ٹکڑا۔ ۷۷۱.



کے لیے جلا وطن کر دیا جائے گا، اب اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ سزا اس کے لیے شر ہے مگر چونکہ یہ اس کے اس گناہ کا کفارہ ہے لہٰذا یہ اس کے لیے اس اعتبار سے خیر بھی ہے، اس لیے کہ دنیوی سزا اخروی سزا سے بہت آسان ہے، اس میں ضمیر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں دوسروں کے لیے سامان عبرت ہے، وہ اس کا انجام بد دیکھ کر اس گناہ کے ارتکاب سے باز رہیں گے، بلکہ یہ خود بھی آئندہ کے لیے، ایسے گناہوں سے دور رہے گا جن کی پاداش میں اسے اس قسم کی سزا بھگتنا پڑ سکتی ہو۔

جہاں تک امور کونیہ قدریہ کا تعلق ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز مقدور ہونے کے اعتبار سے شر ہوتی ہے مگر فی الواقع اس میں خیر ہوتی ہے مثلاً بیماری، جو اگرچہ بیمار کے لیے بری ہے مگر اس میں خیر کا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے بیمار کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مانع کی وجہ سے انسان کے گناہ توبہ واستغفار سے بھی معاف نہیں ہوتے۔ مثلاً صدق نیت کا فقدان مگر وہ بیماریوں اور سزاؤں سے معاف ہو جاتے ہیں۔

اس میں خیر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان صحت جیسی اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر ومنزلت سے اسی وقت آگاہ ہوتا ہے جب وہ بیمار پڑ جاتا ہے، صحت وتندرستی تندرست لوگوں کے سر کا تاج ہے اور اس سے صرف بیمار ہی آشنا ہیں۔ لہٰذا بیماری اس اعتبار سے بھی خیر ہے کہ اس سے انسان نعمت کی قدر وقیمت سے آگاہ ہوتا ہے۔ بیماری میں خیر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں کبھی ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ جو بدن میں موجود ایسے ضرر رساں جراثیم کو ختم کر دیتی ہیں۔ جن کا خاتمہ صرف اس بیماری سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے: جسم میں پائے جانے والے ضرر رساں جراثیم کو بعض مخصوص بیماریاں ختم کر دیتی ہیں جبکہ انسان کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

حاصل کلام

۱۔ جس شر کے ساتھ قدر کو موصوف کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقدور کی نسبت سے شر ہے، جہاں تک تقدیر باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ ساری کی ساری خیر ہے اس کی دلیل نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''اور شر تیری طرف نہیں ہے۔''

۲۔ مقدور میں پنہاں شر بھی محض شر نہیں ہوا کرتی بلکہ اس پر منتج ہونے والے کئی امور خیر وبرکت کے حامل ہوا کرتے ہیں، لہٰذا اس کی طرف نسبت کے حوالے سے برائی امر اضافی کی حیثیت رکھتی ہے۔

مؤلف آگے چل کر قضاء وقدر کے بارے میں تفصیلی گفتگو فرمائیں گے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بیان کردہ اوصاف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ پر ایمان لانا

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَمِنَ الْاِیْمَانِ بِاللّٰهِ: اَلْاِیْمَانُ بِمَا وَصَفَ بِهٖ نَفْسَهٗ فِیْ کِتَابِهٖ ، وَبِمَا وَصَفَهٗ بِهٖ رَسُوْلُهٗ مُحَمَّدٌ ﷺ .))

''اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس چیز پر ایمان لایا جائے جس کے ساتھ اس

نے اپنی کتاب میں اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہے اور جس کے ساتھ اس کے رسول معظم محمد ﷺ نے اس کا وصف بیان کیا ہے۔''

شرح:......[وَمِنَ الْإِيْمَانِ] ......اس جگہ (من) تبعیض کے لیے ہے، اس لیے کہ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ ایمان باللہ، چار امور پر مشتمل ہے، اس کے وجود پر ایمان لانا، ربوبیت والوہیت کے ساتھ اس کے منفرد ہونے پر ایمان لانا اور اس کے اسماء وصفات پر ایمان لانا۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان باللہ کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس چیز پر ایمان لایا جائے جس کے ساتھ اس نے اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہے۔

[بِمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ فِي كِتَابِهِ] ...... اصل میں یوں بھی کہنا چاہیے تھا: وسمى به نفسه . مگر مؤلف رحمہ اللہ نے صرف صفت کا ذکر کیا اور یہ اس لیے کہ ہر اسم کسی نہ کسی صفت کو متضمن ہوا کرتا ہے، یا اس لیے کہ اسماء میں اختلاف برائے نام ہے، اس کا انکار صرف غالی قسم کے جہمیہ اور معتزلہ نے ہی کیا ہے، معتزلہ اسماء کا اثبات کرتے ہیں، اگرچہ اشاعرہ اور ماتریدیہ بھی اسماء کا اثبات کرتے ہیں، مگر وہ اکثر صفات میں اہل سنت کے ساتھ اختلاف رکھتے ہیں۔

فِي كِتَابِهِ کتاب سے مراد قرآن ہے، قرآن کو کتاب کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، ان صحیفوں میں لکھا ہوا ہے، جو بزرگ اور نیک لکھنے والے فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اسی طرح لوگ بھی انہیں مصاحف میں لکھا کرتے ہیں۔ پس لفظ ''کتاب'' مکتوب کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ یہ اس کا کلام ہے۔ قرآن کلام اللہ ہے، اللہ عزوجل نے حقیقتاً اس کے ساتھ کلام فرمایا، اس نے اس کے ایک ایک حرف کے ساتھ کلام فرمایا۔ اس جملہ میں متعدد مباحث ہیں:

پہلی بحث:...... ایمان باللہ کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس چیز کے ساتھ بھی ایمان لایا جائے جس کے ساتھ اس نے اپنا وصف بیان کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان باللہ، اس کے اسماء وصفات پر ایمان لانے کو متضمن ہے، اس لیے کہ ذات باری تعالیٰ کو کئی اسماء سے موسوم کیا جاتا اور کئی اوصاف سے موصوف ٹھہرایا جاتا ہے۔ اوصاف سے مجرد ذات کا وجود امر مستحیل ہے، انسانی ذہن کبھی یہ فرض کر لیتا ہے کہ صفات سے مجرد وعاری ذات موجود ہے مگر فرض امر واقع جیسا نہیں ہوسکتا، یعنی مفروض، مشہود جیسا نہیں ہوسکتا، خارج میں ایسی کسی ذات کا وجود نہیں ہے۔ جو صفات سے متصف نہ ہو۔

انسانی ذہن کسی بھی چیز کو فرض کرسکتا اور کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی فرض کرسکتا ہے اگرچہ خارج میں اس کا کوئی وجود نہ ہو، مگر جو چیز واقع ہے اس کا بدون صفت وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حصہ ہے۔ صفات باری تعالیٰ کے حوالے سے کم ازکم جس بات پر لوگوں کا اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ موجود ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔ اس بنا پر اس کے لیے صفات کا ہونا ضروری ہے۔

دوسری بحث:...... صفات باری تعالیٰ امور غیبیہ کے قبیل سے ہیں اور ان امور کے حوالے سے انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ

وہ ان پر اسی طرح ایمان لائے جس طرح وہ وارد ہوئے ہیں اور نصوص سے ہٹ کر کسی بھی دوسری چیز کی طرف رجوع نہ کرے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کو صرف انہی چیزوں کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جن کے ساتھ خود اس نے اپنی ذات کو اپنی کتاب میں موصوف کیا ہو یا پھر اس کے رسول علیہ السلام نے کیا ہو، قرآن وحدیث سے ہرگز تجاوز نہ کیا جائے۔ [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں انہیں چیزوں کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوصاف بیان کرنے چاہئیں جن کے ساتھ خود اس نے اپنی کتاب میں اپنے اوصاف بیان کیے ہیں یا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بیان کروائے ہیں۔

اس پر قرآن بھی دلالت کرتا ہے اور عقل بھی، قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ٣٣)

''کہہ دو کہ حرام کیا ہے، میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو ان میں سے جو ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں وہ بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔''

اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف کرنا جس کے ساتھ خود اس نے اپنے آپ کو موصوف نہ کیا ہو، اس کے بارے میں بغیر علم کے بات کرنے کے مترادف ہے، جو کہ قرآنی نص کی رو سے حرام ہے۔ اس نے فرمایا:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا۝﴾

(الاسراء: ٣٦)

''اور جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ، یقیناً کان، آنکھ اور دل، ان تمام کے تمام اعضاء سے پوچھ ہونی ہے۔''

اگر ہم ان چیزوں کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کے اوصاف بیان نہ کریں جن کے ساتھ خود اس نے اپنے اوصاف بیان نہ کیے ہوں مگر ان باتوں کے پیچھے پڑے رہیں جن کے بارے میں ہم لاعلم ہیں تو اس طرح بھی ہم اللہ تعالیٰ کے منع کردہ امور میں مبتلا ہو جائیں گے۔

رہی دلیل عقلی، تو صفات باری تعالیٰ کا شمار غیبی امور میں ہوتا ہے اور عقل کے لیے غیبی امور کا ادراک کرنا ممکن نہیں ہوتا، دریں صورت ہم ان چیزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اوصاف بیان نہیں کریں گے جن کے ساتھ اس نے خود اپنے اوصاف بیان نہ کیے ہوں اور نہ ہی ان اوصاف کی کیفیت بیان کریں گے اس لیے کہ یہ غیر ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ہم یہاں دنیا میں رہ کر ان کا ادراک نہیں کر سکتے اگر چہ ان کی تخلیق ہو چکی ہے۔ جنت میں انگور، کھجور، حور وغلمان، پھل، تخت اور دیگر متعدد اشیاء موجود ہیں۔ مگر ہم ان کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر اور ان کے اوصاف بیان کرنے سے عاجز وبے بس ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

---

[1] ملاحظہ ہو: "مجموع فتاوی شیخ الاسلام" ٥/ ٢٦.

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (السجدة: ۱۷)

''کوئی بھی شخص نہیں جانتا جو آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہے، یہ بدلہ ہے ان کے نیک اعمال کا۔''

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور نہ ہی کسی بندہ بشر کے دل میں اس کا خیال آیا۔''❶

جب اس مخلوق کے بارے میں انسانی ذہن کی بے بسی کا یہ عالم ہے جسے ان صفات کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے جن کا معنی ومفہوم معلوم اور حقیقت غیر معلوم ہے تو وہ خالق کا ادراک کیونکر سکتا ہے؟

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ انسان میں روح موجود ہے اور ادراک کی زندگی کا دارومدار اسی روح پر ہے، اگر وہ اس کے بدن میں نہ رہے تو زندگی کا چراغ بھی گل ہو جاتا مگر انسان اس کا وصف بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اگر اس سے یہ پوچھا جائے کہ تجھ میں موجود یہ روح کیا چیز ہے؟ اس چیز کی حقیقت کیا ہے کہ اگر اسے تجھ سے نکال لیا جائے تو تو ایک بے حس وحرکت جثہ بن کر رہ جائے اور وہ جب تک تجھ میں موجود ہے اس وقت تک تو عقل اور سوجھ بوجھ رکھنے والا اور موجب ادراک انسان رہے؟ تو وہ ادھر ادھر دیکھنے اور سوچ وبچار کرنے لگے اور کبھی بھی اس کا وصف بیان نہ کر سکے، حالانکہ وہ اس کے قریب ہی ہے، اس کی ذات میں ہے اور اس کے پہلوؤں میں موجود ہے، وہ اس کا ادراک کرنے سے قاصر رہے گا، اگرچہ وہ ایسی حقیقت ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب روح قبض کر لی جاتی ہے تو آنکھیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔''❷ انسان دیکھتا ہے کہ اس کی روح قبض کی جا رہی ہے لہٰذا مرتے وقت اس کی آنکھیں کھلی رہتیں اور روح کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں۔ بعد ازاں اسے کفن میں لپیٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھایا جاتا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود بھی اگر انسان اس کا وصف بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اس بات کی کوشش کس طرح کرتا ہے کہ اپنی طرف سے رب تعالیٰ کا وصف اس چیز کے ساتھ بیان کرے جس کے ساتھ اس نے اپنی ذات کا وصف بیان نہیں کیا۔

تیسری بحث: ...... ہم اس چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وصف بیان نہیں کر سکتے جس کے ساتھ اس نے خود اپنا وصف بیان نہ کیا ہو۔

اس کے دلائل سماعی بھی ہیں اور عقلی بھی، سماعی دلائل میں سے ہم نے دو آیتیں پیش کی ہیں ...... جبکہ عقلی دلائل کے حوالے سے ہم نے بتایا ہے کہ یہ غیبی امر ہے جس کا عقل کے ساتھ ادراک کرنا ممکن نہیں ہے، ادراک کے لیے ہم نے آپ کے سامنے دو مثالیں پیش کی ہیں۔

چوتھی بحث: ...... کتاب وسنت میں وارد نصوص کا ان کے ظاہر پر اجرا کرنا واجب ہے۔ ہم اس سے تجاوز نہیں کر سکتے، مثلاً: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں یہ بتایا کہ اس کی آنکھ ہے، تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ آنکھ سے مراد

❶ بخاری: ۳۲۴۴۔ مسلم: ۲۸۲۴ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

❷ مسلم: ۹۲۰ عن ام سلمه رضی اللہ عنہا۔



رؤیت ہے نہ کہ حقیقت عین (آنکھ) اگر ہم یہ کہیں گے تو ہم نے اللہ تعالیٰ کا وصف اس چیز کے ساتھ بیان نہیں کیا جس چیز کے ساتھ اس نے اپنا وصف خود بیان کیا ہے۔

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا وصف بیان کرتے ہوئے اپنے لیے دو ہاتھوں کا اثبات فرمایا: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتٰنِ﴾ (المائدة: ٦٤) ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔''

تو اب اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ کا حقیقتاً ہاتھ نہیں ہے بلکہ (ید) ہاتھ سے مراد اس کی نعمتیں ہیں تو کیا ہم نے اللہ تعالیٰ کی اس چیز کے ساتھ توصیف کی جس کے ساتھ اس نے خود اپنی ذات کی توصیف کی؟ ہرگز نہیں۔

پانچویں بحث:...... مؤلف رحمہ اللہ کے کلام کا عموم جملہ صفات ذاتیہ معنویہ، خبریہ اور صفات فعلیہ کو شامل ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی توصیف فرمائی ہے۔

صفات ذاتیہ سے مراد وہ صفات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ تک کے لیے متصف رہے گا۔ ان کی دو قسمیں ہیں: معنویہ اور خبریہ۔

صفات معنویہ مثلاً: حیات، علم، قدرت، حکمت...... اور ان جیسی دیگر صفات۔

صفات خبریہ مثلاً: دو ہاتھ، چہرہ، دو آنکھیں...... اور ان جیسی دیگر صفات۔ اس کی نظیر ہمارے بعض حصے اور اجزا ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہمیشہ سے دو ہاتھ، چہرہ اور دو آنکھیں رہی ہیں، ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو پہلے نہیں تھی اور بعد میں وجود میں آئی، اسی طرح وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، ہمیشہ سے عالم ہے اور ہمیشہ عالم رہے گا، ہمیشہ سے قادر ہے اور ہمیشہ قادر رہے گا...... یعنی نہ تو اس کی حیات متجدد ہے نہ قدرت متجدد ہے اور نہ ہی اس کی سمع متجدد ہے۔ بلکہ وہ ازل سے لے کر ابد تک ان کے ساتھ موصوف ہے۔ مسموع کا تجدد سمع کے تجدد کو مستلزم نہیں ہے، مثلاً اگر میں اب اذان سنوں تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اذان سنتے وقت میرے لیے جدید سماعت حادث ہوئی بلکہ وہ تو اس وقت سے ہے جب اللہ نے اس کو مجھ میں پیدا فرمایا تھا، ہاں مسموع ضرور متجدد ہے اور اس کا صفت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ علماء کی اصطلاح میں ان صفات کو صفات ذاتیہ سے موسوم کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ ذات کے لیے لازم ہیں اس سے جدا نہیں ہوتیں۔ صفات فعلیہ وہ صفات ہیں جو اس کی مشیت سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایسی صفات جن کا سبب معلوم ہو مثلاً رضا، جب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا کوئی سبب وجود میں آئے گا تو وہ راضی ہو جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾ (الزمر: ٧)

''اگر تم کفر کرو گے تو یقیناً اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔''

۲۔ ایسی صفات جن کا سبب معلوم نہ ہو: مثلاً آخر شب میں آسمان دنیا پر نزول فرمانا۔

کچھ صفات ایسی بھی ہیں جو ذاتیہ بھی ہوتی ہیں اور فعلیہ بھی، کلام اپنے آحاد کے اعتبار سے صفت فعلیہ ہے، جبکہ اپنے اصل کے اعتبار سے صفت ذاتیہ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے تا ابد متکلم ہے لیکن وہ جو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے جیسا کہ کلام کی بحث میں آگے چل کر آئے گا۔ ان شاء اللہ! ان صفات کو، صفات فعلیہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فعل میں سے ہیں، قرآن مجید میں ان کے بہت سارے دلائل موجود ہیں۔ مثلاً:

﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر: ۲۲) ''اور آئے گا تیرا رب اور فرشتے صف در صف۔''

﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ﴾ (الانعام: ۱۵۸)

''وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کا کہ ان کے پاس فرشتے آ جائیں یا تیرا رب خود آ جائے۔''

﴿رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (المائدۃ: ۱۱۹) ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔''

﴿وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ﴾ (التوبۃ: ۴۶)

''لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو ان کو روک ہی دیا۔''

﴿أَن سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَٰلِدُونَ﴾ (المائدۃ: ۸۰)

''یہ کہ ناراض ہوا اللہ ان پر اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کے لیے صفات فعلیہ کے اثبات سے اس کے لیے کسی بھی طرح سے کوئی نقص لازم نہیں آتا، بلکہ اس سے اس کے اس کمال کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا کرتا ہے۔ جبکہ محرفین کا کہنا ہے کہ اس سے نقص لازم آتا ہے، اسی لیے وہ جملہ صفات فعلیہ کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے بقول اللہ تعالیٰ نہ تو آتا ہے، نہ راضی ہوتا اور نہ ناراض ہوتا ہے، نہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند...... وہ ان صفات کا اس دعویٰ کی بنیاد پر انکار کرتے ہیں کہ یہ چیزیں حادث ہیں اور حادث کا قیام حادث کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ مگر ان کا یہ قول باطل ہے، اس لیے کہ اسے نص کے مقابلہ میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر یہ بنفسہ بھی باطل ہے، اس لیے کہ فعل کے حدوث سے فاعل کا حدوث لازم نہیں آتا۔

چھٹی بحث:...... اسماء وصفات کے باب میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں۔

یہ اس لیے کہ اسماء وصفات کے نفی واثبات کا دارومدار سمع پر ہے، ہماری عقلیں ذات اللہ العالمین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ جبکہ اشعریہ، معتزلہ، جہمیہ اور دیگر اہل تعطیل اس کے برعکس اسماء وصفات کے نفی واثبات کے لیے عقل پر بھروسا کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: عقل جس چیز کے اثبات کا تقاضا کرے گی اس کا اثبات ہم بھی کریں گے، چاہے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اس کا اثبات کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اور جس چیز کی وہ نفی کرے گی اس کی نفی ہم بھی کریں گے۔ اگرچہ اللہ نے اس کا اپنے لیے اثبات کیا ہی کیوں نہ ہو۔ رہے وہ امور کہ نہ تو عقل ان کے اثبات کی متقاضی ہو اور نہ نفی کی۔ تو ان کی اکثریت ان کی نفی کرتی ہے، اس لیے کہ ان کے خیال میں دلالت عقل ایجابی ہوا کرتی ہے، وہ جس صفت کا اثبات کرے گی اس کا اثبات کیا جائے گا اور جس کا نہیں کرے گی اس سے انکار کر دیا جائے گا، جبکہ کچھ لوگ توقف سے کام لیتے ہوتے اس کا اثبات نہیں

کرتے کیونکہ عقل ایسا نہیں کرتی۔ وہ توقف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس وقت دلالت عقل سلبی ہے اگر وہ کسی صفت کا نہ اثبات کرے گی اور نہ نفی تو ایسی صورت میں توقف اختیار کیا جائے گا۔

الغرض! یہ لوگ ان امور میں عقل کو حکم تسلیم کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے واجب ہیں یا ممتنع۔

اللہ تعالیٰ کے لیے جن اوصاف کا عقل تقاضا کرے اسے گردانا اور جن کی نفی کرے اسے چھوڑنے کی تفصیل

اس اصول سے یہ چیز متفرع ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جن اوصاف کا تقاضا عقل کرتی ہو ان کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا جائے گا اگرچہ کتاب وسنت سے ان کا اثبات نہ ہی ہوتا ہو، اور جن اوصاف کی نفی کا تقاضا عقل کرتی ہو ان کی نفی کردی جائے گی اگرچہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا اثبات ہوتا ہو۔

اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نہ آنکھ ہے، نہ چہرہ اور نہ ہاتھ، وہ نہ تو عرش پر مستوی ہے اور نہ آسمان دنیا پر آتا ہے...... یہ لوگ نصوص شرعیہ میں تحریف کرتے ہیں مگر اس تحریف کو تاویل کا نام دیتے ہیں اگر یہ ان نصوص کا انکار کریں تو کفر کا ارتکاب کریں مگر وہ ایسا انکار کرتے ہیں جسے تاویل سے موسوم کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے نزدیک یہ تاویل نہیں بلکہ تحریف ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ رب العزت کے اسماء وصفات کے باب میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ آپ کا یہ قول قرآن کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا﴾ (المائدۃ: ۵۰) ''اور حکم کرنے میں اللہ سے اچھا کون ہے؟''

اور دو چیزوں کے درمیان تفصیل کا فیصلہ عقل کیا کرتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (النحل: ۶۰) ''اور اللہ کے لیے اعلیٰ صفات ثابت ہیں۔''

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل: ۱۷)

''کیا جو پیدا کرتا ہو وہ اس جیسا ہوسکتا ہے جس نے کچھ بھی پیدا نہ کیا ہو پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

اس جیسی دوسری آیات جن میں اللہ تعالیٰ ان امور کا فیصلہ عقل کے حوالے کرتا ہے جنہیں وہ اپنی ذات کے لیے ثابت کرتا اور جن کی جھوٹے خداؤں سے نفی کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لیے واجب ہیں اور جو اس کے لیے ممتنع ہیں، عقل ان کا ادراک علی سبیل الاجمال کرسکتی ہے علی سبیل التفصیل نہیں۔ مثلاً عقل اس بات کا ادراک تو کرسکتی ہے کہ رب کے لیے کامل الصفات ہونا ضروری ہے لیکن اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے ہر صفت کا اثبات بھی کرسکتی ہے یا اس کی نفی بھی کرسکتی ہے۔ البتہ وہ علی سبیل العموم مثبت یا منفی یہ فیصلہ سکتی ہے کہ رب تعالیٰ کے لیے کامل الصفات ہونا اور ہر نقص وعیب سے محفوظ ہونا ضروری ہے۔

مثلاً عقل اس بات کا ادراک کر سکتی ہے کہ رب تعالیٰ کو سمیع اور بصیر ہونا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا تھا:

﴿یٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ﴾ (مریم: ٤٢)

''ابا جان! آپ ان کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔''

اسی طرح عقل اس امر کا بھی ادراک رکھتی ہے کہ رب کے لیے خالق ہونا بھی ضروری ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ﴾ (النحل: ١٧)

''کیا جو پیدا کرتا ہو وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس نے کچھ بھی پیدا نہ کیا ہو؟''

اور.....﴿وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ﴾ (النحل: ٢٠)

''یہ اللہ کے علاوہ جنہیں پکارتے ہیں وہ پیدا نہیں کرتے۔''

انسانی عقل اس کا ادراک رکھتی ہے اور وہ اس بات کا بھی ادراک رکھتی ہے کہ رب تعالیٰ کا عدم کے بعد حادث ہونا ممتنع ہے، اس لیے کہ یہ نقص ہے۔ اسی بات سے احتجاج کرتے ہوئے مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ﴾

''یہ اللہ کے علاوہ جنہیں پکارتے ہیں وہ پیدا نہیں سکتے وہ تو خود پیدا کیے جاتے ہیں۔''

اس بناء پر عقلاً خالق کے لیے حادث ہونا محال ہے۔

عقل یہ بھی ادراک رکھتی ہے کہ نقص والی ہر صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ممتنع ہے، اس لیے کہ رب تعالیٰ کو کامل ہونا چاہیے۔ اسے اس امر کا بھی ادراک ہے کہ عجز اللہ تعالیٰ سے مسلوب ہے، اس لیے کہ یہ صفت نقص ہے۔ رب تعالیٰ کی نافرمانی کی جائے اور وہ نافرمان کو سزا دینا چاہے مگر یہ اس کے بس میں نہ ہو۔

عقل اس بات کا مکمل ادراک رکھتی ہے کہ عجز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وصف بیان کرنا ممکن نہیں، اندھے پن، بہرے پن اور جہالت کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے ہم علی سبیل العموم ان امور کا ادراک کر سکتے ہیں لیکن علی سبیل التفصیل اس کا ادراک کرنا غیر ممکن ہے، لہٰذا اس حوالے سے ہمیں سمع پر انحصار کرنا پڑے گا۔

جو چیز ہمارے لیے کمال و نقص والی ہے، کیا اللہ کے لیے بھی ہے؟

سوال: کیا ہر وہ چیز جو ہمارے حق میں کمال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی کمال ہے؟ اور کیا جو چیز ہمارے لیے باعث نقص ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی باعث نقص ہے؟

جواب: نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کہ نقص و کمال کا پیمانہ انسان کی طرف منسوب چیز کے اعتبار سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان نمایاں فرق ہے، بلکہ وہ صفت کے صفت ہونے کے اعتبار سے ہے۔ ہر صفت کمال اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے۔ اکل و شرب خالق کی نسبت سے نقص ہے، اس لیے کہ ان دونوں کا سبب حاجت ہے اور اللہ ہر چیز سے بے نیاز ہے مگر یہ مخلوق کی نسبت سے کمال ہے، اس لیے اگر انسان کھانا نہ کھا سکتا ہو تو اسے بیمار کہا جائے گا جو کہ نقص



ہے۔ اسی طرح نیند خالق کے لیے نقص ہے جبکہ مخلوق کے لیے کمال۔ فرق صاف ظاہر ہے۔ تکبر خالق کے لیے کمال اور مخلوق کے لیے نقص ہے۔ اس لیے کہ جاہ وجلال اور عظمت و کبریائی کا اتمام بدون تکبر ممکن نہیں ہے تاکہ غلبہ کامل ہو اور کوئی بھی اس سے تنازع نہ کر سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو سرزنش کی ہے جو اس سے عظمت و کبریائی کا تنازع کرنا چاہے۔ فرمایا:

''جو کوئی ان میں سے ایک بھی چیز مجھ سے چھیننا چاہے میں اسے عذاب دوں گا۔'' ❶

فالمھم مخلوق کا ہر کمال خالق کا کمال نہیں ہوتا اور نہ ہی مخلوق کا ہر نقص خالق کا نقص ہوا کرتا ہے۔ کمال اور نقص دونوں اعتباری ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا اپنے رب کے اوصاف بیان کرنا

[وَ بِمَا وَصَفَهُ بِهِ رَسُوْلُهُ] ...... رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنے رب کا وصف بیان کرنا تین اقسام میں منقسم ہے۔ وہ قول سے ہوگا، یا فعل سے یا پھر اقرار سے۔

۱۔ **وصف بالقول:** اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں، مثلاً: آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((ربنا اللّٰه الذی فی السماء، تقدس اسمك، امرك فی السماء والارض......))

''ہمارا رب وہ ہے جو آسمان میں ہے، تیرا نام مقدس ہے۔ تیرا حکم زمین میں بھی ہے اور آسمان میں بھی۔''

اسی طرح آپ نے قسم اٹھاتے وقت فرمایا:

((لا و مقلب القلوب)) ❷ ''نہیں، اے دلوں کو پھیرنے والے۔''

۲۔ **وصف بالفعل:** اس کی مقدار وصف بالقول سے کم ہے۔ مثلاً: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس بات پر گواہ بنایا کہ میری امت اس بات کا اقرار کر رہی ہے کہ میں نے ان تک تیرا دین پہنچا دیا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''کیا میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا؟'' لوگوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے یہ بات تین دفعہ دہرائی، اور پھر فرمایا: ''یا اللہ! گواہ رہنا۔'' اس دوران آپ ﷺ اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے اور اسے لوگوں کی طرف موڑتے۔ ❸ آپ ﷺ کا آسمان کی طرف انگلی اٹھانا فعلاً اللہ تعالیٰ کا علو کے ساتھ وصف بیان کرنا ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ جمعہ کے دن لوگوں کو خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اس دوران ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! مال مویشی ہلاک ہو گئے...... آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ❹ یہ بھی عن طریق الفعل اللہ تعالیٰ کو علو کے ساتھ موصوف قرار دینا ہے۔

ان کے علاوہ بھی کئی ایسی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے فعلاً اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا اظہار فرمایا۔

---

❶ صحیح مسلم: ۲۶۲۰۔ عن ابی سعید و ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما، مسند احمد: ۲/ ٤١٤ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

❷ صحیح بخاری: ٦٦٤٣۔ ❸ صحیح مسلم: ۱۲۱۸۔ عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

❹ صحیح بخاری: ۱۰۱۳، ۱۰۱٤۔ صحیح مسلم: ۸۹۷ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ذکر کرتے اور پھر اس کی اپنے فعل سے تاکید فرماتے۔ مثلاً آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ (النساء: ٥٨) ''بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

تو پھر اپنا انگوٹھا اپنے دائیں کان پر اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کو اپنی آنکھ پر رکھا۔ ❶ یہ آپ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے لیے قول اور فعل کے ساتھ سمع و بصر کا اثبات ہے۔

دریں حالات ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات قول کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور فعل کے ساتھ بھی، کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ۔

۳۔ **وصف بالاقرار:** اس کا وجود ماقبل کی نسبت بہت کم ہے۔ ایک لونڈی سے آپ نے سوال کیا: ''اللہ کہاں ہے؟'' تو اس نے جواب دیا: آسمان میں۔ آپ نے اس کا اقرار کرتے ہوئے اس کے مالک سے فرمایا: ''اسے آزاد کردے۔'' ❷

اسی طرح ایک یہودی عالم نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ہم پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کو ایک انگلی پر، زمینوں کو ایک انگلی پر اور نمناک مٹی کو ایک انگلی پر رکھے گا...... الیٰ آخر الحدیث۔ نبی کریم ﷺ اس کی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے ہنس پڑے ❸ یہ بھی اقرار کی صورت ہے۔

رسول کے بیان کردہ اوصاف پر ایمان لانے کی وجہ تسمیہ اور دلائل

سوال: جن چیزوں کے ساتھ رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے رب کا وصف بیان کیا، اس پر وجوب ایمان کی کیا وجہ ہے؟ یا اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب: اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ﴾ (النساء: ١٣٦)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اس نے اپنے رسول پر اتارا اور اس کتاب پر بھی جسے اس نے اس سے پہلے اتارا۔''

ہر وہ آیت جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول مبلغ ہیں۔ وہ ان صفات کے قبول کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں جن

---

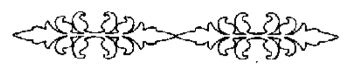
❶ حافظ ابن حجر فتح الباری: ١٣/ ٣٧٣ میں فرماتے ہیں: اسے ابوداود نے قوی سند کے ساتھ مسلم کی شرط پر روایت کیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ آیت پڑھتے سنا:
﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ اس دوران آپ اپنی انگلیاں کانوں اور آنکھوں پر رکھتے۔ اسے البانی نے صحیح ابی داود (٤٧٣٨) میں صحیح کہا ہے۔

❷ صحیح مسلم: ٥٣٧۔ من حدیث معاویة بن الحکم السلمی رضی اللہ عنہ۔

❸ صحیح بخاری: ٤٨١١۔ مسلم: (١٩) ٢٧٨٦۔ عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

کے بارے میں آپ نے مطلع فرمایا ہے، کیونکہ انہیں لوگوں تک آپ نے پہنچایا ہے، آپ نے جس چیز کی بھی خبر دی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہی دی ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ رسول علیہ الصلاۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے بارے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتے اور سب سے بڑھ کر اللہ کے بندوں کے خیر خواہ ہیں، سب سے بڑھ کر سچے اور سب سے بڑھ کر خوبصورت تعبیر کرنے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صفات قبول میں سے چار چیزیں موجود ہیں۔ علم، خیر خواہی، صدق اور بیان۔ لہٰذا ہم پر ہر اس چیز کو قبول کرنا واجب ہے جس کی آپ نے اپنے رب کی طرف سے خبر دی ہے۔ واللہ العظیم، آپ ان مناطقہ اور فلاسفہ سے بڑھ کر فصیح اللسان، صاحب علم اور خیر خواہ ہیں جن کے یہ لوگ پیروکار بنے پھرتے ہیں۔

مگر آپ اس کے باوجود فرماتے ہیں: ''تو پاک ہے، میں تیری کما حقہ ثناء بیان نہیں کر سکتا، تو اس طرح ہے جس طرح تو نے اپنی ثناء خود بیان کی ہے۔''



تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل کا بیان

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((من غير تحريف ولا تعطيل، ومن غير تكييف ولا تمثيل))

''بغیر تحریف و تعطیل کے اور بغیر تکییف و تمثیل کے۔''

شرح:...... یہ جملہ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اہل سنت کے ایمان کی صفت پر مشتمل ہے، اہل سنت کا صفات باری تعالیٰ پر ایمان ان چاروں امور سے خالی ہے: تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل۔

تحریف لغوی و معنوی اعتبار سے

[**التحريف**]..... تحریف، تغییر سے عبارت ہے، جو لفظی ہوتی ہے یا معنوی۔

عام طور پر تحریف لفظی کا وقوع نہیں ہوا کرتا اور اگر کبھی ہوگا تو جاہل کی طرف سے ہوگا۔ تحریف لفظی کا مطلب شکل میں تبدیلی کرنا ہے۔ مثلاً کوئی بھی شخص: ﴿اَلْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ دال کی زبر کے ساتھ نہیں پڑھے گا، اِلاَّ یہ کہ وہ جاہل ہو۔ جبکہ تحریف معنوی کا بہت سارے لوگ ارتکاب کرتے ہیں مگر اہل سنت والجماعت کا صفات باری تعالیٰ پر ایمان تحریف یعنی لفظی اور معنوی تغییر سے خالی ہے۔ تغییر معنیٰ کے قائلین اسے تاویل کے نام سے اور اپنے آپ کو اہل تاویل کے نام سے موسوم کرتے ہیں تاکہ اس طرح وہ اپنی اس بات کو قبولیت کا رنگ دے سکیں، اس لیے کہ تاویل کے نام سے لوگ نفرت نہیں کرتے اور اسے کراہت کی نظر سے نہیں دیکھتے، مگر درحقیقت یہ تحریف ہی ہے جسے وہ تسلیم نہیں کرتے۔ اگر وہ اسے تحریف تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب خود ان کی طرف سے یہ اعلان ہوگا کہ ہماری باتوں کو رد کر دیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ مؤلف رحمہ اللہ نے تاویل سے ہٹ کر تحریف کا لفظ استعمال کیا ہے، اگرچہ اس موضوع پر گفتگو کرنے والے اکثر لوگ ''من غیر تاویل'' کی عبارت کا انتخاب کرتے ہیں لیکن مؤلف کی تعبیر چار وجوہ کی بناء پر زیادہ موزوں ہے:



پہلی وجہ: یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (النساء: ٤٦) ''وہ کلمات کو ان کی اصلی جگہوں سے تبدیل کرتے ہیں۔''

قرآن کی تعبیر غیر قرآن سے اولیٰ ہے، اس لیے کہ یہ معنیٰ پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔

دوسری وجہ: یہ تعبیر صورت حال پر زیادہ دلالت کرتی اور عدل سے زیادہ قریب ہے۔ دلیل کے بغیر کی گئی تاویل کو اس نام سے موسوم نہ کرنا عدل نہیں ہے بلکہ عدل یہ ہے کہ اسے وہی نام دیا جائے جو اس کا حق ہے اور وہ تاویل نہیں بلکہ تحریف ہے۔

تیسری وجہ: دلیل کے بغیر تاویل کرنا باطل ہے، جس سے دور رہنا اور اس سے نفرت کرنا واجب ہے۔ اس قسم کی تاویل سے نفرت دلانے کے لیے لفظ تحریف کا استعمال زیادہ موثر ہے، اس لیے کہ تحریف کو کوئی بھی قبول نہیں کرتا، جبکہ تاویل ایک نرم سا لفظ ہے جسے قبول کرنا آسان ہے، جہاں تک تحریف کا تعلق ہے تو صرف اسے یہ نام دینے سے ہی انسان اس سے متنفر ہو جاتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو طریق سلف کی مخالفت کرنے والوں کے لیے لفظ تحریف کا استعمال لفظ تاویل کے استعمال سے زیادہ مناسب ہے۔

چوتھی وجہ: ہر تاویل مذموم نہیں ہوتی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یا اللہ! اسے دین میں سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل سکھا۔'' ❷ اور اللہ فرماتا ہے:

﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (ال عمران: ٧)

''اور اس کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے اور علم میں رسوخ رکھنے والے۔''

تاویل کے معانی

اللہ نے ان کی تعریف اس لیے فرمائی ہے کہ وہ تاویل کا علم رکھتے ہیں۔ ہر طرح کی تاویل مذموم نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ متعدد معانی میں استعمال ہوتی ہے، مثلاً: تفسیر، عاقبت وانجام اور لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹا دینا۔

(ا) **تاویل بمعنی تفسیر:** اکثر مفسرین جب کسی قرآنی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو یوں کہا کرتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ کی تاویل اس طرح سے ہے، پھر اس کا معنی بتاتے ہیں۔ تفسیر کو تاویل کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کلام کو اس کے مرادی معنی کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔

(ب) **تاویل بمعنی کسی چیز کا انجام:** یہ لفظ طلب (امر ونہی) میں بھی وارد ہو سکتا ہے اور خبر میں بھی۔

خبر میں اس کے ورود کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا

---

❶ صحیح مسلم: ٤٧٦ عن عائشة رضی اللہ عنہا.   ❷ مسند احمد: ٢٣٩٦۔ الفسوی فی "المعرفة والتاریخ": ١/ ٤٩٤۔ شیخ احمد شاکر نے اسے صحیح کہا ہے۔ بخاری (٧٥، ١٤٣) نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ "اللهم علمه الكتاب".



بِالْحَقِّ﴾ (الاعراف: ۵۳)
''وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کے انجام کا، جس دن اس کا انجام سامنے آئے گا تو کہیں گے وہ لوگ جو اسے اس سے پہلے بھول چکے تھے کہ یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے۔''

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ انہیں جس چیز کے آنے کی خبر دی گئی تھی یہ لوگ اس کے انجام کا انتظار کرتے رہے، پھر جس دن خبر دی گئی چیز آئے گی تو جو لوگ اسے قبل ازیں بھول چکے تھے وہ کہیں گے کہ ہمارے رب کے رسول حق اور سچ لے کر آئے تھے۔

جب یوسف علیہ السلام کے والدین اور ان کے بھائی ان کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تو وہ گویا ہوئے:

﴿هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ﴾ (یوسف: ۱۰۰) ''یہ ہے میرے پہلے والے خواب کی تعبیر۔''

آپ علیہ السلام کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے، کیونکہ انہوں نے یہ بات ان کے سجدہ کرنے کے بعد فرمائی تھی۔

طلب میں اس کے ورود کی مثال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اتری:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ (النصر: ۱) ''جب اللہ کی نصرت اور فتح آئے گی۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدہ میں اکثر پڑھا کرتے: ''پاک ہے تو اے اللہ! ہمارے پروردگار اپنی تعریف کے ساتھ، میرے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔'' آپ یہ پڑھ کر قرآن پر عمل فرماتے۔''[1]

(ج) تاویل کا تیسرا معنی ہے، لفظ کو اس کے ظاہر سے ہٹا دینا: یہ قسم محمود بھی ہے اور مذموم بھی۔ اگر تاویل کسی دلیل کی بنیاد پر کی جائے تو محمود ہوگی اور تفسیر کہلائے گی بصورت دیگر وہ مذموم ہوگی اور تحریف کے باب سے ہوگی نہ کہ تفسیر کے باب سے۔ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اہل تحریف اسی کا ارتکاب کیا کرتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰهٰ: ۵) ''رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔''

لفظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا۔ اس پر استقرار پکڑا اور اس پر علو اختیار کیا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ''استوی'' ''استولیٰ'' کے معنی میں ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ خود ساختہ تاویل ہے جو کہ درحقیقت تحریف ہے، اس لیے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل اس کے مخالف معنی پر ہے۔ جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ ان شاء اللہ

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ (النحل: ۱) ''اللہ کا حکم آیا ہی آیا، پس تم اس کی جلدی مت مچاؤ۔'' کا معنی ہے: عنقریب اللہ کا حکم آن پہنچے گا۔ اگرچہ یہ معنی ظاہر لفظ کے مخالف ہے لیکن اس پر دلیل ہے اور وہ ہے: (فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ) ''اس کی جلدی نہ مچاؤ''...... اس طرح قرآنی آیت: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل: ۹۶) کا معنی ہے: ''جب تو قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کر۔'' اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جب تو قراءت مکمل کرے تو ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھ لیا کر۔ اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت کرنا چاہتے تو...... اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے۔[2] نہ کہ قراءت مکمل کرنے پر

[1] صحیح بخاری: ۴۹۶۸، ۴۹۶۷۔ مسلم: ۴۸۴ عن عائشة رضي الله عنها.
[2] سنن ابی داود: ۷۶۴۔ ابن ماجه: ۸۰۷.



ایسا کرتے چونکہ یہ تاویل دلیل پر مبنی ہے، لہٰذا صحیح ہے۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ ." پڑھتے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ جب آپ بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے۔ اس لیے کہ بیت الخلاء میں ذکر کرنا نامناسب ہے چونکہ اس تاویل کی بھی ایک دلیل ہے، لہٰذا یہ تاویل صحیح ہے اور یہی تفسیر ہے۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں: بدون دلیل تاویل کو تحریف سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں اور صحیح ہے، ایک تو اس لیے کہ یہ قرآنی تعبیر ہے اور دوسرے اس لیے کہ یہ تحریف کرنے والے کے مناسب حال ہے، نیز اس لیے بھی کہ اس سے طریقہ سلف کے مخالف طریقہ اختیار کرنے والے سے زیادہ نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مزید برآں تحریف جیسی بھی ہو مذموم ہوتی ہے، جبکہ تاویل مذموم بھی ہوتی ہے اور محمود بھی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا چار وجوہ کی بنا پر تاویل کی جگہ تحریف کی تعبیر اختیار کرنا زیادہ موزوں ہے۔

تعطیل کا معنی

[**ولا تعطیل**] ..... تعطیل، تخلیہ اور ترک کے معنی میں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ﴾ (الحج: ٤٥) "یعنی خالی اور متروک کنواں۔"

تعطیل اور تحریف میں فرق

اور تعطیل سے مراد ہے۔ ان اسماء وصفات سے انکار کرنا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہو۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ ارشاد ربانی: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (الحج: ٤٥) "بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھوں سے مراد اس کی دو قوتیں ہیں۔ تو اس نے دلیل میں تحریف کی اور صحیح مراد کو معطل کر ڈالا۔ اس لیے کہ ہاتھ سے مراد حقیقی ہاتھ ہیں، اس شخص نے معنی مراد کو معطل کرتے ہوئے غیر مرادی معنی کا اثبات کیا۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ اس کے کھلے ہاتھوں سے کیا مراد ہے میں یہ معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس طرح نہ تو اس نے حقیقی ہاتھ کا اثبات کیا اور نہ اس ہاتھ کا جس کی طرف لفظ کی تحریف کی گئی۔ ایسے شخص کو ہم معطل کا نام دیں گے محرف کا نہیں، اس لیے کہ اس نے نہ تو لفظ کے معنی میں تبدیلی کی اور نہ ہی اس کی غیر مرادی تفسیر کی، مگر اس کا مرادی معنی معطل کر ڈالا، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے لیے ید (ہاتھ) کا اثبات۔ اہل السنہ والجماعہ ان دونوں طریقوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں:

پہلا طریقہ:...... لفظ کے حقیقی اور مرادی معنی کو معطل کرتے ہوئے اسے غیر مرادی معنی کی طرف منتقل کر کے لفظ میں تحریف کرنا۔

دوسرا طریقہ:...... یہ اہل تفویض کا طریقہ ہے، ان کا قول ہے کہ دو ہاتھوں سے مراد حقیقی ہاتھ ہیں جو کہ قوت اور نعمت کے علاوہ ہیں۔ مگر اہل سنت کا عقیدہ تحریف اور تعطیل ان دونوں سے متبرء ہے۔

اس سے ان لوگوں کی گمراہی یا کذب بیانی کا پتہ چلتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سلف کا طریقہ تفویض ہے، اگر تو انہوں نے

ایسا جہالت کی بناء پر کہا ہے تو گمراہ قرار پائیں گے اور اگر عمداً کہا ہے تو پھر وہ کذب بیانی کے مرتکب ہوئے۔

علی کل حال تفویض کو اہل سنت کا مذہب قرار دینے والے یقیناً غلط کہتے ہیں، اہل سنت کا مذہب معنی کا اثبات اور کیفیت کی تفویض ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تفویض کا قول اہل بدعت والحاد کے بدترین اقوال میں سے ایک ہے۔'' ❶

جب انسان تفویض کے بارے میں سنتا ہے تو کہتا ہے: یہ بڑا عمدہ قول ہے، اس سے میں ان سے بھی بچ جاؤں گا اور ان سے بھی، میں نہ تو سلف کا مذہب اختیار کرتا ہوں اور نہ اہل تاویل کا، میں راہ اعتدال اختیار کر کے اس سب کچھ سے محفوظ و مامون رہوں گا۔ میں کہتا ہوں: اللہ اعلم، اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا معنی ہے۔ مگر شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ یہ اہل بدعت والحاد کے بدترین اقوال میں سے ایک ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کا یہ قول مبنی بر صداقت ہے۔ اگر آپ اس میں غور کریں تو اس سے قرآن کی تکذیب نبی کریم ﷺ کی تجہیل اور فلاسفہ کی تعظیم وتوقیر ہوتی ہے۔ قرآن کی تکذیب تو اس طرح کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل: ۸۹)

''اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کی وضاحت ہے۔''

جن کلمات کے معانی کا ہی پتہ نہ چل سکے وہ کس چیز کی وضاحت کرتے ہیں؟ حالانکہ قرآن مجید میں ایسے کلمات کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں ہیں۔ جب ہم ان کے معانی سے ہی آگاہ نہیں ہیں تو کیا ایسی صورت میں قرآن ہر چیز کی وضاحت کرتا ہے؟ آخر وہ تبیان کہاں ہے؟ اور وہ بیان کہاں ہے؟ یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اسماء وصفات سے متعلق قرآن کے معانی نہیں جانتے۔ والعیاذ باللہ! اگر رسول اللہ ﷺ نہیں جانتے تو پھر دوسرے بطریق اولیٰ نہیں جانتے۔

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ان کا یہ قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں کلام فرماتے ہیں مگر اس کا معنی نہیں جانتے، وہ کہتے ہیں کہ: ''ہمارا رب وہ ہے جو آسمان میں ہے۔'' ❷ مگر جب ان سے اس کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو فرماتے ہیں: ''میں نہیں جانتا'' آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''ہمارا رب آسمان دنیا پر اترتا ہے۔'' مگر جب ان سے اس کا معنی پوچھا جاتا ہے تو فرماتے ہیں: ''میں نہیں جانتا۔''...... علی هذا القياس.

کیا رسول معظم ﷺ کے لیے اس سے بڑا بھی کوئی طعنہ ہو سکتا ہے کہ آپ منصب رسالت پر فائز ہونے اور منزل من اللہ آیات کی تبیین وتوضیح کی ذمہ داری سنبھالنے کے باوصف صفات باری تعالیٰ سے متعلقہ آیات واحادیث کے معنی ومفہوم سے آگاہ نہیں ہیں، یہ آپ کی ذات اقدس پر کس قدر سنگین الزام ہے کہ آپ آیات پڑھتے ہیں مگر ان کے مفہوم سے ناآشنا

❶ ملاحظہ فرمائیں: رد درع تعارض العقل والنقل از شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ۱/۱۲۱۔

❷ ملاحظہ فرمائیں: رد درع تعارض العقل والنقل از شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ۱/۳۲۰۔



ہیں، گفتگو کرتے ہیں مگر اس کے مطلب سے نابلد ہیں۔

اس سے زنادقہ کو اہل تفویض کے خلاف زبان درازی کا بھی موقع ملتا ہے اور وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ تم لوگ کچھ بھی تو نہیں جانتے، اہل علم بھی ہم ہیں اور اہل معرفت بھی ہم۔ پھر وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرنے لگتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد سے بالکل مختلف ہوتی ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے امّی بن کر رہنے اور کسی بھی چیز سے آگاہ نہ ہونے سے بہتر ہے کہ ہم نصوص کے معانی کا اثبات کریں۔ چنانچہ وہ اپنی پسند وناپسند کے تحت کلام باری تعالیٰ اور اس کی صفات کے بارے میں کلام کرتے ہیں مگر اہل تفویض ان کی تردید کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، اس لیے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی مراد سے آگاہی نہیں رکھتے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ جو تم کہتے ہو اللہ کی مراد وہی ہو۔ اسی طرح انہوں نے بڑے شر کا دروازہ کھول دیا اور ان کی طرف سے یہ جھوٹی عبارت دیکھنے کو ملی کہ سلف کا طریقہ زیادہ محفوظ ہے جبکہ خلف کا طریقہ زیادہ حکیمانہ اور عالمانہ ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ کسی غبی کا قول ہے۔

طریقہ سلف کو محفوظ قرار دینا اور طریقہ خلف کو عالمانہ اور ٹھوس باور کرنا نطق کے اعتبار سے بھی جھوٹ ہے اور مدلول کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے کہ علم وحکمت کے بغیر سلامتی ومحفوظیت کا وجود ناممکن ہے۔ جو شخص راستے کے نشیب وفراز سے آگاہ نہ ہو وہ سالم ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس لیے کہ اس کے پاس راستے کا علم ہی نہیں ہے، سلامتی علم وحکمت کی مرہون منت ہے۔

اگر آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ طریقہ سلف زیادہ سلامتی والا ہے تو پھر آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ زیادہ عالمانہ بھی ہے اور زیادہ حکیمانہ بھی۔ بصورت دیگر آپ تضادات کا شکار رہیں گے۔

لہٰذا صحیح عبارت یوں بنتی ہے: ''طریقہ سلف زیادہ محفوظ، زیادہ عالمانہ اور زیادہ حکیمانہ ہے۔ جبکہ طریقہ خلف کی کسی نے اس طرح عکاسی کی ہے۔''[1]

لَعَمْرِي لَقَدْ طُفْتُ الْمَعَاهِدَ كُلَّهَا ... وَ سَيَّرْتُ طَرْفِي بَيْنَ تِلْكَ الْمَعَالِمِ

فَلَمْ أَرَ إِلَّا وَاضِعًا كَفَّ حَائِرٍ ... عَلَى ذَقَنٍ أَوْ قَارِعًا سِنَّ نَادِمِ

''مجھے میری زندگی کی قسم! میں تمام معاہد کا طواف کر چکا اور ہر نشان راہ دیکھ چکا۔ مگر میں نے بجز حیرانی اور ندامت کے کہیں بھی کچھ نہ دیکھا۔ بدون علم ذات وصفات کے بارے میں بھی لب کشائی کرنے اور سلامتی کی راہ اختیار نہ کرنے سے سوائے حیرانی اور ندامت کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا کرتا۔''

رازی کہتے ہیں:

نِهَايَةُ إِقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالُ ... وَأَكْثَرُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَالُ

وَأَرْوَاحُنَا فِيْ وَحْشَةٍ مِنْ جُسُوْمِنَا ... وَغَايَةُ دُنْيَانَا أَذًى وَ وَبَالُ

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا ... سِوَى أَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ قِيْلَ وَقَالُوْا

[1] انہیں عبدالکریم شہرستانی نے اپنی کتاب "نهاية الاقدام في علم الكلام" میں ذکر کیا ہے مگر شاعر کا نام نہیں بتایا۔ ملاحظہ ہو: الصواعق لابن القیم: ۱/ ۱۶۶.



''انسانی عقلوں کی انتہا بے بسی ہے، اور لوگوں کی زیادہ تر مساعی رائیگاں جاتی ہیں۔ ہماری روحیں ہمارے جسموں میں وحشت کا شکار ہیں اور ہماری دنیا کی انتہا اذیت و وبال ہے۔ ہم نے زندگی بھر کی بحثا بحثی سے سوائے قیل وقال جمع کرنے کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔'' ❶

پھر فرماتے ہیں: میں نے کلامی طرق اور فلسفیانہ مناہج میں غور وفکر کیا، وہ نہ تو کسی بیمار کو شفا دے سکتے ہیں اور نہ کسی پیاسے کو سیراب کر سکتے ہیں، میری نظر میں طریقہ قرآن قریب ترین طریقہ ہے۔ میں اثبات صفات میں ان آیات کو پڑھتا ہوں:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰىO﴾ (طه: ٥) ''رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔''

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُO﴾ (فاطر: ١٠) ''اس کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔''

جبکہ نفی صفات میں ان آیات کو:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشورى: ١١) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔''

اور...... ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ (طٰه: ١١٠) ''اور وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

میرے جیسا تجربہ کرنے والا میرے جیسی معرفت بھی حاصل کرے گا۔ کیا ان کے بارے میں ہم کہیں کہ ان کا طریقہ زیادہ عالمانہ اور زیادہ حکیمانہ ہے؟

جن میں سے ایک شخص کہتا ہے: ''میری دلی تمنا ہے کہ میں نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کے عقیدہ پر مروں، ❷ کیا اس شخص کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت بڑا عالم بھی ہے اور بہت بڑا دانا بھی؟ جس علم کے یہ لوگ دعوے دار ہیں، آخر وہ علم ہے کہاں؟

مذکورہ بالا سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ طریقۂ تفویض ایک غلط طریقہ ہے، اس لیے کہ یہ تین مفاسد پر مشتمل ہے، تکذیب قرآن پر، تجہیل رسول ﷺ پر، اور فلاسفہ کی تعظیم و توقیر پر۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ علماء سلف کا طریقہ تفویض ہے تو وہ ان کے بارے میں کذب بیانی سے کام لیتے ہیں۔

سلف لفظ و معنی کا اثبات کرتے ہوئے اس کی پوری پوری تشریح کیا کرتے ہیں۔

اہل سنت تحریف و تعطیل کے مرتکب نہیں ہوتے، وہ اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق نصوص کا معنی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ﴿اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ٥٤) کا معنی ہے: ''وہ عرش پر بلند ہوا۔'' نہ کہ وہ اس پر مستولی ہوا اور (بیدہ) میں (ید) سے مراد حقیقی ہاتھ ہے نہ کہ نعمت اور قوت۔ لہٰذا ان کے ہاں نہ تو تحریف ہے اور نہ ہی تعطیل۔

تکییف کے معنی

[ومن غير تكييف] ...... تکییف سے نہی کتاب وسنت میں تو وارد نہیں ہوئی، لیکن ایسی چیزیں ضرور وارد ہوئی ہیں جو اس سے نہی پر دلالت کرتی ہیں۔

---

❶ یہ ابیات فخر الدین رازی کے ہیں، جن کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''اقسام اللذات'' میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''الصواعق لابن القيم: ١/ ١٦٧.

❷ اس کے قائل ابو المعالی الجوینی ہیں، ملاحظہ ہو: ''الصواعق'' لابن القيم رحمه الله : ١/ ١٦٧.

تکییف کسی صفت کی کیفیت بیان کرنا۔ کہا جاتا ہے: کیف یکیف تکیفا، یعنی اس نے صفت کی کیفیت بیان کی۔ **تکییف** کے بارے میں (کَیْفَ) کے ساتھ سوال کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ کیف جاء زید؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: راکبا، گویا آپ نے اس کے آنے کی کیفیت بیان کر دی اور کیف لون السیارة؟ کے جواب میں کہا جائے گا۔ ابیض یعنی سفید اس طرح آپ نے اس کا رنگ بتا دیا۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت بیان نہ کرنا اور ان کے دلائل

اہل سنت صفات باری تعالیٰ کی کیفیت بیان نہیں کرتے، وہ اس بارے سمعی اور عقلی دلائل پر اعتماد کرتے ہیں۔

سمعی دلیل:......قرآن مجید میں ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف: ۳۳)

''کہہ دیجئے کہ میرے رب نے ظاہری اور باطنی فواحش کو حرام قرار دیا ہے، گناہ کو اور بدون حق زیادتی کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں وہ کچھ کہو جس کا تمہیں علم نہیں۔''

شاہد ﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ اس کیفیت میں عرش پر مستوی ہے اور پھر مخصوص کیفیت کا اظہار کرے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بات کی جس کا اسے علم نہیں ہے۔ کیا اللہ نے اسے بتایا ہے کہ وہ اس کیفیت میں عرش پر مستوی ہے؟ ہرگز نہیں اس نے ہمیں اپنے استوی کے بارے میں بتایا ہے مگر اس کی کیفیت سے آگاہ نہیں کیا۔ لہٰذا ہم اسے تکییف کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدون علم بات کرنا، قرار دیں گے۔

اسی لیے بعض علماء سلف فرماتے ہیں: جب تمہارے سامنے کوئی جہمی شخص یہ کہے کہ اگر اللہ آسمان پر اترتا ہے تو پھر کیسے اترتا ہے؟ تو آپ بتائیں کہ اس نے ہمیں اترنے کے بارے میں تو بتایا ہے مگر اس کی کیفیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ بڑا مفید قاعدہ ہے۔ اسے ہمیشہ ذہن میں رکھیے گا۔

دوسری سمعی دلیل:......اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا......﴾ (الاسراء: ۳٦)

''اور اس چیز کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے یقیناً کان، آنکھ اور دل ان سب اعضاء سے جواب طلبی ہونی ہے۔''

عقلی دلیل:......کسی بھی چیز کی کیفیت کا ادراک مندرجہ ذیل تین چیزوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اس چیز کا مشاہدہ، اس کی نظیر کا مشاہدہ یا اس کے بارے میں صادق کی خبر۔ یعنی آپ نے خود اس چیز کا مشاہدہ کیا اور اس کی کیفیت سے آگاہ ہوئے یا آپ نے اس کی نظیر کا مشاہدہ کیا۔ مثلاً کسی نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص نے اٹھاسی ماڈل ڈاٹسن گاڑی نمبر ۲۰۰۰ خریدی ہے۔ چونکہ آپ کے پاس بھی اس جیسی گاڑی موجود ہے، لہٰذا آپ اس کی کیفیت سے آگاہ ہو جائیں گے۔ یا آپ کے پاس کوئی صادق آدمی آیا اور اس گاڑی کے تمام اوصاف بیان کر دیئے۔ تو آپ اس طرح بھی اس کی کیفیت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے۔

اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں: جب ہم ''بدون تکییف'' کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہمارا اس کی کیفیت پر اعتقاد نہیں ہے ہم اس کی کیفیت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر ہمیں اس کا علم نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر استواء کی کوئی نہ کوئی کیفیت ضرور ہے مگر اس کا علم کسی کے پاس نہیں۔ رب تعالیٰ کے آسمان دنیا پر نزول فرمانے کی کیفیت ضرور ہے لیکن ہمیں اس کا علم نہیں۔ اس لیے کہ ہر وجود کی کوئی نہ کوئی کیفیت ہوتی ہے مگر وہ کبھی معلوم ہوتی ہے اور کبھی غیر معلوم۔

امام مالک رحمہ اللہ سے ارشاد باری تعالیٰ:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰهٰ: ٥) ''رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔'' کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ کیسے مستوی ہوا؟ تو آپ نے سر جھکا لیا یہاں تک کہ آپ پسینہ پسینہ ہوگئے، پھر سر اٹھا کر فرمانے لگے: ''استواء تو غیر مجہول ہے'' یعنی اس کا معنی معلوم ہے اس لیے کہ عربی زبان ہمارے پاس موجود ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں (استوی) وارد ہوا ہے اور وہ (علیٰ) کے ساتھ متعدی ہے تو علو کے معنی میں وارد ہوا ہے۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا: ''استواء تو معلوم ہے جبکہ کیفیت غیر معقول ہے'' اس لیے کہ عقل کیفیت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ جس کیفیت کے بارے میں سمعی اور عقلی دلیل مفقود ہو تو اس سے رک جانا ضروری ہے۔ ''اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔''

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں خبر دی ہے:

''اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔''[1]

کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت اس لیے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ٥٤) ''وہ عرش پر مستوی ہوا۔''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے استواء کی کیفیت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال نہ کیا حالانکہ وہ ہم سے کہیں زیادہ علم کے حریص تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور استواء علی العرش کے معنی سے بخوبی آگاہ تھے، مگر اس کی کیفیت کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جب ہم سے اس کے بارے میں سوال کیا

[1] اسے لالکائی نے ''شرح السنه'' ٦٦٤ اور بیہقی نے ''الاسماء والصفات'': ٨٦٧ میں روایت کیا: فتح الباری: ١٣/ ٤٠٧۔ میں حافظ فرماتے ہیں: اس کی سند جید ہے۔ اسے دارمی نے ''الردّ علی الجهمیه'' ١٠٤ اور ابن عبدالبر نے ''التمهید'': ٧/ ١٥١ میں روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ذکر کرنے کے بعد شیخ الاسلام فرماتے ہیں: یہ جواب امام مالک رحمہ اللہ کے شیخ ربیعہ سے ثابت ہے اور یہ موقوفاً اور مرفوعاً ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ لیکن اس کی سند قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ تمام اقوال امام مالک رحمہ اللہ کے قول سے موافقت رکھتے ہیں۔ ''مجموع الفتاویٰ'': ٥/ ٣٦٥.



جائے گا تو ہم یہی کہیں گے کہ: یہ سوال بدعت ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول جمیع صفات کے لیے میزان ہے۔ مثلاً اگر آپ سے سوال کیا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہے؟ تو اس کا بھی یہی جواب ہے کہ نزول غیر مجہول ہے، کیف غیر معقول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رات کا آخری تہائی حصہ تو منتقل ہوتا رہتا ہے ایسے میں نزول کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟ تو ہم کہیں گے: یہ سوال کرنا ہی بدعت ہے، جس چیز کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال نہیں کیا اس کے بارے میں آپ کیسے سوال کر سکتے ہیں؟ حالانکہ وہ حصول خیر اور حصول علم کے تم سے زیادہ حریص تھے۔ پھر ہم کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑے عالم نہیں ہیں، جب آپ نے لوگوں کو اس کی تعلیم نہیں دی تو ایسے میں آپ کا یہ سوال بدعت ہی ہوگا۔ اگر ہمیں آپ کے بارے میں حسن ظن نہ ہوتا تو ہم تمہارے بارے میں وہی بات کہتے جو تمہارے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ آپ بدعتی شخص ہیں اور یہ اس لیے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اس شخص سے یہ کہتے ہوئے کہ: ''تو بدعتی آدمی ہے۔'' اسے اپنی مجلس سے نکال دیا تھا۔ سلف اہل بدعت سے بڑی نفرت کرتے تھے بلکہ وہ ان کی گفتگو، ان کے اعتراضات، تقدیرات اور مجادلات سے بھی نفرت کیا کرتے تھے۔

برادر محترم! آپ کے لیے اس باب میں سر تسلیم خم کر دینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کما حقہ اطاعت گزاری کا اہم ترین عنصر یہ ہے کہ ان امور میں بحث کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ اسماء و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال نہیں کیا تو ہمیں بھی اس سے گریز کرنا چاہیے، اس لیے کہ اگر ہم اپنے لیے اس قسم کے دروازے کھولنا چاہیں گے۔ تو دروازے کھل جائیں گے، دیواریں گر جائیں گی اور پھر ہم اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکیں گے۔ لہٰذا آپ بھی یہ کہہ دیں کہ ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی، ہم ایمان لائے اور ہم نے تصدیق کی۔ اسی میں ہم سب کی سلامتی ہے۔

اگر کوئی انسان صفات باری تعالیٰ سے متعلق کسی ایسی چیز کے بارے میں ایسا سوال کرے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا تو آپ اسے امام مالک رحمہ اللہ والا جواب دیں کہ اس بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ اگر آپ یہ جواب دیں گے تو وہ آپ سے جواب کے حصول کے لیے اصرار نہیں کرے گا اور اگر وہ اپنی بات پر اڑا رہے تو پھر آپ یوں کہیں: ارے بدعتی! اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، تو ان احکام کے بارے میں سوال کر جن کا تو مکلف ہے اور اگر تو رب تعالیٰ اور اس کے اسماء و صفات کے بارے میں سوال کرے گا، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ سوال نہیں کیا، تو ہم اسے قبول کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہیں۔

علمائے سلف سے کچھ ایسا کلام بھی منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ صفات کے مفاہیم و معانی کا فہم رکھتے تھے، جیسا کہ اوزاعی وغیرہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے صفات کی آیات اور احادیث کے بارے میں فرمایا: ''انہیں بلا کیف اسی طرح گزارو جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں۔'' [1] یہ قول اس بات کی دلیل ہے کہ سلف

[1] شرح السنه از لالکائی: ۸۷۵۔

آیات صفات کے معنی کا اثبات کرتے تھے اور یہ دو طرح سے ثابت ہے۔

اولاً: ان کا یہ فرمانا: ''انہیں اسی طرح گزارو جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں۔'' اور یہ سبھی کے علم میں ہے کہ یہ الفاظ معانی کے لیے ہی وارد ہوئے ہیں عبث ہرگز نہیں ہیں۔ جب ہم انہیں اسی طرح گزاریں گے جس طرح وہ وارد ہوئے ہیں تو اس سے ان کے معنی کا اثبات کرنا بھی لازم آئے گا۔

ثانیاً: ان کا قول ''بلا کیف'' اس لیے کہ کیفیت کی نفی اصل معنی کے وجود پر دلالت کرتی ہے، کسی چیز کی کیفیت کی نفی لغو اور عبث نہیں ہوا کرتی۔

الغرض! علمائے سلف کا یہ مشہور مقولہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ان نصوص کے مفہوم و معنی کا اثبات کرتے تھے۔

[**ولا تمثیل**] ...... یعنی من غیر تمثیل ، اہل سنت اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے مماثل قرار نہیں دیتے۔ نہ اس کی ذات میں اور نہ ہی صفات میں۔

تمثیل کا مطلب ہے: کسی چیز کے مماثل کا ذکر کرنا۔ اس کے اور ''تکییف'' کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔ اس لیے کہ ہر مُمثل مکیف ہوتا ہے۔ مگر ہر مکیف مُمثل نہیں ہوتا اور یہ اس لیے کہ تکییف ایسی کیفیت کے ذکر سے عبارت ہے جو مماثل کے ساتھ مقرون نہیں ہوتی۔ مثلاً آپ کہتے ہیں: میرے قلم کی کیفیت یہ یہ ہے، پھر اگر اسے مماثل سے ملاتے ہوئے یہ کہا جائے کہ یہ قلم اس قلم جیسا ہے تو یہ تمثیل ہوگی، اس لیے کہ میں نے ایک ایسی چیز کا ذکر کیا جو دوسری چیز کے مماثل ہے اور اس مماثل کے ساتھ میں نے قلم کی شناخت کروائی۔

تمثیل کی سمعی، عقلی اور فطری نفی کے دلائل

اہل سنت اللہ تعالیٰ کے لیے صفات کا اثبات بدون مماثلت کرتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے لیے زندگی ہے مگر وہ ہماری زندگی جیسی نہیں ہے اس کے لیے علم ثابت ہے مگر وہ ہمارے علم جیسا نہیں ہے، اسی طرح اس کا چہرہ بھی ہے، آنکھیں بھی ہیں اور ہاتھ بھی ہیں، مگر اس کا چہرہ ہمارے چہرے جیسا، اس کی آنکھیں ہماری آنکھوں جیسی اور اس کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں جیسے نہیں ہیں...... وہ جمیع صفات میں اسی طرح کہا کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی مخلوق کی صفات سے مماثل نہیں ہیں۔ ان کے پاس اس کے سمعی دلائل بھی ہیں اور عقلی بھی۔

۱۔ سمعی دلائل: خبر کے حوالے سے یہ ارشاد باری تعالیٰ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس جیسی کوئی شے نہیں ہے۔''

اس آیت میں صراحتاً تمثیل کی نفی کی گئی ہے۔

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا٥﴾ (مریم: ٦٥) ''کیا تم اس کے کسی ہم نام کو جانتے ہو؟''

اگرچہ یہ انشائیہ جملہ ہے مگر خبر کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ یہ استفہام بمعنی نفی ہے۔ اسی طرح یہ ارشاد ربانی:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ٥﴾ (الاخلاص: ٤) ''اس کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔''

یہ تمام آیات ذات باری تعالیٰ کے لیے مماثلت کی نفی کرتی ہیں اور یہ ساری کی ساری خبر یہ ہیں اور طلب کے حوالے سے یہ آیات ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (البقرۃ: ۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ کی نظیریں اور مماثل مت بناؤ۔ اور...... ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ (النحل: ۷۴) ''اللہ کی مثالیں مت بیان کرو۔''

اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے مثل قرار دینے والا خبر کی تکذیب کرتا اور حکم سے روگردانی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سلف ایسے شخص پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں، امام بخاری کے شیخ نعیم بن حماد خزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس کسی نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے مشابہ قرار دیا اس نے کفر کیا۔'' [1] اس لیے کہ اس نے خبر کی تکذیب بھی کی اور طلب سے روگردانی بھی۔

۲۔ عقلی دلائل:

اولاً:...... خالق اور مخلوق کے درمیان کسی بھی حالت میں تماثل ممکن نہیں ہے اگر دونوں میں اصل وجود کے علاوہ اور کوئی تباین نہ بھی ہوتا تو یہی کافی تھا، اور یہ اس لیے کہ خالق کا وجود واجب ہے وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔ جبکہ مخلوق کا وجود ممکن ہے، وہ وجود سے قبل معدوم تھا اور بعد ازاں فنا ہو جائے گا۔ جو دو وجود اس طرح سے ہوں انہیں مماثل نہیں کہا جا سکتا۔

ثانیاً:...... خالق اور مخلوق کی صفات اور افعال میں بھی بڑا تباین ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر آواز کو سنتا ہے وہ جس قدر بھی مخفی ہو اور جس قدر بھی دور حتیٰ کہ سمندروں کی گہرائی میں موجود آوازوں کو بھی سنتا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ (المجادلة: ۱) ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے خاوند کے بارے میں آپ سے بحث وجدل کر رہی تھی اور اللہ سے شکایت کر رہی تھی اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔''...... تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: ''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی سماعت نے تمام آوازوں کو اپنی وسعت میں سے رکھا ہے۔ میں اپنے کمرے میں تھی جبکہ اس خاتون کی کچھ باتیں مجھے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔'' [2]

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے عرش کے اوپر سے سن لیا۔ جبکہ زمین وعرش کے درمیان فاصلہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ کہنا ممکن ہے کہ اللہ کا سننا ہمارے سننے جیسا ہے۔

ثالثاً:...... ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی مخلوق سے متباین ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ (البقرة: ۲۵۵)

''اس کی کرسی زمینوں اور آسمانوں کو اپنی وسعت میں لیے ہوئے ہے۔''

نیز...... ﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (الزمر: ۶۷)

''قیامت کے دن ساری زمین اس کے قبضہ میں ہوگی۔''

---

[1] اسے لالکائی نے ''شرح السنہ: ۱۳/ ۳۷۲'' میں روایت کیا اور البانی نے ''مختصر العلو'': ۶/ ۴۶ میں اسے صحیح کہا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''سیر اعلام النبلاء'' از ذهبی: ۱۰/ ۶۱۰۔

[2] اسے بخاری نے تعلیقاً روایت کیا۔ فتح الباری: ۱۳/ ۳۷۲۔ احمد نے اسے مسند میں موصولاً روایت کیا ہے۔ ۶/ ۴۶۔ ابن ماجہ: ۱۸۸۔ نیز ۲۰۶۳۔

جبکہ مخلوق میں سے کسی ایک کے لیے بھی ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ جب اس کی ذات مخلوق سے مباین ہے تو صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں، لہٰذا اس کی صفات بھی اس کی مخلوق سے مباین ہوں گی۔ خالق ومخلوق کے درمیان تماثل ممکن ہی نہیں ہے۔

رابعاً:...... مخلوقات میں کتنی ہی ایسی اشیاء ہمارے مشاہدے میں ہیں جو اسماء میں تو متفق ہوتی ہیں مگر مسمیات میں مختلف؟ خود لوگوں کی صفات ایک دوسری سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔

کسی کی سماعت و بصارت قوی ہے تو کسی کی کمزور، یہ جسمانی طور پر طاقتور ہے اور یہ ضعیف، کوئی مرد ہے اور کوئی عورت...... جب ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے والی مخلوق میں تباین موجود ہے تو مختلف اجناس سے تعلق رکھنے والی مخلوق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ان کے مابین تباین تو اس سے بھی واضح ہے۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا ہاتھ اونٹ کے ہاتھ جیسا ہے، چیونٹی کے ہاتھ جیسا ہے یا بلی کے ہاتھ جیسا، جب انسانوں، چیونٹیوں اور بلیوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مختلف ہیں حالانکہ نام سب کا ایک ہی ہے، تو پھر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ جب مخلوقات میں اسم کے اتفاق کے باوصف مسمیات میں اختلاف وتفاوت موجود ہے تو پھر یہ خالق ومخلوق میں تو بطریق اولیٰ ہوگا۔ یہ چار عقلی وجوہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خالق کا کسی بھی حالت میں اپنی مخلوق سے مماثل ہونا ممکن نہیں ہے۔

ویسے اس پر ایک فطری دلیل بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ انسان فطری طور پر خالق ومخلوق کے مابین موجود فرق سے آگاہ ہے۔ اگر یہ بات اس کی فطرت میں نہ ہوتی تو وہ خالق سے کبھی دعا نہ کرتا۔

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ سمعی، عقلی اور فطری اعتبار سے خالق کی مخلوق کے ساتھ مماثلت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

کیا یہ احادیث تمثیل کا فائدہ دیتی ہیں؟

سوال: ہم آپ کے سامنے نبی کریم ﷺ کی کچھ ایسی احادیث رکھنا چاہیں گے جن کے بارے میں ہم یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ وہ تمثیل پر مبنی ہیں یا نہیں؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کی رات چاند کو دیکھا کرتے ہو، اس کے لیے تمہیں رش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' اس حدیث میں حرف ''کما'' استعمال ہوا ہے۔ اور (کاف) تشبیہ کے لیے ہے، جس طرح ہمارا اللہ تعالیٰ کے حکم پر ایمان ہے اسی طرح آپ ﷺ کے فرمان پر بھی ایمان ہے۔ اپ اس حدیث کا کیا جواب دینا چاہیں گے؟

جواب: اس حدیث کا ایک جواب مجمل ہے اور دوسرا مفصل۔

جواب مجمل:...... اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام میں۔ بشرطیکہ وہ آپ سے صحت کے ساتھ ثابت ہو۔

تعارض کا پایا جانا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ یہ دونوں حق ہیں اور حق ایک دوسرے سے متعارض نہیں ہوا کرتا، اور چونکہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ اللہ کی طرف سے ہو اس میں تناقض نہیں آیا کرتا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء: ۸۲)

''اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔''

اگر کسی چیز کی وجہ سے آپ کے فہم میں تعارض کا تاثر پیدا ہوتا ہے تو یہ تعارض نص میں نہیں ہوتا بلکہ آپ کی اپنی معلومات کے اعتبار سے ہوتا ہے، جب آپ کو کتاب وسنت کی نصوص میں تعارض نظر آئے تو ایسا یا تو کم علمی کی وجہ سے ہوگا، یا قصور فہم کی وجہ سے ہوگا، یا پھر بحث وتدبر کا حق ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے۔ اگر کما حقہ بحث وتمحیص اور تدبر سے کام لیا جائے تو بظاہر نظر آنے والا تعارض لا اصل ثابت ہوگا۔ کبھی کبھی اس کے پیچھے قصد وارادہ کی خرابی بھی کارفرما ہوا کرتی ہے، جس سے انسان توفیق ایزدی سے محروم ہو جاتا ہے، بالکل ان باطل پرستوں کی طرح جو آیات متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

اس مجمل جواب سے یہ بات متفرع ہوتی ہے کہ اشتباہ کے وقت محکم کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔ علم میں رسوخ رکھنے والوں کا یہی وطیرہ ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران: ۷)

''اللہ تو وہ ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری، اس میں سے کچھ آیتیں محکم ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں محض فتنہ کی تلاش میں یا اس کی حقیقت تلاش کرتے ہوئے جبکہ اس کی حقیقت کو سوائے اللہ کے کوئی بھی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں مضبوط ہیں وہ کہتے ہیں کہ سب آیات ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔''

راسخین فی العلم متشابہ کو محکم پر محمول کرتے ہیں۔

جواب مفصل:...... پوری نص سے متعلق جواب کی تفصیل اس طرح سے ہے:

آپ ﷺ کے مذکورہ بالا ارشاد میں مرئی (دیکھی گئی چیز) کو مرئی کے ساتھ تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ رؤیت (دیکھنا) کو رؤیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ حدیث کے الفاظ: "سترون ربکم کما ترون القمر" میں (ک) تشبیہ مصدر مؤول پر داخل ہوا ہے، اس لیے کہ (ما) مصدریہ ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: "کرؤیتکم القمر لیلة البدر" جس سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو اس طرح واضح طور پر دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو۔ اسی معنی کے پیش نظر اس کے بعد فرمایا گیا: "لا تضامون فی رؤیته" یا جس طرح دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: "لا تضارون فی رؤیته" یعنی اس کا دیدار کرتے وقت بھیڑ بھاڑ نہیں ہوگی یا اس کا دیدار کرتے وقت تمہیں تکلیف نہیں ہوگی۔ اس صورت میں یہ اشکال دور ہو جاتا ہے۔



حدیث ان اللہ خلق آدم علی صورتہ پر بحث

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((ان اللّٰہ خلق آدم علی صورتہ)) ❶ کہ ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا فرمایا۔''

حقیقت یہ ہے کہ ایک صورت دوسری صورت کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے۔ اگر آپ کسی مکتوب کی فوٹو کاپی کریں تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی تصویر ہے، ایک تصویر دوسری تصویر کے عین مطابق ہوتی ہے اور ان کے حروف اور کلمات میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔'' رسول علیہ السلام کا ارشاد ہے، جو سب سے بڑھ کر علم وصدق کے حامل، امت کے خیر خواہ اور سب لوگوں سے زیادہ فصیح المقال ہیں۔

جواب مجمل: ...... اس کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔'' کے خلاف نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ان میں تطبیق دینے کی توفیق دے تو ایسا ضرور کریں اور اگر یہ میسر نہ آئے تو پھر کہہ دیں ﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (ال عمران: ۷) ''ہم اس پر ایمان لائے، سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت کا کوئی مثیل نہیں ہے، ہم اس عقیدے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ اس کے رسول ﷺ کا، ان میں سے ہر کلام حق ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کی تکذیب کرے، کیونکہ یہ خبر ہے کوئی حکم نہیں کہ اس میں نسخ کا امکان ہو۔ میں کہتا ہوں ادھر مماثلت کی نفی ہو رہی ہے اور ادھر اثبات صورت۔ آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور یہ کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ ہمارا کلام اللہ پر بھی ایمان ہے اور کلام رسول اللہ ﷺ پر بھی۔ یہ دونوں برحق ہیں، ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور ہم ان کے سامنے خاموش ہیں۔

جواب مفصل: جنہوں نے یہ بات فرمائی کہ: ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔'' وہ اس اللہ کے رسول ہیں جس نے فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوری: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔'' اور یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اپنے بھیجنے والے کی تکذیب کرے، جس پیغمبر نے یہ فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔'' اسی پیغمبر کا ارشاد ہے: ''جنت میں داخل ہونے والا پہلا گروہ چاند کی صورت میں ہوگا۔'' ❷ کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ گروہ ہر اعتبار سے چاند کی صورت میں ہوگا، یا وہ ہوگا تو انسانی شکل وصورت میں ہی لیکن حسن وجمال، چہرے کی گولائی اور اس کی چمک دمک میں چاند جیسا ہوگا؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی نہ آنکھیں ہوں گی، نہ ناک اور نہ ہی منہ۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ تو پتھر ہوں گے اور اگر آپ دوسری بات کو تسلیم کرتے ہوں

---

❶ صحیح بخاری: ۶۲۲۷۔ صحیح مسلم: ۲۶۱۲ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

❷ صحیح بخاری: ۳۲۵۴۔ صحیح مسلم: ۲۸۳۴ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

تو پھر اشکال ختم ہوا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک چیز کا دوسری چیز کی صورت پر ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہوتا کہ وہ ہر اعتبار سے اس کے مماثل ہوگی۔

لیکن اگر آپ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں اور اس سے انکار کرتے ہوئے اس بات پر بضد رہیں کہ اس سے مراد مماثلت ہے۔ تو اس کا ایک اور جواب بھی ہے اور وہ یہ کہ اس جگہ اضافت، مخلوق کی اپنے خالق کی طرف اضافت کے باب سے ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان: ((خلق آدم علی صورته)) آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد جیسا ہے۔

﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي﴾ (صٓ: ۷۲) ''اور میں اس میں اپنی روح پھونک دوں۔''

یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی روح کا کوئی حصہ ودیعت کر دیا ہو، بلکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ روح ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اس کے شرف کے اظہار کے لیے ہے۔ جب ہم (عباد اللہ) کہتے ہیں تو اس کے تحت مومن، کافر، شہید، صدیق، نبی سبھی آ جاتے ہیں مگر جب یہ کہیں گے (محمد عبداللہ) ''محمد اللہ کے بندے ہیں۔'' تو یہ اضافت خاصہ ہوگی جو کہ سابقہ عبودیت جیسی نہیں ہے۔

لہٰذا آپ کے ارشاد: ((خلق آدم علی صورته)) سے مراد اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ کوئی صورت ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِآدَمَ﴾ (الاعراف: ۱۱)

''یقیناً ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔''

آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی صورت پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی آدم علیہ السلام کو اس صورت پر پیدا فرمایا جو کہ کائنات کی سب سے حسین وجمیل صورت ہے۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا ٱلْإِنسَٰنَ فِىٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (التین: ٤)

''یقیناً ہم نے انسان کو بہت اچھی ترکیب وقامت میں پیدا فرمایا۔''

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں بڑی دلچسپی لی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے چہرے پر مارنے اور اس پر حسی اور معنوی طور پر عیب لگانے سے منع کیا گیا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جواب تحریف ہے یا اس کی کوئی نظیر بھی موجود ہے؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کی نظیر موجود ہے، مثلاً: بیت اللہ، عبداللہ اور ناقۃ اللہ، آدم علیہ السلام کی صورت اللہ تعالیٰ سے الگ اور منفصل ہے۔ اور ہر وہ چیز جسے اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی طرف منسوب کرے اور وہ اس سے الگ اور منفصل ہو تو اس کا شمار اس کی مخلوقات میں ہوتا ہے۔ اس طرح یہ اشکال دور ہوگیا۔ اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پہلا معنی زیادہ سلامتی والا ہے یا دوسرا؟ تو ہمارے نزدیک پہلے معنی میں زیادہ سلامتی ہے، اس لیے کہ ظاہر لفظ کے لیے عربی زبان میں جواز بھی موجود ہے اور عقلاً اس کا امکان بھی۔ لہٰذا کلام کو اس معنی پر محمول کرنا واجب ہے، جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ صورت سے اس کا دوسری صورت کے ساتھ مماثل ہونا لازم نہیں آتا۔ لہٰذا محفوظیت اسی میں ہے کہ اسے ظاہری مفہوم پر محمول کیا جائے۔



سوال: اللہ کی وہ صورت کون سی ہے جس پر آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا چہرہ بھی ہے، آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں بھی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ چیزیں انسان کے ساتھ مماثلت رکھتی ہیں، کسی قدر مشابہت ضرور ہے مگر یہ مماثلت کے انداز میں ہرگز نہیں، جس طرح جنت میں داخل ہونے والے پہلے گروہ کی چاند کے ساتھ مشابہت ہوگی مگر یہ مماثلت کے بغیر ہوگی۔ اسی سے اہل سنت کے اس عقیدہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تمام صفات مخلوقات کی صفات کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتیں۔ وہ ان پر تحریف وتعطیل کے بغیر اور تکییف وتمثیل کے بغیر ایمان رکھتے ہیں۔

تعبیر بالتمثیل اولیٰ ہے تعبیر تشبیہ سے

سوال: بہت سے مؤلفین اپنی کتابوں میں ''تشبیہ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے ان کا مقصود ''تمثیل'' ہوا کرتا ہے۔ ان میں سے کون سی تعبیر زیادہ موزوں ہے؟

جواب: اسے ''تمثیل'' کے ساتھ تعبیر کرنا اولیٰ ہے اور اس کی چند وجوہات ہیں:

اولاً:...... یہ قرآنی تعبیر ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔''

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (البقرة: ۲۲) ''اللہ کے شریک مت بناؤ۔''

اور ان جیسی دوسری آیات، قرآنی تعبیر غیر قرآنی تعبیر سے اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ قرآن سے بڑھ کر کوئی چیز فصیح نہیں ہے اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی چیز معنی مراد پر دلالت کرنے والی ہے، لہٰذا قرآن سے موافقت اختیار کرنا ہی مبنی بر صواب ہوگا۔

ثانیاً:...... بعض لوگوں کے نزدیک تشبیہ اثبات صفات سے عبارت ہے، اس لیے وہ اہل سنت کو مشبہ کا نام دیتے ہیں اگر ہم "من غير تشبيه" کی تعبیر اختیار کریں اور کوئی شخص یہ سمجھے کہ اس سے مراد اثبات صفات ہے تو اس سے تشبیہ کا مفہوم بگڑ جائے گا۔ لہٰذا اس سے گریز اختیار کرنا ضروری ہے۔

ثالثاً:...... علی الاطلاق تشبیہ کی نفی کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ کوئی سی بھی دو چیزوں کے مابین بعض وجوہ کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی اشتراک ضرور پایا جاتا ہے۔

ان چیزوں کا تعلق اعیان کے ساتھ ہو یا صفات کے ساتھ، اگر مطلقاً تشبیہ کی نفی کر دی جائے تو اس طرح ہر اس چیز کی نفی ہو جائے گی جس کی وجہ سے خالق ومخلوق کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وجود، اصل وجود کے اعتبار سے خالق ومخلوق میں اشتراک ہے جو کہ ایک طرح کا تشابہ ہے مگر وجود وجود میں فرق ہے۔ خالق واجب الوجود ہے جبکہ مخلوق ممکن الوجود، یہی حال سمع کا ہے، خالق بھی سمع سے متصف ہے اور مخلوق بھی، مگر دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔

اگر ہم "من غير تشبيه" کی تعبیر اختیار کرتے ہوئے مطلق تشبیہ کی نفی کریں گے تو اس سے اشکال پیدا ہوگا۔ لہٰذا اس جگہ ''تمثیل'' کی تعبیر اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔



تکییف اور تمثیل میں فرق

سوال: تکییف اور تمثیل میں کیا فرق ہے؟

جواب: ان دونوں میں دو طرح سے فرق ہے۔

پہلی وجہ: ...... تمثیل ایسی صفت کے ذکر سے عبارت ہے جو مماثل کے ساتھ مقید ہو، مثلاً فلاں شخص کا ہاتھ فلاں شخص کے ہاتھ جیسا ہے جبکہ تکییف ایسی صفت کے ذکر سے عبارت ہے جو مماثل کے ساتھ مقید نہ ہو۔ مثلاً فلاں کے ہاتھ کی کیفیت اِس اِس طرح سے ہے۔ اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ ہر ممثل مکیّف ہوتا ہے، جبکہ ہر مکیّف ممثل نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ: ...... کیفیت صرف صفت اور حقیقت میں ہوتی ہے جبکہ تمثیل ان میں بھی ہوتی ہے اور عدد میں بھی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ (الطلاق : ۱۲)

''اللہ تو وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور ان جیسی زمین بھی۔'' یعنی عدد میں ان جیسی۔

اہل سنت کا ایمان ہے کہ اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((بَلْ یُؤْمِنُوْنَ بِاَنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ :﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾(الشوریٰ : ۱۱)......))

''اہل سنت اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

شرح: ...... [بَلْ یُؤْمِنُوْنَ] ...... یعنی اہل سنت اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ اس نے اپنی ذات کے بارے میں خود فرمایا:

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ (الشوریٰ : ۱۱)

اس جگہ رب تعالیٰ نے مماثلت کی نفی کی اور سمع و بصر کا اثبات۔ اس طرح اس نے عیب کی نفی کرتے ہوئے کمال کا اثبات فرمایا، اس لیے کہ نفی عیب، اثبات کمال سے پہلے ہوا کرتی ہے۔

لفظ شَیْءٌ نفی کے سیاق میں نکرہ ہے جو کہ ہر شے کا احاطہ کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی چیز اس کی مثل نہیں ہے، کوئی بھی مخلوق وہ جس قدر بھی عظیم ہو اللہ تعالیٰ کے مماثل نہیں ہے، اس لیے کہ ناقص کے ساتھ مماثلت بذات خود ایک نقص ہے۔

اس جگہ اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل موجود ہے تو اس سے اس کا ناقص ہونا لازم آئے گا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے مخلوق کے ساتھ مماثلت کی اس لیے نفی کی ہے کہ یہ نقص اور عیب ہے، اس لیے کہ مخلوق ناقص ہے اور کامل کی ناقص کے ساتھ تمثیل اسے بھی ناقص بنا دیتی ہے، بلکہ ان دونوں میں مفاضلت کا ذکر ہی اسے ناقص بنا دیتا ہے۔ بجز اس صورت کے کہ وہ مقام تحدی میں ہو۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:



﴿ءٰ آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ٥﴾ (النمل: ٥٩)

''کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو انہوں نے شریک بنا رکھا ہے۔''

نیز یہ آیت قرآنی:

﴿قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ (البقرة: ١٤٠) ''آپ پوچھیں کہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟''

[لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ] ..... میں ممثلہ کی صراحتاً تردید کی گئی ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے مثیل کا اثبات کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس زبان میں خطاب کیا جسے ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہم سے اس زبان میں مخاطب ہو جس کا ہم فہم نہ رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میرا چہرہ بھی ہے۔ میری آنکھیں بھی ہیں اور دو ہاتھ بھی۔ اور ہم عربی زبان کے حوالے سے ان چیزوں کا وہی مفہوم سمجھیں گے جس کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں۔ اس بناء پر ان کلمات کا مدلول مخلوقات کی نسبت سے ان کے مدلول کے مماثل ہوگا۔ ہاتھ جیسا ہاتھ، آنکھ جیسی آنکھ اور چہرے جیسا چہرہ...... ہم نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ ہمارے پاس اس کی دلیل موجود ہے۔

مگر یہ دلیل انتہائی کمزور ہے اور اسے کمزور کرنے والا یہ گزشتہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل نہیں ہے اور ان کی دلیل کے جواب میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے ہمیں اپنی صفات سے آگاہ کیا ہے، مگر ہمیں اس بات کا یقینی علم ہے کہ صفت موصوف کے حساب سے ہوا کرتی ہے اور اس کی دلیل شاہد میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اونٹ کا بھی ہاتھ ہے اور چیونٹی کا بھی۔ مگر یہ کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ جس ہاتھ کی اضافت ہم نے اونٹ کی طرف کی ہے وہ اس ہاتھ کی مثل ہے جسے ہم نے چیونٹی کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ بات تو مخلوقات کے حوالے سے ہے۔ اگر خالق کے اوصاف کے حوالے سے بات کی جائے گی تو تباین اس سے کہیں واضح اور جلی ہوگا۔ الغرض! ممثلہ کا قول عقلی حوالے سے بھی مردود ہے اور سمعی حوالے سے بھی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ اللہ عزوجل نے اپنے کمال کے بیان کی غرض سے اپنی ذات کے لیے سمع اور بصر کا اثبات فرمایا اور ان بتوں کی تنقیص کی جن کی اس کے علاوہ پرستش کی جاتی ہے، اس لیے کہ وہ سن نہیں سکتے اور اگر سن لیں تو جواب نہیں دے سکتے اور نہ ہی وہ دیکھ سکتے ہیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ٥ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ٥﴾ (النحل: ٢٠-٢١)

''اور جنہیں یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود پیدا کیے گئے ہیں۔ مردے ہیں زندہ نہیں اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

وہ سمع و بصر اور عقل سے محروم ہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ ان چیزوں کے مالک ہیں تو بھی جواب نہیں دے سکتے۔



﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (الاحقاف : ٥)

''اوراس سے بڑھ کرکون گمراہ ہوسکتا ہے جو اللہ کے علاوہ ان کو پکارتا ہو جو قیامت تک ان کو جواب نہ دے سکتے ہوں جبکہ وہ ان کی پکار سے بھی بے خبر ہوں۔''

اہل سنت کا انتفاء مماثلت پر ایمان رکھنا

اہل سنت اللہ تعالیٰ سے انتفاء مماثلت پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے کہ یہ عیب ہے، مگر وہ اس کے لیے سمع و بصر کا اثبات کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

انسان کا اللہ تعالیٰ کے سمیع و بصیر ہونے پر ایمان رکھنا اسے یہ فائدہ دیتا ہے کہ وہ اس کی آخری حد تک تعظیم کرنے لگتا ہے۔ اس لیے کہ مخلوقات میں سے کوئی ایک بھی اس جیسا نہیں ہے اور اگر انسان رب عظیم کی اس قدر تعظیم نہ کرے تو پھر اس کے اس ایمان کا کوئی فائدہ نہیں کہ ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔''

جب آپ اس کے بارے میں یہ ایمان رکھیں گے کہ وہ سننے والا ہے تو آپ اُسے ناراض کرنے والے ہر قول سے احتراز کریں گے، اس لیے کہ آپ کو علم ہے کہ وہ میری ہر بات سن رہا ہے، آپ ہر اس بات سے اجتناب کریں گے جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت کا کوئی پہلو موجود ہو، اس لیے کہ آپ کا ایمان ہے کہ اللہ سننے والا ہے اور اگر آپ کا یہ ایمان آپ کو یہ کچھ عطا نہیں کرتا تو پھر یقین کیجئے کہ آپ کا ایمان ناقص ہے اور بلا شک ناقص ہے۔

جب آپ کا اللہ تعالیٰ کے سمیع ہونے پر ایمان ہے تو پھر وہی کلام کیجئے جو اسے پسند آئے۔ خصوصاً جب آپ اس کی شریعت کے ترجمان ہوں، آپ معلم و مبلغ ہوں یا افتاء کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الانعام : ١٤٤)

''اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہو تا کہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر علم کے، بے شک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

علم کے بغیر فتویٰ دینے والوں کی سزا یہ ہے کہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ ظالم ہیں۔

میرے مسلمان بھائیو! ایسی بات کرنے سے خبردار رہیں جو اللہ تعالیٰ کو اچھی نہ لگتی ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہو یا کسی اور کے بارے میں۔

اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے پر ایمان رکھنے پر یہ ثمرہ مرتب ہوتا ہے کہ انسان ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ کے غیض

وغضب کا باعث بن سکتا ہو، اس لیے کہ آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں نے کسی کی طرف نظر حرام سے دیکھا تو اگر چہ یہ بات لوگوں کے کے علم میں بھی ہو مگر اللہ اسے دیکھتا بھی ہے اور وہ میرے دل کی حالت سے بھی آ گاہ ہے۔

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (الغافر: ١٩)

''وہ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور اسے بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔''

اگر آپ کا اس بات پر ایمان ہوگا کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو آپ کے لیے اس کے کسی بھی غیر پسندیدہ فعل کا ارتکاب کرنا ممکن نہیں رہے گا، اور آپ اس سے اسی طرح حیا کریں گے جس طرح آپ اپنے قریب ترین اور انتہائی محترم لوگوں سے کیا کرتے ہیں۔

بہرصورت اگر ہمارا اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے پر ایمان ویقین ہوگا تو ہم ہر اس فعل سے بچنے کی کوشش کریں گے جو اس کے قہر وغضب کو دعوت دینے والا ہو۔ بصورت دیگر ہمارا ایمان ناقص ہوگا۔

اگر کوئی شخص اپنی انگلی، آنکھ یا سر کے ساتھ کسی حرام کام کا اشارہ کرے تو اگر چہ اس کے آس پاس کے لوگوں کو بھی اس کا علم نہ ہو سکے مگر اللہ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے بصیر ہونے کا یقین رکھنے والے کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے، اگر ہمارا ان چیزوں پر ایمان ہو جن کے باری تعالیٰ کے اسماء وصفات متقاضی ہیں تو ہم میں مکمل طور پر استقامت آ جائے۔ فاللّٰہ المستعان.

صفاتِ باری تعالیٰ جو اللہ نے خود بیان کی ہیں کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَلَا يَنْفُوْنَ عَنْهُ مَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ وَلَا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ.))

''اہل سنت اللہ رب العزت سے ان چیزوں کی نفی نہیں کرتے جن کے ساتھ اس نے اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہے اور نہ ہی وہ کلمات کو ان کی اصلی جگہوں سے تبدیل کرتے ہیں۔''

شرح: ...... [فَلَا يَنْفُوْنَ عَنْهُ مَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ] یعنی اہل السنہ والجماعہ اللہ تعالیٰ سے اس چیز کی نفی نہیں کرتے جس کے ساتھ اس نے اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہو، اس لیے کہ وہ نفیاً اور اثباتاً نص کی اتباع کیا کرتے ہیں، ہر وہ چیز جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہو وہ اس کی حقیقت کے مطابق اس کا اثبات کرتے ہیں، وہ اللہ سے اس چیز کی نفی نہیں کرتے جس کے ساتھ اس نے اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہو، ان کا تعلق صفات ذاتیہ کے ساتھ ہو، صفات فعلیہ کے ساتھ ہو یا صفات خبریہ کے ساتھ۔

صفات ذاتیہ، مثلاً حیات، قدرت اور علم...... کی دو قسمیں ہیں: ذاتیہ معنویہ اور ذاتیہ خبریہ اور یہ وہ صفات ہیں، جنہیں علماء ذاتیہ خبریہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ذاتیہ تو اس لیے کہ یہ اس کی ذات سے الگ نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ان کے

ساتھ متصف رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور خبریہ اس لیے کہ یہ خبر سے ثابت ہیں، ان پر عقل دلالت نہیں کرتی، اگر اللہ ہمیں مطلع نہ کرتا کہ اس کا ہاتھ ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا، بخلاف علم، سمع اور بصر کے، کہ ہم سمعی دلالت کے ساتھ ساتھ اپنی عقلوں سے بھی ان کا ادراک کر سکتے ہیں، اسی لیے ہم ہاتھ، چہرے اور ان جیسی دیگر صفات کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ذاتیہ خبریہ ہیں، ہم انہیں اجزا اور ابعاض نہیں کہتے بلکہ ہم تو اس لفظ سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ مگر ہمارے حوالے سے ان کا مسمی اجزا اور ابعاض موجود ہیں۔ اس لیے کہ جزء اور بعض کا کل سے انفصال جائز ہوتا ہے۔ مگر رب تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جن صفات کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو متصف قرار دیا ہے (مثلاً ہاتھ) وہ اس سے کبھی بھی جدا ہوں گی۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ اس کے اجزا اور ابعاض ہیں۔

صفات فعلیہ وہ صفات ہیں جن کا اس کی مشیت کے ساتھ تعلق ہے اگر وہ چاہے تو انھیں سرانجام دے اور اگر نہ چاہے تو نہ دے۔ ہم قبل ازیں یہ بتا چکے ہیں کہ ان میں سے بعض کا کوئی سبب ہوتا ہے جبکہ بعض دیگر کا کوئی سبب نہیں ہوا کرتا۔ اور ان میں سے کچھ ذاتی فعلی ہوتی ہیں۔

الکلم کا معنیٰ ومفہوم

[وَلَا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ.] ..... (الکلم) اسم ہے اور کلمہ کی جمع، اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کلام مراد ہوتا ہے۔

یعنی وہ کلمات کو ان کے مدلولات سے تبدیل نہیں کرتے۔ مثلاً اہل سنت ارشاد باری تعالیٰ: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدۃ: ٦٤) ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔'' کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس سے مراد حقیقی ہاتھ ہیں جو کہ بغیر تکییف اور تمثیل کے اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں، جبکہ محرفین کہتے ہیں کہ ید سے مراد اس کی قوت یا نعمت ہے، مگر اہل سنت کہتے ہیں کہ قوت اور ہاتھ دو الگ الگ چیزیں ہیں، نعمت اور ہاتھ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اہل سنت کلمات کو ان کے اصلی مدلولات سے تبدیل نہیں کرتے، اس لیے کہ تحریف یہودیوں کا وطیرہ ہے:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (النساء: ٤٦)

''یہودیوں میں سے کچھ لوگ کلمات کو ان کی اصلی جگہوں سے تبدیل کرتے ہیں۔''

قرآن وسنت کی نصوص میں تحریف کرنے والا ہر شخص یہودیوں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سے دور رہیں اور ان لوگوں کے ساتھ مشابہت نہ رکھیں جن پر رب تعالیٰ کا قہر وغضب ٹوٹا، وہ لوگ کہ جن میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے بندر، خنزیر اور بتوں کے پجاری بنا دیا، لہٰذا تحریف کا ارتکاب مت کریں۔ کلام کی وہی تفسیر کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مراد ہو۔

امام شافعی رحمہ اللہ سے ان کا یہ قول منقول ہے: ''میں اللہ پر ایمان لایا اور اس چیز پر ایمان لایا جو اللہ کی طرف سے آئی، اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق اور میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا اور اس چیز پر ایمان لایا جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آئی، رسول اللہ کی مراد کے مطابق۔



الحاد اور اس کے معانی

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلَا يُلْحِدُوْنَ فِي أَسْمَاءِ اللّٰهِ وَ آيَاتِهِ .))''اور وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی آیات میں کج روی نہیں کرتے۔''

شرح: ......[وَلَا يُلْحِدُوْنَ] عربی زبان میں الحاد، میلان سے عبارت ہے، قبر میں لحد کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ اس کے درمیان میں نہیں بلکہ ایک طرف میں ہوتی ہے، درمیان میں کھودے گئے حصے کو شق کہا جاتا ہے۔ اور لحد، شق سے افضل ہوتی ہے۔

اہل سنت نہ تو اسماء باری تعالیٰ میں کج روی اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی آیات باری تعالیٰ میں، مؤلف ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ الحاد اسماء میں بھی ہوتا ہے اور آیات میں بھی۔ قرآن اس کی تائید یوں کرتا ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الاعراف : ١٨٠)

''اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں، تو تم اسے ان کے ساتھ پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں، وہ عنقریب اپنے اعمال کی سزا پائیں گے۔''

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا﴾ (فصلت : ٤٠)

''بے شک جو لوگ ہماری آیات میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں۔''

اسماء میں الحاد کا معنیٰ ہے: واجب چیز میں کج روی اختیار کرنا اور اس کی چند قسمیں ہیں:

قسم اوّل: ...... اللہ تعالیٰ کو وہ نام دیا جائے جس کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو موسوم نہیں کیا، جیسا کہ فلاسفہ نے اسے علة فاعله اور نصاریٰ نے اسے باپ اور عیسیٰ کو ابن (بیٹا) کا نام دیا۔ یہ اسماء اللہ میں الحاد ہے، اسی طرح ہر وہ شخص ملحد ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو اس نام کے ساتھ موسوم کرے جس کے ساتھ اس نے اپنی ذات کو موسوم نہ کیا ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں، لہٰذا ہم اس کے لیے وہی نام ثابت کر سکتے ہیں جو نص سے ثابت ہوں اگر کسی نے اس سے ہٹ کر اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نام دیا تو اس نے کج روی اختیار کی اور واجب سے انحراف کیا۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے کسی نام کے ساتھ موسوم کرنا اس کی بے ادبی کرنا اور اس کے حق میں ظلم وعدوان روا رکھنا ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص آپ کو آپ کے نام سے ہٹ کر کسی اور نام سے پکارے گا تو اس کا یہ عمل ظلم وزیادتی کے زمرے میں آئے گا۔ یہ تو مخلوق کے بارے میں ہے۔ خالق کے بارے میں کیا کچھ ہونا چاہیے؟ یہ فیصلہ آپ کر لیں۔

قسم دوم: ...... اللہ تعالیٰ کے کسی نام کا انکار کرنا، پہلے شخص نے اللہ تعالیٰ کو اس نام کے ساتھ موسوم کیا جس کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو موسوم نہیں کیا۔ جبکہ اس نے اس کے اس نام سے انکار کر دیا، جس کے ساتھ اس نے اپنی ذات کو موسوم

کیا ہے، ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت شدہ تمام ناموں کا انکار کرے یا ان میں سے کسی ایک نام کا۔ وہ اسماء رب تعالیٰ میں کج روی اختیار کرنے کا مرتکب ہوگا۔ اور اس میں الحاد کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے انہیں اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہے تو اس کا اثبات کرنا ہمارے لیے بھی واجب ہے، لہٰذا اگر ہم ان کا انکار کریں گے تو یہ الحاد قرار پائے گا اور اس چیز سے انحراف کے زمرے میں آئے گا جسے تسلیم کرنا ہم پر واجب تھا۔ اسلام کی طرف منسوب کچھ لوگ واقعی اسماء باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً غالی قسم کے جہمیہ کہتے ہیں کہ اللہ کا سرے سے کوئی نام ہی نہیں، اسی لیے کہ اگر آپ اس کے لیے کوئی نام ثابت کریں گے تو اسے موجودات کے ساتھ تشبیہ دیں گے، مگر ان کا یہ کہنا باطل ومردود ہے۔

قسم سوم:...... ان صفات کا انکار کرنا جن پر اسماء دلالت کرتے ہوں: ایسا شخص اسم کو تو ثابت کرتا ہے مگر اس صفت سے انکار کرتا ہے جس کو یہ اسم متضمن ہے۔ مثلاً وہ یہ کہتا ہے: اللہ سمیع ہے بغیر سمع کے، علیم ہے بغیر علم کے، خالق ہے بغیر خلق کے اور قادر ہے بغیر قدرت کے۔ اگرچہ یہ معتزلہ کا معروف عقیدہ ہے مگر ہے غیر معقول۔

پھر یہ لوگ اسماء کو محض الگ الگ اعلام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ السمیع اور العلیم دو مختلف نام ہیں، مگر ان کا کوئی مفہوم ومعنی نہیں ہے۔ السمیع سمع پر دلالت نہیں کرتا اور العلیم علم پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ صرف اعلام ہیں۔

ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ یہ اسماء ایک ہی چیز ہیں، علیم ہو، بصیر ہو یا سمیع سب ایک ہی ہیں، ان میں اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ صرف حروف کی ترکیب کا ہے اور بس۔ وہ تمام اسماء کو ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں۔

مگر یہ سب اقوال غیر معقول ہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اسماء باری تعالیٰ پر اس وقت تک ایمان لانا ممکن نہیں ہے جب تک ان صفات کا اثبات نہ کیا جائے جن پر وہ متضمن ہیں۔

دلالت اسم اور اس کی اقسام

اب ہم دلالت اسم کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گے۔ یاد رہے کہ دلالت کے اعتبار سے اسم کی تین قسمیں ہیں: دلالت مطابقت، دلالت تضمن اور دلالت التزام۔

۱۔ **دلالت مطابقت:**......لفظ کا اپنے جمیع مدلول پر دلالت کرنا، اس بنا پر ہر اسم اپنے مسمّٰی بہ پر بھی دلالت کرتا ہے اور اس صفت پر بھی جس سے وہ اسم مشتق ہے۔

۲۔ **دلالت تضمن:** ......لفظ کا اپنے بعض مدلول پر دلالت کرنا، اس بنا پر اسم کا صرف ذات پر دلالت کرنا یا صرف صفت پر دلالت کرنا دلالت تضمن میں سے ہے۔

۳۔ **دلالت التزام:**......لفظ کا کسی ایسی چیز پر دلالت کرنا جو اسم کے لفظ سے نہیں بلکہ اس کے لازم سے سمجھی جائے۔

مثلاً: کلمہ (خالق) ایسا اسم ہے جو ذات الٰہ پر بھی دلالت کرتا ہے اور صفت خلق پر بھی، چونکہ یہ اسم دو چیزوں پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اسے دلالت مطابقت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب آپ لفظ (خالق) بولیں گے تو اس سے خالق کا وجود بھی سمجھ میں آئے گا اور مخلوق کا بھی۔



اس اعتبار سے کہ وہ صرف خالق پر دلالت کرے یا صرف مخلوق پر، اسے دلالت تضمن سے موسوم کیا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ اس کے بعض معنی پر دال ہے۔

اس اعتبار سے کہ وہ علم اور قدرت پر بھی دلالت کرتا ہے اسے دلالت التزام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس لیے کہ علم اور قدرت کے بغیر عمل خلق ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا علم اور قدرت پر دلالت کرنا دلالت التزام میں سے ہے۔

اس سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ جب کوئی انسان ان دلالات میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا تو وہ اسماء باری تعالیٰ میں الحاد کا مرتکب ہوگا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ کلمہ (خالق) ذات پر دلالت کرتا ہے مگر میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ صفت پر بھی دلالت کرتا ہے، تو ایسا شخص بھی اسم میں الحاد کا مرتکب ہوگا۔

اگر وہ یہ کہے کہ میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ لفظ (خالق) ذات اللہ اور صفت خلق پر تو دلالت کرتا ہے مگر وہ صفت علم اور قدرت پر دلالت نہیں کرتا۔ تو ہم اسے بھی الحاد سے تعبیر کریں گے، ہمارے لیے ہر اس چیز کا اثبات لازم ہے جس پر یہ اسم دلالت کرتا ہے، جبکہ اس کا انکار الحاد فی الاسم ہے۔ اس صفت پر اس کی دلالت، دلالت مطابقت ہو، دلالت تضمن ہو یا دلالت التزام۔

اس جگہ ہم ایک حسی مثال بیان کرنا چاہیں گے، جس سے دلالت کی ان تینوں قسموں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، جب آپ نے کہا: میں ایک گھر کا مالک ہوں، تو لفظ (گھر) میں یہ تینوں دلالتیں موجود ہیں، یہ لفظ دلالت مطابقت کے انداز میں سارے گھر پر دلالت کرتا ہے اور دلالت تضمن کے انداز میں صرف بیٹھک پر بھی، صرف غسل خانوں پر بھی اور صرف کمرہ استقبال پر بھی۔ اس لیے کہ یہ چیزیں گھر کا ایک حصہ ہیں اور لفظ کا اپنے معنی کے ایک حصہ پر دلالت کرنا دلالت تضمن ہے، پھر یہ لفظ دلالت التزام کے انداز میں اس کے تعمیر کرنے والے پر بھی دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی تعمیر کنندہ تو ضرور ہوتا ہے۔

قسم چہارم:...... اسماء باری تعالیٰ میں الحاد کی چوتھی قسم یہ ہے کہ انسان اسماء وصفات کا تو اثبات کرے لیکن انہیں تمثیل پر دال قرار دے، یعنی آنکھ ہماری آنکھ جیسی، علم ہمارے علم جیسا اور مغفرت ہماری مغفرت جیسی...... مگر یہ بھی الحاد ہے، اس لیے کہ یہ اس حوالے سے امر واجب سے انحراف ہے، صفات کا بلا تمثیل اثبات واجب ہے۔

قسم پنجم:...... انہیں معبودان باطلہ کی طرف منتقل کرنا، یا ان سے ان کے لیے اسماء مشتق کرنا، مثلاً کسی چیز کی پوجا کرنا اور اسے اللہ کے نام سے موسوم کرنا اس طرح اللہ سے لات، عزیز سے عزیٰ اور منان سے منات مشتق کرنا، یہ بھی اسماء میں کج روی اختیار کرنا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کو اس کے ساتھ خاص کرنا واجب اور اس سے تجاوز کرتے ہوئے ان سے معبودان باطلہ کے نام مشتق کرنا ناروا ہے۔

الحاد، قرآنی آیات کی روشنی میں

اہل سنت اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کے مرتکب نہیں ہوتے، وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق ان کا اجرا کرتے



اور اس کے لیے دلالت کی تمام انواع کا اثبات کرتے اور اس کی مخالفت کو الحاد گردانتے ہیں۔

آیات آیۃ کی جمع ہے: ایسی علامت جو ایک چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کر دے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو آیات کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے نہ کہ معجزات کے ساتھ، لہٰذا آیات کی تعبیر معجزات کی تعبیر سے احسن واولیٰ ہے، اور اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

اولاً: کتاب وسنت میں آیات کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

ثانیاً: معجزات جیسے امور کا صدور جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھی ہو سکتا ہے۔

ثالثاً: لفظ (آیات) لفظ معجزات سے زیادہ معنی مقصود پر دلالت کرتا ہے۔

اس بناء پر آیات اللہ سے مراد وہ علامات ہیں جو اللہ تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں اور اس صورت میں وہ اسی کے ساتھ خاص ہیں اگر وہ اس کے ساتھ خاص نہ ہوتیں تو آیات اللہ نہ ہوتیں۔

آیات اللہ کی دو قسمیں ہیں: آیات کونیہ اور آیات شرعیہ۔

آیات کونیہ: ...... وہ آیات ہیں جو خلق وتکوین سے متعلق ہیں، اس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ (فصلت: ۳۷)

''رات، دن اور چاند سورج بھی اس کی آیات میں سے ہیں۔''

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾ (الروم: ۲۰)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر تم آدمی بن کر پھیلے پھرتے ہو۔''

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ○ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ○ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ○ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ○﴾ (الروم: ۲۲۔ ۲۵)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا، اور مختلف ہونا تمہاری زبانوں اور رنگوں کا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں علم والوں کے لیے اور اس کی نشانیوں میں تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور اس کے فضل (یعنی رزق) کو تلاش کرنا، بیشک اس میں نشانیاں ہیں سننے والوں کے لیے، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے خوف کی راہ سے بھی اور امید کی راہ سے بھی اور آسمان سے بارش برساتا ہے پھر اس سے زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مردہ ہو جانے کے بعد، بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تم کو

پکار کر زمین سے بلائے گا تو تم یکبارگی نکل پڑو گے۔''

یہ آیات کونیہ ہیں، آپ انہی آیات کونیہ قدریہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور یہ آیات اللہ اس لیے ہیں کہ اس کی مخلوق یہ کچھ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، کوئی بھی سورج اور چاند جیسی کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی دن کو رات میں یا رات کو دن میں تبدیل کر سکتا ہے۔

ان آیات میں الحاد کا مفہوم یہ کہ انہیں استقلالاً یا مشارکۃً یا اعانۃً غیر اللہ کی طرف منسوب کیا جائے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کام فلاں نبی نے کیا، فلاں ولی نے کیا، یا یہ کام کرنے میں فلاں نبی یا فلاں ولی نے شرکت کی یا اس نے اللہ تعالیٰ سے تعاون کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍo﴾ (سباء: ۲۲)

''کہہ دو کہ بلاؤ ان کو جن کو تم سوائے اللہ کے (معبود) خیال کرتے ہو، وہ ذرہ برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ہی ان کی ان میں کوئی شراکت ہے اور نہ ہی ان میں سے اللہ کے لیے کوئی مددگار ہے۔''

چونکہ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ اگرچہ یہ بت مالک بھی نہیں ہیں اور ان کی اس میں کوئی شراکت بھی نہیں ہے اور یہ اس سے تعاون بھی نہیں کرتے مگر یہ ہمارے سفارشی ضرور ہیں۔ اس پر اللہ نے فرمایا:

﴿وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾ (سباء: ۲۳)

''اور اس کے ہاں شفاعت نفع نہیں دیتی مگر جسے وہ اجازت دے۔''

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر اس سبب کی جڑیں کاٹ دیں جس کے ساتھ مشرکین کا تعلق رہا ہے۔

آیات شرعیہ:......ان آیات سے مراد وحی ہے، جو رسولوں پر نازل ہوا کرتی تھی، جیسا کہ قرآن عظیم، میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَo﴾ (البقرة: ۲۵۲)

''یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور بیشک آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌo﴾ (العنکبوت: ۵۰)

''اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں کہہ دیں کہ نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں، میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو بھی آیات قرار دیا ہے۔ آیات شرعیہ میں الحاد سے مراد ہے، ان کی تکذیب

کرنا، ان میں تحریف کرنا یا ان کی مخالفت کرنا۔

ان کی تکذیب یہ ہے کہ انسان انہیں جھٹلاتے ہوئے انہیں اللہ کی طرف سے تسلیم نہ کرے یا ان کی تو تصدیق کرے مگر وہ جن واقعات سے آگاہ کرتی ہیں ان کی تکذیب کرے۔

مثلاً اصحاب کہف کے واقعہ کو غیر صحیح قرار دے یا اصحاب فیل کے واقعہ کو تسلیم نہ کرے۔

آیات شرعیہ میں تحریف کرنے کا مطلب یہ ہے، ان کے الفاظ کو تبدیل کرنا یا ان کے معنی کو اللہ اور اس کے رسول کی مراد سے پھیر دینا۔ مثلاً اس کا یہ کہنا کہ عرش پر مستوی ہونے کا مطلب عرش پر استیلاء ہے، یا رب تعالیٰ کے آسمان دنیا پر اترنے سے اس کے حکم کا اترنا مراد ہے۔ رہا ان کی مخالفت کرنا تو وہ ترک اوامر اور ارتکاب معاصی سے عبارت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ مسجد حرام کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (الحج: ٢٥)

''اور جو کوئی ظلم سے اس میں الحاد پھیلانا چاہے گا تو ہم اسے بڑے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں۔''

جملہ معاصی کا، آیات شرعیہ میں الحاد کے زمرے میں شمار ہوتا، چونکہ ہماری ذمہ داری امتثال اوامر اور اجتناب نواہی ہے لہٰذا اگر ہم اپنی ذمہ داری نہیں نبھائیں گے تو یہ الحاد کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر، شریک اور ہم نام نہیں

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَ لَا یُکَیِّفُوْنَ وَ لَا یُمَثِّلُوْنَ صِفَاتِهٖ بِصِفَاتِ خَلْقِهٖ ، لِأَنَّهٗ سُبْحَانَهٗ لَا سَمِيَّ لَهٗ وَ لَا کُفُوَ لَهٗ وَ لَا نِدَّ لَهٗ ، وَ لَا یُقَاسُ بِخَلْقِهٖ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی .))

''اہل سنت صفات باری تعالیٰ کو مکیف نہیں بتاتے اور نہ وہ اس کی صفات کو اس کی مخلوق کی صفات کی مثل قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی بھی ہم نام نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ہمسر ہے اور نہ ہی اس کا کوئی شریک۔''

اللہ تعالیٰ کی کیفیت

شرح: ...... [وَ لَا یُکَیِّفُوْنَ] ...... قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ کیفیت صفت کے ذکر سے عبارت ہے، وہ ذکر زبان سے ہو یا دل سے، یعنی اہل سنت صفات باری تعالیٰ کی کیفیت کا ذکر نہیں کرتے۔ یعنی وہ یہ نہیں کہتے کہ اس کے ہاتھ کی کیفیت یہ ہے اور اس کے چہرے کی کیفیت یہ ہے، نہ زبان کے ساتھ اور نہ ہی دل کے ساتھ۔

یعنی انسان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ عرش پر کیسے مستوی ہے اور وہ کس طرح اترتا ہے اس کے چہرے کی کیفیت کیا ہے اور اس کے ہاتھ کی کیفیت کیا ہے؟ اور اس کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس کا نتیجہ تمثیل کی صورت میں سامنے آئے گا یا پھر تعطیل کی صورت میں، لہٰذا انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیفیت سے آگاہ ہونے



کی کوشش کرنا بھی جائز نہیں ہے، وہ نہ تو کیفیت استواء کے بارے میں اپنی زبان سے اس کا اظہار کرے اور نہ اس کے بارے میں کسی سے سوال کرے۔ اس لیے کہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔'' مت پوچھیں کہ وہ مستوی کیسے ہے؟ اترتا کیسے ہے؟ اگر آپ یہ کام کریں گے تو بدعتی کہلائیں گے، قبل ازیں تکییف کے حرام ہونے کے سمعی اور عقلی دلائل گزر چکے ہیں۔

اللہ کی تمثیل

[وَلَا يُمَثِّلُوْنَ] ..... یعنی اہل السنہ والجماعہ صفات باری تعالیٰ کو اس کی مخلوق کی صفات کے مماثل قرار نہیں دیتے۔ مؤلف کے گزشتہ قول: "من غیر تمثیل" کا یہی معنی ہے، ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ تمثیل سمعی اور عقلی دلائل کی بناء پر ممنوع ہے۔

اللہ ہر نقص سے پاک ہے

[لِأَنَّهُ سُبْحَانَهُ] ..... (سبحان) سبح سے اسم مصدر ہے، جبکہ مصدر تسبیح ہے۔ پس (سبحان) تسبیح کے معنی میں ہے۔ لیکن غیر لفظی جو چیز بھی مصدر کے معنی پر دلالت کرے وہ اسم مصدر ہوا کرتا ہے۔ جیسے سبح سے سبحان، کلم سے کلام اور سلم سے سلام (سبحان) مفعول مطلق ہے اور مفعولیت مطلقہ کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا عامل ہمیشہ محذوف ہوا کرتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں: (سبح) نَـزّہ کے معنی میں ہے، یہ سبح سے ماخوذ ہے جو کہ بُعد سے عبارت ہے، گویا کہ آپ اللہ تبارک وتعالیٰ سے صفات نقص کو دور کر رہے ہیں۔ پس اللہ ہر نقص سے منزہ ہے۔

اللہ کا کوئی ہم نام نہیں

[لَا سَمِيَّ لَهُ] ..... ''اس کا کوئی ہم نام نہیں۔'' اس کی دلیل یہ ارشاد مبارک ہے:

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّاo﴾(مریم: ٦٥)

''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اس کا جو ان کے درمیان ہے، اس لیے اسی کی عبادت کریں اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہیں کیا تم اس کے کسی ہم نام کو جانتے ہو؟''

(هل) حرف استفہام ہے مگر یہ نفی کے معنی میں ہے۔ صیغہ استفہام کے ساتھ نفی ایک عظیم فائدہ کے لیے آیا کرتی ہے اور وہ ہے: تحدی۔ ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ اور "لا سمی له" میں واضح فرق ہے، اس لیے کہ ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ نفی کے ساتھ ساتھ تحدی کو بھی متضمن ہے۔ جب بھی استفہام نفی کے معنی میں ہوگا اس میں تحدی کے معنی کی آمیزش ہوگی اس بناء پر ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ "لا سمی له" سے زیادہ بلیغ ہے۔ اور سمی، مماثل کے معنی میں ہے۔

اللہ کا کوئی ہمسر نہیں

[وَ لَا كُفُؤَ لَهُ] ..... اور اس کا کوئی ہمسر نہیں، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:



﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص: ٤) ''اور اس کا کوئی بھی ہمسر نہیں ہے۔''

اللہ کا کوئی شریک نہیں

[وَ لَا نِدَّ لَهٗ] ..... ''اور اس کی کوئی نظیر نہیں۔'' اس کی دلیل یہ قرآنی آیت ہے:

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ٢٢)

''اور اللہ کے شریک نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔''

کہ اس کا کوئی شریک نہیں۔ "ند" نظیر کے معنی میں ہے۔

یہ تینوں الفاظ (سمیّ، کفٔ، نِدّ) قریب المعنی ہیں۔

اس نفی سے مقصود صفات باری تعالیٰ کا کمال ہے۔ اس لیے کہ ان کمالی صفات کی وجہ سے ہی سے کوئی اس کے مماثل نہیں ہے۔

اللہ کو کسی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا

[وَ لَا يُقَاسُ بِخَلْقِهٖ سبحانه و تعالىٰ] ..... ''اور اسے اس کی مخلوق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔'' قیاس کی تین قسمیں ہیں: قیاس شمول، قیاس تمثیلی اور قیاس الوہیت۔

۱۔ **قیاس شمول**: ..... ایسا عام لفظ جو اپنے تمام افراد کو شامل ہو، بایں طور کہ اس کا ہر فرد اس لفظ کے مسمی اور معنی میں داخل ہو۔ مثلاً الحیاۃ، اللہ تعالیٰ کی زندگی کو اس کی مخلوق کی زندگی پر اس لیے قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اسم (حیّ) سب شامل ہے۔

۲۔ **قیاس تمثیل**: ..... ایک چیز کو اس کے مثیل کے ساتھ ملانا اور خالق کے لیے ثابت شدہ اشیاء کو مخلوق کے لیے ثابت اشیاء کی مثل قرار دینا۔

۳۔ **قیاس اولویت**: ..... فرع کا اصل سے اولیٰ بالحکم ہونا، علماء فرماتے ہیں کہ: یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں مستعمل ہے۔ اس لیے کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (النحل: ٦٠) ''اور اللہ کے لیے اعلیٰ صفات ثابت ہیں۔''

یعنی ہر صفت کمال سے اللہ تعالیٰ کے لیے صفت اعلیٰ ثابت ہے۔ سمع، بصر، قدرت، حیات، حکمت اور ان جیسی دیگر صفات مخلوقات میں بھی موجود ہیں، مگر اعلیٰ ترین اور کامل ترین صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں۔ ہم اس کے لیے کبھی کبھی قیاس بالاولیٰ کے زاویہ سے دلالت عقلیہ سے استدلال کیا کرتے ہیں۔ مثلاً علو جب مخلوق میں صفت کمال ہے، تو اس کا خالق میں موجود ہونا باب اولیٰ سے ہے، علماء کی گفتگو میں یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے۔

مؤلف کے قول: "و لا یقاس بخلقه" سے مراد وہ قیاس ہے جو مساوات کا متقاضی ہو اور وہ ہے قیاس شمول اور قیاس تمثیل۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے مابین قیاس سے کام لینا منع ہے، اس لیے کہ دونوں کے درمیان تباین ہے، جب ہم احکام میں واجب کو جائز پر یا جائز کو واجب پر قیاس نہیں کرتے تو خالق و مخلوق کے درمیان صفات کے باب میں ایسا کرنا بطریق

اولیٰ جائز نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ اللہ بھی موجود ہے اور انسان بھی موجود ہے، تو قیاس کی رو سے اللہ کا وجود انسان کے وجود جیسا ہی ہوگا۔ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ خالق کا وجود واجب ہے جبکہ انسان کا وجود ممکن۔

اگر وہ یہ کہے کہ میں خالق کی سماعت کو مخلوق کی سماعت پر قیاس کرتا ہوں۔ تو ہم کہیں گے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ خالق کی سماعت اس کے لیے واجب ہے اس میں کوئی نقص نہیں آسکتا اور وہ ہر شے کو شامل ہے۔ جبکہ انسان کی سماعت ممکن ہے، اس لیے کہ وہ بہرہ بھی پیدا ہوسکتا ہے یا زندگی میں کسی وقت بھی اس میں نقص پیدا ہوسکتا ہے اور پھر اس کی سماعت محدود بھی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق پر قیاس کرنا اور اس کی صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان عظیم تباین پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم اتم اور قول سب سے بڑھ کر سچا ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَإِنَّهُ أَعْلَمُ سُبْحَانَهُ بِنَفْسِهِ وَبِغَيْرِهِ ، وَأَصْدَقُ قِيلًا ، وَأَحْسَنُ حَدِيثًا مِنْ خَلْقِهِ .))

''اللہ تعالیٰ تو خود اپنی ذات کے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں بہت زیادہ علم رکھتا ہے، اس کی بات سب سے سچی اور ساری مخلوق سے خوبصورت ہے۔''

شرح: ...... جب کسی خبر میں چار صفات جمع ہو جائیں تو اسے قبول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

وصف اول: ...... اس کا صدور علم سے ہو، مولف نے "فانه اعلم بنفسه ولغيره" کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وصف ثانی: ...... صدق، مولف نے "واصدق قیلا" کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وصف ثالث: ...... بیان وفصاحت، اس کی طرف ان کے اس قول میں اشارہ ہے۔ "واحسن حدیثا"

وصف رابع: ...... قصد وارادہ کی سلامتی، مخبر جن لوگوں کو خبر دے رہا ہے وہ انہیں رشد وہدایت سے نوازنا چاہتا ہو۔

وصف اول یعنی علم کی دلیل یہ قرآنی آیت ہے:

﴿وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (الاسراء: ۵۵)

''اور تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو زمینوں میں ہیں اور جو آسمان میں ہیں اور یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر درجہ دیا ہے۔''

اللہ تبارک اپنے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں بخوبی جانتا ہے وہ تم سے بڑھ کر تمہارا علم رکھتا ہے، وہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے امور سے بھی آگاہ ہے، جب کہ آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کل کیا کچھ کمائیں گے۔

کلمہ (اعلم) اسم تفضیل ہے، بعض علماء اس سے احتراز کرتے ہوئے (اعلم) کی تفسیر ''عالم'' سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآنی آیت:

﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (النحل: ۱۲۵)

''یقیناً تیرا رب وہ خوب جانتا ہے اس کو جو اس کے راستے سے گمراہ ہوگیا اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی۔''

(اعلم) عالم کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ (اعلم) اسم تفضیل ہے جو کہ مفضل اور مفضل علیہ میں اشتراک کا متقاضی ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے جائز نہیں ہے، جبکہ ''عالم'' اسم فاعل ہے، جس میں نہ تو مقارنہ ہے اور نہ ہی تفضیل۔

مگر ان کا یہ موقف غلط ہے۔ ایک تو اس لیے کہ خود اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات کے لیے (اعلم) کی تعبیر اختیار کرتا ہے اور آپ اس کی تفسیر ''عالم'' کے ساتھ کرتے ہیں، دوسرے ہم اس سے اللہ تعالیٰ کے علم کی قدر و منزلت میں کمی کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ (عالم) میں مساوات کے انداز میں غیر اللہ بھی شریک ہیں، جبکہ (اعلم) کا مقتضٰی یہ ہے کہ علم میں کوئی بھی اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ وہ ہر عالم سے بڑھ کر عالم ہے۔ اس سے صفت علم کی اکملیت کا اظہار ہوتا ہے۔

نیز عربی زبان اسم فاعل کی نسبت سے وصف میں مساوات سے نہیں روکتی، جبکہ اسم تفضیل کے حوالے سے وہ اس کی دلالت میں مشارکت سے روکتی ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ اسم تفضیل کو اس صورت میں بھی لایا جا سکتا ہے جب مفضل علیہ میں وہ معنی سرے سے پایا ہی نہ جاتا ہو۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا﴾ (الفرقان: ۲۴)

''جنت والے اس دن بہت اچھے ٹھکانے والے اور بڑی اچھی آرام گاہ والے ہوں گے۔''

اس جگہ اسم تفضیل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ مفضل علیہ میں یہ معنی سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔

اسی طرح مد مقابل سے مجادلہ کے وقت بھی اسم تفضیل کا استعمال جائز ہے اگرچہ مفضل علیہ میں اس معنی کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿آللَّهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (النمل: ۵۹) ''کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو انہوں نے اس کا شریک بنا رکھا ہے۔'' سبھی کے علم میں ہے کہ جن کو انہوں نے شریک بنا رکھا ہے ان میں خیر کا وجود تک بھی موجود نہیں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿ءَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (یوسف: ۳۹)

''کیا جدا جدا رب بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست ہی؟''

حالانکہ ارباب من دون اللہ خیر سے تہی دامن ہوتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ کتاب اللہ میں وارد کلمہ (اعلم) سے اس کا حقیقی معنی مراد ہے۔ اس کی (عالم) کے ساتھ تفسیر کرنا معنی

کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور لغت کے اعتبار سے بھی۔

وصف ثانی:...... یعنی صدق کی دلیل یہ فرمان ربانی ہے:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (النساء: ۱۲۲) ''اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے۔''

یعنی اللہ سے سچا کوئی نہیں ہے۔ صدق کا مطلب ہے: کلام کا واقع کے مطابق ہونا۔ کوئی بھی کلام واقع کے ساتھ اس طرح مطابقت نہیں رکھتا جس طرح کہ کلام اللہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی بتایا وہ مبنی بر صداقت ہے، بلکہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت ہے۔

وصف ثالث:...... یعنی بیان وفصاحت کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء: ۸۷) ''اور اللہ کی نسبت بات میں کون سچا ہے۔''

اور...... ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾ (الزمر: ۲۳) ''اللہ نے انتہائی خوبصورت بات اتاری۔''

اللہ تعالیٰ کی بات کا حسن، لفظی اور معنوی حسن کو متضمن ہے۔

وصف رابع: قصد وارادہ کی سلامتی کی دلیل ہے:

﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ (النساء: ۱۷۶)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو۔''

نیز...... ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (النساء: ۲۶)

''اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (احکام) کھول کر بیان کردے اور تمہاری ان لوگوں کے طریقوں کی طرف راہنمائی کرے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔''

اس طرح کلام اللہ میں وہ چاروں اوصاف جمع ہو گئے جو قبول خبر کو واجب قرار دیتے ہیں۔

پھر جب صورت حال یہ ہے تو پھر یہ امر ضروری قرار پاتا ہے کہ اس کے کلام کو اس کے اصل مفہوم کے ساتھ قبول کیا جائے اور اس کے مدلول کے بارے میں ہمارے ذہن میں کوئی شک پیدا نہ ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلام کا تکلم لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ احکام کے بخوبی اظہار اور مخلوق کی رشد وہدایت کے لیے فرمایا ہے۔ پھر چونکہ یہ کلام اعلم القائلین کی طرف سے صادر ہوا ہے۔ لہٰذا اس میں خلاف صدق کسی بات کا پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا غیر فصیح اور معیوب ہونا ممکن ہے اگر تمام جن وانس مل کر بھی اس جیسا کلام لانا چاہیں تو یہ ان کی استطاعت میں نہیں ہوگا۔ جب کلام میں مذکورہ بالا چار امور جمع ہو جائیں تو مخاطب پر اس کی دلالت کو قبول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (صٓ: ۷۵)

''تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس نے روکا، جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔''



اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے لیے دو ہاتھوں کا اثبات ہو رہا ہے، جن کے ساتھ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے، تو ہم بھی اس کے لیے ان کا اثبات کریں گے، اس لیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو کہ علم اور صدق سے صادر ہوا ہے، اللہ کا کلام، ہر کلام سے خوبصورت، فصیح اور واضح ہے، لہٰذا اس کے لیے دو ہاتھوں کا نہ ہونا غیر ممکن ہے، مگر اکثر لوگ یہی اعتقاد رکھتے ہیں، اب اگر ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معاذ اللہ قرآن گمراہی ہے، کہ وہ اللہ کا ایسا وصف بیان کرتا ہے جو اس میں موجود ہی نہیں ہے، مگر یہ ممتنع ہے، جب صورت حال یہ ہے تو پھر آپ کے لیے اس بات پر ایمان رکھنا ضروری ٹھہرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں جن کے ساتھ اس نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ ہاتھوں سے مراد نعمت یا قدرت ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ دو ہاتھوں سے یہ معنی مراد لینا ممکن ہی نہیں، الا یہ کہ آپ اپنے رب کے خلاف جرأت کا مظاہرہ کریں اور اس کے کلام کو ہمارے ذکر کردہ اوصاف اربعہ کی ضد کے ساتھ موصوف ٹھہرائیں۔ اس شخص سے ہمارا سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے: (بیدیّ) کا لفظ استعمال فرمایا، تو کیا اسے اپنے دونوں ہاتھوں کا علم تھا؟ اگر وہ اس کا جواب اثبات میں دے تو اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا وہ اپنے اس قول میں صادق ہے؟ اگر وہ یہ کہے کہ ہاں وہ بلا شک صادق ہے اور وہ اسے غیر عالم اور غیر صادق کہنے کی جرأت نہ کر سکے، اور نہ ہی وہ یہ کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ نے دو ہاتھوں کی تعبیر اختیار کی ہے وہ کہنا تو کچھ چاہتا تھا مگر وہ کچھ کہنے سے بے بس ہو گیا، اور وہ نہ ہی یہ کہہ سکتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو گمراہ کرنے کی غرض سے ان سے یہ چاہا کہ وہ ان صفات پر ایمان لائیں جو اس میں موجود ہی نہیں ہیں۔ جب وہ ان باتوں میں سے کوئی بھی بات کرنے سے قاصر ہے تو ہم اس سے یہ سوال کریں گے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ کے لیے دو ہاتھ ثابت کرنے سے روک رہی ہے؟ اپنے رب سے معافی مانگیں، اس کے سامنے توبہ کریں اور یوں کہیں: میں اس چیز پر ایمان لایا جس کی اس نے اپنی ذات کے بارے میں خبر دی، اس لیے کہ وہ اپنے اور دوسروں کے بارے میں بہتر جانتا ہے، اس کی بات سب سے سچی اور خوبصورت ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے تین اوصاف کا ذکر کیا ہے جبکہ ہم نے اپنی طرف سے چوتھے وصف کا اضافہ کر دیا اور وہ ہے لوگوں کے سامنے حق واضح کرنا اور ان کے لیے ہدایت کا ارادہ کرنا۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾ (النساء: ٢٦)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے (احکام) واضح کرنا چاہتا ہے اور تمہاری ان لوگوں کے طریقوں کی طرف راہنمائی کرنا چاہتا ہے جو تم سے پہلے ہو گزرے۔''

اللہ تعالیٰ کے تمام رسول صادق و مصدوق ہیں

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثُمَّ رُسُلُهُ صَادِقُوْنَ مُصْدُوْقُوْنَ ؛ بِخِلَافِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ عَلَيْهِ مَا لَا يَعْلَمُوْنَ .))



''پھر اس کے رسول صادق ومصدوق ہیں، بخلاف ان لوگوں کے جو اس کے بارے میں بغیر علم کے بات کرتے ہیں۔''

شرح:......[ثُمَّ رُسُلُهُ صَادِقُوْنَ مُصْدُوْقُوْنَ] ...... [1] الصادق: واقع کے مطابق خبر دینے والا، تمام رسول ہر اس چیز میں صادق ہوتے ہیں جس کی وہ خبر دیتے ہیں، مگر اس خبر کا رسول سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہونا ضروری ہے۔ جب کوئی نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کوئی بات منسوب کرے تو یہ بات صرف اسی صورت میں قابل قبول ہوگی کہ وہ صحیح سند کے ساتھ حضرت عیسیٰ سے ثابت ہو جائے۔ جب کوئی یہودی یہ دعویٰ کرے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کچھ فرمایا، تو اس کا یہ دعویٰ صرف اس وقت قابل تسلیم ہوگا جب ہمیں اس بات کا علم ہوگا کہ یہ بات صحیح سند کے ساتھ آپ سے ثابت ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی بات منسوب کرے تو اسے بھی اس صورت قبول کیا جائے گا جب وہ بسند صحیح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے۔

تمام رسولوں کی باتیں مبنی برصداقت ہوا کرتی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا اس کی مخلوق کی طرف سے جو بھی خبر فراہم کرتے ہیں، اس میں صادق ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھی کذب بیانی سے کام نہیں لیتے۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کذب بیانی سے معصوم ہوتے ہیں۔

''مصدوقون'' یا ''مصدقون'' دو نسخے ہیں۔

''مصدوقون'' کی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان کی طرف جو بھی وحی کی گئی وہ صدق ہے۔ المصدوق: جسے سچی خبر دی گئی، الصادق . صدق کے ساتھ آنے والا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے شیطان کے بارے میں یہ فرمانا: ''صدقك وهو كذوب'' یعنی شیطان اگرچہ جھوٹا ہے مگر اس نے تجھے سچی خبر دی۔'' اسی قبیل سے ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب شیطان نے ان سے کہا کہ اگر تم آیت الکرسی پڑھ لو گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگہبان تمہارے ساتھ رہے گا، اور شیطان صبح تک تمہارے قریب بھی نہیں آئے گا۔ رسولوں کی طرف جو بھی وحی آتی ہے وہ سراسر صدق ہوتی ہے، نہ تو انہیں رسول بنا کر بھیجنے والا ان کی تکذیب کرتا ہے اور نہ جبرئیل جسے ان کی طرف بھیجا جاتا ہے:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝﴾

(التکویر: ۱۹۔ ۲۱)

''یقیناً یہ قول ہے فرشتے عالی مرتبت کا، جو صاحب قوت ہے عرش والے کے پاس، اونچے درجے والا ہے، اس کی بات مانی جاتی ہے، وہاں امانت دار بھی ہے۔''

اگر ''مصدقون'' ہو، تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ لوگوں پر ان کی تصدیق کرنا شرعاً واجب ہے، اور ان کی تکذیب کرنے والا کافر ہے۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصدیق فرمائی ہے، سبھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول سے بھی رسولوں کی تصدیق فرمائی اور اپنے فعل سے بھی۔

[1] ایک نسخہ میں ''مصدقون'' ہے۔



جہاں تک قول سے رسولوں کی تصدیق کرنے کا تعلق ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ سے فرمایا:

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ﴾ (النساء: ١٦٦)

''اللہ اس چیز کی گواہی دیتا ہے جو اس نے آپ کی طرف اتاری۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ﴾ (المنافقون: ١) ''اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اس کے رسول ہیں۔''

یہ تصدیق بالقول ہے۔

رہی تصدیق بالفعل، تو یہ اس کی تمکین اور اظہار آیات کی صورت میں ہوتا ہے۔ رسول لوگوں کے پاس آتا اور انہیں اسلام کی دعوت دیتا ہے، اگر وہ اسے قبول کرلیں تو بہت خوب، بصورت دیگر ان پر جزیہ عائد ہوتا ہے، اس کے لیے ان کے خون، عورتیں اور اموال مباح قرار پاتے ہیں، اسے تمکین فی الارض سے نوازا جاتا ہے اور اس کے لیے زمین میں فتوحات کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا پیغام زمین کے شرق وغرب میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ تصدیق بالفعل کے چند مظاہر ہیں۔ تصدیق بالفعل کے زمرے میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر آیات شرعیہ اور آیات کونیہ کا اجراء فرما دیتا ہے۔ جب اس سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے جو اس کے علم میں نہ ہو تو وہ خود اس کا جواب دے دیا کرتا ہے:

﴿وَيَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ [1] (الاسراء: ٨٥)

''آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔''

اللہ کا یہ فرمان آپ کے رسول ہونے کی تصدیق کرتا ہے، اگر آپ رسول نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ اس سوال کا جواب نہ دیتا۔ اسی طرح فرمایا گیا:

﴿يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ: ٢١٧)

''وہ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس میں لڑنا کیسا ہے؟ آپ فرما دیں کہ اس میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے، جبکہ اللہ کے راستہ سے روکنا، اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا، اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق کا یہ بھی ایک انداز ہے۔

رہی آیات کونیہ، تو ان کا معاملہ تو بالکل ظاہر ہے، ایسی آیات کونیہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] صحیح بخاری: ٤٧٢١ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا، ادھر سے یہودیوں کا گزر ہوا تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ان سے روح کے بارے میں سوال کرو، پھر جب انہوں نے آپ سے اس کے بارے میں سوال کیا تو آپ خاموش ہو گئے اور انہیں کوئی جواب نہ دیا، اس دوران مجھے معلوم ہوا کہ آپ پر وحی کا نزول ہو رہا ہے، چنانچہ میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا، جب وحی اتر چکی تو آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

اپنے رسول ﷺ کی تائید فرمائی جو کہ سیرت کا ایک معروف باب ہے۔

لفظ "مصدقون" سے ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ان کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیات کونیہ وشرعیہ کے ساتھ تصدیق کی جاتی ہے اور مخلوقات کی طرف سے بھی ان کی تصدیق کیا جانا واجب ہے، ہم نے اسے شرعاً تصدیق پر اس لیے محمول کیا ہے کہ کچھ لوگ تصدیق کرتے ہیں۔ جبکہ کچھ تصدیق نہیں بھی کرتے، لیکن ان کی تصدیق کرنا امر واجب ہے۔

[بِخِلَافِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ عَلَيْهِ مَا لَا يَعْلَمُوْنَ] ...... اور یہ لوگ جھوٹے یا گمراہ ہیں، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا انہیں علم ہی نہیں۔ اس سے مؤلف اہل تحریف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، یہ لوگ دو طرح سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں لاعلمی پر مبنی باتیں کرتے ہیں، اپنی طرف سے یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس سے اللہ کا یہ ارادہ نہیں، بلکہ یہ ہے۔ پھر سلب وایجاب کے بارے میں وہ کچھ کہنا جس کا ان کے پاس علم نہیں ہے۔

مثلاً ان کا یہ کہنا کہ چہرے سے مراد حقیقی چہرہ نہیں بلکہ اس سے مراد اجر وثواب ہے، اس طرح انہوں نے سلب وایجاب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ بات کہہ ڈالی جس کا انہیں علم ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں لاعلمی پر مبنی باتیں کرنے والے نہ تو صادق ومصدوق ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مصدقین۔ بلکہ دلائل کی رو سے ثابت ہے کہ یہ لوگ کاذب مکذوب اور شیطانی وحی کے پیروکار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ کی وضاحت

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلِهٰذَا قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى : ﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾ (الصافات: ۱۸۰۔ ۱۸۲)......))

"پاک ہے تیرا رب، عزت کا رب اس سے جو یہ بیان کرتے ہیں، اور سلام ہو رسولوں پر، اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا رب ہے۔"

شرح: ...... [وَلِهٰذَا] یعنی: چونکہ اس کا اپنا کلام اور اس کے رسولوں کا کلام کمال کے ساتھ متصف ہے۔

[سُبْحٰنَ رَبِّكَ] ...... قبل ازیں تسبیح کا معنی بیان کیا جا چکا ہے، اور وہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر اس چیز سے منزہ قرار دینا جو اس کے شایان نہیں ہے۔

[رَبِّكَ] ...... محمد ﷺ کی طرف ربوبیت کی اضافت کرنا، خالق کی مخلوق کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے اور یہ ربوبیت خاصہ ہے۔

[رَبِّ الْعِزَّةِ] ...... یہ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے باب سے ہے۔ اور یہ بات معروف ہے کہ ہر مربوب مخلوق ہے مگر اللہ کی عزت غیر مخلوق ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کی صفت ہے۔ اس بنا پر "رَبِّ الْعِزَّةِ" کا معنی ہوگا: صاحب عزت۔ کہا

جاتا ہے: رب الدار، یعنی صاحب دار (گھر والا)

[عَمَّا يَصِفُوْنَ] ..... یعنی اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے منزہ ہے جو مشرک بیان کرتے ہیں، جیسا کہ آگے چل کر مؤلف اس کا ذکر کریں گے۔

[وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ] ..... یعنی رسولوں پر سلام ہو۔

[وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ] ..... اللہ تعالیٰ نے اپنی تنزیہ بیان کرنے کے بعد اپنی حمد بیان فرمائی، اس لیے کہ حمد میں کمال صفات ہے اور تسبیح میں تنزيه عن العيوب . آیت میں ان دونوں چیزوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مخالفین کی بیان کردہ صفات سے پاک ہونا اور رسولوں پر سلامتی بھیجنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَسَبَّحَ نَفْسَهُ عَمَّا وَصَفَهُ بِهِ الْمُخَالِفُوْنَ لِلرُّسُلِ، وَسَلَّمَ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ لِسَلَامَةِ مَا قَالُوْهُ مِنَ النَّقْصِ وَالْعَيْبِ .))

''اللہ رب العزت نے اپنی ذات کو ان باتوں سے منزہ فرمایا جو اس کے رسولوں کے مخالفین اس کے بارے میں کیا کرتے ہیں اور رسولوں پر سلام بھیجا اس لیے کہ ان کی باتیں نقص وعیب سے محفوظ ہوتی ہیں۔''

شرح: ..... اس جملہ کا مفہوم ومعنی بالکل واضح ہے، اب صرف یہ کہنا باقی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے کمال کی وجہ سے اپنی ذات کی تعریف فرمائی، اس لیے کہ وہ کمال صفات کی وجہ سے اور انبیاء ورسل کے بھیجنے کی وجہ سے لائق تعریف ہے، جو کہ مخلوق پر اس کی رحمت بھی ہے اور اس کا احسان بھی۔

نفی اور اثبات کا اسماء وصفات میں جمع ہونا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ سُبْحَانَهُ قَدْ جَمَعَ فِيْمَا وَصَفَ وَسَمَّى بِهِ نَفْسَهُ بَيْنَ النَّفْيِ وَالْإِثْبَاتِ .))

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اوصاف اور اسماء بیان کرتے ہوئے نفی واثبات کو جمع کر دیا ہے۔''

شرح: ..... مؤلف نے اس جملہ میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اوصاف اور اسماء بیان کرتے ہوئے نفی اور اثبات کو جمع فرما دیا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ تمام کمال کا اظہار صرف اسی صورت ہی ممکن ہے جب صفات کمال کا اثبات ہو اور ان سے متضاد صفات نقص کا انتفاء۔ مؤلف رحمہ اللہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ صفات کی دو قسمیں ہیں:

صفات کی قسمیں

۱۔ **صفات مثبتہ**: انہیں صفات ثبوتیہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔



۲۔ **صفات منفیہ**: انہیں صفات سلبیہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، جو کہ سلب بمعنی نفی سے ماخوذ ہے، انہیں صفات سلبیہ کا نام دینے میں ہمارے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ بعض لوگ انہیں یہ نام دینے سے گریز کرتے اور صفات منفیہ کے نام پر اصرار کرتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک چونکہ سلب، نفی کے معنی میں مستعمل ہے لہٰذا یہ ایک لفظی اختلاف ہے جو کہ ضرررساں نہیں ہے۔

الغرض! صفات باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں: ثبوتیہ اور سلبیہ اگر آپ چاہیں تو انہیں مثبتہ اور منفیہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

صفات مثبتہ وہ تمام صفات جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے اثبات کیا ہے، جو کہ تمام کی تمام صفات کمال ہیں اور ان میں کسی بھی وجہ سے کوئی نقص نہیں ہے۔ اور ان کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا تمثیل پر دلالت کرنا ناممکن ہے اس لیے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ مماثلت نقص ہے۔

جب ہم یہ قاعدہ سمجھ گئے تو اس سے ہم اہل تحریف کی گمراہی سے بھی آگاہ ہو گئے، جن کا خیال ہے کہ صفات مشبہ تمثیل کو مستلزم ہیں اور پھر تمثیل سے راہ فرار اختیار ہوئے ان کی نفی کرنے لگے۔

مثلاً، انہوں نے کہا: اگر ہم اللہ کے لیے چہرے کا اثبات کریں تو اس سے اس کی مخلوق کے ساتھ مماثلت لازم آئے گی۔ لہٰذا اس کے معنی کی تاویل حقیقی چہرے سے نہیں بلکہ کسی اور معنی سے کرنی واجب ہوگی۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے جن صفات کا اثبات کیا ہے، وہ صفات کمال ہیں اور جن صفات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خود ثابت کیا ہو ان میں نقص کا در کر آنا ممکن نہیں ہے۔

سوال: کیا اسماء کی طرح صفات بھی توقیفی ہیں یا اس معنی میں اجتہادی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی چیز کے ساتھ موصوف قرار دے سکتے ہیں جس کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو موصوف نہیں کیا؟

جواب: اہل علم کے نزدیک صفات کا اسماء کی طرح توقیفی ہونا مشہور ہے، لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کو انہی اوصاف کے ساتھ موصوف قرار دے سکتے ہیں جن کے ساتھ خود اس نے اپنی ذات کو موصوف کیا ہو۔

دریں حالات یہ کہا جائے گا کہ صفات کی تین قسمیں ہیں: صفت کمال مطلق، صفت کمال مقید اور صفت نقص مطلق۔

جہاں تک علی الاطلاق صفات کمال کا تعلق ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں، مثلاً متکلم، قادر، فعال لما یرید...... اور ان جیسی دیگر صفات۔

رہیں صفات کمال مقید، تو ان کے ساتھ اللہ کا وصف علی الاطلاق نہیں بلکہ مقیداً بیان کیا جا سکتا ہے، مثلاً مکر، خداع اور استہزاء...... اور ان جیسی دیگر صفات، تو یہ مقیداً صفات کمال ہیں۔ اگر ان کا اظہار اس قسم کے کام کرنے والوں کے مقابلہ میں ہو تو صفات کمال ہیں اور اگر ان کا ذکر مطلقاً ہو تو پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہم تقییداً یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ مکر کرنے والوں کے ساتھ مکر کرتا ہے، منافقوں کا مذاق اڑاتا ہے، منافقوں کو دھوکا دیتا ہے...... اس لیے کہ یہ مقیداً ہی وارد ہوئی ہیں۔ مگر ہم اسے علی الاطلاق مکر کرنے والا، مذاق اڑانے والا، یا دھوکا دینے والا نہیں کہہ سکتے۔ جہاں تک صفات نقص

علی الاطلاق کا تعلق ہے، تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کسی بھی حالت میں وصف بیان نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ العاجز، الخائن، الاعمی اور الاصم وغیرھا ان کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کو موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ خادع اور خائن میں فرق ملاحظہ فرمائیں:

﴿ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (النساء: ۱٤۲)

''یقیناً منافق اللہ کو دھوکا دیتے ہیں جبکہ وہ انہیں دھوکا دینے والا ہے۔''

اس جگہ اس نے اس امر کا اثبات کیا کہ وہ دھوکا دینے والوں کو دھوکا دیتا ہے۔ مگر خیانت کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ﴾ (الانفال: ۷۱)

''اور اگر وہ تمہاری خیانت کرنا چاہیں تو وہ اس سے قبل اللہ کی خیانت کر چکے ہیں۔ پس اللہ نے انہیں آپ کے قابو میں دے دیا۔''

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس نے ان کی خیانت کی، اس لیے کہ مقام ائتمان میں خیانت دھوکا دہی کے زمرے میں آتی ہے جو کہ نقص ہے اور اس میں مدح کا کوئی بھی پہلو موجود نہیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ سے صفات نقص مطلقاً منفی ہیں۔

اسماء سے ماخوذ صفات ہر حالت میں صفات کمال ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے مدلول کے ساتھ متصف ہے، سمع صفت کمال ہے جس پر اس کا اسم سمیع دلالت کرتا ہے۔ ہر وہ صفت جس پر اسماء دلالت کرتے ہیں صفت کمال ہے اور وہ اللہ کے لیے علی الاطلاق ثابت ہے۔ ہم اس کو ایک الگ قسم قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ اس میں تفصیل نہیں پائی جاتی، جبکہ دیگر صفات تین قسموں میں منقسم ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو متکلم کے نام سے موسوم نہیں کیا۔ حالانکہ وہ کلام کرتا ہے، اس لیے کہ کلام اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی، اور کبھی نہ اچھی ہوتی ہے اور نہ بری۔ جبکہ برائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح لغو کو بھی، اس لیے کہ وہ سفاہت ہے۔ اس کی طرف صرف خیر کو ہی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو متکلم کے ساتھ موسوم نہیں کیا، اسماء اسی طرح ہیں جس طرح اللہ نے انہیں بیان کیا:

﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ''اور اللہ کے لیے اچھے اچھے نام ہیں۔''

ان میں کسی طرح کا بھی نقص موجود نہیں ہے۔ ان کے لیے اسم تفضیل مطلق کا استعمال بھی اسی لیے ہی کیا گیا ہے۔

سوال: ہم صفات اور اقسام صفات سے آگاہ ہو چکے، لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ تمام صفات توقیفی ہیں تو پھر اثبات صفت کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: اثبات صفت کے متعدد طریقے ہیں:

طریق اول:...... ان پر اسماء کا دلالت کرنا، اس لیے کہ ہر اسم صفت کو متضمن ہوا کرتا ہے ہم نے گزشتہ سطور میں لکھا تھا، اللہ تعالیٰ کا ہر اسم اس کی ذات اور اس صفت پر دلالت کرتا ہے جس سے وہ مشتق ہے۔

طریق ثانی:...... وہ نص سے ثابت ہو۔ مثلاً چہرہ، دو ہاتھ اور دو آنکھیں...... یہ صفات نص قرآنی سے ثابت ہیں۔



انتقام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ﴾ (ابراھیم: ٤٧) ''یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا غالب انتقام لینے والا ہے۔''

جبکہ منتقم اللہ تعالیٰ کا نام نہیں ہے، اس لیے کہ انتقام یا تو وصف کے طور پر استعمال ہوا ہے، یا اسم فاعل مقید کے طور پر، مثلاً:

﴿اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ﴾ (السجدہ: ٢٢) ''بے شک ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔''

البتہ جن بعض کتابوں میں اسماء باری تعالیٰ کو شمار کیا گیا ہے ان میں اسے اس کے نام کے طور پر گنوایا گیا ہے۔

طریق ثالث:...... اسے فعل سے اخذ کیا جائے، مثلاً: ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء: ١٦٤) ''اور اللہ نے موسیٰ سے صاف صاف کلام کی۔'' سے اسم ''متکلم'' اخذ کر لیا جائے۔''

یہ وہ مختلف طریقے ہیں جن سے ہم صفات کا اثبات کر سکتے ہیں اور اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ صفات اسماء سے عام ہیں، اس لیے کہ ہر اسم صفت کو متضمن ہوتا ہے مگر ہر صفت اسم کو متضمن نہیں ہوتی۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ سے صفات منفیہ کا تعلق ہے تو ان کی تعداد کافی زیادہ ہے مگر صفات مثبہ ان سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ اس لیے کہ ساری کی ساری صفات اثبات، صفات کمال ہیں۔ ان میں جس قدر تعدد اور تنوع آئے گا اس سے کہیں زیادہ موصوف کے کمال کا اظہار ہوتا چلے جائے گا۔

چونکہ صفات منفیہ ان سے کم ہیں لہٰذا وہ اکثر اوقات عام انداز میں وارد ہوئی ہیں انہیں کسی معین صفت کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا اور اگر اسے کسی ایسی صفت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے تو ایسا کسی سبب کی وجہ سے ہوا ہے مثلاً بعض لوگوں کے اس دعویٰ کی تکذیب کرنا کہ اللہ اس صفت سے متصف ہے جس کی اس نے اپنی ذات سے نفی کی ہے۔

نفی صفات کی قسم اوّل:...... عامہ، اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ: ١١)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

یعنی اس کے علم، قدرت، سمع، بصر، عزت، حکمت، رحمت...... میں کوئی بھی چیز اس جیسی نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان امور کو تفصیلاً بیان نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کہ کوئی بھی چیز اس جیسی نہیں ہے، یہ مجمل اور عام نفی کمال مطلق پر دلالت کرتی ہے۔ مگر جب اس کی تفصیل بیان کی جائے تو یہ تفصیل کسی سبب کی وجہ سے فراہم کی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ﴾ (المومنون: ٩١) ''اللہ نے کوئی اولاد نہیں اپنائی۔''

اس سے ان لوگوں کی تردید کرنا مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ (الاخلاص: ٣) ''نہ اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔''

نیز...... ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ (ق: ٣٨) ''یقیناً

ہم نے آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پیدا کیے ہیں اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔“

یہ تفصیل اس لیے فراہم کی گئی کہ جو ذہن کما حقہ اللہ تعالیٰ کا قدر شناس نہیں ہے وہ یہ فرض کر سکتا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا تو وہ یقیناً تھک گیا ہوگا، لہٰذا اس کی تردید کرنے کی غرض سے فرمایا گیا کہ:

”ہمیں اس سے کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی۔“

اس سے یہ امر بین ہوگیا کہ نفی صفات باری تعالیٰ میں علی سبیل العموم وارد ہوتی ہے اور اگر علی سبیل الخصوص وارد ہو تو ایسا کسی سبب کی وجہ سے ہوگا اس لیے کہ صفات سلب، کمال کو اسی صورت متضمن ہوتی ہیں جب وہ اثبات پر مشتمل ہوں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں: وہ صفات سلبیہ جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے نفی کی ہے۔ وہ اپنی ضد کے کمال کے ثبوت پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لہٰذا ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ (ق : ۳۸) کمال قوت وقدرت کو متضمن ہے۔

﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (الكهف : ۴۹) ”اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔“

کمال عدل کو اور ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (البقرة : ۸۵) ”اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔“

کمال علم واحاطہ کو متضمن ہے، الغرض منفی صفت کا ثبوت پر مشتمل ہونا ضروری ہے جو کہ منفی کی ضد کا کمال ہوا کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس میں مدح کا کوئی پہلو بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے نفی کردہ صفات میں مجرد نفی نہیں پائی جاتی، اس لیے کہ مجرد نفی عدم ہوا کرتی ہے اور عدم کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ وہ نہ تو مدح کو متضمن ہوتی ہے اور نہ ثناء کو، عدم کبھی کبھار صفت کے حصول سے بے بسی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جو کہ محض مذمت ہے اور کبھی عدم قابلیت کی وجہ سے جو نہ مدح ہے نہ مذمت۔

پہلے کی مثال شاعر کا یہ قول ہے:❶

قُبَيِّلَةٌ لَا يَغْدِرُوْنَ بِذِمَّةٍ وَلَا يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ حَبَّةَ خَرْدَلِ

”وہ ایک حقیر سا قبیلہ ہے جس کے لوگ عہد شکنی نہیں کرتے اور نہ ہی ذرہ بھر کسی پر ظلم کرتے ہیں۔“

اور دوسرے کی مثال جو کہ عدم قابلیت کے لیے ہے، کسی کا یہ قول ہے:

((ان جدارنا لا يظلم احدا.)) ”ہماری دیوار کسی پر ظلم نہیں کرتی۔“

اللہ تعالیٰ نے جن صفات کو اپنے لیے ثابت کیا ہے یا ان کی نفی کی ہے تو ان کے حوالے سے ہم پر یہ کہنا واجب ہے کہ ہم نے سن لیا، ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

صفات کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان میں مثبت بھی ہیں اور منفی بھی۔ رہے اسماء تو وہ سارے کے سارے مثبت ہیں مگر ان مثبت اسماء میں سے کچھ تو ایجابی معنی پر دلالت کرتے ہیں اور کچھ سلبی معنی پر۔ ایجابی مدلول والے اسماء کی مثالیں تو کثیر ہیں جبکہ سلبی مدلول کی مثال ہے۔

---

❶ اس کے قائل کا نام قیس بن عمرو حارث ہے۔ "الشعر والشعراء" ۱/ ۲۸۸.



السّلام علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے: ہر نقص وعیب سے سالم یعنی اس میں نہ کوئی نقص ہے اور نہ کوئی عیب۔

اس طرح مؤلف رحمہ اللہ کی عبارت سلیم اور صحیح قرار پاتی ہے، وہ اسماء باری تعالیٰ کی نسبت سے یہ نہیں کہنا چاہتے کہ ان میں سے بعض اسماء منفی ہیں، اس لیے کہ منفی اسم اللہ کا اسم نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اسماء اللہ کے مدلولات ثبوتی بھی ہیں اور سلبی بھی۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَلَا عُدُوْلَ لِأَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ عَمَّا جَاءَ بِهِ الْمُرْسَلُوْنَ ؛ فَإِنَّهُ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ .))

''اہل سنت مرسلین کی تعلیمات سے انحراف نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ صراط مستقیم ہے، ان لوگوں کا صراط (راستہ) جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، اور نیکوکار لوگوں کا راستہ۔''

عُدُوْلَ کا معنی

شرح:......[فَلَا عُدُوْلَ لِأَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ عَمَّا جَاءَ بِهِ الْمُرْسَلُوْنَ] ..... العدول ، بمعنی انصراف وانحراف، اہل سنت کے لیے انبیاء ورسل کی تعلیمات سے انحراف کرنا ممکن نہیں ہے۔

مؤلف نفی کا یہ اسلوب اختیار کر کے اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اہل سنت کے لیے ان کی کمال درجے کی اتباع کی وجہ سے رسولوں کی تعلیمات سے روگردانی اختیار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

انبیاء کا اللہ کے بارے میں خبر دینا اور ان پر ایمان لانا واجب ہے

پیغمبران جو کچھ بھی لے کر آئے وہ اسے مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں اور کسی بھی صورت اس سے انحراف نہیں کرتے، بلکہ وہ احکام کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ: ہم نے انہیں سنا اور تسلیم کیا اور اخبار کے بارے میں کہتے ہیں: ہم نے سنا اور تصدیق کی۔

عَمَّا جَاءَ بِهِ الْمُرْسَلُوْنَ نبی کریم ﷺ جو کچھ لے کر آئے اس سے انحراف کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، سب لوگوں پر آپ کی اتباع کرنا واجب ہے، لیکن آپ کے علاوہ دوسرے رسولوں کی طرف سے جو کچھ آیا، تو اہل سنت کے لیے اس سے انحراف کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان سے اخبار کے باب میں جو کچھ منقول ہوا تو وہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ وہ صادق ہیں، اور وہ منسوخ بھی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ خبر ہے۔ لہٰذا انبیاء ورسل نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی بتایا وہ مقبول ہوگا اور اس پر ایمان لانا واجب ہوگا۔ مثلاً جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ﴿فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی٥﴾ (طٰهٰ: ٥١) ''قرون اولیٰ کا کیا حال ہوا؟''

تو انہوں نے فرمایا:



﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾ (طٰہٰ: ۵۲)

''ان کا علم کتاب میں میرے رب کے پاس ہے، میرا رب نہ چوکتا ہے اور بھولتا ہے۔''

انہوں نے یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے جہل اور نسیان کی نفی فرما دی، لہٰذا اس کی تصدیق کرنا ہم پر واجب ہے۔ اس لیے کہ اس بات کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے، اس سے قبل ارشاد ہوا:

﴿قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (طٰہٰ: ۴۹۔۵۰)

''اس نے کہا: اے موسیٰ! تمہارا رب کون ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی شکل وصورت دی پھر اسے راہ دکھائی۔''

سوال: ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت دی اور پھر اسے راہ دکھائی؟

جواب: ہمیں اس کا علم موسیٰ علیہ السلام کی کلام سے ہوا۔ لہٰذا ہم اس پر ایمان رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وہ شکل وصورت دی جو اس کے لائق تھی۔ انسان، اونٹ، گائے اور بھیڑ کی اپنی اپنی شکل وصورت ہے، پھر ہر مخلوق کو اس کی مصالح اور منافع کی راہ دکھائی، چیونٹیاں موسم گرما کے ایام میں اپنی خوراک اپنی بلوں میں جمع کر لیتی ہیں، مگر دانوں کو اسی حالت میں نہیں بلکہ ان کے سر توڑ کر ذخیرہ کرتی ہیں تاکہ وہ اگ نہ سکیں، کیونکہ اگنے کی صورت میں یہ خوراک خراب ہو جاتی ہے، پھر جب بارش کے دوران ان دانوں میں نمی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ انہیں تعفن سے بچانے کے لیے بلوں سے نکال کر دھوپ میں بکھیر دیتی ہے اور خشک ہونے پر انہیں دوبارہ بلوں کے اندر لے جاتی ہے۔

سابقہ رسول کے احکام میں فرق ہونے میں علماء کا اختلاف

چونکہ انبیائے سابقین کی طرف منسوب چیزوں میں کذب کا امکان ہے، لہٰذا ان کی صحت کا یقین کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی طرف کئی باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ مؤلف کا قول: "عما جاء به المرسلون" احکام پر بھی مشتمل ہے یا چونکہ گفتگو صفات کے حوالے سے ہو رہی ہے، لہٰذا یہ اخبار کے ساتھ مختص ہے؟

اگر عموم لفظ کی طرف دیکھا جائے تو یہ جملہ اخبار واحکام دونوں کا احاطہ کرتا ہے اور اگر سیاق کلام کو مدنظر رکھا جائے تو قرینہ اس امر کا متقاضی ہے کہ بات عقائد کے حوالے سے ہو رہی ہے جو کہ اخبار کے قبیل سے ہیں، لیکن ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ اگر شیخ الاسلام کی گفتگو عقائد کے ساتھ خاص ہے تو پھر ایسا ہی ہے اور ہمیں کچھ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، لیکن اگر وہ عام ہے تو پھر احکام پر بھی مشتمل ہے۔

گزشتہ رسولوں کے احکام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر ہماری شریعت ان کے خلاف نہ ہو تو کیا وہ احکام ہمارے لیے بھی مشروع ہیں یا نہیں؟ [1]

[1] اس بارے میں امام احمد سے دو روایتیں مروی ہیں: پہلی یہ کہ وہ ہمارے لیے بھی مشروع ہیں اور دوسری یہ کہ وہ ہمارے لیے مشروع نہیں ہیں۔ ملاحظہ: "روضة الناظر" از ابن قدامہ: ۲/ ۵۱۷۔



صحیح قول یہ ہے کہ انبیاء سابقین سے ثابت شدہ احکام ہمارے لیے مشروع ہیں الا یہ کہ ہماری شریعت ان کے خلاف وارد ہو، مثلاً: حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کی شریعت میں تعظیمی سجدہ جائز تھا، جبکہ وہ ہماری شریعت میں حرام ہے، اونٹ کا گوشت ہمارے لیے حلال ہے جبکہ وہ یہودیوں کے لیے حرام تھا۔

﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ﴾ (الانعام: ١٤٦)

''اور ہم نے یہودیوں پر ناخن والے تمام جانور حرام کر دیئے تھے۔''

اس صورت میں شیخ الاسلام کی کلام کو اس بات پر محمول کرنا ممکن ہے کہ وہ احکام واخبار کے لیے عام ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ چیز انبیاء سابقین کی شریعت میں سے ہے؟ اس کا جواب ہے کہ اس کا پتہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے چلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں گزشتہ اُمتوں کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی ثابت ہے اور بشرط صحت ان کے بارے میں جو کچھ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، وہ بھی ثابت ہے۔

علاوہ ازیں کی نہ تو ہم تصدیق کریں گے اور نہ تکذیب، اہل کتاب سے جو کچھ منقول ہے اگر ہماری شریعت اس کی تصدیق کرے گی تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور اگر ہماری شریعت اس کی تکذیب کرے گی تو ہم بھی یہی کچھ کریں گے، نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں مگر ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں، یہودی یہی دعویٰ حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں کرتے ہیں مگر ہم اسے بھی جھوٹ قرار دیتے ہیں۔

فَإِنَّهُ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ پر بحث

[فَإِنَّهُ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ] ...... ضمیر کا مرجع "ماجاء ت به الرسل" ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ "طریق اهل السنة والجماعة" کی طرف لوٹتی ہو، جو کہ اتباع اور عدم انحراف سے عبارت ہے۔ انبیاء ورسل کی تعلیمات اور اہل السنہ والجماعہ کا مسلک ہی صراط مستقیم ہے۔

"صراط" فعال کے وزن پر ہے اور مصروط کے معنی میں ہے۔ جیسے فراش بمعنی مفروش، اور غراس بمعنی مغروس۔ صراط، سیدھے اور کھلے راستے کو کہا جاتا ہے اور یہ زرط سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے: جلدی سے لقمہ نگل لیتا جب راستہ کھلا ہو تو لوگ اس پر چلتے ہوئے تنگی کی وجہ سے لڑکھڑایا نہیں کرتے۔ صراط کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: ہر کھلا راستہ جس میں اونچ نیچ نہ ہو، ٹیڑھا پن نہ ہو۔

صراط مستقیم وہ راستہ ہے۔ جسے انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آئے، اس میں نہ کوئی ٹیڑھا پن ہے اور نہ نشیب وفراز، ایسا سیدھا راستہ کہ اس کے دائیں بائیں بھی انحراف نہیں ہے:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ (الانعام: ١٥٣)

''اور بے شک میرا یہ راستہ سیدھا ہے، پس تم اس کی اتباع کرو۔''

اس بنا پر المستقیم، ہماری طرف سے الصراط کی اس تفسیر کی صفت کاشفہ ہے کہ وہ ایسا کھلا راستہ ہے جس میں



ٹیڑھا پن نہ ہو، اس لیے کہ مستقیم یہی راستہ ہوسکتا ہے، اسے صفت مقیدہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ بعض راستے غیر مستقیم بھی ہوا کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ○ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ○﴾ (الصافات: ۲۳۔ ۲۴)

''انہیں جہنم کا راستہ دکھا دو اور انہیں ٹھہرانا یقیناً ان سے پوچھ گچھ ہونی ہے۔''

ظاہر ہے جہنم کا راستہ مستقیم (سیدھا) نہیں ہے۔

[صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ] ...... یعنی ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ نے انعام کیا۔ راستے کی اضافت ان لوگوں کی طرف اس لیے کی گئی کہ وہ اس پر چلنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت کبھی اپنی طرف بھی کی ہے۔

﴿صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ أَلَا إِلَى اللّٰهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ ○﴾

(الشوریٰ: ۵۲۔ ۵۳)

''یقیناً آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں، اللہ کے راستے کی طرف، وہ اللہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

یہ اس اعتبار سے ہے کہ اسی نے اسے مشروع اور اپنے بندوں کے لیے وضع کیا اور یہی راستہ اس تک پہنچاتا ہے۔ یہ اللہ کا راستہ دو اعتبار سے ہے، اس اعتبار سے بھی کہ اس نے اسے اپنے بندوں کے لیے وضع کیا اور اس اعتبار سے بھی کہ وہ اس تک پہنچاتا ہے۔ جبکہ وہ مومن بندوں کا راستہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ وہ اس پر چلا کرتے ہیں۔

[الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ] ...... اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر ہر فضل واحسان اس کی نعمت ہے۔ ہمارے پاس جو بھی نعمت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی دو قسمیں ہیں۔ نعمت عامہ اور نعمت خاصہ۔ خاصہ کی پھر دو قسمیں ہیں، خاصہ اخص اور خاصہ اعم۔

نعمت عامہ: ...... مومنین و کفار سب کے لیے ہوتی ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ کفار پر بھی انعامات فرماتا ہے؟

جواب: ہاں، ضرور فرماتا ہے، مگر یہ وہ انعامات ہیں جو کفار و مومنین کے لیے عام ہیں اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے ساتھ ابدان کی درستگی ہوتی ہے نہ کہ ادیان کی، مثلاً ماکولات و مشروبات اور لباس و رہائش وغیرہا ان انعامات ایزدی میں مومن و کافر سب برابر ہیں۔

نعمت خاصہ: ...... وہ نعمت جس کے ساتھ ادیان کی اصطلاح ہوتی ہے، مثلاً ایمان، علم اور اعمال صالحہ، یہ نعمت اہل ایمان کے ساتھ خاص جبکہ نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کے لیے عام ہے۔ انبیاء ورسل پر اللہ تعالیٰ کی خاص ترین نعمت ہوا کرتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء: ۱۱۳)

''اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت اتاری اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی یہ خاص ترین نعمت انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے اس میں اہل ایمان ان کے شراکت دار نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ لوگوں کا راستہ

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ .))

شرح:......مؤلف کا یہ قول اس ارشاد باری تعالیٰ جیسا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ o صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ o﴾ (الفاتحه: ٥-٦)

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کن لوگوں پر انعام فرمایا؟ تو اس کی اللہ تعالیٰ نے یوں وضاحت فرمائی ہے:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ (النساء: ٦٩)

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین پر۔''

اللہ تعالیٰ کی عام اور خاص نعمتیں

یہ چار قسم کے لوگ ہیں جن کی تفصیل اس طرح سے ہے:

اولاً: انبیاء کرام علیہم السلام، یعنی وہ لوگ جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اور انہیں خبریں فراہم کیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی حکم کے تحت آتے ہیں، اس لیے کہ ہر رسول نبی ہوا کرتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوا کرتا، اس بناء پر انبیاء کا اطلاق رسولوں پر بھی ہوتا ہے وہ اولوالعزم ہوں یا غیر اولی العزم، یہ مخلوق کی اعلیٰ ترین صنف ہے۔

ثانیاً: صدیقین، یہ فعیل کے وزن پر صدیق کی جمع ہے اور یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قرآن مجید میں اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے:

﴿وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ﴾ (الزمر: ٣٣) ''اور وہ جو صدق لے کر آیا اور اس کی تصدیق کی۔''

اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ (الحدید: ۱۹)

''اور وہ جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر تو یہی صدیق ہیں۔''

ایمان کی تحقیق وتصدیق کرنے والا صدیق ہوا کرتا ہے اور ایمان کی تحقیق صدق سے مکمل ہوتی ہے پھر صدق کی کئی قسمیں ہیں:

عقیدہ میں صدق:...... اس کا تحقق اخلاص کے ساتھ ہوتا ہے، جو کہ انسان کے لیے مشکل ترین مقام ہے، بعض سلف تو یہاں تک فرماتے ہیں، میں نے جس قدر اخلاص کے لیے مجاہدہ کیا کسی دوسری چیز کے لیے نہیں کیا۔

مقال میں صدق:...... وہ اس طرح کہ انسان وہی بات کرے جو واقع کے مطابق ہو، اس کی زد میں وہ خود آئے یا کوئی اور، مثلاً: اس کا باپ، اس کی ماں، اس کا بھائی یا اس کی بہن۔

افعال میں صدق:...... بایں طور کہ اس کے جملہ افعال نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے عین مطابق ہوں، یہ بات بھی صدق فی الفعال کے زمرے میں آتی ہے کہ اس کے اعمال وافعال اخلاص پر مبنی ہوں، بصورت دیگر وہ صدق سے خالی ہوں گے۔ اس لیے کہ اس کا فعل اس کے قول کے خلاف ہے۔

دریں حالات صدیق وہ ہے، جو اعتقاد وارادہ اور قول وعمل میں سچا ہو۔ طبقہ صدیقین میں سے علی الاطلاق افضل ترین سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، اس لیے کہ تمام امتوں میں سے بہترین اُمت آنحضرت ﷺ کی امت ہے اور آپ کی امت کے افضل ترین فرد ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ مقام صدیقیت پر مرد بھی فائز ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ (المائدہ: ۷۵) ''اور ان کی ماں صدیقہ تھیں۔''

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ''عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بنت صدیق رضی اللہ عنہ'' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرما دیتا ہے۔

ثالثاً: شہداء: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جام شہادت نوش کر جاتے ہیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ (آل عمران: ۱۴۰)

''تاکہ اللہ ان کی پڑتال کرے جو ایمان لائے اور تاکہ تم میں سے کچھ کو شہید بنا دے۔''

ایک دوسرے قول کی رو سے شہداء سے مراد علماء ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ﴾ (آل عمران: ۱۸)

''اللہ گواہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور فرشتے اور علم والے بھی گواہ ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو اس بات کا شاہد قرار دیا ہے جس کی شہادت اس نے خود اپنی ذات کے لیے دی ہے، نیز اس لیے بھی کہ علماء انبیاء کرام کے حق میں بلاغ اور امتوں کے خلاف ردّ تبلیغ کی گواہی دیں گے۔

بعض لوگوں کا موقف ہے کہ یہ آیت شہداء اور علماء کے لیے عام ہے اس لیے کہ لفظ میں دونوں معنوں کا احتمال موجود ہے۔



رابعاً: صالحین: اس زمرے میں مذکورہ بالا تینوں قسموں کے لوگ بھی آتے ہیں اور مرتبہ میں ان سے کمتر لوگ بھی۔ انبیاء، صدیقین اور شہداء کا شمار بھی میں ہوتا ہے، اس حوالے سے یہ عطف، عطف العام علی الخاص کے باب سے ہے۔

صالحین وہ لوگ ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی برابر ادائیگی کرتے ہیں، مگر ان کا مرتبہ، نبوت وصدیقین اور شہادت کے مرتبہ سے کم ہے۔

جو راستہ انبیاء و رسل لے کر آئے وہ مذکورۃ الصدر لوگوں کے علاوہ ان لوگوں کا بھی راستہ ہے جو زندگی میں انبیاء و رسل کی تعلیمات پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

سورۂ اخلاص قرآن کا ایک تہائی ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَدْ دَخَلَ فِيْ هٰذِهِ الْجُمْلَةِ مَا وَصَفَ اللّٰهُ بِهِ نَفْسَهُ فِيْ سُوْرَةِ الْاِخْلَاصِ ، الَّتِيْ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ ، حَيْثُ يَقُوْلُ: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ٥ لَمْ يَلِدْ ٥ وَلَمْ يُوْلَدْ ٥ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ٥﴾ (الاخلاص: ٤-١) ......))

''اس جملہ میں وہ چیز داخل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سورہ الاخلاص میں اپنے اوصاف بیان کیے ہیں۔ جو کہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کی اولاد، اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔''

سورۂ اخلاص پر مفصل بحث

شرح: ...... [قَدْ دَخَلَ فِيْ هٰذِهِ الْجُمْلَةِ] ...... اس امر کا احتمال ہے کہ اس سے مراد مؤلف کا یہ قول ہو: "وَهُوَ سُبْحَانَهٗ قَدْ جَمَعَ فِيْمَا وَصَفَ وَسَمّٰى بِهِ نَفْسَهٗ بَيْنَ النَّفْيِ وَالْاِثْبَاتِ ." جبکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد مؤلف کا یہ گزشتہ قول ہو کہ ''اہل سنت اللہ تعالیٰ کا وصف ان چیزوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں جن کے ساتھ اس نے خود اپنا وصف بیان کیا ہو یا اس کے رسول ﷺ نے کیا ہو۔'' صورت حال جو بھی ہو، یہ سورت اور اس کے مابعد کی گفتگو مؤلف کے اس گزشتہ قول کے ضمن میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوصاف بیان کرتے وقت اور اپنے نام گنواتے وقت نفی واثبات کو جمع فرمایا ہے اور یہ کہ اہل سنت کا اس پر ایمان ہے۔

[فِيْ سُوْرَةِ الْاِخْلَاصِ] ...... (سورۃ) کتاب اللہ کی چند ایسی آیات سے عبارت ہے جو اپنے سے ماقبل اور مابعد سے الگ مستقل حیثیت کی حامل ہوں، بالکل اس عمارت کی طرح جسے چاروں طرف سے دیواروں نے گھیر رکھا ہو۔

سُوْرَةِ الْاِخْلَاصِ (اخلاص الشی) کسی چیز کو نقائص وعیوب سے مبرا کرنا۔ اسے اس طرح صاف کرنا کہ اس میں کسی چیز کی آمیزش نہ رہے۔ اس سورت کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص پر



مشتمل ہے اور یہ کہ اس پر ایمان رکھنے والا بندہ مخلص ہوتا ہے، یعنی جب کوئی شخص اس پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص ہو جاتا ہے، اس کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اپنی ذات کے لیے مخلص بنایا ہے، یعنی اس میں اس کی ذات اقدس کے علاوہ کسی حکم یا خبر کا ذکر تک نہیں ہے، یہ دونوں توجیہات درست ہیں اور ان کے مابین کوئی مضافات نہیں ہے۔

[اَلَّتِیْ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ] ..... اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''کیا تم میں سے کوئی شخص ایک رات میں قرآن کا ایک تہائی حصہ پڑھنے سے قاصر رہے گا؟'' لوگوں نے کہا: اللہ کے رسول! وہ کس طرح؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ احد، اللہ الصمد، قرآن کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے۔''❶ یہ بات یاد رہے کہ سورۂ اخلاص اجر وثواب کے اعتبار سے ثلث قرآن کے برابر ہے نہ کہ کفایت کرنے کے اعتبار سے، اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'جو شخص دس دفعہ یہ کلمات پڑھے: ((لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهُ ، لَا شَرِيْكَ لَهُ ، لَهُ الْمُلْكُ ، وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ .)) تو گویا اس نے اولاد اسماعیل سے چار گردنیں آزاد کر دیں۔❷ تو کیا اگر کسی شخص پر چار گردنیں آزاد کرنا واجب ہوں اور وہ یہ کلمات پڑھ لے تو اس کے لیے یہ کچھ پڑھنا کافی ہوگا؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، جہاں تک جزا کا تعلق ہے تو ان کلمات کا پڑھنا چار گردنیں آزاد کرنے کے برابر ہے۔ لہٰذا جزا میں برابری کا مطلب اجزا میں برابری نہیں ہے، اسی لیے اگر کوئی شخص نماز میں سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھ لے تو اس کا یہ عمل سورۂ فاتحہ کی قراءت سے کفایت نہیں کرے گا۔

ثلث قرآن ہونے کی علت

علماء فرماتے ہیں: سورۂ اخلاص کے ثلث قرآن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن تین قسم کی مباحث پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ سے متعلقہ اخبار پر، مخلوقات سے متعلقہ اخبار پر اور احکام شرعیہ پر۔

۱۔ **اللہ تعالیٰ سے متعلقہ خبر:** سورۂ اخلاص: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اس پر مشتمل ہے۔

۲۔ **مخلوقات سے متعلقہ خبر:** مثلاً گزشتہ امتوں کے حالات وواقعات، عصر حاضر اور آئندہ کے حالات وواقعات۔

۳۔ **احکام شرعیہ** مثلاً، قائم کرو: ادا کرو، شرک مت کرو......

سورۂ اخلاص کے ثلث قرآن ہونے کی توجیہات کے بارے میں یہ سب سے خوبصورت قول ہے:

[حَیْثُ یَقُوْلُ: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ] ..... (قل) یہ ہر اس شخص سے خطاب ہے جس کے ساتھ مخاطب ہونا درست ہے۔

سبب نزول: ...... مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اپنے رب کے اوصاف بیان کیجیے، تو اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اس کا سبب نزول یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہودیوں نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ اللہ کی تخلیق فلاں فلاں مواد سے ہوئی ہے، تو

❶ صحیح بخاری: ٥٠١٥۔ صحیح مسلم: ٨١١.   ❷ صحیح بخاری: ٦٤٠٤۔ صحیح مسلم: ٢٦٩٣.

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ❶ الغرض سبب نزول کوئی بھی ہو، اگر ہم سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا جائے تو ہمیں اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا ہوگا۔ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ ❷ (هُوَ) ضمیر ہے، مگر اس کا مرجع کون سا ہے؟ ایک قول کی رو سے اس کا مرجع مسئول عنہ ہے، یعنی جس کے بارے میں تم سوال کر رہے ہو، وہ اللہ ہے...... دوسرے قول کی رو سے یہ ضمیر شان مبتدا ہے۔ (اللّٰہ) مبتدا ثانی اور (احد) مبتدا ثانی کی خبر ہے۔ جبکہ پہلی وجہ کی صورت میں (هُوَ) مبتدا، (اللّٰہ) خبر اول اور (اَحَدٌ) خبر ثانی ہے۔

لفظ اللہ کا معنی

(اللّٰہ) یہ ذات باری تعالیٰ کا علم اور اسی کے ساتھ مختص ہے، اس کے علاوہ کسی کو بھی اس نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں وہ بجز معدودے چند اس کے تابع ہیں۔

لفظ (اللّٰہ) کا معنی "ألا له" ہے۔ اور "اله" بمعنی "مألوه" یعنی معبود ہے، کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا۔ جس طرح کہ (الناس) میں ہے جو کہ اصل میں (ألاناس) تھا، اسی طرح: "هذا خير من هذا" اصل میں: أخير من هذا، تھا، مگر کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ حذف کر دیا گیا۔

(احد) اس کے ساتھ مثبت کلام میں رب تعالیٰ کا وصف بیان کیا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ احد ہے، یعنی اپنی ذات وصفات اور اسماء وافعال کے ساتھ مختص چیزوں میں متوحد ہے۔ وہ (احد) ہے کہ اس کا کوئی ثانی نہیں، اس کی کوئی نظیر نہیں اور اس کا کوئی ہم سر نہیں۔ (اللّٰہ الصمد) یہ جملہ مستانفہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی احدیت کا ذکر کرنے کے بعد اپنی صمدیت کا ذکر کیا اور افادہ حصر کے لیے اسے جملہ معرفہ کے انداز میں لایا گیا، یعنی اللہ ہی یکتا و بے نیاز ہے۔

لفظ الصمد کا معنی

(الصمد) کے معنی میں کئی اقوال ہیں:

(أ) (الصمد) جو اپنے علم، قدرت وحکمت، عزت وسیادت اور جملہ صفات میں کامل ہو۔

(ب) (الصمد) جس کا پیٹ ہو نہ انتڑیاں، ملائکہ کو بھی صمد کہا جاتا ہے، اس لیے کہ ان کے پیٹ نہیں ہوتے، وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ❸ اور یہ معنی اول کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اس

---

❶ مسند احمد: ٥/ ١٣٣۔ ترمذی: ٣٣٦٤۔ بیهقی فی "الاسماء والصفات" رقم: ٦٠٧، ٦٠٨، ٥٠۔ ابن خزیمه فی "التوحید": ٤٥۔ دارمی فی "الرد علی الجهمية"، رقم: ٢٨۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں، اسے بیہقی نے جید سند کے ساتھ نکالا (١٣/٣٥٦) اور البانی نے اسے صحیح سنن ترمذی میں صحیح کہا: ٢٦٨۔

❷ اسے ابو الشیخ نے کتاب "العظمة" میں روایت کیا، اس کی سند میں یحییٰ بن عبداللہ بابلتی ضعیف ہے، جیسا کہ "التقریب" میں بتایا گیا ہے، اس کا دوسرا راوی آبان بن ابی عیاش متروک ہے۔ اسے سیوطی نے "درمنثور ٦/ ٥٠٤" میں "فضائل قل هو الله احد" میں ابوبکر سمرقندی کی طرف منسوب کیا ہے۔

❸ اسے ابن ابی عاصم نے "السنة" میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند ضعیف روایت کیا ہے (٦٦٥) مجاہد رحمہ اللہ سے یہ معنی صحت کے ساتھ ثابت ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسے عبداللہ بن بریدہ پر موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔



کے کل مخلوقات سے مستغنی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

(ج) (الصمد) مفعول کے معنی میں ہے، یعنی وہ ذات کہ ہر شے اس کی محتاج ہے، ہر کوئی اس کے سامنے دست سوال دراز کرتا اور اس کے سامنے اپنی ضروریات کو پیش کرتا ہے۔ یہ اقوال ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں، یہ جملہ معانی اللہ رب العزت کے لیے ثابت ہیں۔

ہم (الصمد) کی جامع تعریف اس طرح کر سکتے ہیں: جو اپنی صفات میں کامل ہو، مخلوقات اس کے در کی محتاج ہوں، سب اسی کے سامنے دست سوال دراز کریں اور وہ سب سے بے نیاز ہو۔

اس جگہ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ مستوی علی العرش ہے، کیا اس کا یہ معنی ہے کہ وہ عرش کا اس طرح محتاج ہے کہ اگر اسے ہٹا دیا جائے تو وہ گر جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ الصمد ہے، بے نیاز ہے، کامل ہے، وہ ہرگز عرش کا محتاج نہیں ہے۔ خود عرش، آسمان، کرسی اور کل مخلوقات اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں اور وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ، کھاتا پیتا ہے؟

جواب: ہرگز نہیں، اس لیے کہ وہ صمد ہے، بے نیاز ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ (الصمد) ایک ایسا کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے جملہ صفات کمال کو اور مخلوق کے لیے کل صفات نقص کو جمع کرنے والا ہے اور یہ کہ ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْo وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ﴾

یہ صمدیت ووحدانیت کی تاکید ہے، اس نے اپنی صمدیت واحدیت کی وجہ سے کسی کو جنم نہیں دیا، اس لیے کہ اولاد خلقت وصفات میں اپنے باپ جیسی ہوتی ہے، حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ مشابہت بھی رکھتی ہے، ایک دفعہ زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ اس دوران مجزز مدلجی آیا، اس نے باپ بیٹا کے قدموں کی طرف دیکھا تو کہنے لگا: یہ پاؤں ایک دوسرے سے ہیں۔ [1] وہ اس حقیقت سے ان دونوں میں مشابہت کی وجہ سے آشنا ہوا۔

اس نے اپنی احدیت وصمدیت میں کمال کی وجہ سے کسی کو جنم نہیں دیا۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کا معنی

(لم یلد) باپ اپنی اولاد کی طرف سے خدمت ونفقہ کا محتاج ہوتا ہے اور وہ ضرورت کے وقت اپنے باپ کی مددگار ومعاون ہوا کرتی ہے اور اس کی نسل کو باقی رکھتی ہے۔

﴿وَلَمْ يُولَدْ﴾ اور وہ کسی کی اولاد نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں اس کا باپ اس سے پہلے ہوتا، حالانکہ وہ اول ہے اس سے قبل کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ جب وہ خالق ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس کی مخلوق ہے تو پھر وہ کسی کی

[1] صحیح بخاری: ٦٧٧٠۔ صحیح مسلم: ١٤٥٩ عن عائشہ رضی اللہ عنہا.

اولاد کیسے ہوتا؟ اب کائنات کے مولود ہونے کا انکار کرنا اس کے والد ہونے کے انکار کرنے سے زیادہ قابل قبول ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی ایک فرد نے بھی کے لیے اس کا باپ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جبکہ بے شمار افتراء پردازوں نے اس کی اولاد کا دعویٰ ضرور کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سب کی نفی فرما دی، اور پہلے اس کی اولاد کی نفی کی جس سے اس قسم کا دعویٰ کرنے والوں کی تردید کی اہمیت کو واضح کرنا مقصود ہے، بلکہ اس نے تو یہاں تک فرما دیا:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ﴾ (المومنون : ۹۱) ''اللہ نے کسی کو بھی بیٹا قرار نہیں دیا۔''

یہاں تک کہ نام کی حد تک بھی ایسا نہیں ہوا، اس کی نہ تو اولاد ہے اور نہ ہی اس نے کسی کو اپنی اولاد قرار دیا ہے، اگرچہ انسان کسی کو تبنی، ولایت یا کسی اور طرح سے اپنا بیٹا قرار دے لیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسا بھی نہیں کرتا، پھر جب انسان کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ ایک چیز والد بھی نہیں ہے اور مولود بھی نہیں ہے مگر وہ متولد (از خود پیدا ہونے والی) تو ہو سکتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس وہم کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ جب کسی کے لیے اس کا ہمسر ہونے کی نفی کر دی گئی تو اس سے یہ لازم آیا کہ وہ متولد بھی نہیں ہے اس لیے کہ جمیع صفات میں اس کا کوئی بھی ہمسر نہیں ہے۔

سورۂ اخلاص ایجابی اور سلبی صفات پر مشتمل ہے۔

اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ کا بھی بیان ہے اور صفات سلبیہ کا بھی۔

صفات ثبوتیہ مندرجہ ذیل ہیں: (الله) جو کہ الوہیت کو متضمن ہے۔ (احد) احدیت کو اور اور (الصمد) صمدیت کو متضمن ہے۔ صفات سلبیہ مندرجہ ذیل ہیں:

﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ٥ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ٥﴾

اور یہ نفی کمال احدیت اور کمال صمدیت کے اثبات کو متضمن ہے۔

آیت الکرسی قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ فِيْ أَعْظَمِ آيَةٍ فِي كِتَابِ اللّٰهِ ، حَيْثُ يَقُوْلُ: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ (البقرة : ۲۵۵) ......))

''اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی بڑی عظیم آیت میں اپنے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: اللہ کے علاوہ کوئی

معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کا سنبھالنے والا ہے، اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، ایسا کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے سفارش کر سکے، وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے، وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے، اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو گھیر رکھا ہے اور اس پر ان کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں، وہ عالیشان ہے، عظیم الشان ہے۔"

آیت الکرسی کی تفسیر

شرح:...... [وَمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ فِيْ أَعْظَمِ آيَةٍ فِي كِتَابِ اللهِ]..... قرآن مجید کی یہ آیت، آیۃ الکرسی کے نام سے موسوم ہے، اور یہ اس لیے کہ اس میں کرسی کا ذکر آتا ہے؟ اور یہ کتاب اللہ کی بڑی باعظمت آیت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: ''کتاب اللہ میں کون سی آیت سب سے عظمت والی ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ اس پر آپ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا: ''ابومنذر! آپ کو علم مبارک ہو۔''[1] یعنی نبی کریم ﷺ نے ان کی اس بات کی تائید فرما دی کہ یہ کتاب اللہ کی عظیم ترین آیت ہے۔ نیز یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کتاب اللہ کے بڑے عالم تھے۔

یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ بعض قرآنی آیات بعض دوسری آیات پر فضیلت رکھتی ہیں، سورۂ اخلاص کی فضیلت پر مبنی گزشتہ حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے، چونکہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے لہٰذا اس کے بارے میں چند سطور پیش خدمت ہیں۔

جہاں تک متکلم قرآن کا تعلق ہے تو اس میں تفاضل ہرگز نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا متکلم ایک ہی ہے اور وہ ہے: اللہ عزوجل۔ البتہ اس کے مدلولات و موضوعات کے اعتبار سے اس میں تفاضل ضرور پایا جاتا ہے، سورۂ اخلاص جو کہ اللہ رب العزت کی حمد و ثنا اور اس کے اسماء و صفات پر مشتمل ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سورۂ لہب جیسی نہیں ہے جو کہ ابولہب کی حالت کے بیان پر مشتمل ہے، اسی طرح قرآن مجید تاثیر اور اسلوب بیان کی قوت کے اعتبار سے بھی متفاضل ہے، ہم کتنی ہی ایسی چھوٹی چھوٹی آیات کی تلاوت کرتے ہیں جو دل پر گہرے اثرات مرتب کرتیں اور اپنے اندر عبرت و موعظت کا بڑا سامان رکھتی ہیں، جبکہ ان سے زیادہ طویل سورتیں ایسے اثرات پر مشتمل نہیں ہوتیں۔ مثلاً

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾ (البقرۃ: ۲۸۲)

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ مدت تک ادھار میں لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''

اس قرآنی آیت کا موضوع بالکل آسان ہے اور اس میں لوگوں کے مابین طے پانے والے روزمرہ کے معاملات کے بارے میں بحث کی گئی ہے، لیکن یہ اس تاثیر کی حامل نہیں ہے جس کی حامل یہ قرآنی آیت ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ

[1] صحیح مسلم: ۸۱۰ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔



الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران: ۱۸۵)

''ہر جاندار موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے اور یقیناً قیامت کے دن تمہیں تمہارے اجور پورے پورے دیئے جائیں گے، پس جو شخص آگ سے بچا لیا گیا اور اسے جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے۔''

یہ آیت کریمہ ترغیب وترہیب اور زجر وموعظت جیسے عظیم معانی پر مشتمل ہے جو کہ قرضہ والی مذکورہ بالا آیت میں نظر نہیں آتے حالانکہ وہ اس سے طویل ہے۔

[اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ] ..... اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس امر سے آگاہ کر رہا ہے کہ وہ الوہیت میں منفرد ہے اور یہ اس لیے کہ یہ جملہ حصر کا فائدہ دیتا ہے، نفی واثبات کا طریقہ حصر کے قوی ترین طریقوں میں سے ایک ہے۔

[اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ] ......(الحی) یعنی حیات کاملہ والا، جو کہ کمال کی جمیع صفات پر مشتمل ہے، ایسی حیات کہ جس سے قبل عدم نہیں تھا اور بعد میں زوال نہیں ہوگا اور نہ اس میں کسی طرح کا کوئی نقص آتا ہے۔ (الحی) یہ اسمائے باری تعالیٰ میں سے ہے، جس کا غیر اللہ پر بھی اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ (الانعام: ۹۵) ''وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔''

مگر زندہ، زندہ جیسا نہیں ہے، اسم میں اشتراک سے مسمی میں مماثلت لازم نہیں آتی۔

[اَلْقَيُّوْمُ]..... یہ فیعول کے وزن پر، مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ قیام سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے: قائم بنفسہ یہ معنی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ ہر شے سے بے نیاز ہے، وہ اکل وشرب اور کسی بھی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہے۔ جبکہ اس کے علاوہ کوئی بھی از خود قائم نہیں ہے بلکہ وہ ایجاد واعداد اور امداد میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، اس کا یہ معنی بھی ہے کہ وہ دوسروں کو سنبھالنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (الرعد: ۳۳)

''پھر کیا وہ جو ہر شخص پر مطلع ہے کہ اس نے کیا کیا۔'' (وہ دوسروں کے برابر ہے؟)

اس ہر مقابل محذوف ہے، اور تقدیری عبارت ہے: کمن لیس کذلك، یعنی جو ایسا نہیں ہے، اسی لیے علماء فرماتے ہیں: قیوم وہ ہے جو خود قائم ہو اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہو، پھر جب وہ دوسروں کو سنبھالنے والا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس کی وجہ سے قائم ہیں۔ فرمایا گیا:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ﴾ (الروم: ۲۵)

''اور اس کی آیات قدرت میں سے یہ بات بھی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔''

لہٰذا رب تعالیٰ کی صفات بھی کامل ہیں، اس کی بادشاہت بھی کامل، اور اس کے جملہ افعال بھی کامل ہیں۔

یہ دونوں اسم اعظم ہیں جب ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے تو وہ قبول فرماتا ہے، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ دعا

کرتے وقت ان کا وسیلہ اختیار کرتے ہوئے یوں کہا کرے: یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ. ❶ ان دونوں کا کتاب عزیز میں تین مقامات پر ذکر آیا ہے، ایک دفعہ اس جگہ، دوسری دفعہ سورۂ آل عمران میں: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (آل عمران : ۲)
اور تیسری دفعہ سورۂ طٰہٰ میں:

﴿وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ﴾ (طٰہٰ: ۱۱۱) ''اور چہرے جھک جائیں گے زندہ و قیوم کے لیے۔''

ان دونوں ناموں میں کمال ذاتی کا اظہار بھی کیا گیا ہے اور کمال سلطانی کا بھی، ذاتی کمال کا اظہار (الحی) سے ہوتا ہے اور سلطانی کمال کا (اَلْقَیُّوْمُ) سے، اس لیے کہ وہ ہر چیز کا نگہبان ہے ہر چیز اس کی وجہ سے قائم ہے۔

[لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ] ..... سنة: اونگھ، یعنی نیند کا آغاز۔ اللہ تعالیٰ نے "لا ینام" نہیں فرمایا، اس لیے کہ نیند کا وقوع اختیار کے تحت ہوتا ہے جبکہ ''اخذ'' سے قہر وزبردستی کی عکاسی ہوتی۔ نیند کا شمار صفات نقص میں ہوتا ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سوتا نہیں اور نہ ہی سونا اس کے شایان شان ہے۔ ❷

اس صفت کا شمار صفات نفی میں ہوتا ہے اور قبل ازیں یہ بتایا جا چکا ہے کہ صفات نفی، ثبوت کو متضمن ہوا کرتی ہیں، اور وہ ہے کمال ضد ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ میں جس کمال کا اثبات ہوتا ہے وہ ہے حیات وقبولیت کا کمال، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کمال حیات کی وجہ سے نیند کا محتاج نہیں ہے اور کمال قبولیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوئے نہیں۔ زندہ مخلوق کو اپنے اندر موجود نقص کی وجہ سے سونے کی حاجت ہوتی ہے تا کہ اسے گزشتہ تھکاوٹ سے راحت میسر آئے اور آئندہ کے کام کاج کے لیے قوت بحال ہو، چونکہ جنت میں اہل جنت کو کامل زندگی سے نوازا جائے گا لہٰذا وہ اس میں نیند نہیں لیں گے، جیسا کہ صحیح آثار سے ثابت ہے۔

اگر کوئی یہ اشکال پیش کرے کہ انسان کو نیند آنا وصف کمال ہے، اس لیے کہ جب انسان کو نیند نہ آئے تو اسے مریض سمجھا جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو کھانے پینے کی ضرورت پیش آنا صفت کمال ہے اگر کوئی شخص کھانا نہ کھائے تو اسے بیمار خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ایک وجہ سے کمال ہے تو دوسری وجہ سے نقص بھی ہے۔ کمال تو اس لیے کہ یہ انسان کے صحت مند ہونے کی دلیل ہے اور نقص اس لیے کہ بدن اس کا محتاج ہے۔ اکل و شرب حقیقتاً ایک نقص ہی ہے۔

الغرض مخلوق کی نسبت سے ہر کمال نسبی اللہ تعالیٰ کے لیے کمال نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح خالق کا ہر کمال مخلوق کا کمال نہیں ہوا کرتا۔ تکبر خالق میں کمال ہے مگر مخلوق میں نقص۔ اکل وشرب اور نیند مخلوق میں کمال ہے اور خالق میں نقص۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں فرمایا:

﴿وَ هُوَ یُطْعِمُ وَ لَا یُطْعَمُ﴾ (الانعام: ١٤) ''وہ کھلاتا ہے اسے کھلایا نہیں جاتا۔''

---

❶ مستدرك حاكم: ۱/ ۵۰۹ میں ابن مسعود سے اور "عمل الیوم واللیلة: ۳۳۷" میں انس بن مالک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ پریشان کن حالات میں یہ دعا کرتے: "یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ." اسے ترمذی: ۳۴۳۶ نے بھی اسی طرح سے روایت کیا ہے۔

❷ مسلم: ۱۷۹.

[لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ] ..... (له) خبر مقدم اور (ما) مبتداء موخر ہے، اس جملہ میں حصر ہے جس کا طریقہ تقدیم ماحقہ التاخیر ہے۔ له میں لام ملك کے لیے ہے۔ یعنی ملک تام بدون معارض ﴿مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ یعنی فرشتے، جنت اور کتنی ہی ایسی اشیاء جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ﴿وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ یعنی ہر طرح کی مخلوق، حیوان بھی اور غیر حیوان بھی۔

[السَّمٰوٰتِ] ..... کے لفظ سے متعدد آسمانوں کا پتہ چلتا اور قرآن میں ان کے سات ہونے کی اس طرح صراحت کی گئی ہے۔

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ (المومنون : ۸۶)

''پوچھو کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟''

زمینوں کے سات ہونے کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے اس کی صراحت نہیں کی، جبکہ سنت نے اس کی صراحت کر دی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ (الطلاق : ۱۲)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور زمین بھی ویسی ہی۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص از راہ ظلم بالشت بھر زمین ہتھیا لے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے بدلے میں اسے سات زمینوں کا طوق پہنائے گا۔'' [1]

[مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ] ..... (مَنْ ذَا) اسم استفہام ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ (من) اسم استفہام ہے اور (ذا) ملغیٰ ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے ایسی مثالوں میں (ذا) اسم موصول ہوا کرتا ہے، اس لیے کہ اس صورت میں اس جملہ کا یہ معنی ہوگا، من الذی الذی اور یہ غیر مستقیم ہے۔

شفاعت کی شرائط اور اس کا فائدہ

لغت میں شفاعت کا معنی ہے: طاق کو جفت بنانا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (الفجر : ۳) ''اور جفت اور طاق کی قسم۔''

اس کا اصطلاحی معنی ہے: جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے کسی کا واسطہ بننا ہے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کی طرف سے اہل موقف کے لیے یہ شفاعت کرنا کہ ان کا فیصلہ کر دیا جائے۔ دفع مضرت کی شفاعت اور اہل جنت کے لیے جنت میں داخل ہونے کی شفاعت کرنا جلب منفعت کی شفاعت ہے۔ (عِنْدَهٗٓ) یعنی اللہ کے ہاں (اِلَّا بِاِذْنِهٖ) یعنی بجز اس کے کہ اللہ اس کی اجازت دے دے۔ یہ آیت اثبات شفاعت کا فائدہ دیتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے مشروط ہے اگر اس شرط کو تسلیم نہ کیا جائے تو (اِلَّا) کے ساتھ استثناء لغو اور بے مقصد قرار پائے گا۔ اسے ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ.....﴾ کے بعد ذکر کرنا

---

[1] صحیح بخاری: ۲۴۵۲۔ صحیح مسلم: ۱۶۱۰ عن سعید بن زید رضی اللہ عنہ۔



اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص یہ ملک تام السلطان ہے، یعنی اس کی بادشاہت تام و مکمل ہے اور اس میں تصرف کرنا کسی کی بھی استطاعت میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ شفاعت جیسا عمل خیر بھی۔ الا یہ کہ وہ خود اس کی اجازت دے دے۔ اور یہ اس کی ربوبیت و سلطانی کے کمال کا مظہر ہے۔

یہ جملہ اس بات کا بھی فائدہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اذن ثابت ہے جو کہ اصل میں اعلام و آ گاہی سے عبارت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ﴾ (التوبۃ : ۳) ''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آگاہ کیا جاتا ہے۔''

اس بناء پر اذن کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنے راضی ہونے سے آگاہ کر دے۔ شفاعت کے لیے کچھ اور بھی شرائط ہیں، مثلاً یہ کہ وہ شفاعت کرنے والے پر بھی راضی ہو اور اس سے بھی جس کے لیے شفاعت کی جا رہی ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی﴾ (الانبیاء : ۲۸)

''اور وہ کسی کی شفاعت نہیں کر سکتے مگر صرف اس کی جس سے اللہ راضی ہو۔''

مزید فرمایا گیا:

﴿یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا﴾ (طٰہٰ : ۱۰۹)

''جس دن شفاعت نفع نہ دے گی مگر جسے رب رحمٰن نے اجازت دی ہو اور اس کی بات کو پسند کیا ہو۔''

اس قرآنی آیت میں ان تینوں شرائط کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ کَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰی﴾ (النجم : ۲۶)

''اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں کہ ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آئے گی مگر اس کے بعد کہ اللہ جسے چاہے اجازت دے اور پسند بھی کرے۔''

یعنی وہ شافع سے بھی راضی ہو اور مشفوع لہ سے بھی۔ ہم نے یہ معنی اس بناء پر کیا ہے کہ معمول کو حذف کرنا عموم پر دلالت کرتا ہے۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ کو مشفوع لہ کے نجات پانے کا علم ہے تو پھر شفاعت کا فائدہ؟

جواب: اللہ تبارک و تعالیٰ شفاعت کرنے والے کی عزت افزائی اور اسے مقام محمود پر فائز کرنے کی غرض سے اسے شفاعت کرنے کی اجازت دے گا۔

[**یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ**] ...... کسی چیز کی حقیقت کے مطابق اس کا مکمل ادراک کرنا علم کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ﴾ ان کے مستقبل کو بھی جانتا ہے۔ ﴿وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾ اور ان کے ماضی کو بھی، لفظ (ما) عموم کے صیغوں میں سے ہے یعنی جو ہر ماضی اور ہر مستقبل کا بھی احاطہ کرتا ہے اور لوگوں کے افعال کا بھی۔



[وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ] ..... (يُحِيطُوْنَ) میں ضمیر خلق کی طرف لوٹتی ہے جس کی دلیل: ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ہے، یعنی آسمانوں اور زمین والے اللہ کے علم سے کسی بھی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو اللہ چاہے۔

[مِّنْ عِلْمِهٖٓ]..... اس کے علم سے مراد اس کی ذات اور صفات کا علم بھی ہو سکتا ہے، یعنی ہم لوگ اللہ تعالیٰ، اس کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جس کی اس نے ہمیں تعلیم دی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ علم بمعنی معلوم ہو، یعنی وہ اس کی معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے اور یہ دونوں معانی صحیح ہیں، ویسے دوسرا معنی زیادہ عام ہے، اس لیے کہ اس کی معلومات میں اس کی ذات وصفات اور علاوہ ازیں کا علم بھی داخل ہے۔

[اِلَّا بِمَا شَآءَ] ......یعنی انہیں تعلیم کردہ علم سے جتنا اور جو چاہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء وصفات اور اپنے کونی اور شرعی احکام میں سے ہمیں بہت ساری چیزوں کا علم دیا ہے، مگر جو کچھ اس کے علم میں ہے یہ بہت کچھ اس کی نسبت سے بہت کم ہے، جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (الاسراء: ۸۵)

''لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ فرما دیں کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے اور تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔''

[وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ] ..... (وَسِعَ) شَمَلَ کے معنی میں ہے، یعنی اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو گھیر رکھا ہے اور یہ کہ وہ ان سے بہت بڑی ہے اس لیے کہ اگر وہ ان سے بڑی نہ ہوتی تو انہیں گھیر نہ پاتی۔''

کرسی اللہ تعالیٰ کے قدموں کی جگہ ہے

کرسی کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''وہ اللہ تعالیٰ کے دو قدموں کی جگہ ہے۔''[1]

کرسی عرش نہیں ہے عرش کرسی سے بڑا ہے: نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کی نسبت سے اس گول چیز جیسی ہیں جسے وسیع بیابان میں پھینک دیا جائے اور بے شک کرسی پر عرش کی فضیلت اس گول چیز پر وسیع وعریض بیابان کی فضیلت جیسی ہے۔''[2]

---

[1] اسے عبداللہ بن امام احمد نے کتاب ''السنة: ٥٨٦'' میں ابن ابی شیبہ نے کتاب ''العرش: ٦١'' میں ابن خزیمہ نے ''التوحید: ٢٤٨'' میں اور حاکم نے ''مستدرك: ٢/ ٢٨٢'' میں روایت کیا۔ امام حاکم کہتے ہیں: یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے مگر انہوں نے اسے روایت نہیں کیا، ذہبی ان سے موافقت کرتے ہیں، اسے دارقطنی نے ''کتاب الصفات'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان پر موقوف روایت کیا ہے۔ اور ہیثمی نے اسے ''مجمع الزوائد: ٦/ ٣٢٣'' میں طبرانی کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے راوی صحیح ہیں، البانی ''مختصر العلو: ٤٥'' میں فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

[2] السلسلة الصحيحة: ١٠٩۔ الأسماء والصفات للبيهقي: ٨٦٢۔



[وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا]...... یعنی آسمانوں اور زمین کی نگہداشت اسے تھکاتی نہیں۔

یہ صفت، صفات منفیہ میں سے ہے، یہ نفی جن صفات ثبوتیہ پر دلالت کرتی ہے وہ ہیں: کمال قدرت وقوت اور کمال علم ورحمت۔

[وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ] ...... (العلی) فعیل کے وزن پر صفت ہے اس لیے کہ اس کا علو لازم لذاتہ ہے۔ صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق یہ ہے کہ اسم فاعل امر حادث ہے جس کا زوال ممکن ہوتا ہے جبکہ صفت مشبہ اور موصوف لازم و ملزوم ہوا کرتے ہیں، موصوف اس سے الگ نہیں ہوسکتا۔

علوم کی اقسام

علو باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں: علو ذات اور علو صفات۔ اول الذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات ہر چیز سے اوپر ہے اس سے اوپر کوئی چیز نہیں۔ جبکہ ثانی الذکر پر یہ ارشاد گرامی دلالت کرتا ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (النحل: ٦٠)

یعنی اس کی تمام صفات عالی و برتر ہیں، اور ان میں کسی بھی اعتبار سے کوئی نقص نہیں ہے۔

﴿اَلْعَظِيْمُ﴾ یہ بھی صفت مشبہ کا صیغہ ہے، یعنی عظمت والا، جو کہ قوت و کبریائی اور ان جیسے ان معانی سے عبارت ہے جو اس کلمہ کے مدلول سے معروف ہیں۔

آیت الکرسی اللہ تعالیٰ کے پانچ ناموں اور چھبیس صفات پر مشتمل ہے

یہ آیت ان پانچ اسمائے باری تعالیٰ ((اَللّٰهُ ، اَلْحَيُّ ، الْقَيُّوْمُ ، الْعَلِيُّ ، الْعَظِيْمُ)) اور اس کی چھبیس صفات پر مشتمل ہے، ان میں سے پانچ صفات کو تو یہ اسماء متضمن ہیں، جبکہ باقی کی تفصیل اس طرح سے ہے:

چھٹی صفت: اس کا الوہیت کے ساتھ منفرد ہونا۔

ساتویں صفت: کمال حیات اور کمال قبولیت کی وجہ سے اس کے حق میں نیند اور اونگھ کا منتفی ہونا۔

آٹھویں صفت: عموم ملکیت، ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾

نویں صفت: اس کا ملک کے ساتھ منفرد ہونا۔ جو کہ تقدیم خبر سے مأخوذ ہے۔

دسویں صفت: بادشاہت کی قوت وکمالیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾

گیارھویں صفت: اثبات عندیت۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود نہیں ہے، جس سے حلولیت کی تردید ہوتی ہے۔

بارھویں صفت: اثبات اذن۔ ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾

تیرھویں صفت: عموم علم۔ ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾

چودھویں، پندرھویں صفت: وہ نہ تو ماضی کو بھولتا ہے اور نہ مستقبل سے ناآگاہ ہے۔ ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾

سولھویں صفت: کمال عظمت باری تعالیٰ، اس لیے کہ مخلوق اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

سترھویں صفت: اثبات مشیت ﴿اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾

اٹھارھویں صفت: اثبات کرسی، جو کہ اس کے قدموں کی جگہ ہے۔

انیسویں، بیسویں اور اکیسویں صفت: اثبات عظمت اور اثبات قدرت وقوت۔ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ مخلوق کی عظمت خالق کی عظمت کی دلیل ہوتی ہے۔

بائیسویں، تیئیسویں اور چوبیسویں صفت: کمال علم ورحمت اور کمال حفظ ﴿وَ لَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا﴾

پچیسویں صفت: اثبات علو، ﴿وَ هُوَ الْعَلِيُّ﴾

اللہ تعالیٰ کی صفت علو ذاتیہ ازلیہ ابدیہ ہے

اہل سنت کا مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بلند وبرتر ہے اور یہ کہ اس کا علو صفات ذاتیہ ازلیہ ابدیہ سے ہے۔ اس حوالے سے دو گروہ ان کے مخالف ہیں، ایک گروہ کہتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے، جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو عالم سے اوپر ہے اور نہ نیچے اور نہ ہی عالم کے اندر، نہ دائیں، نہ بائیں، نہ اس سے منفصل اور نہ ہی اس سے متصل۔

اسے ہر جگہ موجود ماننے والے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ (المجادلة: ٧)

''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو اور نہ پانچ آدمیوں کی جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔''

نیز اس ارشاد ربانی سے بھی:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (الحديد: ٤)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر مستوی ہوا عرش پر، وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں، اور تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے۔''

اس بناء پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے عالی ہے، ان کے نزدیک علو سے مراد علو صفت ہے۔



صفت علو میں اہل السنہ کی مخالفت کرنے والوں کا ردّ

مگر جو یہ کہتے ہیں کہ اسے کسی جہت کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا، تو ان کا موقف ہے کہ اس سے اس کا جسم ہونا لازم آئے گا جبکہ اجسام متماثل ہوتے ہیں اور یہ تمثیل کو مستلزم ہے لہٰذا ہم اس کے کسی جہت میں ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

مگر ہم ان دونوں گروہوں کی دو وجوں سے تردید کرتے ہیں:

پہلی وجہ : ان کے احتجاج کو باطل قرار دے کر۔

دوسری وجہ: ادلہ قاطعہ کے ذریعے ان کے قول کی نقیض کا اثبات کر کے۔

۱۔ جو لوگ ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ موجود ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے ہم یہ کہیں گے کہ تمہارا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے، اس کی تردید نقلی دلائل سے بھی ہوتی ہے اور عقلی دلائل سے بھی۔

جہاں تک سمعی اور نقلی دلیل کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے علو کا اثبات کیا ہے اور جس آیت سے تم استدلال کرتے ہو وہ تمہارے دعوے کی دلیل نہیں بن سکتی، اس لیے کہ معیت حلول فی المکان کو مستلزم نہیں ہوتی۔ کیا آپ نے عربوں کا یہ قول نہیں سنا کہ: چاند ہمارے ساتھ ہے۔ حالانکہ وہ آسمان پر موجود ہوتا ہے۔ آدمی کہتا ہے: میری بیوی میرے ساتھ ہے۔ حالانکہ وہ مشرق میں ہوتا ہے اور اس کی بیوی مغرب میں۔ کمان دار اپنی سپاہ سے کہتا ہے: جنگ میں کود پڑو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ حالانکہ وہ اپنے دفتر میں ہوتا ہے اور سپاہ میدان جنگ میں۔ معیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ صاحب ہمیشہ مصاحب کے مکان میں موجود ہو۔ معیت کے معنی کی تحدید اس کے مضاف الیہ کے حساب سے ہوتی ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں: اس دودھ کے ساتھ پانی ہے اس جگہ معیت اختلاط کی متقاضی ہے، آدمی کہتا ہے، میرا سامان میرے ساتھ ہے۔ حالانکہ وہ اس کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے گھر میں ہوتا ہے، پھر جب اس کا سامان اس کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ پھر بھی کہتا ہے۔ میرا سامان میرے ساتھ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ہی کلمہ ہے مگر اضافت کے حساب سے اس کا معنیٰ مختلف ہو جاتا ہے۔ اس بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت اس کی دیگر تمام صفات کی طرح اس کے شایان شان ہے۔ پس یہ معیت تامہ حقیقیہ ہے مگر وہ خود آسمان پر ہے۔

رہی دلیل نقلی، تو ان کے اس دعویٰ کے بطلان کے لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ جب تم نے یہ کہا کہ اللہ ہر جگہ میرے ساتھ ہے۔ تو اس پر کئی لوازم باطلہ لازم آئیں گے، مثلاً

اولاً: اس سے تعدد یا تجزء لازم آئے گا۔ اور یہ لازم بلا شک باطل ہے اور لازم کا بطلان ملزوم کے بطلان پر دلالت کرتا ہے۔

ثانیاً: جب آپ یہ کہیں گے کہ وہ مختلف جگہوں میں میرے ساتھ ہے، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ لوگوں کے اضافے سے اس میں بھی اضافہ ہو اور ان کی کمی سے اس میں بھی کمی آئے۔

ثالثاً: اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ تو گندی جگہوں سے بھی اسے منزہ قرار نہیں دے سکتا، جب تو بیت الخلاء میں بیٹھ کر یہ کہے گا کہ اللہ میرے ساتھ ہے، تو اس سے بڑھ کر اللہ کی توہین کیا ہوگی۔

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ حلول پر مبنی ان کا یہ قول سمع وعقل دونوں کے منافی ہے اور یہ کہ قرآن کسی بھی طرح اس پر دلالت نہیں کرتا، نہ دلالت مطابقت، نہ تضمن اور نہ ہی التزام۔

۲۔ دوسرے گروہ سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ:

اولاً: رب تعالیٰ کے لیے جہت کا انکار اس کے وجود کی نفی کے مترادف ہے، اس لیے کہ ہم عدم کے علاوہ کسی ایسی چیز کا علم نہیں رکھتے جو نہ تو کائنات سے اوپر ہو اور نہ اس کے نیچے، نہ دائیں ہو اور نہ بائیں، نہ اس سے متصل ہو اور نہ ہی منفصل۔ اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ہم سے یہ مطالبہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کا عدم کے ساتھ وصف بیان کرو تو ہمیں عدم کا اس سے زیادہ سچا وصف اور کوئی نہیں ملے گا۔

ثانیاً: تمہارا یہ قول ہے کہ جہت کا اثبات تجسیم کو مستلزم ہے، تو مگر ہم کلمہ جسم کے بارے میں تم سے مناقشہ کرنا چاہیں گے اور تم سے یہ سوال کریں گے کہ آخر وہ جسم ہے کیا جس کی وجہ سے تم لوگوں کو صفات باری تعالیٰ کے اثبات سے تنفر کرتے ہو؟ کیا جسم سے مراد تمہارے نزدیک ایسی چیز ہے جو ایسے اجزاء سے مکون ہو جو ایک دوسرے کے طرح محتاج ہوں کہ ان اجزاء کے اجتماع کے بغیر اس کا قیام ناممکن ہو؟ اگر تمہارا یہی ارادہ ہو تو ہم اس کی تصدیق کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس معنی میں جسم نہیں ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے لیے علو کا اثبات اس جسم کو مستلزم ہے تو اس کا یہ کہنا محض دعویٰ ہے جسے قبول نہیں کیا جا سکتا، اور اگر تمہارے نزدیک جسم سے مقصود ایسی ذات ہے جو از خود قائم ہو اور اپنے شایان شان اوصاف سے متصف ہو، تو ہم اس کا اثبات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو از خود قائم ہے اور صفات کمال سے متصف ہے، اور یہ ایسی چیز ہے جو ہر کسی کے علم میں ہے۔

اس سے ان لوگوں کے قول کا بطلان واضح ہو جاتا ہے جو اس امر کا اثبات کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، یا جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ تو فوق العالم ہے اور نہ تحت العالم، نہ اس کے ساتھ متصل ہے اور نہ اس سے منفصل۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے۔

علو ذات باری تعالیٰ کے وہ دلائل جن کے ساتھ ان دونوں گروہوں کے قول کے نقیض کا بھرپور اثبات ہوتا ہے اور جن سے اہل سنت کے عقیدہ کا اثبات ہوتا ہے، تو ایسے دلائل بے شمار ہیں اور وہ پانچ قسم کے ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت، عقل اور فطرت۔

کتاب اللہ: کتاب اللہ میں علو ذات باری پر مختلف قسم کے دلائل موجود ہیں، ان میں سے بعض دلائل میں علو اور فوقیت کی تصریح کی گئی ہے۔ کچھ اس کی طرف اشیاء کے چڑھنے اور اس کی طرف سے اترنے پر مشتمل ہیں۔

سنت رسول اللہ ﷺ: اس حوالے سے دلائل سنت میں بھی تنوع پایا جاتا ہے، علو ذات کا اثبات نبی کریم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر سے ہوتا ہے۔

اجماع:...... ان بدعتی گروہوں کے ظہور سے قبل مسلمانوں کا اس بات پر اجماع تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی

ہے اور اپنی مخلوق سے اوپر ہے۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے کلام میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے، جو اس بات کی دلیل بن سکے کہ اللہ تعالیٰ نہ عرش پر ہے اور نہ آسمان پر۔ بلکہ ان کا کلام اس بات پر متفق ہے کہ اللہ ہر چیز کے اوپر ہے۔

عقل:...... عقلی دلائل سے بھی علو ذات کا اثبات ہوتا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ علو صفت کمال ہے اور ایسی صفت کا اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات واجب ہے، اس لیے کہ وہ صفات کمال سے متصف ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہوگا یا نیچے یا پھر محاذات میں، آخری دونوں صورتیں ممتنع ہیں۔ اسفل میں معنوی نقص ہے، محاذات سے مخلوق کے ساتھ مشابہت اور مماثلت لازم آتی ہے لہٰذا علو کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

فطرت:...... فطرت بھی علو ذات کی متقاضی ہے، جب بھی کوئی شخص اسے یا رب، یا رب کہہ کر پکارتا ہے تو اس کے دل میں علو کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک علو صفات کا تعلق ہے تو اس پر تمام اہل اسلام کا اجماع ہے۔

چھبیسویں صفت: اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثبات، اس لیے کہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَلْعَظِيْمُ﴾

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلِهٰـذَا كَانَ مَنْ قَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ فِيْ لَيْلَةٍ ؛ لَمْ يَزَلْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ حَافِظٌ وَ لَا يَقْرَبُهُ شَيْطَانٌ حَتّٰى يُصْبِحَ .))

''یہی وجہ ہے کہ شب میں یہ آیت پڑھنے والے پر اللہ کی طرف سے ایک نگہبان کا تقرر کیا جاتا ہے اور صبح ہونے تک شیطان اس کے قریب بھی نہیں آتا۔''

شرح:...... یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری کی حدیث کا ایک حصہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا سونے سے قبل آیۃ الکرسی: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ پڑھ لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگہبان تمہارے ساتھ رہے گا اور صبح ہونے تک شیطان تمہارے قریب بھی نہیں آئے گا۔ [1]

اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ﴾ کی تفسیر

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَوْلُهُ سُبْحَانَهُ: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (الحدید: ۳) ......))

[1] اس حدیث کی تخریج پہلے گزر چکی ہے، یہ حدیث امام بخاری کے نزدیک معلق ہے، جبکہ دوسروں نے اسے موصول روایت کیا اور صحیح کہا۔

''اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان: ''وہ اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

شرح: ......[وَقَوْلُهُ سُبْحَانَهُ] ...... یہ لفظ ''سورة'' پر معطوف ہے جو کہ مؤلف کے قول: ''ما وصف به نفسه في سورة الاخلاص'' میں مذکور ہے۔

[اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ] ...... یہ چاروں اسماء زمان ومکان میں باہم متقابل ہیں، جو اس بات کا فائدہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اول سے آخر تک ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے، اور یہ احاطہ زمانی بھی ہے اور مکانی بھی۔

[هُوَ الْاَوَّلُ] ...... الاوّل کی تفسیر نبی کریم ﷺ نے یوں فرمائی ہے: ''جس سے قبل کوئی بھی چیز موجود نہیں تھی۔''[1] آپ ﷺ نے اثبات کی تفسیر نفی کے ساتھ فرمائی اور صفت ثبوتیہ کو صفت سلبیہ قرار دیا اور ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ صفات ثبوتیہ بہت زیادہ بھی ہیں اور زیادہ کامل بھی مگر کیوں؟ اس لیے کہ یہ تفسیر خود نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے جس سے مقصود اولیت کی تاکید ہے، یعنی یہ اولیت مطلقہ ہے نہ کہ اضافیہ، تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ یہ مابعد کے اعتبار سے اول ہے، جبکہ اس سے قبل بھی کوئی چیز موجود تھی، لہٰذا اس کی امر سلبی کے ساتھ تفسیر کرنا اس کے عموم پر زیادہ دلالت کرتا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ اولیت مطلقہ ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا: ''اس سے قبل کوئی چیز نہیں تھی۔ آپ کا یہ ارشاد تقدم زمنی کے اعتبار سے ہے۔

[وَالْاٰخِرُ] ...... اس کی تفسیر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس طرح فرمائی ہے: ''جس کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔'' کسی کو وہم نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کا یہ فرمان اللہ تعالیٰ کی آخریت کی غایت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو کہ ابدی ہیں حالانکہ وہ مخلوق ہیں، مثلاً جنت اور جہنم۔ اس بنا پر ﴿اَلْاٰخِرُ﴾ کا معنی ہوگا کہ اس نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾(التوبة: ٣٣)

''اللہ تو وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر برتری دلا دے۔''

''ظهر الدّابة'' اسی سے ماخوذ ہے بمعنی جانور کی پیٹھ۔ اس لیے کہ وہ اس کا بالائی حصہ ہے۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی معنی میں ہے: ﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ﴾ (الكهف: ٩٧) یعنی وہ ان پر برتری حاصل نہ کر سکے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ''وہ جس کے اوپر کوئی چیز نہیں ہے۔'' پس وہ ہر شے پر برتر ہے۔

[وَالْبَاطِنُ] ...... آنحضرت ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ''جس کے آگے کوئی چیز نہیں۔'' یہ ہر چیز کے احاطہ سے کنایہ ہے۔ مگر اس کا معنی یہ ہے کہ اگرچہ وہ اعلیٰ وبرتر ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ باطن بھی ہے، اس کا علو اس کے قرب کی

---

[1] صحيح مسلم: ٢٧١٣۔



منافی نہیں ہے، باطن تقریباً قریب کے معنی میں ہے۔

ان اسمائے اربعہ میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ باہم متقابل ہیں اور تمام کے تمام ایک مبتدا کی خبر ہیں مگر حرف عاطفہ کے واسطہ کے ساتھ۔ حرف عطف کے ساتھ معلومات کی فراہمی حرف عطف کے واسطہ کے بغیر فراہمی معلومات سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مثلاً:

﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُoذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُoفَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُo﴾ (البروج: ١٦-١٤)

''اور وہ بہت بخشنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے، عرش والا بڑی شان والا ہے، کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

یہ حرف عطف کے بغیر متعدد خبریں ہیں۔ کبھی کبھی اسماء و صفات باری تعالیٰ واؤ عاطفہ کے ساتھ مل کر آتی ہیں جن کے فوائد یہ ہوتے ہیں:

اولاً گزشتہ کی تاکید، اس لیے کہ جب آپ اس پر عطف ڈالیں گے تو اسے اصل قرار دیں گے اور اصل ثابت ہوتا ہے۔

ثانیاً: اِفادہ جمع، مگر اس سے موصوف کا تعدد لازم نہیں آتا۔ ملاحظہ ہو یہ ارشاد باری تعالیٰ:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰىoالَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰىoوَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰىo﴾ (الاعلی: ٣-١)

''تسبیح بیان کریں سب سے بلند اپنے رب کے نام کی جس نے پیدا کیا اور درست طریقہ سے پیدا کیا، اور جس نے اندازہ مقرر کیا پھر راستہ دکھایا۔''

جس رب اعلیٰ نے درست طریقہ سے پیدا کیا اسی نے اندازہ بھی مقرر کیا اور راستہ بھی دکھایا۔

سوال: امر معروف تو یہ ہے کہ عطف مغایرت کا متقاضی ہوتا ہے۔

جواب: یہ بات درست ہے، لیکن مغایرت کبھی اعیان کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی اوصاف کے ساتھ۔ اس جگہ اوصاف میں مغایرت ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ کبھی کبھی مغایرت محض لفظی ہوا کرتی ہے۔

کسی شاعر کا شعر ہے:

فالفی قولها کذباً ومینا

''اس نے اس کی بات کو جھوٹ جان کر ردّ کر دیا۔''

''مَیْن'' بھی کذب سے ہی عبارت ہے مگر شاعر نے اس کا اس پر عطف اس لیے ڈالا کہ لفظوں میں مغایرت ہے، جبکہ معنی ایک ہی ہے۔ تغایر یا تو عینی ہوتا ہے یا معنوی یا پھر لفظی، مثلاً: ''جاء زیدٌ و عمرو و بکر و خالد'' میں تغایر عینی ہے۔ ''جاء زید الکریم و الشجاع و العالم'' میں تغایر معنوی ہے اور ''ھذا الحدیث کذب و مین'' میں تغایر لفظی۔ اس آیت سے مندرجہ ذیل چار اسماء باری تعالیٰ کا اثبات ہوتا ہے: ﴿اَلْاَوَّلُ، اَلْآخِرُ، الظَّاهِرُ، اَلْبَاطِنُ﴾ جبکہ ان اسماء سے پانچ صفات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں: اولیت، آخریت، ظاہریت، باطنیت اور عموم علم۔

ان اسماء کے مجموعہ سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمان و مکان کے اعتبار سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے،

اور یہ اس لیے کہ اوصاف کے اجتماع سے زیادت صفت حاصل ہوتی ہے۔

سوال: کیا یہ اسماء اس معنی میں متلازم ہیں کہ ألاوّل کہنے کے بعد الاخر کہنا بھی واجب ہو یا انھیں ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: بظاہر ان کا متلازم ہونا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ نے "الظَّاھر" کہا تو ساتھ ہی "الباطن" بھی کہنا ہوگا تا کہ احاطہ علم پر دلالت کرنے والی صفت کے مقابل کا ذکر چھوٹنے نہ پائے۔

[وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ] ..... یہ گزشتہ صفات اربعہ کا اکمال ہے۔ یعنی وہ اس کے ساتھ ہر چیز کا بخوبی علم بھی رکھتا ہے۔ ان صیغوں کا شمار عموم کے صیغوں میں ہوتا ہے جن میں کبھی بھی تخصیص پیدا نہیں کی جا سکتی، اور یہ عموم اس کے اپنے افعال اور دوسرے کے افعال کلیہ اور جزئیہ کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ آج اور کل کا مکمل علم رکھتا ہے اور اس کا یہ علم واجب، ممکن اور مستحیل تک کو شامل ہے۔ وہ بڑا وسیع، ہمہ گیر اور محیط ہے۔ کوئی بھی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ واجب کے بارے میں اس کے علم کی مثال اس کا اپنی ذات کے بارے میں علم ہے۔ مستحیل کے بارے میں اس کے علم کی مثال یہ قرآنی آیت ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء: ۲۲)

"اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور معبود بھی ہوتے تو وہ دونوں تباہ ہو جاتے۔"

اسی طرح ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ (الحج: ۷۳)

"جن کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے خواہ وہ سب اس کام کے لیے جمع ہو جائیں۔"

جہاں تک ممکن کے بارے میں اس کے علم کا تعلق ہے، تو اس نے اپنی مخلوق کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا وہ ممکن کے زمرے میں ہی آتا ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ﴾ (النحل: ۱۹) "وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔"

الغرض اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

انسان کا اس بات پر ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر شے کا بخوبی علم ہے، اسے یہ فائدہ دیتا ہے کہ وہ درجہ کمال تک اسے اپنا نگران سمجھتا اور اس سے ڈرتا رہتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا اور اس کے منع کردہ امور سے کنارہ کش رہتا ہے۔

اللہ حی لا یموت پر توکل رکھنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَوْلُهُ سُبْحَانَهُ: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾ (الفرقان: ۵۸)......))

"اور اس زندہ پر توکل رکھیں جو کبھی فوت نہیں ہوگا۔"

شرح: ......[وَتَوَكَّلْ] ..... یہ لفظ "وکل الشیئ الی غیرہ" سے ماخوذ ہے، یعنی اس نے اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دیا۔

بعض علماء توکل علی اللہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں، جلب منفعت اور دفع مضرت کے لیے اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد کرنا اور اس کے لیے صحیح اسباب اختیار کرنا۔

اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد کا تقاضا یہ ہے کہ آپ صرف اسی کے سامنے دست سوال دراز کریں، صرف اسی کی مدد کے خواستگار ہوں، اسی سے امید رکھیں اور اسی سے ڈریں، منافع کے حصول اور مضرات کے دفعیہ کے لیے صرف اللہ پر اعتماد کریں، اس کے ساتھ ساتھ اس پر مکمل یقین بھی رکھیں اور مشروع اسباب بھی اختیار کریں۔

اپنی قوت پر اعتماد کرنے والے اور اللہ پر توکل نہ کرنے والے کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی دلیل غزوۂ حنین کے موقع پر صحابہ کرام کو پیش آنے والا واقعہ ہے، انہوں نے اپنی کثرت پر ناز کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم کم ہونے کی وجہ سے شکست نہیں کھائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ٥ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ٥﴾ (التوبة: ٢٥-٢٦)

''یقیناً بہت ساری جگہوں میں اللہ تمہاری مدد کر چکا اور جنگ حنین کے دن بھی، جب تمہاری کثرت تمہیں خوش لگ رہی تھی، پس وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکی اور زمین باوجود فراخ ہونے کے تم پر تنگ پڑ گئی تھی، پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اپنی تسکین اتاری اور مومنوں پر بھی اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنہیں تم دیکھ نہیں سکے تھے اور اس نے کافروں کو عذاب دیا اور یہی سزا ہے کافروں کی۔''

جو شخص اللہ پر توکل تو کرے مگر وہ سبب اختیار نہ کرے جس کی اللہ نے اجازت دی ہے تو ایسا شخص توکل میں غیر صادق ہے، بلکہ اسباب اختیار نہ کرنا کم عقلی اور دین میں کمزوری کی علامت ہے، اس لیے کہ یہ اللہ کی حکمت میں کھلی طعنہ زنی ہے۔

اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا نصف دین ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ٥﴾ (الفاتحة: ٥)

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔''

استعانت باللہ توکل کا ثمرہ ہے۔

﴿فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (هود: ١٢٣) ''اللہ کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں۔''

غیر اللہ پر توکل کی اقسام

اولاً: توکل اعتماد اور توکل عبادت، یہ شرک اکبر ہے، مثلاً اس کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ متوکل علیہ اسے ہر خیر سے نوازے گا اور اس سے ہر شر کو دور کرے گا، جس کی وجہ سے وہ اپنا معاملہ کلیتاً اس کے سپرد کر دے، پھر اس سے امیدیں بھی وابستہ رکھے اور

اس سے ڈرتا بھی رہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ متوکل علیہ زندہ ہو یا مردہ، اس لیے کہ یہ سپردگی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

ثانیاً: کسی شخص کو اپنا نائب قرار دیتے ہوئے اس پر توکل کرنا، جیسے لوگ بیع وشراء اور اس قسم کے دوسرے نیابتی امور میں وکیل پر توکل کرتے ہیں، اس قسم کا توکل جائز ہے اور یہ اللہ پر توکل کے منافی نہیں ہے، خود نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیع وشراء اور اس قسم کے دیگر امور میں دوسروں کو وکیل بنایا۔

ثالثاً: غیر اللہ کو سبب قرار دیتے ہوئے اس پر قدرے اعتماد کرتے ہوئے توکل کرنا اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا۔ جس طرح کہ اکثر لوگ تحصیل معاش کے لیے حکمرانوں اور بااختیار لوگوں پر توکل کیا کرتے ہیں، یہ شرک اصغر کی ایک قسم ہے۔

[عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ] ..... جب حکم کو کسی وصف کے ساتھ معلق کیا جائے تو وہ اس وصف کی علیت پر دلالت کرتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ یہ آیت اس طرح کیوں نہیں اتری: (وتوكل على القوى العزيز) اس لیے کہ اس جگہ بظاہر قوت اور عزت زیادہ مناسب لگتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جن بتوں پر لوگ اعتماد کیا کرتے تھے جب انہیں مردوں کی حیثیت حاصل تھی، تو پھر یہی کہنا مناسب تھا کہ ان مردوں کو چھوڑ کر اس زندہ پر توکل کیجئے جو کبھی نہیں مرے گا۔ جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۝﴾ (النحل: ۲۰۔۲۱)

''جنہیں یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود پیدا کیے گئے ہیں، وہ مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں اور انہیں تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔''

ویسے دوسری آیت میں اس طرح بھی فرمایا گیا ہے:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ﴾ (الشعراء: ۲۰۷)

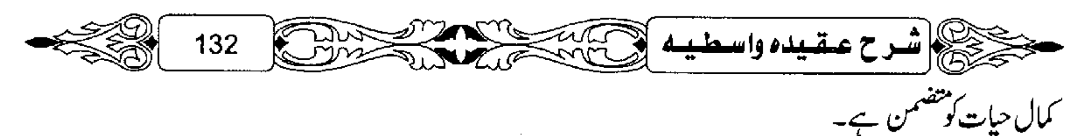
''اور توکل کیجئے بڑے غالب اور بڑے رحم کرنے والے پر۔''

اس لیے کہ اس سیاق میں عزیزیت زیادہ مناسب ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿الْحَيّ﴾ ایسا اسم ہے جو حیات کی تمام صفات کاملہ کو متضمن ہے اور اس کی حیات کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اعتماد کیے جانے کے اہل ہے۔

[لَا يَمُوْتُ] ..... یعنی کمال حیات کی وجہ سے اسے موت نہیں آئے گی، اس کا ماقبل کے ساتھ تعلق مقصود بہ ہے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ یہ حیات کامل ہے۔ جسے کبھی فنا نہیں ہونا۔

اس آیت میں اسمائے رب تعالیٰ میں سے ﴿الْحَيّ﴾ کا ذکر ہوا ہے، جبکہ صفات میں سے حیات اور انتفاء موت کا، جو کہ



کمال حیات کو متضمن ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال علیم و حکیم

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَوْلُهُ: ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (التحریم: ۲) ......))

''اور وہ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

شرح:......[وَهُوَ الْعَلِيْمُ] ...... گزشتہ صفحات میں علم کی تعریف گزر چکی ہے، اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ علم صفت کمال ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

[الْحَكِيْمُ] ...... یہ مادہ (ح ک م) حکم اور احکام پر دلالت کرتا ہے، پہلی صورت حکیم بمعنی حاکم ہوگا، جبکہ دوسری صورت میں حکیم، محکم کے معنی میں ہے، دریں حالات یہ اسم کریم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حکم اللہ کے لیے ہے اور یہ کہ اللہ موصوف بالحکمت ہے، اس لیے کہ احکام، اتقان سے عبارت ہے اور اتقان کا معنی ہے: کسی چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا، اس آیت میں حکم کا بھی اثبات ہے اور حکمت کا بھی۔

اللہ تعالیٰ اکیلا ہی حاکم ہے پھر اللہ کا حکم یا تو کونی ہوتا ہے یا شرعی۔

اس کا شرعی حکم تو وہ ہے جسے اس کے رسول لے کر تشریف لائے اور اس کے ساتھ شرائع دین پر مشتمل اس کی کتابیں بھی اتریں۔

اور اس کا کونی حکم، اس کا وہ فیصلہ ہے، جو اس نے اپنے بندوں کی تخلیق، رزق، زندگی، موت اور زق جیسے دیگر امور کے بارے میں کیا۔ حکم شرعی کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ﴾ (الممتحنة: ۱۰)

''یہ اللہ کا فیصلہ ہے جس کے ساتھ وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔''

اور حکم کونی کی دلیل اللہ تعالیٰ کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ایک بھائی کے بارے میں یہ ارشاد ہے:

﴿فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۝﴾

(یوسف: ۸۰)

''میں تو اس جگہ سے ہرگز نہیں ہٹوں گا یہاں تک کہ میرے باپ مجھے اجازت دے دیں یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

رہا یہ ارشاد باری ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ۝﴾ (التین: ۸) ''کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟'' تو یہ حکم شرعی اور حکم کونی دونوں کو شامل ہے، اللہ حکم کونی میں بھی حکیم ہے اور حکم شرعی میں بھی، نیز وہ ان دونوں کو احکام بھی دینے



والا ہے اس کا ہر حکم حکمت کے موافق ہوا کرتا ہے، مگر ہم اس کی بعض حکمتوں کو جانتے ہیں جبکہ بعض کو نہیں جانتے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (الاسراء: ۸۵) ''تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔''

حکمت کی اقسام

پھر حکمت کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: کسی چیز کے اس کی کیفیت اور اس کی موجودہ حالت پر ہونے کی حکمت، مثلاً نماز، جو کہ بہت بڑی عبادت ہے، اس کی ادائیگی سے قبل حدث اصغر اور حدث اکبر سے طہارت حاصل کی جاتی ہے، اسے قیام، قعود رکوع اور سجود جیسی معیات معینہ پر ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے جو کہ عام طور پر نمو پانے والے مال کا کچھ حصہ ضرورت مندوں کو دے کر ادا کی جاتی ہے یا ان لوگوں کو دی جاتی ہے جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ بعض مؤلفة القلوب۔

دوسری قسم: حکم کی غرض وغایت: اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کے لائق ستائش مقاصد اور جلیل القدر ثمرات ہوا کرتے ہیں۔ آپ حکم کونی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا مشاہدہ کریں کہ لوگوں کو بڑے بڑے مصائب میں مبتلا کرنے کے بھی قابل ستائش مقاصد ہوا کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

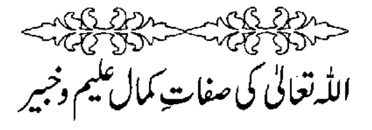
﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (الروم: ۴۱)

''لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا تا کہ وہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید کہ وہ واپس لوٹ آئیں۔''

اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کسی حکمت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ وہ محض اس کی مشیت کا مظہر ہوتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ عزوجل کے ناموں میں سے العلیم اور الحکیم کا ذکر ہے اور اس کی صفات میں سے علم وحکمت کا۔

یہ آیت اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر ایمان رکھنے سے اس کے کونی اور شرعی احکام پر طمانینت تامہ حاصل ہوتی ہے۔ دل کی بے قراری ختم ہوتی ہے اور شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا صدور علم وحکمت سے ہوتا ہے۔



اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال علیم وخبیر

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقوله: ﴿الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ (التحريم: ٣) ......)) ''علم والا، باخبر۔''



شرح:..... [اَلْعَلِیْمُ] اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔

[اَلْخَبِیْرُ] ..... امور کے اندروں کو بخوبی جاننے والا، یہ وصف اعم کے بعد وصف اخص ہے، یعنی امور کے ظاہر کا علم رکھنے والا اور ان کے اندروں سے باخبر، اسی طرح اندروں کے علم کا دو دفعہ ذکر ہوا، ایک دفعہ بطریق عموم اور دوسری دفعہ بطریق خصوص، تاکہ کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ رب تعالیٰ کا علم ظواہر کے ساتھ مختص ہے۔

عام کے بعد خاص جس طرح معانی میں ہوتا ہے، اسی طرح اعیان میں بھی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا﴾ (القدر: ٤) ''اس رات ملائکہ اور روح اترتے ہیں۔''

روح سے مراد جبرئیل امین علیہ السلام ہیں اور ان کا شمار بھی فرشتوں میں ہوتا ہے، جبرئیل علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ ان کے عز وشرف کا اظہار ہے، اس طرح ان کا ذکر دو دفعہ ہوا، ایک دفعہ بالعموم اور دوسری دفعہ بالخصوص۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو کا ذکر ہوا ہے: یعنی العلیم اور الخبیر کا اور صفات میں سے: علم اور خبر کا۔ اور اس نے فائدہ یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کے علیم وخبیر ہونے پر ایمان رکھنے سے انسان کے دل میں اللہ کے خوف وخشیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ مخفی طور پر بھی اور اعلانیہ طور پر بھی۔

صفت علم اور اس پر دلائل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَوْلِهِ : ﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا﴾ (سباء: ٢) ......))

''وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، اور جو اترتا ہے آسمان سے اور جو چڑھتا ہے اس میں۔''

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ (الانعام: ٥٩)

''اور اسی کے پاس ہیں چابیاں غیب کی جسے اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے۔ اور نہیں گرتا کوئی بھی پتہ مگر وہ اسے جانتا ہے اور نہ ہی کوئی دانہ ہے زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک، مگر وہ کھلی کتاب میں درج ہیں۔''

﴿وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ (فاطر: ١١)

''اور نہیں حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ اسے جنتی ہے مگر یہ اس کے علم میں ہوتا ہے۔''

وَقَوْلِهٖ: ﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (الطلاق: ١٢)



''تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اور یقیناً اللہ نے ہر چیز کو از روئے علم کے گھیر رکھا ہے۔''

شرح:...... یہ قرآنی آیات اللہ تعالیٰ کی صفت علم کی تفصیل فراہم کرتی ہیں۔

پہلی آیت: [يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا]

..... (ما) اسم موصول ہے، اور یہ عموم کا فائدہ دیتا ہے، مثلاً بارش، زمین میں بویا جانے والا غلہ، مردے، کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں وغیرہ۔ ﴿وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا﴾ مثلاً پانی اور کھتیاں وغیرہا۔ ﴿وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ﴾ مثلاً بارش، وحی، ملائکہ اور اللہ کے احکام۔ ﴿وَ مَا يَعْرُجُ فِيهَا﴾ مثلاً اعمال صالحہ، فرشتے، روحیں اور دعا وغیرھم۔

اس جگہ فرمایا گیا: ﴿وَ مَا يَعْرُجُ فِيهَا﴾ یعنی فعل کو (فی) کے ساتھ متعدی کیا گیا، جبکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ﴾ (المعارج: ٤) ''فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں۔''

یہاں اسے (الی) کے ساتھ متعدی کیا گیا، اور اصل استعمال یہی ہے۔

سوال: اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جگہ (یعرج) کو (فی) کے ساتھ متعدی کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس قسم کی مثالوں میں کوفی اور بصری علماء نحو کا اختلاف رہا ہے۔ بصری نحویوں کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں فعل کو معنوی طور پر حرف سے ہم آہنگ کیا جائے گا، جبکہ نحاۃ کوفہ کے بقول حرف کو وہ معنی دیا جائے گا جو فعل کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

بنابریں پہلی رائے کے مطابق (یعرج فیھا) (یدخل) کے معنی پر مشتمل ہوگا، اور اس کا معنی یوں بنے گا: (وما یعرج فیدخل فیھا) اس بناء پر آیت دو چیزوں پر دلالت کرے گی، عروج پر اور دخول پر۔

جبکہ دوسری رائے کے مطابق (فی) کو (الی) کے معنی میں لیا جائے گا اور یہ تناوب بین الحروف کے باب سے ہوگا، مگر اس قول کی رو سے آیت میں کوئی نیا معنی پیدا نہیں ہوتا، آپ کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ لفظ (الی) کو لفظ (فی) میں تبدیل کر دیں گے۔ اسی بناء پر پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اور وہ یہ کہ فعل کو حرف سے مناسب معنی پر مشتمل قرار دے دیا جائے۔

عربی زبان میں اس کی نظیر موجود ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (الانسان: ٦) ''ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پیں گے۔''

حالانکہ پیا تو برتن کے ساتھ جاتا ہے اور چشمے سے پیا جاتا ہے۔ اہل کوفہ کی رائے کے مطابق کہا جائے گا کہ اس جگہ (با) (من) کے معنی میں ہے...... یعنی: منھا، جبکہ اہل بصرہ کی رائے کے مطابق (یشرب) کو ایسے معنی پر مشتمل مانا جائے گا جو حرف (باء) سے مطابقت رکھتا ہو، اور وہ معنی ہے: یُروی ''سیراب کیا جانا'' اور یہ معلوم ہی ہے کہ سیرابی، پینے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح فعل کو اس کی غایت کے معنی پر مشتمل قرار دیا گیا جو کہ ری ''سیرابی'' ہے۔

اس طرح ہم ﴿وَ مَا يَعْرُجُ فِيهَا﴾ کے بارے میں بھی کہیں گے کہ آسمان میں داخلہ اس کی طرف عروج کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے، اس طرح فعل کو اس کی غایت کے معنی پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔



آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قدرے تفصیل کے ساتھ ہر چیز کے بارے میں اپنے علم کا ذکر کیا۔

پھر دوسری آیت میں اس کی مزید تفصیل فراہم کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّ رَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍo ﴾

[عِنْدَهٗ]..... یعنی اللہ کے پاس، یہ خبر مقدم ہے اور (مفاتح) مبتدا مؤخر۔

یہ ترکیب حصر اور اختصاص کا فائدہ دیتی ہے، یعنی غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں کسی اور کے پاس نہیں، پھر اس حصر کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ گویا اس حصر کو دو طریقوں سے ثابت کیا گیا۔ تقدیم و تاخیر کے طریقہ سے اور نفی و اثبات کے طریقہ سے۔

[مَفَاتِحُ] ..... کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ مِفْتَح (میم کی زیر اور تاء کی زبر کے ساتھ) کی جمع ہے بمعنی چابی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مفتاح کی جمع ہے مگر اس سے یاء کو حذف کر دیا گیا ہے مگر یہ استعمال قلیل ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ یہ مَفْتَح (میم کی زبر اور تاء کی زیر کے ساتھ) کی جمع ہے، بمعنی خزانے ﴿مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ یعنی غیب کے خزانے۔ ﴿مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ کا معنی: مبادئ الغیب بھی کیا گیا ہے۔

[الْغَيْبِ] ..... غاب، یغیب غیبا سے مصدر ہے اور غیب سے مراد غائب ہے، غیب نسبی امر ہے مگر غیب مطلق کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

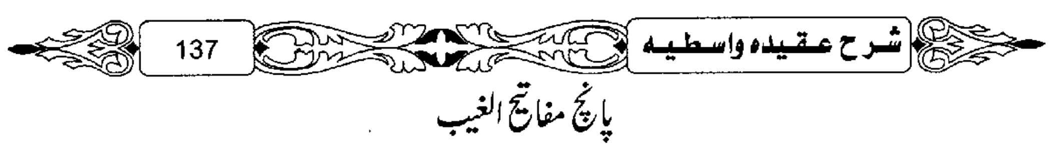
الغرض! مفاتح سے مراد مبادئ ہوں، خزائن ہوں، یا پھر چابیاں، ان کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اس کے علاوہ نہ کسی فرشتے کے پاس ہے اور نہ کسی رسول کے پاس۔ یہاں تک اشرف الملائکہ، جبرئیل علیہ السلام نے اشرف الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''مجھے قیامت کے بارے میں بتائیں۔'' تو آپ نے فرمایا: ''قیامت کے بارے میں مسئول سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔''❶ جس کا معنی یہ ہے کہ اگر تمہیں قیامت کا علم نہیں ہے تو مجھے بھی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مجھے قیامت کا علم ہے، تو وہ کافر و کاذب ہے اور اس کی تصدیق کرنے والا بھی کافر ہے، اس لیے کہ وہ قرآن کی تکذیب کرتا ہے۔

مخلوقات میں کلام اللہ کے سب سے بڑے عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر یہ آیت پڑھ کر فرمائی: [اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌo] (لقمان: ٣٤) ❷ ''بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ (ماؤں کے) رحموں میں ہے اور کسی جان کو یہ معلوم نہیں کہ اسے آئندہ کل کیا کرنا ہے اور نہ ہی کسی جان کو یہ معلوم ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گی۔''

---

❶ اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

❷ صحیح بخاری: ٤٧٧٨ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ.



پانچ مفاتیح الغیب

یہ کل پانچ چیزیں ہیں:

۱۔ **قیامت کا علم:** ...... یہ اخروی زندگی کی چابی کا آغاز ہے، اسے اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک عظیم گھڑی ہے جس کے ساتھ سب لوگوں کی تہدید کی جاتی ہے۔ قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب آئے گی۔

۲۔ **بارش اتارنا:** ......﴿وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ الغيث: مصدر ہے، جس کا لفظی معنی ہے: سختی کا ازالہ کرنا۔

اور مراد اس سے بارش ہے، اور یہ اس لیے کہ بارش کی وجہ سے قحط اور خشک سالی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جب اللہ ہی بارش برساتا ہے تو اس کے برسنے کے وقت کا بھی اسے ہی علم ہے۔

باران رحمت کا نزول زمین کی زندگی کی چابی ہے، جس سے زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے، جانوروں کو وافر مقدار میں خوراک ملتی اور انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔

نکتہ: ...... اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ فرمایا: "ینزل المطر" نہیں فرمایا، اس لیے کہ کبھی بارش تو برستی ہے مگر اس سے زمین میں کچھ نہیں اگتا، اس سے نہ تو زمین سیراب ہوتی ہے اور نہ ہی اسے زندگی ملتی ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ: "بارش نہ ہونے سے قحط نہیں پڑتا، قحط اس لیے پڑتا ہے کہ بارش تو برسے مگر زمین کچھ نہ اُگائے۔" ❶

۳۔ **مافی الارحام کا علم:** ...... شکم مادر میں کیا ہے؟ اس کا علم بھی صرف اللہ کو ہے۔ "الارحام" سے مراد ماؤں کے پیٹ ہیں، ان کا تعلق اولاد آدم سے ہو یا کسی اور جنس سے، شکم مادر میں جو کچھ بھی ہے اسے وہی جانتا ہے جو اس کا خالق ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ آج کل شکم مادر میں ہی بچے کی جنس کا پتا لگایا جا سکتا ہے کیا یہ بات درست ہے؟

یہ امر واقع ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں، مگر اس کا علم جنین کی تکوین اور اس کی جنس کے ظہور کے بعد ہوتا ہے جبکہ جنین کے کئی دیگر احوال کا انہیں کچھ علم نہیں ہوتا، مثلاً: وہ پیدا ہونے کے بعد کب تک زندہ رہے گا؟ نیک ہوگا یا بد؟ غنی ہوگا یا فقیر...... الغرض! مخلوق کو جنین سے متعلقہ اکثر باتوں کا علم نہیں ہوتا، لہٰذا ﴿وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ میں عموم مبنی برصداقت ہے۔

٤۔ **آئندہ کل کا علم:** ......﴿وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ اور جب انسان اپنے بارے میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کچھ کمائے گا تو وہ دوسروں کے بارے میں ایسا بطریق اولیٰ نہیں جانتا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے اپنے کل کے بارے میں معلوم ہے کہ میں فلاں جگہ جاؤں گا، اپنے قرابت داروں سے ملاقات کروں گا، اور فلاں کام کروں گا...... اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ کچھ کرنے کا پروگرام تو بنا سکتا ہے مگر کبھی کوئی ایسی رکاوٹ آڑے آتی ہے کہ وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

۵۔ **موت کی جگہ کا علم:** ......﴿وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ اسے اپنی زمین

❶ صحیح مسلم: ٢٩٠٤ عن ابی هريرة رضي الله عنه.



زمین میں موت آئے گی یا کسی اور زمین میں، وہ مسلمانوں کی زمین میں مرے گا یا کافروں کی زمین میں۔ اسے اس کا بھی علم نہیں کہ وہ خشکی میں مرے گا یا کسی سمندر میں، یا فضا میں ہی موت آ جائے گی؟

یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے موت کس وقت آئے گی، اس لیے کہ جب اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کون سی زمین میں مرے گا، حالانکہ وہ زمین کے بارے میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کر سکتا ہے۔ تو اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سے وقت اور کون سی گھڑی میں لقمہ اجل بن جائے گا۔

یہ پانچ چیزیں غیب کی چابیاں ہیں جن کا علم صرف اللہ کے پاس ہے انہیں ﴿مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ مافی الارحام کا علم دنیوی زندگی کی چابی ہے، کل کی کمائی کا علم مستقبل کے عمل کی چابی اور کسی مخصوص قطعہ ارضی میں مرنے کا علم اخروی زندگی کی چابی ہے۔ اس لیے کہ انسان موت کے فوراً بعد عالم آخرت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ تمام چابیاں اپنے مابعد کی ہر چیز کے لیے مبادیٔ اور اسباب ہیں۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ ''یقیناً اللہ علیم وخبیر ہے۔''

پھر فرمایا گیا: [وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ] .... ''وہی جانتا ہے کہ خشکی اور سمندر میں کیا ہے۔'' یہ اجمال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ سمندر میں موجود، حیوانات، حشرات، اشجار اور آبی حیات کی دیگر مختلف اجناس کو کوئی بھی شمار نہیں کر سکتا، کہا جاتا ہے کہ خشکی کے مقابلہ میں سمندر میں تین گنا زیادہ مختلف اجناس پائی جاتی ہیں اور یہ اس لیے کہ زمین کا زیادہ حصہ پانی پر مشتمل ہے۔

[وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّ رَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا] ..... ''وہ درخت کے گرنے والے ہر پتے کا علم رکھتا ہے۔''

یہ ہے اس اجمال کی تفصیل، کسی بھی درخت سے گرنے والا ہر پتہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا قریب ہو یا بعید، اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ (ما) نافیہ اور (من) زائدہ ہے جسے ہر گرنے والے پتے کا علم ہے وہ تخلیق کردہ پتے کا بطریق اولیٰ علم رکھتا ہے۔

اس سے آپ اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، وہ کائنات میں موجود ہر شے کا عالم ہے حتیٰ کہ جو چیز ابھی تک معرض وجود میں نہیں آئی اسے اس کا بھی بخوبی علم ہے۔

[وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ]..... (الانعام: ٥٩) زمین کی تاریکیوں میں پنہاں چھوٹے سے چھوٹا دانہ جس تک آنکھ کی رسائی نہیں ہے، وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔

[ظُلُمٰتِ] ..... یہ ظلمة کی جمع ہے، فرض کریں ایک چھوٹا سا دانہ برستی بارش والی تاریک رات میں سمندر کی گہرائی میں پڑا ہو اور اسے کئی تاریکیوں نے اپنے اندر چھپا رکھا ہو، مثلاً مٹی کی تاریکی، پانی کی تاریکی، بارش کی تاریکی، بادل کی تاریکی اور پھر رات کی تاریکی، زمین کی ان پانچ تاریکیوں کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس دانے کا علم بھی رکھتا ہے اور اسے دیکھتا بھی ہے۔

[وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ] ..... ''دنیا میں موجود ہر چیز خشک ہوگی یا تر۔''

[اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ] ..... (کتاب) مکتوب کے معنی میں ہے۔ (مبین) یعنی ظاہر کرنے والی اور خود ظاہر، اس

لیے کہ (أبان) متعدی بھی استعمال ہوتا ہے اور لازم بھی کہا جاتا ہے، أبان الفجر فجر ظاہر ہوگئی، اور ابان الحق، اس نے حق ظاہر کر دیا۔ اس جگہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

یہ سب چیزیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو معلوم ہیں اور اس کے پاس لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا تو اسے حکم دیا: لکھ۔ اس نے کہا: کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا: وہ سب کچھ لکھ دے جو روز قیامت تک ہونے والا ہے۔''[1] چنانچہ اس نے اس وقت وہ سب کچھ لکھ ڈالا جو قیامت تک ہونے والا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ہاتھوں میں کتابیں تھما دیں جن میں وہ انسان کے اعمال لکھا کرتے ہیں، اس لیے کہ جو کچھ لوح محفوظ میں ہے، اس میں وہ کچھ لکھا گیا ہے جو انسان کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور جو تحریر فرشتے لکھتے ہیں، یہ وہ ہے جس کا انسان کو بدلہ دیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ فرماتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ﴾ (محمد: ۳۱)

''اور ہم تم کو ضرور آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم جان لیں تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو۔''

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس کا فلاں بندہ صبر کرے گا یا نہیں کرے گا؟ تو اس کا اسے پہلے سے علم ہے مگر اس پر ثواب وعقاب مرتب نہیں ہوتا۔

تیسری آیت: [وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ (فاطر: ۱۱)]..... (ما) نافیہ ہے، اور (أنثی) (تحمل) کا فاعل ہے، مگر اسے اس کے آخر میں ضمہ مقدرہ کے ساتھ اعراب دیا گیا ہے جس کے ظہور سے محل اعراب کا زائد حرف جر کی حرکت کے ساتھ مشغول ہونا مانع ہے۔

اشکال:..... آپ حرف جر کو زائد کیسے کہہ سکتے ہیں: قرآن میں تو کوئی چیز زائد نہیں ہے؟

جواب: وہ صرف اعراب کے اعتبار سے زائد ہے، جبکہ معنی کے اعتبار سے مفید ہے۔ قرآن مجید میں ایسی کوئی زائد چیز نہیں ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو، جب ہم قرآن میں کسی چیز کو زائد کہتے ہیں تو وہ اس معنی میں زائد ہوتی ہے کہ اگر اسے حذف کر دیا جائے تو اس سے اعراب میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوگا۔

(من انثی) یہ کسی بھی مادہ کو شامل ہے، اس کا تعلق اولاد آدم سے ہو یا کسی اور حیوان سے مثلاً: گائے، اونٹنی اور بکری...... اس میں انڈے دینے والے جانور بھی شامل ہیں۔ اس لیے کہ انڈہ بھی پرندے کے پیٹ میں حمل ہی ہوتا ہے۔

﴿وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ حمل کی ابتدا بھی اللہ کے علم میں ہوتی ہے، پھر اس کی انتہا اور جنین کی پیدائش بھی اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔

چوتھی آیت: [لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا

---

[1] مسند احمد: ۳۱۷/۵۔ ابوداود: ۴۷۰۰۔ ترمذی: ۲۱۵۵۔ مستدرك حاكم: ۲۱۴۹۷۔ البیهقی، ''الاسماء والصفات'': ۸۰۴۔ آجری، ''الشریعة'': ۱۱۷۸۔ ابن ابی عاصم، ''السنة'': ۱۰۵ اس حدیث کو البانی نے ''الصحیحه: ۱۳۳'' میں اور ''السنة'' لابن ابی عاصم: ۱/ ۴۸، ۴۹ میں صحیح کہا ہے۔



(الطلاق : ۱۲)]......﴿لِتَعْلَمُوْا﴾ لام تعلیل ہے، اسی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (الطلاق : ۱۲)

''اللہ تو وہ ہے جس نے سات آسمان اور ان جیسی زمین پیدا فرمائی، ان میں اللہ کا حکم اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس نے سات آسمان اور سات زمینیں پیدا فرمائیں اور اس سے ہمیں آگاہی بخشی، تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ''بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

قدرت ایک ایسا وصف ہے جس کی وجہ سے فاعل جو کچھ کرنا چاہتا ہے بغیر کسی بے بسی کے وہ کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ معدوم کو وجود عطا کرنے اور موجود کو معدوم کر دینے پر قادر ہے، کسی وقت نہ آسمان تھے اور نہ زمین، پھر اللہ نے انہیں پیدا فرمایا اور انہیں انوکھے نظام پر وجود بخشا۔

[وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا] ..... یعنی اس کے علم نے ہر چھوٹی بڑی چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔ جو کچھ اس کے اپنے فعل سے متعلق ہے یا جو کچھ اس کے بندوں کے افعال سے متعلق ہے، وہ ماضی میں ہو یا حال میں یا پھر مستقبل، میں اس نے اس سب کچھ کا از روئے علم احاطہ کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم وقدرت کا خلق کے بعد ذکر فرمایا، اس لیے کہ تخلیقی عمل علم وقدرت کے ساتھ ہی تکمیل کو پہنچتا ہے، علم وقدرت پر خلق کی دلالت، دلالت تلازم کے باب سے ہے، اور قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ اسماء کی صفات پر دلالت تین قسم کی ہوا کرتی ہے۔

صاحب تفسیر جلالین کا مناقشہ

تنبیہ:...... تفسیر جلالین میں سورۂ مائدہ کے آخر میں لکھا ہے: ''عقل کے فیصلہ کی رو سے ذات باری تعالیٰ اس سے مستثنیٰ ہے اللہ اس پر قادر نہیں ہے۔''

ہم اس کلام کا دو طرح سے مناقشہ کریں گے۔

۱۔ ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کے بارے میں عقل کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتی بلکہ وہ کسی بھی غیبی امر کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتی، غیبی امور کے بارے میں وظیفہ عقل مکمل طور پر تسلیم کر لینا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان امور کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ محال نہیں ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: نصوص شرعیہ محال اشیاء پیش نہیں کرتیں محیر العقول اشیاء پیش کرتی ہیں۔

اس لیے کہ وہ ایسی باتیں بتاتی ہیں جن کا آپ نہ ادراک کر سکتے ہیں اور نہ تصور کر سکتے ہیں۔

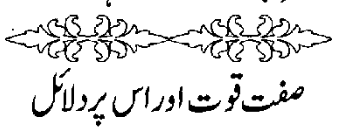
۲۔ مؤلف تفسیر جلالین کا یہ کہنا کہ: ''اللہ اس پر قادر نہیں ہے۔'' ایک سنگین غلطی ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ غیر پر تو

قادر ہو مگر اپنے آپ پر قادر نہ ہو، ان کی اس بات سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ نہ مستوی ہونے پر قادر ہے، نہ کلام کرنے پر اور نہ ہی آسمان دنیا کی طرف نزول فرمانے پر۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں نقص پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ چیز تو عموم میں داخل ہی نہیں تھی کہ اس کے اخراج اور تخصیص کی ضرورت پیش آتی۔ اس لیے کہ قدرت کا تعلق صرف اشیاء ممکنہ کے ساتھ ہے، اس لیے کہ غیر ممکن کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے، نہ خارج میں اور نہ ہی ذہن میں، علم کے برخلاف قدرت کا امر مستحیل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

انسان کے لیے شان ربوبیت سے متعلقہ امور میں ادب واحترام کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے، اس لیے کہ یہ ایک عظیم مقام ہے اس حوالے سے انسان کی ذمہ داری صرف سر تسلیم خم کرنا اور سلامتی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔

دریں صورت ہم ان چیزوں کو مطلق ہی رکھیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مطلق رکھا ہے، اور ہم بدون استثنٰی اس بات کا اعتراف کریں گے کہ: ''اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' ان آیات میں اللہ رب العزت کی جن صفات کا ذکر ہوا ہے وہ ہیں: تفصیلی انداز میں اللہ تعالیٰ کے علم کے عموم کا اثبات اور قدرت باری تعالیٰ کے عموم کا اثبات۔ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت پر ایمان رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ڈر اور مراقبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔



صفت قوت اور اس پر دلائل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((......﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (الذاریات: ٥٨) ......))

''یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا ہے، قوت والا ہے، مضبوط ہے۔''

شرح:...... اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے صفت قوت کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس آیت سے قبل فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ○ مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ○﴾ (الذاریات: ٥٦۔ ٥٧) ......

''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں، میں نہ تو ان سے رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔'' یعنی لوگ اللہ کے رزق کے محتاج ہیں، وہ ان سے نہ تو رزق چاہتا ہے اور نہ یہ کہ وہ اسے کھلائیں پلائیں۔

[الرَّزَّاقُ] ...... رزق سے مبالغہ کا صیغہ ہے، جو کہ عطاء سے عبارت ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ﴾ (النساء: ٨)

''اور جب تقسیم کے وقت قرابت دار، یتیم اور مسکین، حاضر ہوں تو انہیں بھی اس سے دو۔''

انسان اللہ تعالیٰ سے دوران نماز یہ دعا کرتا ہے: ''میرے اللہ! مجھے رزق عطا فرما۔''



رزق کی اقسام

رزق کی دو قسمیں ہیں: رزق عام اور رزق خاص۔

رزق عام ...... ہر وہ رزق ہے جس سے بدن فائدہ اٹھاتا ہے، وہ حلال ہو یا احرام، اور مرزوق مسلمان ہو یا کافر۔ اسی لیے سفارینی فرماتے ہیں:❶

وَالــرِّزْقُ مَــا يَـنْـفَعُ مِنْ حَلَالِ　　　أَوْ ضِـدُّهُ فَـحُـلْ عَـنِ الْمُحَـالِ

لِأَنَّــــهُ رَازِقُ كُـلِّ الْـخَـلْـقِ　　　وَلَيْـمْــسَ مَـخْـلُوْقٌ بِغَيْرِ رِزْقِ

''رزق وہ ہے جو فائدہ دے وہ حلال ہو یا حرام مگر تو حرام سے دور رہ، اس لیے کہ وہ ساری مخلوق کا رازق ہے اور کوئی بھی مخلوق رزق کے بغیر نہیں ہے۔''

یہ اس لیے ہے کہ اگر آپ رزق سے مراد عطاء حلال لیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حرام کھانے والوں کو رزق نہیں ملتا، حالانکہ اللہ نے انہیں وہ سب کچھ دے رکھا ہے جس سے ان کی بدنی اصلاح ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رزق دو طرح کا ہوتا ہے: طیب بھی اور خبیث بھی۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف : ٣٢)

''ان سے پوچھیں کہ اللہ کی بنائی ہوئی زینت کی چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور اس کا پیدا کردہ پاکیزہ رزق۔''

اللہ تعالیٰ نے ﴿وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ فرمایا ہے، صرف الرزق نہیں فرمایا جہاں تک رزق خبیث کا تعلق ہے تو وہ حرام ہے۔

رہا رزق خاص، تو اس سے مراد وہ رزق ہے جس کی وجہ سے دین قائم رہتا ہے، مثلاً علم نافع عمل صالح اور رب تعالیٰ کی اطاعت کے لیے معین و مددگار بننے والے دیگر امور۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (الــرزاق) فرمایا ''رازق'' نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس کے رزق کی بھی بہتاب ہے اور جنہیں وہ رزق دیتا ہے ان کی بھی کوئی کمی نہیں، وہ جنہیں رزق عطا کرتا ہے ان کی تعداد اور انواع واجناس کا کوئی شمار نہیں۔

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا﴾ (هود : ٦)

''اور زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی بھی نہیں ہے مگر اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، اور وہ اس کے رہنے اور سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ سب کو ان کے حسب حال رزق عطا کرتا ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب رزاق اللہ تعالیٰ ہے تو کیا مجھے حصول رزق کے لیے بھاگ دوڑ کرنی چاہیے یا پھر میں گھر میں پڑا رہوں اور رزق میرے پاس از خود آتا رہے گا؟

❶ ابن مانع: الكواكب الدرية : ٣٧.

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو حصول رزق کے لیے کوشاں رہنا چاہیے، اگر اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والا ہے تو اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ مغفرت کی امید پر اعمال صالحہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ رہا شاعر کا یہ قول کہ:

جُنُوْنٌ مِنْكَ أَنْ تَسْعَى لِرِزْقٍ　　　وَيُرْزَقُ فِيْ غِشَاوَتِهِ الْجَنِيْنُ

''جب شکم مادر میں بچے کو رزق ملتا ہے تو پھر تیری طرف سے اس کے حصول کی کوشش کرنا پاگل پن ہے۔''

تو یہ باطل ہے، جہاں تک جنین کو رزق فراہم کیے جانے سے استشہاد کا تعلق ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے تلاش رزق کا مطالبہ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس پر قدرت ہی نہیں رکھتا۔ جو اس پر قادر ہے اس کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِزْقِهٖ﴾ (الملك: ١٥)

''وہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نرم بنایا، تو اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اس کے رزق سے کھاؤ پیو۔''

حصول رزق کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ البتہ یہ کوشش شریعت کے دائرہ میں رہ کر ہونی چاہیے۔

[ذُو الْقُوَّةِ] ..... قوت ایک ایسی صفت ہے، جسے فاعل کام میں لاتے ہوئے بغیر کسی کمزوری کے اپنے فعل کو سرانجام دے سکے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً﴾ (الروم: ٥٤)

''اللہ تو وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت عطا کی۔''

قوت، قدرت سے الگ ایک دوسری چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا﴾ (فاطر: ٤٤)

''اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکتی آسمانوں میں اور نہ زمین ہیں، یقیناً وہ خوب علم والا، بڑی قدرت والا ہے۔''

قدرت کے مقابلے میں عجز جبکہ قوت کے بالمقابل ضعف آتا ہے اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ قدرت کے ساتھ صرف ذی شعور کو موصوف کیا جا سکتا ہے جبکہ قوت کے ساتھ ذی شعور کے ساتھ غیر ذی شعور کو بھی موصوف کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قوت، قدرت سے خاص ہے، ذی شعور میں سے ہر قوی قادر ہوتا ہے مگر ہر قادر قوی نہیں ہوتا، مثلاً آپ آندھی کو قوی تو کہہ سکتے ہیں مگر اسے قادر نہیں کہہ سکتے، آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ لوہا قوی ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ لوہا قادر ہے، مگر ذی شعور کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ قوی ہے یا وہ قادر ہے۔

جب قوم عاد نے کہا: ﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (فصلت: ١٥) ''ہم سے قوت میں بڑھ کر کون ہے؟'' تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ (فصلت: ١٥)

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے قوت میں بڑھ کر ہے۔''

[الْـمَتِیْـنُ] ..... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ❶ ''متین بمعنی شدید ہے، یعنی قوت وعزت میں شدید، تمام صفات جبروت میں شدید، یہ معنی کے اعتبار سے قوی کی تاکید ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تو بتا سکتے ہیں کہ وہ شدید ہے مگر ہم اسے اس نام سے موسوم نہیں کر سکتے، بلکہ اسے متین کے نام سے موسوم کریں گے اس لیے کہ اس نے خود اس کے ساتھ اپنی ذات کو موسوم کیا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے دو ناموں الرزاق اور المتین، اور تین صفات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہیں: رزق، قوت اور جس صفت پر اسم ''متین'' مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت قوت اور رزق کا فائدہ یہ ہے کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ سے ہی قوت اور رزق کا سوال کریں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ کوئی قوت جتنی بھی بڑی ہو وہ اللہ تعالیٰ کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

آیت لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اور اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا پر بحث

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں (ارشاد باری تعالیٰ ہے):

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا﴾ (النساء: ۵۸)

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے ساتھ اچھی نصیحت کرتا ہے، بیشک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

شرح: ..... مؤلف پہلی آیت کو اللہ تعالیٰ کے دو ناموں کے اثبات اور اس صفت کے اثبات کے لیے لائے ہیں جس پر یہ دونوں نام مشتمل ہیں، اور وہ دو نام ہیں: السَّمِیْع اور الْبَصِیْر اور اس میں معطلہ کی تردید ہے۔

[لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ] ..... یہ نفی ہے اور صفات سلبیہ میں سے ہے، اور اس سے مقصود کمال باری تعالیٰ کا اثبات ہے۔ یعنی اس کے کمال کی وجہ سے اس کی مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز اس کے مماثل نہیں ہے، اس قرآنی جملہ میں اہل تمثیل کا ردّ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے سمع وبصر کا ثبوت

[وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ] ..... (السَّمِیْع) کے دو معنی ہیں، مجیب اور آواز سننے والا، سمیع بمعنی مجیب کی مثال کے طور پر اس ارشاد باری تعالیٰ کو پیش کیا جاتا ہے:

﴿اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ﴾ (ابراهیم: ۳۹) یعنی ''میرا رب دعا قبول کرنے والا ہے۔''

جہاں تک سمیع بمعنی ادراک الصوت کا تعلق ہے تو اس کی کئی قسمیں ہیں:

❶ اسے بیہقی نے الاسماء والصفات: ۶۸ میں اور سیوطی نے درمنثور: ۶/ ۱۴۲ میں ذکر کیا اور اسے ابن ابی حاتم کی طرف منسوب کیا۔

الاول: ایسی سماعت جس سے یہ بتانا مقصود ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر آواز کو سنتا ہے۔

الثانی: ایسی سماعت جس سے تائید ونصرت مراد ہو۔

الثالث: ایسی سماعت جس سے وعید وتہدید مقصود ہو۔

پہلی قسم کی مثال: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ (المجادلۃ: ۱) ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے خاوند کے بارے میں آپ سے جھگڑا کر رہی تھی اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کر رہی تھی'' اس ارشاد ربانی میں اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سماعت نے ہر مسموع کا احاطہ کر رکھا ہے، اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: ''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی سماعت تمام آوازوں کو محیط ہے، بیشک میں حجرہ میں تھی اور اس کی کچھ باتیں مجھے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔''

دوسری قسم کی مثال: موسیٰ وہارون کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ (طٰہٰ: ٤٦) ''بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔''

تیسری قسم کی مثال: قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ﴾ (الزخرف: ۸۰)

''کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی مخفی باتوں اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے ہیں کیوں نہیں، ان کے پاس موجود ہمارے فرشتے لکھتے چلے جاتے ہیں۔''

اس سے مقصود ان کی اس بات پر سرزنش کرنا ہے کہ وہ چھپے چھپے غیر پسندیدہ باتیں کیا کرتے تھے۔ سمع بمعنی ادراک مسموع کا شمار اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ میں ہوتا ہے، اگرچہ مسموع کبھی حادث بھی ہوا کرتا ہے۔ سمع بمعنی تائید ونصرت کا شمار صفات فعلیہ میں ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ کسی سبب کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں۔ سمع بمعنی اجابت کا شمار بھی صفات فعلیہ میں ہوتا ہے۔

[اَلْبَصِیْرُ] ..... یعنی وہ تمام مبصرات کا ادراک کرنے والا ہے، بصیر، علیم کے معنی میں بھی آتا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس معنی میں بھی بصیر ہے کہ وہ پوشیدہ سے پوشیدہ چیز کو بھی دیکھتا ہے، اور اس معنی میں بھی بصیر ہے کہ وہ بندوں کے افعال کا علم رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الحجرات: ۱۸) ''اور اللہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔''

ہمارے کچھ اعمال تو دیکھے جا سکتے ہیں، جبکہ کچھ نہیں دیکھے جا سکتے۔ اس اعتبار سے اللہ کا بصیر ہونا دو قسم کا ہے۔ اور یہ دونوں قسمیں ﴿اَلْبَصِیْرُ﴾ میں داخل ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے دو ناموں: اَلسَّمِیْعُ اور اَلْبَصِیْرُ اور تین صفات کا اثبات ہے جو کہ یہ ہیں، اس کی صفات کا نفی مماثلت سے کمال اور سمع وبصر۔

اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے ساتھ مماثل قرار دینے کی کوشش سے باز رہنا۔

اس کی عظمت وکمال سے آگاہی حاصل کرنا اور اس بات سے خبردار رہنا کہ وہ تجھے اپنی معصیت کرتے دیکھے یا تیری زبان سے کوئی غیر پسندیدہ بات سنے۔

یاد رہے کہ علماء نحوارشاد باری تعالیٰ: ﴿كَمِثْلِهٖ﴾ کے بارے میں لمبی چوڑی بحث کرتے رہے ہیں، ان کا ایک قول یہ ہے کاف (مثل) پر داخل ہے، جس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ: اللہ کی مثال جیسی کوئی مثال نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ﴾ فرمایا ہے، آیت کا یہ ظاہری مفہوم لفظی حیثیت سے ہے نہ کہ معنوی حیثیت سے، اس لیے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ معنی کی حیثیت سے اس کا ظاہری مفہوم ہے، تو اس صورت میں ظاہر قرآن کفر ٹھہرے گا جو کہ مستحیل ہے اس آیت کی تخریج میں نحویوں کے متعدد اقوال ہیں:

پہلا قول: کاف زائدہ ہے، اور تقدیری کلام اس طرح ہے: لیس مثله شیء یہ قول اطمینان بخش ہے اس لیے کہ نفی میں حروف کی زیادتی کثیر الوقوع ہے، مثلاً: ﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى﴾ (فاطر: ١١) میں (من) زائدہ ہے ان کا کہنا ہے کہ عربی زبان میں حروف زائدہ کا استعمال عام سی بات ہے۔

دوسرا قول: یہ قول پہلے قول کے بالکل برعکس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کاف نہیں بلکہ (مثل) زائد ہے اور تقدیر کلام ہے: لیس کهو شیٔ. مگر یہ قول ضعیف ہے اس لیے کہ عربی زبان میں اسماء کا زائد ہونا قلیل الوجود ہے بخلاف حروف کے۔ اگر ہمیں کسی چیز کو زائد قرار دینا ہی ہے تو وہ حرف یعنی کاف ہونا چاہیے نہ کہ اسم۔

تیسرا قول: (مثل) صفت کے معنی ہیں اس طرح معنی ہوگا: "لیس کصفته شیئٌ" یعنی اس کی صفت جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: مِثل، مَثل، شِبہ اور شَبہ عربی لغت میں ایک ہی معنی میں آتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (محمد: ١٥) ''اس جنت کی صفت جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

اس جگہ مثل صفت کے معنی میں ہے ہمیں یہ قول صائب لگتا ہے۔

چوتھا قول: آیت میں کچھ بھی زائد نہیں ہے، البتہ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کہنے سے مثل کی نفی لازم آئے گی۔ جب مثل کی مثل نہیں ہے تو پھر موجود ایک ہی قرار پائے گا۔ اس قول کے قائلین عربی لغت سے اس کی یہ مثال پیش کرتے ہیں: "لیس کمثل الفتٰی زهیرٌ."

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر علماء نحو کی یہ بحثیں آپ کے سامنے نہ بھی پیش کی جائیں تو بھی آیت کا معنی بالکل واضح ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل نہیں ہے، ہمارے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ کاف زائدہ ہے، مگر آخری معنی زیادہ عمدہ ہے۔

[اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (النساء: ٥٨)] ...... یہ آیت قرآن مجید کی اس آیت کا تکملہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (النساء: ٥٨)



''بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کر دو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔''

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کریں۔ کسی انسان کے حق میں گواہی دینا یا اس کے خلاف گواہی دینا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ اور یہ کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت عدل کا ترازو قائم رکھیں، گویا اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دے رہا ہے کہ ہم حکم تک پہنچنے کے لیے بھی اپنی ذمہ داری ادا کریں اور حکم کرتے وقت بھی حکم تک پہنچنا جو کہ شہادت سے عبارت ہے اس آیت کریمہ کے عموم میں داخل ہے: ﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ اور فیصلہ جاری کرتے وقت اپنی ذمہ داری نبھانے کا حکم اس آیت میں ہے: ﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ اس کے بعد ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ ﴿نِعِمَّا﴾ اصل میں '' نعم ما'' تھا، ادغام کبیر کے باب سے میم کو میم میں مدغم کر دیا، اور یہ اس لیے کہ دو ہم جنس حرفوں میں ادغام صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب ان میں سے پہلا حرف ساکن ہو جبکہ اس جگہ پہلے حرف کے مفتوح ہونے کے باوصف ادغام کر دیا گیا ہے۔

[نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ] ..... اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ادائے امانت اور حکم بالعدل کو موعظت قرار دیا۔

اس لیے کہ ہر وہ چیز جس سے دلوں کی اصلاح ہوتی ہو موعظت کہلاتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فرائض کی ادائیگی سے دلوں کی اصلاح ہوا کرتی ہے۔

[اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا] ..... (كَانَ) فعل ہے، مگر زمانے سے عاری، اور اس سے مراد فقط وصف پر دلالت کرنا ہے۔ یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ سمع اور بصر کے ساتھ متصف ہے ہم نے اسے زمانے سے عاری اس لیے کہا کہ اگر ہم اسے دلالت زمنیہ پر باقی رکھیں تو پھر اس وصف کو قصہ پارینہ سمجھنا پڑے گا، یعنی وہ ماضی میں تو سمیعاً بصیراً تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ جبکہ سبھی کے علم میں ہے کہ یہ معنی فاسد و باطل ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمع و بصر کے ساتھ متصف ہے اس قسم کے سیاق میں ﴿كَانَ﴾ سے مراد تحقیق ہوا کرتی ہے۔

[سَمِيْعًا بَصِيْرًا] ..... ہم اس کے بارے میں بھی وہی بات کہیں گے جو قبل ازیں آیت کے بارے میں کہی گئی تھی کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے سمع کی دونوں قسموں اور بصر کی دونوں قسموں کا اثبات ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو اپنی آنکھ اور کان پر رکھا۔ [1] اس وضع سے مراد سمع و بصر کی تحقیق ہے آنکھ اور کان کا اثبات نہیں، اس لیے کہ آنکھ کا ثبوت تو دوسرے دلائل میں موجود ہے، جبکہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے کان ثابت نہیں ہے، ویسے اس کی نفی بھی نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ اس کے نقلی دلائل نہیں ملتے۔

سوال: کیا میں بھی اس طرح کر سکتا ہوں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا؟

---

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

جواب: بعض علماء اس کا جواب ہاں میں دیتے ہیں اس لیے کہ کوئی بھی شخص نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر مخلوق کو راہ ہدایت دکھانے والا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی آپ سے زیادہ اس امر سے محتاط ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی چیزیں منسوب نہ کی جائیں جو اس کے شایان نہیں ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے علماء کے نزدیک ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کے اس اشارہ سے مقصود سمع و بصر کا اثبات تھا وہ خود ہرگز مقصود نہیں تھا، خصوصاً اس وقت جب یہ خدشہ موجود ہو کہ اس اشارے سے کسی شخص کو تمثیل کا وہم بھی لاحق ہوسکتا ہے، مثلاً آپ ایسے عوام الناس سے مخاطب ہیں جو کہ کما حقہ بات سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں تو ایسے حالات میں اس سے پرہیز کرنا مناسب ہوگا۔ ہر بات ہر جگہ نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے گا، اور پھر فرمائے گا، میں اللہ ہوں۔''❶ اس کی وضاحت کے لیے آپ ﷺ اپنی انگلیاں بند فرماتے اور انہیں کھولتے۔ اس حدیث کے بارے میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے بارے میں کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصر پر ایمان رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے جملہ اقوال وافعال میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے سے خبردار رہیں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے دو ناموں، السَّمِيْعُ اور الْبَصِيْرُ کا اثبات ہے اور مندرجہ صفات کا: سمع، بصر، امر اور موعظت۔

صفت مشیئہ اور ارادہ کا ثبوت

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَوْ لَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (الکهف: ٣٩)

''اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو کہتا کہ اللہ کی مدد کے بغیر کوئی طاقت نہیں ہے۔''

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ (البقرہ: ٢٥٣)

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ (المائدة: ١)

''تمہارے لیے مویشی چوپائے حلال کر دیے گئے، ماسوائے ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جائیں گے، تم شکار کو احرام کی حالت میں حلال جاننے والے نہ بننا، بیشک اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔''

❶ صحیح مسلم: ٢٧٨٨ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما.



﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''پھر اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہ رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سینے کو تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔''

شرح:...... ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے لیے دو صفات: ارادہ اور مشیت کا اثبات کیا گیا ہے۔

پہلی آیت: [وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (الکھف: ۳۹)] ......

﴿وَلَوْلَا﴾ هَلَّا کے معنی میں ہے، جو کہ تحضیض کے لیے ہے، اور اس جگہ اس سے مراد توبیخ ہے، یعنی وہ اپنے ساتھی کو اس قول کے ترک کرنے پر ڈانٹ پلا رہا تھا۔

[اِذْ دَخَلْتَ] ...... یعنی جس وقت تو داخل ہوا۔

[جَنَّتَكَ] ...... اَلجنّةَ میم کی زبر کے ساتھ، بہت زیادہ درختوں پر مشتمل باغ، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہاں موجود لوگ اس کے درختوں اور ان کی ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں، یہ مادہ (جیم، نون) استتار (چھپ جانے) پر دلالت کرتا ہے، اسی سے ''الـجـنـة''......جیم کی زیر کے ساتھ ہے۔ یعنی جن، اس لیے کہ وہ لوگوں سے چھپے رہتے ہیں، لفظ ''الجنة'' جیم کی پیش کے ساتھ۔ بھی اسی مادہ سے ماخوذ ہے، یعنی ڈھال۔ اس جگہ جنة بطور مفرد استعمال ہوا، جبکہ دیگر قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو باغ تھے، اس کا کیا جواب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مفرد اضافت کے وقت عام ہو جاتا ہے اور اس صورت میں وہ دو باغوں کو بھی شامل ہو جاتا ہے، یا قائل کے پیش نظر ان کی قدر و منزلت کو گھٹا کر بیان کرتا تھا، اس لیے کہ وہ وقت پند و نصیحت کا تھا نہ کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق پر فخر غرور کرنے کا۔ گویا کہ وہ ان کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی باغ ہے مگر پہلی وجہ عربی زبان کے قواعد کے زیادہ قریب ہے۔

﴿قُلْتَ﴾ لَوْلَآ کا جواب ہے۔

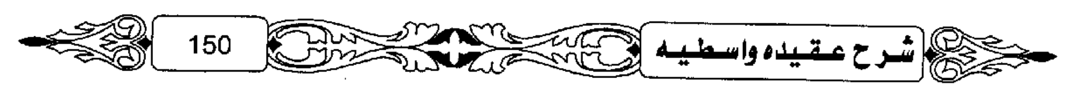
[مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ] ...... (ما) موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور شرطیہ بھی، موصولہ ہونے کی صورت میں مبتداء محذوف کی خبر ہے، اس صورت میں تقدیری عبارت ہوگی: ماشاء اللّٰه کان ، یعنی وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا۔ یعنی تجھے باغ میں داخل ہوتے وقت ﴿مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ کہنا چاہیے تھا۔ تو نہ اپنی قوت پر نازاں ہوتا اور نہ اپنے باغ پر فخر کرتا۔

[لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ]......(لا) نفی جنس کے لیے ہے۔ اور ﴿قُوَّةَ﴾ نفی کے سیاق میں نکرہ ہے، قوت ایک ایسی صفت ہے جس کی وجہ سے فاعل بغیر کسی کمزوری کے اپنے ارادہ کی تکمیل کر سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ غیر اللہ سے لیے قوت کی نفی اور اس ارشاد ربانی میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً﴾ (الروم: ۵۴)

''اللہ تو وہ ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا پھر ضعف کے بعد قوت دی۔''



اسی طرح قوم عاد کے بارے میں فرمایا:

﴿وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾

(فصلت: ۱۵)

''اور انہوں نے کہا کہ ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ یقیناً اللہ وہی ہے جس نے انہیں پیدا کیا وہ قوت میں ان سے بڑھ کر ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان سے قوت کی نفی نہیں کی بلکہ ان کے لیے اس کا اثبات کیا ہے۔ اس جگہ تطبیق کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: مخلوق میں موجود قوت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، اگر اللہ کسی کو قوت نہ دیتا تو وہ قوی نہ ہوتا۔ انسان میں ودیعت کردہ قوت اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے، لہٰذا اللہ کی مدد کے بغیر طاقت کا مطلقاً کوئی وجود نہیں ہے۔

دوسری صورت: ﴿لَا قُوَّةَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قوت کاملہ صرف اللہ کے پاس ہے۔

علی کل حال اس صالح انسان نے اپنے ساتھی کو رشد وہدایت پر مبنی یہ تلقین کی کہ وہ اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور اس کی قوت سے ممکن ہوا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم (اَللّٰہُ) کا اثبات ہے، اور تین صفات کا بھی، اور وہ ہے: الوہیت، قوت اور مشیت۔ اللہ کی مشیت اس کا کونی ارادہ ہے، جو اس کے پسندیدہ امور میں بھی نافذ ہوتا ہے۔ اور غیر پسندیدہ امور میں بھی۔ بدون تفصیل اس کے تمام بندوں پر بھی جسے اللہ چاہے اسے ہر حالت میں معرض وجود میں آنا ہوتا ہے۔ وہ اسے پسند کرتا ہو یا ناپسند، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دوسری آیت: [وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (البقرة: ۲۵۳)] ..... (لَوْ) حرف امتناع ہے، اس کا جواب (ما) کے ساتھ منفی ہوتو اس وقت لام کو حذف کرنا زیادہ فصیح ہوتا ہے اور اگر وہ مثبت ہو تو پھر زیادہ تر لام ثابت رہتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

﴿لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا﴾ (الواقعہ: ٦٥) ''اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کردیں۔''

ہم نے زیادہ تر کہا ہے، زیادہ فصیح نہیں کہا، اس لیے کہ یہ قرآن میں دونوں طرح استعمال ہوا ہے، اثبات لام کی مثال ابھی اوپر گزری ہے اور حذف لام کی مثال ہے:

﴿لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ اُجَاجًا﴾ (الواقعہ: ۷۰) ''اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا بنادیں۔''

رہا ہمارا یہ قول کہ منفی میں لام کو حذف کرنا زیادہ فصیح ہے، تو یہ اس لیے کہ لام تاکید کا فائدہ دیتی ہے جبکہ نفی تاکید کی نفی کرتی ہے، جب صورت حال یہ ہے تو پھر شاعر کا یہ شعر:

وَلَوْ نُعْطَى الْخِيَارَ لَمَا افْتَرَقْنَا ۔۔۔ وَلٰكِنْ لَا خِيَارَ مَعَ اللَّيَالِي

افصح کے خلاف ہوگا، افصح عبارت یوں ہوتی: ما افترقنا.

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا..... ضمیر کا مرجع مومنین وکفار ہیں، جس کی دلیل یہ قرآنی آیت ہے:

﴿وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾(البقرة: ۲۵۳)

''لیکن انہوں نے اختلاف کیا پھر ان میں سے کچھ ایمان لے آئے اور کچھ نے کفر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔''

یعنی اللہ نے چاہا کہ وہ لڑیں تو وہ لڑ پڑے، پھر فرمایا: ﴿یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ﴾ یعنی وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس جگہ ارادہ سے مراد ارادہ کونیہ ہے، فعل اس اعتبار سے کہ اسے ذات باری تعالیٰ سرانجام دے فعل مباشر ہوتا ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ اسے بندوں کے مقدر میں کر دے غیر مباشر ہوتا ہے، اس لیے کہ ہمیں کے علم میں ہے کہ انسان جب صوم وصلاۃ کی پابندی کرتا، زکوٰۃ دیتا، حج ادا کرتا اور جہاد کرتا ہے، تو بلاشبہ فاعل انسان ہی ہوتا ہے اور یہ بھی ہمارے علم میں ہے کہ اس کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے سرانجام پاتا ہے۔

بندے کے فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف براہ راست منسوب کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ اسے براہ راست سرانجام دینے والا انسان ہے، ہاں اسے تقدیر وخلق کے حوالے سے اس کی طرف منسوب کرنا درست ہوگا، مگر جو افعال اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے مثلاً اس کا عرش پر مستوی ہونا، کلام کرنا، آسمان دنیا پر نزول فرمانا اور ان جیسے دیگر امور، تو انہیں فعل مباشر کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اس قرآنی آیت میں اسماء باری تعالیٰ میں سے اللہ اور اس کی صفات میں سے مشیت، فعل اور ارادہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری آیت: [اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ (المائدة: ۱)]..... (احلت لکم) حلال کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ بھی اشیاء کو حلال وحرام قرار دینے کا استحقاق رکھتے ہیں، مگر یہ اللہ کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال قرار دیئے گئے ہیں۔''[1] آپ اس طرح بھی فرمایا کرتے: ''بیشک اللہ تم پر حرام کرتا ہے۔'' کبھی اس طرح فرماتے کہ یہ چیز تم پر حرام کی گئی ہے اور کبھی کسی چیز کو حرام قرار دے کر اسے اپنی طرف منسوب فرماتے، مگر ایسا اللہ کے حکم سے ہوتا۔

[بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ]..... اس سے مراد اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہے۔ (الانعام) نعم کی جمع ہے، جس طرح کہ سبب کی جمع اسباب آتی ہے۔ (بھیمة) انہیں اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کلام نہیں کر سکتے۔

[اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ]..... یعنی ماسوائے ان کے جو تمہیں اس صورت میں پڑھ کر سنائے جائیں گے اور ان کا ذکر

---

[1] اسے احمد: ۲/ ۹۷۔ ابن ماجہ: ۳۳۱۴ اور دارقطنی: ٤/ ۲۷۲ نے روایت کیا، دارقطنی فرماتے ہیں: اس کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے، بیہقی: ۱۱۲۵٤۔ آپ بھی اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دیتے ہیں مگر یہ بھی کہتے ہیں اس کا حکم رفع کا ہے، اسے عبد بن حمید نے المنتخب: ۸۱۸۔ میں روایت کیا اور زیلعی نے نصب الرایہ: ٤/ ۲۰۲ میں ابن مردویہ کی طرف منسوب کیا۔ ملاحظہ ہو: الصحیحة: ۱۱۱۸.

اس آیت میں ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَ مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ (المائدة: ۳)

''حرام کر دیا تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جسے غیر اللہ کے نام پر مشہور کر دیا گیا ہو۔''

اس جگہ استثناء منقطع بھی ہے اور متصل بھی۔ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ سے میت کا استثناء متصل ہے جبکہ لحم خنزیر کے استثناء کے اعتبار سے منقطع ہے، اس لیے کہ خنزیر کا شمار بھیمۃ الانعام کی فہرست میں نہیں ہوتا۔

[غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ] ..... یعنی حالت احرام میں شکار کرنے والے، اس لیے کہ جو شخص کوئی کام کرتا ہے وہ اسے حلال سمجھنے والے کی طرح ہوتا ہے۔ ﴿الصَّيْدِ﴾ شکاری جانور، اس سے مراد خشکی پر رہنے والے غیر پالتو ماکول اللحم جانور ہیں۔ یہ وہ جانور ہیں جنہیں حالت احرام میں شکار کرنا حرام ہے۔

[إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ] ..... اس ارادہ سے مراد ارادۂ شرعیہ ہے، اس لیے کہ یہ تشریع کا وقت ہے، اس سے ارادہ شرعیہ کونیہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے، اس صورت میں اس حکم کو، کونی شرعی حکم پر محمول کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کونی طور پر کرتا ہے اس کا حکم بھی کر دیتا ہے اور اسے واقع بھی کر دیتا ہے اور چیز کا شرعاً ارادہ کرتا ہے اس کا حکم جاری کر دیتا ہے اور اسے بندوں کے لیے مشروع قرار دے دیتا ہے۔

اس آیت میں اسم ''اللّٰہ'' کا ذکر ہے اور صفات میں سے: تحصیل، حکم اور ارادہ کا۔

چوتھی آیت: [فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (الانعام: ۱۲۵)] .....

[فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ] ..... اس جگہ ارادہ سے مراد ارادہ کونیہ اور ہدایت سے مراد، ہدایت توفیق ہے، اللہ جس شخص کو قبول ہدایت کی توفیق دے دے اس کا سینہ شرائع اسلام اور شعار اسلام کے لیے کھل جاتا ہے اور وہ انہیں خوشی خوشی ادا کرتا ہے۔

اگر آپ اپنے آپ کو ایسا ہی پاتے ہیں تو پھر یقین کیجیے کہ اس نے آپ کے لیے خیر اور ہدایت کا ارادہ کر لیا ہے، مگر جس شخص کا سینہ شرائع اسلام کے حوالے سے تنگ ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ نے اسے ہدایت دینے کا ارادہ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو اسے شرح صدر نصیب ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ نماز منافقین کے لیے گراں بار ہے مگر مخلصین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری دنیا سے مجھے عورتیں اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔''[1]

پھر چونکہ نبی اکرم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ کامل الایمان ہیں، لہٰذا آپ کا سینہ نماز کے لیے کھل گیا اور وہ آپ کی

---

[1] اسے احمد: ۳/ ۲۱۸۔ نسائی: ۷/ ۶۱ اور حاکم: ۲/ ۱۶۰ نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا۔ ابو یعلیٰ: ۶/ ۱۹۹۔ حافظ نے تلخیص: ۳/ ۱۳۴ میں نسائی کی روایت کو صحیح کہا ہے۔

آنکھوں کی ٹھنڈک قرار پائی۔

جب کسی سے یہ کہا جائے کہ بھئی آپ پر مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنا فرض ہے، اور اس سے اس کا سینہ کھل جائے اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہو اور نماز کی مشروعیت پر اس کی حمد وثناء کرنے لگے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت دینے اور اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کر لیا ہے۔

یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (شرح) توسیع دینے اور کھول دینے کے معنی میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو انہوں نے اس سے یہ دعا کی:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ (طٰهٰ: ٢٥) ''میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔''

یعنی اس شخص سے بات کرنے اور اسے دعوت کے لیے میرا سینہ کھول دے اور یہ اس لیے کہ فرعون بڑا جابر اور سرکش تھا۔

لِلْاِسْلَامِ اسلام کا اطلاق اصل اسلام، فروع اسلام اور واجبات اسلام پر ہوتا ہے، انسان کو اسلام اور شرائع اسلام کے بارے میں شرح صدر جس قدر زیادہ حاصل ہوگا۔ اسی قدر وہ اسے اللہ کی طرف سے توفیق ہدایت پر زیادہ دلالت کرے گا۔

[وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا] ..... یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو بہت زیادہ تنگ کر دیتا ہے، پھر اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا: ﴿كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ یعنی جب اسے اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اسے بڑی مشکل کے ساتھ آسمان کی طرف چڑھنا پڑ رہا ہو۔ ﴿يَصَّعَّدُ﴾ کی تعبیر اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ سخت قسم کی مشقت اٹھا کر آسمان میں چڑھنے کی کوشش کرتا ہے مگر چڑھ نہیں پاتا، ظاہر ہے بڑی مشکل اور مشقت سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے والا تھک کر چکنا چور ہو جائے گا۔

الغرض! جس شخص کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اور اللہ اسے گمراہ رکھنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ ایسی تنگی اور مشقت برداشت کرے گا گویا کہ وہ بڑی مشکل سے آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے لیے ارادہ کا اثبات ہوتا ہے۔

اس ارادہ سے مراد صرف ارادہ کونیہ ہے، اس لیے کہ اللہ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ﴾ اور پھر فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ﴾ اور اس قسم کی تقسیم صرف امور کونیہ میں ہی ہو سکتی ہے، رہے امور شرعیہ، تو اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

اس آیت میں سلوک وعبادت کے حوالے سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کل اسلام کو قبول کرنا انسان پر واجب ہے، وہ اس کے اصل کو بھی قبول کرے اور اس کی فروع کو بھی، حقوق اللہ کی بھی ادائیگی کرے اور حقوق العباد کی بھی اور یہ کہ وہ اس کے لیے اپنا سینہ کھلا رکھے اور اگر وہ ایسا نہیں ہے تو پھر اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ نے گمراہ کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ کر لیتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔''[1] دین میں سمجھداری، قبول دین کا تقاضا کرتی ہے، اللہ کے دین میں سوجھ بوجھ رکھنے والے اور اس سے آشنا لوگ

[1] بخاری: ۷۱۔ مسلم: ۱۰۳۷ عن معاویه بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ۔

اسے قبول بھی کرتے ہیں اور اس سے محبت بھی کرتے ہیں۔

اللہ کے فرمان فَلَا وَ رَبِّكَ لَا .... وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا کی تفسیر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًاo﴾ (النساء: ٦٥)

"قسم ہے تمہارے رب کی وہ ایمان والے نہیں بنیں گے یہاں تک کہ وہ آپ کو ہر اس چیز میں حکم مان لیں جس میں ان کا جھگڑا ہو، پھر اپنے دلوں میں اس سے تنگی محسوس نہ کریں جو آپ نے فیصلہ کیا ہو، اور وہ اسے دل وجان سے تسلیم کر لیں۔"

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے اپنی ربوبیت کی تاکیدی قسم اٹھا کر اس شخص سے ایمان کی نفی فرمائی ہے جو مندرجہ ذیل تین امور کا اہتمام نہیں کرتا۔

امر اول:...... نبی کریم ﷺ کو حکم وفیصل تسلیم کرنا ﴿حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ﴾ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی اور کو حکم تسلیم کرنے والا مومن نہیں ہے، اس طرح یا تو اس نے دائرۂ اسلام سے خارج کرنے والے کفر کا ارتکاب کیا یا اس سے کم تر درجے کے کفر کا۔

امر دوم:...... ان کے حکم پر شرح صدر کا حاصل ہونا، بایں طور کہ وہ آپ ﷺ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے خوشی خوشی شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیں۔

امر سوم:...... اسے دل وجان سے پورا پورا تسلیم کرنا، تسلیم کی مصدر کے ساتھ تاکید کی گئی ہے، جس سے مراد تسلیم کامل ہے۔ میرے مسلمان بھائیو! کہیں ایسا نہ ہو کہ ان امور کی پاسداری نہ کرنے کی وجہ سے تم سے تمہارا ایمان چھین لیا جائے۔

ہم اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے ایک مثال بیان کرنا چاہیں گے: کسی شرعی مسئلہ کے حکم کے بارے میں دو آدمیوں میں جھگڑا ہوا تو ان میں سے ایک شخص نے سنت سے استدلال کیا تو دوسرے شخص کو اس سے شدید تنگی محسوس ہوئی کہ یہ شخص مجھے میرے متبوع کی اتباع سے ہٹا کر اتباع سنت پر لانا چاہتا ہے، یقیناً اس شخص کا ایمان ناقص ہے، اس لیے کہ حقیقی مومن جب کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے کسی نص کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے یوں لگتا ہے جیسے بہت زیادہ مال غنیمت اس کے ہاتھ آ گیا ہو، وہ اس پر خوش ہوتا اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے کہ اس نے مجھے ہدایت کی توفیق بخشی، جبکہ دوسرا شخص اپنی رائے کے لیے بڑا متعصب واقع ہوا ہے، جس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کو توڑ مروڑ کر انہیں اپنی رائے سے ہم آہنگ کر دے، اسے نہ تو اللہ کے حکم کی کوئی پرواہ ہوتی ہے اور نہ اس کے رسول کے حکم کی۔ یقیناً ایسا شخص عظیم خطرہ سے دوچار ہے۔

ارادہ کی اقسام

ارادے کی دو قسمیں ہیں:

قسم اوّل: ارادہ کونیہ، یہ ارادہ مشیت کے مترادف ہے، اس میں اَرَادَ (شَاءَ) کے معنی میں ہے اور یہ ارادہ۔

اولاً: اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور غیر پسندیدہ تمام باتوں سے تعلق رکھتا ہے۔

ثانیاً: اس میں وقوع مراد ضروری ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا ارادہ کیا ہو اس کا وقوع پذیر ہونا لازم ہوتا ہے، اس کا عدم وقوع کسی بھی صورت ممکن نہیں رہتا۔

قسم دوم: ارادہ شرعیہ، یہ ارادہ محبت کے مترادف ہے، اور اس میں (اَرَادَ) (اَحَبَّ) کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور یہ ارادہ:

اولاً: اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کے ساتھ خاص ہے، اللہ رب العزت ارادہ شرعیہ کے ساتھ کفر وفسوق کا ارادہ نہیں کرتا۔

ثانیاً: اس میں مراد کا وقوع پذیر ہونا امر لازم نہیں ہوتا، یعنی ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ کسی چیز کا ارادہ کرے مگر وہ واقع نہ ہو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی عبادت کریں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی یہ مراد پوری بھی ہو، لوگ اس کی عبادت کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے، بخلاف ارادہ کونیہ کے۔ اس طرح دونوں ارادوں میں دو طرح سے فرق پایا جاتا ہے:

ارادۂ کونیہ اور شرعیہ میں فرق

۱۔ ارادہ کونیہ میں مراد کا وقوع پذیر ہونا لازم ہوتا ہے جبکہ ارادہ شرعیہ میں یہ لازم نہیں ہوتا۔

۲۔ ارادہ شرعیہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ امور کے ساتھ خاص ہے، جبکہ ارادہ کونیہ دو امور سے متعلق ہوتا ہے۔ پسندیدہ امور سے بھی اور غیر پسندیدہ امور سے بھی۔

سوال: اللہ تعالیٰ غیر پسندیدہ امور یعنی کفر وفسوق اور عصیان کا کیسے ارادہ کرسکتا ہے، جبکہ وہ انہیں پسند نہیں کرتا؟

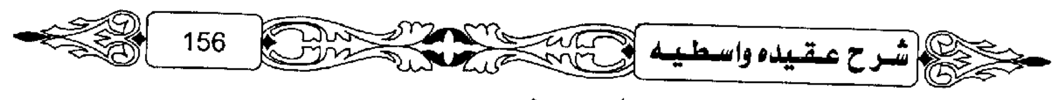
جواب: یہ چیزیں ایک وجہ سے اللہ کی پسندیدہ ہیں اور دوسری وجہ سے غیر پسندیدہ اس لیے کہ ان میں بڑی بڑی مصلحتیں پنہاں ہیں اور مکروہ اس لیے کہ یہ معصیت ہیں اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ ایک چیز ایک اعتبار سے محبوب ہو اور دوسرے اعتبار سے مکروہ۔ ایک شخص اپنے لخت جگر کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تاکہ وہ اس کی جلد کاٹ کر اس کے جسم سے زہریلا موذی مادہ نکال دے، ڈاکٹر آلات جراحی سے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

بیٹا شدید اذیت میں مبتلا ہے، جبکہ باپ بڑا خوش ہے لیکن کیوں؟ اس لیے کہ اس اپریشن میں بڑی مصلحت پنہاں ہے۔ جو کہ اس عمل جراحی پر مرتب ہوگی۔

ارادہ باری تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے بعد ہم اس سے دو چیزوں کا استفادہ کرسکتے ہیں:

اولاً: ہم اپنی امیدوں اور اپنے جملہ احوال واعمال کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ رکھیں، اس لیے کہ ہر شے اس کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے، یہ چیز ہمارے اندر توکل پیدا کرے گی۔

ثانیاً: ہم وہی کچھ کریں جس کا اللہ تعالیٰ شرعاً ارادہ کرتا ہے، جب ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ کام شرعاً اللہ کی مراد اور اس کا محبوب عمل ہے تو یہ چیز اس فعل کے سرانجام دینے کے ہمارے عزم کو تقویت دے گی۔



آیات صفت محبت

مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے صفت محبت کا اثبات ہوتا ہے:

پہلی آیت:...... ﴿وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۹۵) ''اور اچھے کام کرو یقیناً اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

[وَ اَحْسِنُوْا].... فعل امر ہے، احسان کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب، جس چیز پر واجب کی ادائیگی موقوف ہو وہ خود بھی واجب ہوتی ہے اور جو اس سے زائد ہو وہ استحباب کے دائرے میں آتی ہے، اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ﴿اَحْسِنُوْا﴾ فعل امر واجب اور مستحب کے لیے مستعمل ہے۔

احسان، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی ہوتا ہے اور اس کی مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں احسان کی تفسیر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی:

''تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے یقیناً دیکھ رہا ہے۔'' پہلا مرتبہ بعد والے مرتبہ سے زیادہ کامل ہے، اس لیے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرتا ہے گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے تو اس کی یہ عبادت طلب اور رغبت پر مبنی ہوگی جبکہ دوسرے مرتبہ کی عبادت ڈر اور خوف پر مبنی ہے۔

جہاں تک مخلوقات باری تعالیٰ کے ساتھ معاملات کی نسبت سے احسان کا تعلق ہے تو اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے:

حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا: اپنے مال وزر، بدن اور منصب وجاہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک پر مبنی برتاؤ کرنا۔

ایذا رسانی سے پرہیز کرنا: اپنے قول وعمل کے ساتھ لوگوں کی ایذا رسانی سے باز رہنا۔

خندہ پیشانی سے پیش آنا: لوگوں کو خندہ پیشانی سے ملنا اور خشک روئی سے پرہیز کرنا، مگر کبھی کبھی کوئی انسان کسی وجہ سے غضبناک ہو کر تند خوئی کا مظاہرہ بھی کرنے لگتا ہے، اگر اس رویے سے بھی اصلاح حال مقصود ہو تو اس کا شمار بھی احسان میں کیا جا سکتا ہے، لہٰذا جب ہم زانی کو رجم کریں گے، یا اسے کوڑے لگائیں گے تو یہ اس کے ساتھ احسان کے زمرے میں آئے گا۔

خرید وفروخت، اجازت نکاح اور دیگر معاملات میں احسان سے کام لینا بھی اسی قبیل سے ہے، جب آپ ان معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹائیں گے، لوگوں کے سخت رویے کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور ان کے حقوق ادا کریں گے تو آپ کا یہ رویہ حسن سلوک کے زمرے میں آئے گا، لیکن اگر آپ دھوکا دہی، کذب بیانی اور فریب کاری سے کام لیں گے تو آپ اذیت رسانی کے مرتکب ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی احسان سے کام لیجئے اور اللہ کے بندوں کے ساتھ بھی احسان پر مبنی رویہ اختیار کیجئے۔

[اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ] .... یہ حکم کی علت ہے۔ محسن کا ثواب یہ ہے کہ اللہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے، اور

اللہ کی محبت ایک عالی شان اور عظیم القدر مرتبہ ہے اور یہ اس رتبے سے کہیں بلند ہے کہ تو اس سے محبت کرے، اسی لیے فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران : ۳۱)

''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم میری اتباع کرو اس طرح تم اللہ کے ساتھ اپنی محبت کے دعوے کو سچا ثابت کر دو گے حالانکہ تقاضا حال یہی تھا، بلکہ اس نے فرمایا: ﴿يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ کہ اللہ تم سے پیار کرنے لگے گا۔

اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں: اصل کمال یہ ہے کہ اللہ تم سے محبت کرے نہ کہ تم اس سے محبت کرو، ہر کوئی اللہ کے ساتھ محبت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر کیا وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے؟ پھر جب اللہ تم سے محبت کرے گا تو آسمان کے فرشتے بھی تم سے پیار کرنے لگ جائیں گے، پھر آپ کو زمین میں قبولیت حاصل ہوگی۔ [1] اور زمین والے بھی تم سے پیار کرنے لگیں گے، اور یہ مومن کو جلدی ملنے والی خوشخبری ہے۔

اس آیت میں اسماء باری تعالیٰ میں سے اللہ اور اس کی صفات میں سے الوہیت اور محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دوسری آیت: ...... ﴿وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ ''اور انصاف کرو یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

[اَقْسِطُوْا] .... فعل امر ہے۔ اقساط، قسط نہیں بلکہ یہ رباعی فعل ہے اور اس میں ہمزہ نفی کا ہے، جب یہ کسی فعل پر داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی کی نفی کر دیتا ہے، قَسَطَ ، فعل، جَارَ کے معنی میں ہے۔ یعنی اس نے ظلم کیا، پھر جب اس پر ہمزہ داخل کیا گیا تو اَقسَطَ ، عدل کے معنی میں ہو گیا، یعنی اس نے (قسط) کا ازالہ کر دیا جو کہ ظلم سے عبارت ہے، اس ہمزہ کو ہمزہ سلب بھی کہا جاتا ہے۔

مثلاً: خطئی ، اس نے عمداً خطاء کا ارتکاب کیا، اخطأ: اس نے غیر ارادی طور پر خطا کا ارتکاب کیا۔ اس طرح اقسطوا کا معنی ہوگا: عدل کرو، عدل کرنا امر واجب ہے، اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں عدل کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے، اللہ رب تعالیٰ آپ پر طرح طرح کے انعامات فرماتا ہے، عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں، اس نے ہم پر حق واضح فرما دیا، اب عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس حق کی اتباع کریں۔

لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے قیام عدل میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آپ ان کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کریں جس قسم کا معاملہ آپ ان کی طرف سے پسند کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص یہ پسند کرتا ہے، کہ اسے آگ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا جائے تو اسے اس حال میں موت آئے کہ اس کا اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہو، اور وہ لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ ان کی طرف سے اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' [2]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ۳۲۰۹۔ صحیح مسلم: ۲۶۳۷.

[2] صحیح مسلم: ۱۸۴٤.

آپ لوگوں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کریں جس قسم کا برتاؤ آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں، مثلاً: جب آپ کسی شخص کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے آپ یہ سوچ لیں کہ اگر کوئی شخص اس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کرے تو میں اسے پسند کروں گا یا نہیں؟ اگر تو آپ اسے اپنے لیے پسند کرتے ہیں تو پھر اس کے ساتھ بھی ایسا کیجئے بصورت دیگر ایسا کرنے کے باز رہیں۔

اپنی اولاد کو عطیہ دیتے وقت عدل کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو، اپنی اولاد میں عدل سے کام لیا کرو۔''[1]

میت کے ورثاء میں اس کا ترکہ تقسیم کرتے وقت عدل سے کام لینا بھی اسی میں داخل ہے، ہر وارث کو اس کا شرعی حق دیا جائے گا، اور ان میں سے کسی کے لیے کسی بھی چیز کی وصیت نہیں کی جائے گی۔

بیویوں کے درمیان عدل کرنا بھی اس میں شامل ہے، ان میں ہر چیز کو برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اپنی ذات کے ساتھ عدل کرنا بھی اسی قبیل سے ہے، آپ اسے انہی اعمال کا مکلف ٹھہرائیں جن کی ادائیگی اس کے بس میں ہو۔

ہم اس جگہ آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض لوگ عدل کی جگہ مساوات کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جو کہ غلط ہے اور غلط اس لیے کہ مساوات دو چیزوں میں برابری کا تقاضا کرتی ہے، جبکہ حکمت ایزدی ان میں فرق ملحوظ رکھنے کی متقاضی ہوتی ہے۔

چونکہ لوگوں میں مساوات کا ظالمانہ پروپیگنڈہ کرنے والے مرد وزن میں کسی قسم کا فرق ملحوظ نہیں رکھتے، لہٰذا انہوں نے اسی بات کے پیش نظر مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا، کمیونسٹوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حاکم اور محکوم کے درمیان بھی کوئی فرق نہیں ہے، کسی کا کسی پر غلبہ نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ باپ کو اس کی اپنی اولاد پر بھی کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔

مگر عدل ہر ایک کو اس کا جائز حق دینے سے عبارت ہے، اس اصطلاح کے استعمال سے مرد وزن میں مساوات کا خطرناک نظریہ بھی اپنی موت آپ مر جائے گا، اور عبارت بھی درست قرار پائے گی۔ قرآن میں کہیں بھی نہیں آیا کہ اللہ تمہیں مساوات کا حکم دیتا ہے، بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ (النحل: ۹۰) ''بیشک اللہ تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے۔''

﴿وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ (النساء: ۵۸)

''اور جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''

دین اسلام مساوات کا نہیں بلکہ عدل کا دین ہے، ہاں اگر کوئی شخص مساوات سے عدل مراد لیتا ہو، تو پھر یہ معناً تو صحیح ہوگا مگر یہ لفظ پھر بھی غلط ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مساوات کی نفی وارد ہوئی ہے۔ مثلاً:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر: ۹)

---

[1] صحیح بخاری: ۲۵۸۷۔ صحیح مسلم: ۱۶۲۳۔



''پوچھو! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟''

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ﴾ (الرعد: ١٦)

''پوچھو! کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں، یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں؟

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا﴾ (الحدید: ١٠)

''نہیں برابر ہے تم میں سے جس نے خرچ کیا فتح (مکہ) سے قبل اور جہاد کیا، ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں کی نسبت بڑا ہے جنہوں نے اس کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔''

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (النساء: ٩٥)

''نہیں برابر ہو سکتے مومنوں میں سے بیٹھ رہنے والے، ماسوائے عذر والوں کے اور اللہ کے رستے میں جہاد کرنے والے۔''

قرآن مجید میں ایک بھی ایسا حرف موجود نہیں ہے، جو مساوات کا حکم دیتا ہو، قرآن صرف عدل کرنے کا حکم دیتا ہے، پھر کلمہ (عدل) انسانی نفوس کے نزدیک بھی قبولیت کا درجہ رکھتا ہے۔

آیت میں انہی اسماء وصفات کا ذکر ہے جو اس سے ماقبل کی آیات میں گزر چکے ہیں۔

تیسری آیت: ﴿فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (التوبۃ: ٧) ''تو جب تک وہ تمہارے لیے قائم رہیں تو تم بھی ان کے لیے قائم رہو، یقیناً اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔''

[مَا] ...... شرطیہ ہے فعل شرط ﴿اسْتَقَامُوْا﴾ اور جواب شرط ﴿فَاسْتَقِيْمُوْا﴾ ہے۔ یعنی جن لوگوں نے تم سے مسجد حرام کے پاس ایفاء عہد کا معاہدہ کیا تھا جب تک وہ اس عہد پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو اور اگر وہ اپنے وعدے کا پاس نہیں کرتے تو پھر تمہارے لیے بھی اس کا پاس کرنا ضروری نہیں ہے۔ معاہدہ کرنے والے یہ لوگ تین قسم کے ہو سکتے تھے۔

جو لوگ جو اپنے عہد کا پاس کریں گے، مسلمان بھی ان کے ساتھ کیے گئے عہد پر قائم رہیں گے۔ ﴿فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ﴾ ''جب تک وہ قائم رہیں تو تم بھی قائم رہو۔''

ان میں سے جو لوگ عہد شکنی کرتے ہوئے خیانت کے مرتکب ہوں گے تو مسلمان بھی اس عہد کو توڑ دیں گے۔

﴿وَ إِنْ نَّكَثُوْٓا أَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَآ أَيْمَانَ لَهُمْ﴾ (التوبۃ: ١٢)

''اور اگر وہ عہد کرنے کے بعد قسمیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعن کرنے لگیں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو، بیشک وہ ایسے ہیں کہ ان کی قسمیں نہیں ہیں۔''

تیسری قسم کے لوگ وہ ہو سکتے تھے جو عہد پر قائم رہنے کا اظہار کریں گے مگر بعض قرائن کی بنیاد پر مسلمانوں کو ان کی

طرف عہد شکنی کا خوف لاحق رہے گا، ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ۝﴾ (الانفال : ۵۸)

''اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے دغا بازی کا خوف ہو تو ان کے عہد کو سیدھے طریقے پر انہی کی طرف پھینک دو، یقیناً اللہ دغا بازوں سے محبت نہیں کرتا۔''

یعنی تم ان کا عہد توڑ ڈالو اور یہ اعلان کر دو کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان عہد باقی نہیں رہا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اگر وہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو ہم اسے کیسے توڑ سکتے ہیں؟

ہم یہ معاہدہ اس لیے توڑ ڈالیں گے کہ ہمیں ان کی طرف سے دغا بازی کا خوف لاحق ہے، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی دن ہم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں، لہٰذا ہم اس معاہدے سے الگ ہونے کا اعلان تو کر دیں گے، مگر جب تک وہ معاہدہ قائم ہے ان سے دغا بازی نہیں کریں گے اور نہ ہی ان سے فوری جنگ کریں گے، اس لیے کہ معاہدہ سے علیحدگی اختیار کرنے سے قبل ان سے جنگ کرنا حرام ہے۔

[اَلْمُتَّقِیْنَ] .... متقی وہ لوگ ہیں جنہوں نے رب تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل کر کے اور اس کی نواہی سے اجتناب کر کے اس کے عذاب کے سامنے آڑ کھڑی کر دی ہو، تقویٰ کی یہ بڑی خوبصورت اور جامع تعریف ہے۔

چوتھی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۲۲) ''یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں سے اور محبت کرتا ہے بہت پاک رہنے والوں سے۔''

توبہ کی شرائط

التواب: توبہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے، اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع کرنے والا۔ توبہ: اللہ تعالیٰ کی معصیت کو ترک کر کے اس کی اطاعت گزاری کے ذریعے اس کی طرف رجوع کرنا۔ توبہ کی پانچ شرطیں ہیں:

پہلی شرط: اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے مخلص ہونا، بایں طور کہ اللہ کا ڈر اور اس کے ثواب کی امید اسے توبہ کرنے پر آمادہ کر دے۔

دوسری شرط: گزشتہ گناہوں پر ندامت کا اظہار کرنا، اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ آئندہ کے لیے ان کے ارتکاب کی تمنا نہیں کرے۔

تیسری شرط: ارتکاب معاصی سے باز آ جانا، اگر گناہ حرام ہے تو اسے ترک کر دینا اور اگر ترک واجب کی صورت میں ہو تو امکانی حد تک اس کا تدارک کرنا۔

چوتھی شرط: آئندہ کے لیے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا۔

پانچویں شرط: قبولیت توبہ کے وقت میں توبہ کرنا، یعنی موت کا وقت آنے سے پہلے اور مغرب کی طرف سے طلوع

آفتاب سے قبل توبہ کرنا، اس کے بعد کی توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔

التواب: کثیر التوبہ۔

کثرت توبہ کثرت گناہ کو مستلزم ہے، اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ انسان کے گناہ جس قدر بھی زیادہ ہوں وہ جب بھی کسی گناہ سے توبہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا، تو جو شخص ایک ہی گناہ کرے اور پھر اس سے توبہ کرے تو وہ بطریق اولیٰ اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق دار ہوگا۔

[وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ] ..... یعنی جو جملہ آحداث سے طہارت حاصل کرتے ہیں، جسمانی نجاستوں اور ہر اس چیز سے طہارت حاصل کرتے ہیں، جس سے طہارت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی دونوں طہارتوں کو جمع کر دیا ہے۔ التَّوَّابِيْنَ میں باطنی طہارت کی طرف اور الْمُتَطَهِّرِيْنَ میں ظاہری طہارت کی طرف اشارہ ہے۔

پانچویں آیت: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (ال عمران: ۳۱) ''کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔''

علمائے سلف اس آیت کو آیت امتحان کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس لیے کہ جب کچھ لوگوں نے اللہ کے ساتھ محبت کرنے کا دعویٰ کیا تو اس نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے یہ فرمائیں: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص سے یہی کہا جائے گا کہ اگر تو اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کر، اگر کوئی بدعتی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں، تو اس سے کہا جائے گا کہ تو اس دعویٰ میں جھوٹا ہے؟ اس لیے کہ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کی اتباع کرتا، اور آپ کی شریعت میں اپنی طرف سے کوئی چیز داخل کر کے آپ ﷺ کے آگے بڑھنے کی جسارت ہرگز نہ کرتا۔ آپ ﷺ کی اتباع کر کے ہی اللہ تعالیٰ سے محبت کی جا سکتی ہے۔

پھر جب کوئی شخص اللہ سے محبت کرتا اور اس کی عبادت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرنے لگتا، اور اسے اس کے عمل سے زیادہ اجر وثواب سے نوازتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا گیا: ''جو شخص مجھے اپنے دل میں یاد کرے گا میں اسے اپنے دل میں یاد کروں گا، اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرے گا تو میں اسے اس سے بہتر جماعت میں یاد کروں گا، اگر وہ ایک بالشت میرے نزدیک ہوگا تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاؤں گا۔ اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوگا تو میں دو ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر اس کے قریب ہو جاؤں گا اور اگر وہ میرے پاس چلتا ہوا آئے گا تو میں اس کے پاس دوڑتا ہوا جاؤں گا۔ [1]

تو گویا اللہ عزوجل کی عطاء اور اس کا اجر وثواب انسان کے عمل سے کہیں زیادہ ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کے وہی اسماء وصفات ہیں جو گزشتہ آیت میں بتلائے جا چکے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری: ۷۴۰۵۔ صحیح مسلم: ۲۶۷۵ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

چھٹی آیت: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''اللہ جلد ہی ایسی قوم کو لے آئے گا، جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔''

فاء جواب شرط میں واقع ہے، جو کہ اس ارشاد میں ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾ یعنی اگر تم اللہ کے دین سے پھر جاؤ گے تو اللہ اور اس کے دین کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے ''اور وہ ایک ایسی قوم لے آئے گا جس سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کرے گی۔'' جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ﴾ (محمد: ۳۸)

''اور اگر تم منہ پھیر لو گے تو تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو بدل کر لے آئے گا، پھر وہ تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔''

اسے دین اسلام سے مرتد ہونے والے کسی بھی شخص کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ''وہ انسے ہٹا کر اس کی جگہ اس سے بہتر لوگ لے آئے گا'' جو ''اس سے پیار کریں گے اور وہ ان سے پیار کرے گا۔'' پھر جب وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگ جائیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی کریں گے۔

آیت اس طرح پوری ہوتی ہے:

﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (المائدۃ: ٥٤)

''وہ مومنوں پر نرمی کرنے والے اور کافروں پر سختی کرنے والے ہوں گے۔''

یعنی ان کا بنیادی وصف یہ ہوگا کہ وہ مومنوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت پر مبنی رویہ اختیار کریں گے جب کہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور قوی ہوں گے اور ان کے سامنے کبھی بھی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔

اس حوالے سے نبی کریم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ: ''جب راستے میں تمہارا ان کے ساتھ آمنا سامنا ہو تو انہیں تنگ راستے کی طرف مجبور کر دو۔''[1]

مسلمانو! تمہارا جب بھی یہود و نصاریٰ سے آمنا سامنا ہو تو ان کی تعداد جتنی بھی زیادہ ہو اور تمہاری جس قدر بھی کم، ان کے جتھے کو چیرتے ہوئے گزرو، ان کے لیے راستہ کھلا مت کرو، اور ان کے سامنے اپنی نہیں بلکہ اپنے دین کی قوت آشکارا کر دو تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ دین اسلام ہی دین غالب ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ دلی وابستگی رکھنے والا ہی باعزت باوقار ہے۔

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (المائدۃ: ٥٤)

''وہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہیں رکھیں گے۔''

یعنی وہ دین اسلام کے خلاف برسر پیکار ہر کافر و فاسق اور ملحد سے جہاد کریں گے، وہ لوہے اور آگ کے ساتھ لڑنے والوں کا مقابلہ لوہے اور آگ کے ساتھ کریں گے، اور زبانی جدل وجدال کرنے والوں کا مقابلہ اسی انداز سے کریں گے۔

---

[1] صحیح مسلم: ۲۱٦۷ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

الغرض! وہ مخالفین اسلام کے خلاف ہر قسم کے جہاد کے لیے تیار رہیں گے۔

[وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ] .... یعنی وہ لوگوں کی طرف سے کسی ملامت وتنقید سے خائف نہیں ہوتے، وہ حق وصداقت پر مبنی بات ہی کرتے ہیں چاہے اس زد میں خود ہی کیوں نہ آ جائیں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کرتے وقت حکمت کو بروئے کار لاتے ہوئے موقعہ ومحل کی نزاکتوں کو ضرور پیش نظر رکھتے ہیں، اگر حالات نرمی ولیونت کے متقاضی ہوں تو نرمی پر مبنی رویہ اختیار کرتے ہیں، اور اگر دعوت بعض امور میں پیچھے ہٹ جانے کو ضروری قرار دے تو اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ وہ ایک مخصوص مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں اور وسیلہ احوال وظروف کے تقاضوں کے مطابق ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (المائدۃ: ٥٤)

''یہ اللہ کا فضل ہے وہ اسے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا بڑے علم والا ہے۔''

اس آیت میں اسماء وصفات تو وہی ہیں جو گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں، البتہ اس میں اس کے محبوب ہونے کا اضافہ ہے۔

ساتویں آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ٥﴾ (الصف: ٤)

''یقیناً اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے راستے میں ایسی صف بنا کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

یہ سورۂ صف کی آیت ہے جو درحقیقت سورۂ جہاد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا آغاز اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کی تعریف وتوصیف سے کیا اور اس کے آخر میں جہاد کی دعوت دی اور درمیان میں یہ بتایا کہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا اگرچہ مشرکین اسے ناپسند کریں۔

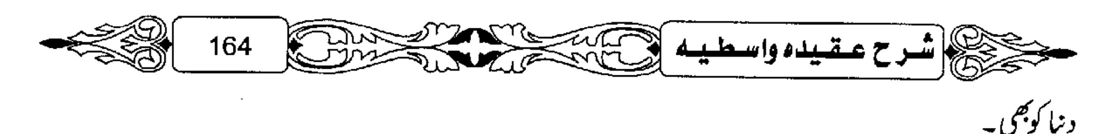
[یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا] .... وہ اللہ کی راہ میں صف بندی کر کے لڑتے ہیں، ایک دوسرے سے آگے پیچھے نہیں ہوتے، اور اس میں کوئی خلل نہیں آنے دیتے۔

نماز جہاد اصغر ہے، اس میں ایک ایسا قائد ہوتا ہے، جس کی اتباع واجب ہوتی ہے، اگر آپ اس کی اتباع نہیں کریں گے تو آپ کی نماز باطل ہو جائے گی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا امام سے قبل سر اٹھانے والا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اس کا سر گدھے کے سر جیسا بنا دے یا اس کی صورت کو گدھے کی صورت میں تبدیل کر دے۔''[1] نماز میں صف بندی، جہاد میں صف بندی کی نظیر ہے، رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معمول تھا کہ آپ جس طرح نماز میں لوگوں کی صف بندی فرماتے میدان جہاد میں بھی اسی طرح فرماتے: ﴿کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ ''گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔'' اور دیوار جیسا کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط بناتا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں سے اپنی محبت کو ان کے اعمال کے ساتھ معلق فرمایا ہے، وہ چند صفات کے حامل ہیں:

اولاً: وہ قتال کرتے ہیں، دون ہمتی، سستی وکاہلی اور جمود کا شکار نہیں ہوتے یہ ایسی چیزیں ہیں جو دین کو بھی کمزور کرتی ہیں اور

[1] صحیح بخاری: ٦٩١۔ صحیح مسلم: ٤٢٧۔ [2] صحیح بخاری: ٦٠٢٦۔ صحیح مسلم: ٢٥٨٥۔



دنیا کو بھی۔

ثانیاً: اخلاص۔ ﴿فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ثالثاً: وہ ایک دوسرے کو مضبوط بناتے ہیں، اس کی طرف اشارہ ارشاد ربانی: ﴿صَفًّا﴾ میں کیا گیا ہے۔

رابعاً: وہ بنیان جیسے ہیں، بنیان، انتہائی محفوظ قلعہ کو کہا جاتا ہے۔

خامساً: ان میں کوئی ایسا وجود نا مسعود نہیں گھس سکتا جو ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ آیت میں جن اسماء وصفات کا تذکرہ ہے وہ قبل ازیں گزر چکی ہیں۔

آٹھویں آیت: ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ﴾ (البروج: ١٤) ''اور وہ بہت بخشنے والا بہت محبت کرنے والا ہے۔''

[اَلْغَفُوْرُ] .... اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا، ان سے درگزر فرمانے والا۔

[اَلْوَدُوْدُ] .... یہ ودّ سے ماخوذ ہے جو کہ خالص محبت سے عبارت ہے، الودود، وادّ کے معنی میں بھی ہے اور مودود کے معنی میں بھی، اس لیے کہ اللہ محبّ بھی ہے اور محبوب بھی۔ جیسا کہ اس نے فرمایا:

﴿فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ﴾ (المائدة: ٥٤)

''اللہ جلد ہی ایک ایسی قوم لے کر آئے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء سے دوستی رکھتا ہے اور وہ اس سے دوستی رکھتے ہیں، وہ اس تک رسائی کے متمنی، اس کی جنت کے طلبگار اور اس کی خوشنودی کے حصول کے متلاشی رہتے ہیں۔

آیت میں اسماء باری تعالیٰ میں سے الغفور اور الودود جبکہ صفات میں سے مغفرت اور ودّ موجود ہیں۔ کاش! مؤلف محبت کے بارے میں دسویں آیت کا بھی اضافہ کر لیتے اور وہ ہے: خلت، قرآن کہتا ہے:

﴿وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ (النساء: ١٢٥) ''اور اللہ نے ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔''

خلیل وہ ہوتا ہے جو محبت کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہو۔ خلت محبت کی اعلیٰ ترین قسم ہے، اس لیے کہ خلیل کی تعریف یہ ہے کہ جس کی محبت دانہ دل تک رسائی حاصل کر لے اور وہ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے، محبت کی کوئی بھی قسم خلت سے برتر نہیں ہو سکتی۔ ایک شاعر اپنی معشوقہ سے کہتا ہے:

قَدْ تَخَلَّلْتِ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّي   وَبِذَا سُمِّيَ الْخَلِيْلُ خَلِيْلًا

''میری عشقیہ! تو میری روح میں رچ بس گئی ہے۔ خلیل کو اس نام سے موسوم کرنے کی یہی وجہ ہے۔''

نبی کریم ﷺ محبت تو اپنے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ فرماتے مگر آپ نے ان میں سے کسی کو بھی خلیل نہیں بنایا، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اگر میں نے اپنی امت سے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔[1] ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب تھے مگر وہ مقام خلت پر فائز نہ ہو سکے، اس لیے کہ

[1] صحيح بخاری: ٢٣٥٦۔ صحيح مسلم: ٢٣٨٣۔

رسول علیہ السلام نے کسی کو بھی اپنا خلیل نہیں بنایا تھا، خلت آپ ﷺ اور آپ کے رب کے درمیان تھی، رسول معظم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ نے مجھے خلیل بنایا جس طرح اس نے ابراہیم کو خلیل بنایا۔'' ❶ جہاں تک ہمیں علم ہے اولاد آدم میں سے خلت صرف، حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہما السلام کے لیے ثابت ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ نے مجھے خلیل بنایا جس طرح اس نے ابراہیم کو خلیل بنایا۔''

خلت اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور یہ محبت کی اعلیٰ ترین قسم ہے، اور توقیفی ہے لہٰذا بدون دلیل ہم کسی بھی انسان کے لیے منصب خلت کا اثبات نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ انبیاء کرام کے لیے بھی اس کا اثبات جائز نہیں ہوگا، بجز ان رسولین کریمین کے جو کہ رب تعالیٰ کے خلیل ہیں۔

﴿وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ یہ وہ قرآنی آیت ہے جس سے معطلہ جہمیہ کے رئیس جعد بن درہم کے قاتل نے اس کے قتل پر استشہاد کیا تھا، جب جعد بن درہم نے اس قرآنی آیت کا انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ نہ تو اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور نہ ہی موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوا تو اس پر خالد بن عبداللہ قسری نے اسے قتل کر ڈالا۔ ❷

جعد بن درہم کو عیدالاضحیٰ کے دن پابند سلاسل کر کے خالد بن عبداللہ کے سامنے پیش کیا گیا تو خالد نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: لوگو! تم قربانی کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے، میں تو آج جعد بن درہم کی قربانی کروں گا، اس لیے کہ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ نے نہ تو ابراہیم کو خلیل بنایا اور نہ ہی موسیٰ سے ہمکلام ہوا۔ پھر اس نے جعد بن درہم کو ذبح کر ڈالا۔ ❸ اس بارے میں ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَلِأَجْلِ ذَا ضَحَّى بِجَعْدٍ خَالِدُ ... الْقَسْرِيُّ يَوْمَ ذَبَائِحِ الْقُرْبَانِ
إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لَيْسَ خَلِيلَهُ ... كَلَّا وَلَا مُوسَى الْكَلِيمُ الدَّانِي
شَكَرَ الضَّحِيَّةَ كُلُّ صَاحِبِ سُنَّةٍ ... لِلَّهِ دَرُّكَ مِنْ أَخِي قُرْبَانِ

''اسی لیے عید قربان کے دن خالد قسری نے جعد کو ذبح کر دیا، جو یہ کہتا تھا کہ نہ تو ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور نہ موسیٰ کلیم اللہ، ہر صاحب سنت نے اس قربانی کی تعریف کرتے ہوئے قربانی کرنے والے کی تعریف کی۔'' محبت اور مودت تو سب لوگوں کے ساتھ ہو سکتی ہے مگر خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے ساتھ خاص

❶ صحیح مسلم: ۵۳۲۔ عن جندب بن عبداللہ.

❶ خالد بن عبداللہ القسری، ذہبی اس کا تعارف یوں کراتے ہیں: امیر ابوالہیثم خالد بن عبداللہ بن یزید بن اسد بن کرز بجلی، دمشقی، قسری، یہ ہشام کی طرف سے کوفہ و بصرہ کا امیر رہا، اور قبل ازیں ولید بن عبدالملک اور پھر سلیمان کی طرف سے مکہ مکرمہ کا امیر رہا، یہ بڑا سخی، بلند پایہ اور قابل تعریف انسان تھا، مگر وہ نصب میں شہرت رکھتا تھا، عبداللہ بن احمد کہتے ہیں، میں نے ابن معین سے سنا وہ فرما رہے تھے: خالد بن عبداللہ قسری برا آدمی ہے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں زبان درازی کیا کرتا تھا۔'' ملاحظہ ہو: السیر: ۵/ ۴۳۲۔ ۴۲۵

❷ اسے بخاری نے ''خلق افعال العباد'' زیر رقم: ۱۲ اور دارمی نے ''الرد علی الجهمية: ۱۷'' میں ذکر کیا۔ اور البانی نے ''مختصر العلو: ۱۳۵'' میں اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو: ''مختصر الصواعق، لابن القیم: ۳/ ۱۰۷۱.

ہے۔ ہمارے لیے غیبی امور میں سمعی دلائل پر اعتماد کرنا ضروری ہے مگر اس حوالے سے عقلی دلائل سے استدلال کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے تاکہ اللہ کے لیے محبت کا انکار کرنے والوں کے خلاف ان کے ساتھ حجت قائم کی جا سکے، مثلاً اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے مابین محبت کا اثبات کبھی بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس پر عقل دلالت نہیں کرتی اور جس چیز پر عقل دلالت نہ کرے اس سے اللہ تعالیٰ کو منزہ قرار دینا واجب ہے۔''

مگر ہمارے نزدیک جس طرح یہ محبت ادلۂ نقلیہ سے ثابت ہے اسی طرح ادلۂ عقلیہ سے بھی ثابت ہے، لہٰذا ہم بتوفیق ایزدی یہ کہنا چاہیں گے۔

اطاعت گزاروں کو جنت، نصرت، معاونت اور تائید وحمایت وغیرہا کی صورت میں اجر وثواب سے نوازنا محبت پر دلالت کرتا ہے، ہمارا اپنا مشاہدہ بھی ہے اور ہم اپنے کانوں سے سنتے بھی رہتے ہیں کہ اللہ عزوجل اپنے بندوں کی تائید وحمایت بھی کرتا ہے اور انہیں اپنی نصرت سے بھی نوازتا ہے کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلیل نہیں ہے؟ اس جگہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

محبت کے اسباب

پہلا سوال: انسان اللہ تعالیٰ کی محبت کیونکر حاصل کر سکتا ہے؟ یاد رہے کہ محبت انسان میں موجود ایک فطری عمل ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے، مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں کے درمیان عدل کے حوالے سے فرمایا: ''میرے اللہ! میری یہ تقسیم ان امور کے بارے میں ہے جن کا میں مالک ہوں مگر جن چیزوں کا مالک میں نہیں ہوں ان کے بارے میں مجھے ملامت نہ کرنا۔''❶

جواب: محبت کے بہت سارے اسباب ہیں:

(أ) انسان یہ دیکھے کہ اس کا خالق کون ہے؟ جب وہ شکم مادر میں تھا، اس وقت سے لے کر آج تک مسلسل اس پر یہ انعامات واکرامات کون کر رہا ہے؟ میری رگوں میں خون کس نے دوڑایا؟ اور مجھے ارضی وآسمانی آفات اور مصائب وآلام سے کون محفوظ رکھتا ہے؟

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ یہ امور حصول محبت کا سبب بنتے ہیں، اسی لیے ایک اثر میں وارد ہے: ''اللہ سے اس لیے محبت کرو کہ وہ تمہیں نعمتوں سے نوازتا ہے۔''❷

اگر کوئی شخص ایک قلم آپ کو تحفہ میں پیش کرے تو آپ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، جب آپ دیکھتے ہیں کہ میرے رب نے مجھ پر بے شمار نعمتیں فرمائی ہیں تو یقیناً آپ اس سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔

جب آپ کو کسی چیز کی شدید ضرورت لاحق ہو اور پھر اللہ کی طرف سے اس کی نعمت کا نزول ہو اور آپ کی وہ ضرورت

---

❶ اسے احمد: ٥/ ١٤٦۔ ابوداود: ٢١٣٤۔ ابن ماجہ: ١٩٧١۔ نسائی: ٦٤٧۔ ترمذی: ١١٤٠۔ ابن حبان: ٥١١٠۔ اور حاکم: ٢/ ١٦٧ نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان سے موافقت کی۔ اس کے وصل وارسال میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ارواء الغلیل: ٢٠١٨.

❷ اسے ترمذی: ٣٧٨٩۔ حاکم: ٣/ ١٥٠۔ بیہقی نے شعب الایمان: ١٣٧٨۔ طبرانی: ٣١٣١۔ ابونعیم نے الحلیۃ: ٣/ ٢١١ میں روایت کیا، اس حدیث کو البانی نے ''فقہ السیرۃ'' کی تعلیقات میں ضعیف کہا ہے۔

پوری کر دی جائے تو آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا اور آپ اپنے محسن سے پیار کرنے لگیں گے، اللہ رب العزت نے آپ کو بڑی بڑی نعمتوں سے نوازا، اس نے آپ کو اپنے بہت سارے مومن بندوں پر فضیلت دی، اس نے آپ کو علم کی دولت سے مالا مال کیا، اپنی بندگی کی توفیق بخشی، دنیاوی مال وزر، اچھی خوراک اور اچھے لباس سے متمتع کیا اور ان کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی نعمتوں کی بہتات فرمائی۔ جب آپ اس سب کچھ کو دیکھتے ہیں تو اللہ رب کائنات کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔

(ب) اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ قولی، فعلی اور قلبی اعمال کے ساتھ محبت کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے لگ جاتا ہے، جب انسان ان اعمال کے ساتھ محبت کرتا ہے تو اللہ اس کے صلہ کے طور پر اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کر دیتا ہے تو پھر جب وہ اس کے پسندیدہ اعمال بجا لاتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے، اسی طرح وہ اس کے محبوب بندوں سے بھی محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ جب آپ نبی کریم ﷺ سے محبت کریں گے، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام سے محبت کریں گے، صدیقین، شہداء اور ان دوسرے لوگوں سے محبت کریں گے، جن سے اللہ محبت کرتا ہے تو اس سے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوگی، گویا اللہ کے محبوب بندوں سے محبت کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا سبب بھی ہے اور اس کا ایک اثر بھی۔

(ج) اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا بایں طور کہ وہ ہمیشہ آپ کے دل میں رہے، یہاں تک کہ آپ جب بھی کوئی چیز دیکھیں اس سے وجود باری تعالیٰ پر استدلال کریں، اور آپ کا دل اللہ کی یاد میں مصروف رہے اور غیر اللہ سے کٹ کر اسی کے ساتھ جڑا رہے۔

میرے نزدیک یہ تین اسباب اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے قوی ترین اسباب ہیں۔

دوسرا سوال: کیا آپ ان سلوکی آثار کی نشاندہی کر سکتے ہیں جنہیں مذکورہ بالا امور مستلزم ہیں؟

جواب: ہاں، اور ان آثار کی تفصیل اس طرح سے ہے:

اولاً: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴾ (البقرة : ۱۹۵) ”اور احسان کرو یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

یہ ارشاد اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم احسان کے حریص رہیں، اس لیے کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہے اور جس چیز سے اللہ محبت کرتا ہو، ہمیں اس کا حریص رہنا چاہیے۔

ثانیاً: ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَاَقۡسِطُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ﴾ (الحجرات : ۹) ”اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

ہم سے عدل اور اس پر حریص رہنے کا تقاضا کرتا ہے۔

ثالثاً: قرآنی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ﴾ (التوبہ : ۷) ”یقیناً اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔“ اس

امر کی متقاضی ہے کہ ہم اللہ سے ڈریں نہ کہ اس کی مخلوق سے۔ وہ اس طرح کہ اگر ہمارے پاس کوئی قابل احترام شخص موجود ہو تو معاصی کو ترک کر دیں اور اس کی عدم موجودگی میں ان کا ارتکاب کرنے لگیں، تقویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ سے ڈریں، اور اس حوالے سے کسی کے وجود اور عدم وجود کو کوئی اہمیت نہ دیں، اگر ہم اپنے اور اللہ کے مابین امور کی اصلاح کریں گے تو وہ ہمارے اور لوگوں کے مابین امور کی خود اصلاح فرما دے گا، آپ اس چیز کو اہمیت دیں جو آپ کے اور آپ کے رب درمیان ہے اور اس کے علاوہ کسی چیز کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (الحج: ۳۸) ''یقیناً اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے۔''

آپ شریعت کے تقاضے پورے کریں گے تو اس کا انجام آپ کے حق میں ہوگا۔

رابعاً: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ﴾ (البقرة: ۲۲۲) ''یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں سے۔''

یہ آیہ کریمہ ہم پر کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے اور قلب وقالب کے ساتھ اس کی طرف بکثرت رجوع کرنے کو واجب قرار دیتی ہے۔ انسان کا صرف زبان سے یہ کہہ دینا کہ میں اللہ کے حضور توبہ کرتا ہوں، نفع بخش ثابت نہیں ہوتا، بلکہ حضور قلب کے ساتھ اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور ان گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہوتا ہے، یقیناً اس طرح آپ اللہ کی محبت کے حصول میں کامیاب ہوں گے۔

﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (البقرة: ۲۲۲) ''اور وہ بہت پاک رہنے والوں سے بھی محبت کرتا ہے۔'' کپڑوں کو نجاست سے پاک کرنے کے لیے انہیں دھوتے وقت آپ کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ اللہ آپ سے محبت کرتا ہے، یہی احساس وضو کرتے وقت اور غسل کرتے وقت بھی ہونا چاہیے، اس لیے کہ اللہ پاک صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

مگر واللہ! ہم ان معانی سے غافل ہیں، ہم نماز ادا کرنے کے لیے وضو بھی کرتے ہیں، غسل جنابت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں، مگر یہ بات بھولے رہتے ہیں کہ یہ اعمال اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ اور اس کی محبت کے حصول کا سبب ہیں، اگر پیشاب کے ایک قطرے سے پاک کرنے کے لیے کپڑوں کو دھوتے وقت یہ بات ہمارے ذہن میں ہو کہ مجھے اللہ کی محبت حاصل ہوگی تو ہم بہت ساری بھلائیاں سمیٹ سکتے ہیں، مگر ہم غفلت میں پڑے ہیں۔

خامساً: ارشاد ربانی: ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ (آل عمران: ۳۱) ''فرما دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔'' بھی اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ ہم آخری حد تک نبی کریم ﷺ کی اتباع کے حریص رہیں آپ کے راستے پر اس طرح گامزن ہوں کہ نہ اس سے باہر نکلیں، نہ اس میں کمی بیشی کریں اور نہ کسی کوتاہی کے مرتکب ہوں، ہمارا یہ شعور ہمیں بدعات وخرافات سے محفوظ رکھے گا، اور دین میں اضافہ کرنے یا غلو اختیار کرنے سے بچائے رکھے گا۔ اگر ہمیں ان امور کا شعور حاصل ہو جائے تو پھر دیکھنا کہ ہمارے اخلاق وآداب اور سلوک وعبادات کیا رنگ اختیار کرتے ہیں۔

سادساً: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ﴾ (المائدۃ: ٥٤) ''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہو جائے تو اللہ ایک ایسی قوم لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔''

ہمیں اسلام سے برگشتہ ہونے سے خبردار کرتا ہے، نماز کا شمار بھی اسی میں ہوتا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خبردار کرتا ہے کہ اگر ہم اپنے دین سے پھریں گے تو وہ ہمیں ہلاک کر دے گا اور پھر ہماری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے اور اپنے رب کی طرف سے ادا کردہ ذمہ داریاں نبھائیں گے تو یقیناً ہم رب تعالیٰ کے اطاعت گزار رہیں گے اور ہر اس چیز سے دور رہیں گے جو ہمیں ارتداد کے قریب کرتی ہو۔

سابعاً: ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝﴾ (الصف: ٤) ''بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے راستے میں ایسی صف بنا کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

اس محبت پر یقین رکھنے کی صورت میں ہم وہ پانچ اسباب ضرور اپنائیں گے جو اس محبت کو واجب قرار دیتے ہیں، اور وہ ہیں: قتال یعنی کاہلی وسستی کا معدوم ہونا، اخلاص، یعنی جہاد کا فی سبیل اللہ ہونا اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک دوسرے کو مضبوط بنانا۔ آخری بات اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ میدان جہاد میں صف حسی طور پر بھی برابر ہو، اس طرح دل بھی مل جائیں گے اور الفت میں مزید اضافہ ہوگا۔

جب آدمی کو معلوم ہو کہ ایک شخص اس کی دائیں طرف اور ایک بائیں طرف کھڑا ہے تو وہ بھرپور انداز میں پیش قدمی کرے گا اور اگر اس کے کئی ساتھی اس کے چاروں طرف کھڑے ہوں تو اس کی ہمت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ان آیات میں:

۱۔ ذات باری تعالیٰ کے لیے سمعی دلائل کے ساتھ محبت کا اثبات کیا گیا ہے۔

۲۔ محبت کے اسباب گنوائے گئے ہیں۔

۳۔ اس محبت پر ایمان ویقین رکھنے سے جو سلوکی آثار جنم لیتے ہیں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

محبت کے انکار کرنے والوں کا ردّ

مگر اس کا انکار کرنے والے بدعتی گروہوں کے پاس صرف ایک ہی کمزور سی دلیل ہے اور یہ ہے کہ:

اولاً: اس پر عقل دلالت نہیں کرتی۔

ثانیاً: محبت دو ہم جنس وجودوں میں ہوتی ہے، خالق ومخلوق کے درمیان محبت نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں: تمہارا یہ دعویٰ قابل تسلیم ہے کہ عقل محبت پر دلالت نہیں کرتی مگر اس پر سمع تو دلالت کرتی ہے، جو کہ ایک مستقل دلیل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل: ٨٩)



''اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کی وضاحت ہے۔''

جب قرآن تبیان ہے تو پھر وہ ایک مستقل دلیل ہے اور دلیل معین کے انتفاء سے مدلول کا انتفاء لازم نہیں آتا، اس لیے کہ مدلول کے متعدد دلائل ہو سکتے ہیں وہ حسی بھی ہو سکتے ہیں اور معنوی بھی۔

حسی دلیل کی مثال یہ ہے کہ ایک شہر ہے جس تک کئی راستے پہنچاتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک راستہ بند ہو جائے تو ہم دوسرا راستہ اختیار کر لیں گے۔

معنوی دلائل کی مثال یہ ہے کہ کتنے ہی شرعی احکام ایسے ہیں جن کے متعدد دلائل موجود ہوتے ہیں، مثلاً نماز کے لیے وجوب طہارت متعدد دلائل سے ثابت ہے۔

اگر تم یہ کہتے ہو کہ خالق ومخلوق کے درمیان اثبات محبت پر عقل دلالت نہیں کرتی تو سمع اس پر بڑے جلی اور واضح انداز میں دلالت کرتی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ دعویٰ ہی تسلیم نہیں کرتے کہ عقل اس محبت پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا عقل خالق ومخلوق کے درمیان اثبات محبت پر دلالت کرتی ہے۔

رہا تمہارا یہ قول کہ محبت صرف دو ہم جنس افراد کے درمیان ہی ہو سکتی ہے، تو تمہارے اس دعویٰ کو بھی قبول نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اصل عدم ثبوت ہے، محبت غیر متجانسین کے درمیان بھی ہو سکتی ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو مختلف چیزوں سے محبت کرتے ہیں اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو مختلف اشیاء کے شائقین ہوتے ہیں۔ جانور لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، ہم بحمد اللہ تعالیٰ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان محبت کا اثبات کر چکے۔

آیات صفت رحمت

شرح:...... مندرجہ ذیل آیات اللہ تعالیٰ کے لیے صفت رحمت کے اثبات پر مشتمل ہیں:

پہلی آیت: ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ (النمل : ۳۰)

''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا بڑا مہربان ہے۔''

مؤلف رحمہ اللہ اس آیت کو اس حکم کے اثبات کے لیے لائے ہیں، بسملہ کی شرح پہلے گزر چکی ہے اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

رحمت عامہ اور خاصہ میں فرق

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے تین اسماء: اللہ، الرحمن، الرحیم اور دو صفات: الوہیت ورحمت پر مشتمل ہے۔

دوسری آیت: ﴿رَبَّنَآ وَسِعۡتَ کُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَۃً وَّعِلۡمًا﴾ (الغافر : ۷) ''ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم کے ساتھ گھیر رکھا ہے۔''



اللہ تعالیٰ حاملین عرش فرشتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ﴾ (الغافر: ۷)

''وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے ہیں، ہمارے پروردگار! تو اپنی رحمت اور علم سے ہر ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس لیے تو ان لوگوں کو معاف کر دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے سیدھے راستے کی اتباع کی اور انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے۔''

ایمان کس قدر عظیم ہے اور اس کا فائدہ کتنا عظیم ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرش عظیم کو اٹھانے والے فرشتے مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کر رہے ہیں۔

[رَبَّنَآ وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا]..... یہ فرمان باری تعالیٰ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی رحمت کی ہر چیز تک رسائی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو حکم میں ایک ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ رحمت عامہ ہے جو کہ تمام مخلوقات پر مشتمل ہے یہاں تک کہ کفار بھی اس سے مستفید ہو رہے ہیں، اور یہ اس لیے کہ رب تعالیٰ نے اس رحمت کو علم کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے، جس چیز تک اللہ تعالیٰ کے علم کی رسائی ہے اور اس کی رسائی ہر ایک چیز تک ہے۔ اس تک اس کی رحمت کی بھی رسائی ہے، اسے کافروں کا علم بھی ہے اور وہ ان پر رحمت بھی فرماتا ہے۔

مگر کفار پر اللہ تعالیٰ کی رحمت بدنی اور دنیوی ہے جو اس رحمت سے کہیں کم اور محدود ہے جو وہ اہل ایمان پر فرماتا ہے، کافر کو رزق دینے والا بھی اللہ ہے، جو اسے کھلاتا، پلاتا، رہائش فراہم کرتا اور اس کا گھر آباد کرتا ہے۔

رہے مومنین، تو ان کی رحمت اس رحمت سے زیادہ خاص بھی ہے اور زیادہ عظیم بھی، اس لیے کہ وہ ایمانی، دینی اور دنیاوی رحمت ہے، یہی وجہ ہے کہ کافر کے مقابلے میں مومن کی حالت زیادہ اچھی ہوتی ہے، یہاں تک کہ دنیوی امور میں بھی وہ اس سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (النحل: ۹۷)

''جو شخص بھی نیک عمل کرے وہ مرد ہو یا عورت اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ آرام دہ زندگی میں زندہ رکھیں گے۔''

جبکہ یہ پاکیزہ زندگی کافر کے لیے مفقود ہے، ان کی زندگی جانوروں جیسی ہے، پیٹ بھر کر کھا لیا تو لید کر دی، بھوکا رہا تو بیٹھ کر چلانے لگا۔ کفار کا بھی یہی حال ہے، آسودہ حال ہوئے تو اکڑنے لگے، بدحال ہوئے تو چیخنے چلانے لگے اور دنیا میں رہ کر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اس کے برعکس مومن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مصیبت آنے پر صبر کرتا ہے اور اللہ سے اس کا

اجر پاتا ہے، اور خوشی ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے۔ وہ اس حالت میں بھی خیریت سے ہوتا ہے اور اس حالت میں بھی۔ وہ بڑے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ رب تعالیٰ کے فیصلوں کو تسلیم کرتا ہے۔ نہ تکلیف آنے پر بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے اور نہ راحت ملنے پر نخوت وغرور میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی توازن، استقامت اور اعتدال سے عبارت ہوتی ہے۔ اس رحمت اور اس رحمت میں فرق نمایاں ہے۔

مگر برادران اسلام! بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم میں سے ہزاروں لوگ کفار کے قدم بقدم چلنا چاہتے ہیں، انہوں نے دنیا کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اگر کچھ مل گیا تو راضی اور نہ ملا تو ناراض، ان لوگوں کو دنیوی آسائشیں جتنی بھی میسر آ جائیں دنیا کی لذت کا ذائقہ کبھی بھی چکھ نہ پائیں گے، اس ذائقہ سے وہی لوگ آشنا ہوں گے جن کا اللہ پر ایمان ہوگا اور اعمال صالحہ بجا لائیں گے، اسی لیے علماء سلف میں سے کسی کا قول ہے: اللہ کی قسم! اگر بادشاہوں اور شہزادوں کو ہماری مسرتوں اور راحتوں کا علم ہو جائے تو وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے ہمارے ساتھ تلواروں سے لڑیں۔ وہ ان مسرتوں سے اس لیے لطف اندوز نہیں ہو سکتے کہ ان کے اور ان راحتوں کے درمیان ان کا فسوق وعصیان اور دنیا کی طرف میلان حائل ہے، دنیا ہی ان کا مقصد وحید ہے اور یہی ان کا مبلغ علم ہے۔

[رَحْمَةً وَّعِلْمًا]..... (رحمةً) یہ تمییز محول عن الفاعل ہے۔ اور اسی طرح (علما) بھی اصل عبارت یوں ہے: "ربنا وسعت رحمتك وعلمك كل شيء"، "ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم نے ہر چیز کو اپنی وسعت میں لے رکھا ہے۔"

آیت میں ان صفات باری تعالیٰ کا ذکر ہے: ربوبیت، عموم رحمت اور علم۔

تیسری آیت: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ (الاحزاب: ٤٣) "اور وہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔"

[بِالْمُؤْمِنِينَ]..... یہ (رحیمًا) کے ساتھ متعلق ہے۔ معمول کو مقدم لانا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح آیت کا معنی ہوگا: وہ مومنوں پر رحم کرتا ہے دوسروں پر نہیں۔

اگر اس آیت کا معنی یہ ہے تو پھر اس میں اور اس سے ماقبل کی آیت: ﴿رَبَّنَآ وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (الغافر: ٧) میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس رحمت کا اس آیت میں ذکر ہے، وہ اس رحمت سے مختلف ہے جس کا ماقبل کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ رحمت خاصہ ہے جو کہ آخرت کی رحمت کے ساتھ متصل ہے اور جسے کفار حاصل نہیں کر سکیں گے، بخلاف پہلی رحمت کے۔ دونوں آیتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ رحمت کفار پر بھی ہوتی ہے اور مومنین پر بھی، مگر رحمت خاصہ اور رحمت عامہ میں بہت فرق ہے۔

آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا ذکر ہے۔ اور یہ سلوکی اعتبار سے ایمان کی ترغیب دلاتی ہے۔

چوتھی آیت: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ٥٤) "تمہارے رب نے اپنی ذات پر رحمت کو ضروری قرار دے دیا ہے۔"

پانچویں آیت: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ٥٤) ''تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کرلیا ہے۔''

[كَتَبَ] .... ''أوجب'' کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے فضل وکرم اور جود وسخاء کی وجہ سے اپنی ذات پر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے اور اپنی رحمت کو اپنے غضب پر مقدم کیا ہے۔

﴿وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (فاطر: ٤٥)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑنے لگتا تو زمین کی پشت پر کسی بھی چلنے پھرنے والی چیز کو نہ چھوڑتا۔''

اس کے حلم اور رحمت کی وجہ سے مخلوق طے شدہ وقت تک باقی رہے گی۔ یہ ارشاد باری بھی اس کی رحمت کے زمرے میں آتا ہے:

﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢ ا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾ (الانعام: ٥٤)

''بات یوں ہے کہ تم میں سے جس نے بھی نہ جانتے ہوئے کوئی برا عمل کیا۔ پھر اس نے اس کے بعد توبہ کرلی اور اصلاح کرلی تو بلاشک وہ معاف فرمانے والا بڑے رحم والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ گناہ کے بعد توبہ کرنے والے اور اصلاح کرنے والے کے گناہ بھی معاف کرتا ہے اور اس پر رحم بھی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کا اختتام ان الفاظ پر اس لیے فرمایا ہے تاکہ بندوں کو بتایا جائے کہ اس کے سامنے توبہ کرنے والے مغفرت اور رحمت دونوں کے حصول میں کامیاب رہتے ہیں۔ وگرنہ عدل کا تقاضا تو یہ تھا کہ اللہ اسے اس کے گناہ کی سزا دیتا اور نیک اعمال کی جزا دیتا۔

اگر کسی نے پچاس دن گناہ کیے ہوں اور پھر پچاس دن توبہ کرنے اور اصلاح کرنے میں گزارے ہوں تو عدل کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے پچاس دنوں کی سزا دی جائے اور پچاس دنوں کے ثواب سے نوازا جائے مگر چونکہ اللہ نے اپنی ذات پر رحمت واجب قرار دے رکھی ہے لہٰذا پچاس دنوں کے گناہ لمحہ بھر کی توبہ سے ختم ہوجاتے ہیں۔ اور اس پر مزید یہ کہ:

﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ (الفرقان: ٧٠)

''بس یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کی برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دے گا۔''

آیت میں اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل صفات کا ذکر ہے: ربوبیت، ایجاب اور رحمت۔

چھٹی آیت: ﴿وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (یونس: ١٠٧) ''اور وہ معاف کرنے والا اور بڑے رحم والا ہے۔'' اللہ ہی غفور ورحیم ہے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں اسموں کو ایک ساتھ بیان کیا، اس لیے کہ مغفرت فرمانے سے گناہوں کی سزا ساقط ہو جاتی ہے اور رحمت سے مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ انسان کو مغفرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور رحمت کی بھی۔ وہ مغفرت ملنے کی صورت میں اپنے گناہوں سے نجات پالیتا ہے اور رحمت کی وجہ سے حصول مطلوب کی سعادت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

[الْغَفُوْرُ] .... مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ غفر سے ماخوذ ہے، جو کہ ''بچاؤ کے ساتھ پردہ'' سے عبارت ہے، اور غفر،

مغفر سے ماخوذ ہے اور یغفر (خود) ایک ایسی چیز ہے جسے فوجی جنگ کے دوران تیروں وغیرہا سے بچنے کے لیے سر پر پہنتا ہے۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک تو سر چھپ جاتا ہے دوسرے تیروں سے محفوظ رہتا ہے، اس اعتبار سے۔

الْغَفُوْرُ وہ ہے جو اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا اور پھر انہیں معاف کر کے انہیں ان کی سزاؤں سے بچاتا ہے۔ اس معنی کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے کے ساتھ علیحدگی میں جا کر اس سے اس کے گناہوں کا اعتراف کرواتے ہوئے فرمائے گا: تو نے یہ عمل کبھی کیا، تو نے یہ گناہ بھی کیا...... یہاں تک کہ وہ سب کا اقرار کر لے گا۔ اس پر اللہ فرمائے گا: میں نے دنیا میں تیرے یہ گناہ چھپائے رکھے اور آج میں انہیں معاف کرتا ہوں۔''[1]

الرَّحِيْمُ ہمہ گیر رحمت والا۔ اس کے بارے میں تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔

اس آیت میں مندرجہ ذیل اسماء: الغفور، الرحیم اور مندرجہ ذیل صفات مذکورہ ہیں: مغفرت، رحمت۔

ساتویں آیت: ﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (یوسف: ٦٤) ''پس اللہ ہی بہتر حفاظت کرنے والا اور سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

یہ بات حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی کو اپنے دوسرے بیٹوں کے ساتھ عزیز مصر کے پاس بھیجتے وقت کہی تھی اسے بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ آئندہ کے لیے تمہیں غلہ اسی صورت میں ملے گا جب تم اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لے کر آؤ گے۔ انہوں نے جب یہ پیغام اپنے والد محترم تک پہنچایا تو انہوں نے اسے وداع کرتے وقت فرمایا:

﴿هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۝﴾ (یوسف: ٦٤)

''اس نے کہا: کیا میں اس پر تمہارا اسی طرح اعتبار کروں جیسے میں نے اس سے پہلے اس کے بھائی پر تمہارا اعتبار کیا تھا، پس اللہ ہی بہتر حفاظت کرنے والا اور سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی اس کی حفاظت تم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ عربوں کے اس قول کی طرح ''اگر ساری مخلوق کی رحمتیں بھی جمع کر لی جائیں تو اللہ کی رحمت پھر بھی بھاری اور عظیم الشان ہوگی۔''

[خَيْرٌ حٰفِظًا].... (حافظها) علماء فرماتے ہیں: یہ تمیز ہے: للہ درہ فارسا. یعنی وہ کس قدر بلند پایہ شہسوار ہے۔ ایک دوسرے قول کی رو سے یہ ﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ﴾ میں (خیر) کے فاعل سے حال ہے۔

آیت میں شاہد: ﴿وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ ہے، جس میں اللہ کے لیے نہ صرف یہ کہ رحمت کا اثبات کیا گیا ہے۔ بلکہ اس امر کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

مخلوق کی مخلوق کے ساتھ رحمت کے حوالے سے ماں کی رحمت اپنی اولاد کے ساتھ سب سے زیادہ ہوتی ہے، یہ ایسی

[1] ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری: ٢٤٤١۔ صحیح مسلم: ٢٧٦٨.

رحمت ہے کہ کوئی بھی دوسری رحمت اس کے برابر نہیں ہوسکتی، یہاں تک کہ باپ بھی اپنی اولاد پر اس طرح رحم نہیں کرسکتا جس طرح ماں کیا کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت قیدیوں میں اپنے بچے کو تلاش کرنے کے لیے ماری ماری پھرتی رہی، پھر جب وہ اسے مل گیا تو اس نے اسے بڑی شفقت کے ساتھ پکڑا اور نبی کریم ﷺ اور دوسرے لوگوں کے سامنے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگالیا۔ یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بیٹے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟'' انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہرگز نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے، جتنی یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے۔'' [1]

اگر تمام مہربانوں کی مہربانیاں جمع کر لی جائیں تو بھی اللہ کی رحمت کے سامنے ان کی کوئی وقعت نہیں ہے، اس بات پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے پیدا فرمائے، اس میں سے صرف ایک رحمت کو کام میں لاتے ہوئے مخلوقات دنیا میں ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے۔ [2]

ساری مخلوق ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے۔ ذوی العقول بھی کرتے ہیں اور غیر ذوی العقول بھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک سرکش اونٹنی اس خوف کے پیش نظر کہ دودھ پیتے وقت اس کے بچے کو تکلیف ہوگی۔ اس سے اپنا پاؤں اوپر اٹھا لیتی ہے تاکہ وہ آرام اور سہولت کے ساتھ دودھ پی سکے، درندوں کیڑے مکوڑوں تک اپنے بچوں پر شفقت کیا کرتے ہیں اگر کوئی دوسرا ان کی بلوں میں گھسنے کی کوشش کرے تو وہ اپنے بچوں کا دفاع کرنے کے لیے اسے بھگا کر ہی دم لیتے ہیں۔

کتاب وسنت، عقل اور اجماع سے متعدد ایسے دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اثبات ہوتا ہے۔

کتاب اللہ میں رحمت کا اثبات کبھی اسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثلاً: ﴿وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ (یونس : ۱۰۷) ''اور وہ غفور رحیم ہے۔'' اور کبھی صفت کے ساتھ۔ مثلاً

﴿وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ﴾ (الکہف : ۵۸) ''اور تیرا پروردگار مغفرت فرمانے والا رحمت والا ہے۔''

کبھی فعل کے ساتھ مثلاً:

﴿یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (العنکبوت : ۲۱)

''وہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے۔''

اور کبھی اسم تفضیل کے ساتھ مثلاً:

﴿وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ (یوسف : ۹۲) ''اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

سنت میں بھی اس قسم کے متعدد دلائل موجود ہیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے لیے ثبوت رحمت کے عقلی دلائل کا تعلق ہے تو ان میں سے ایک دلیل کے طور پر بہت زیادہ خیر و

---

[1] بخاری: ۵۹۹۹۔ مسلم: ۲۷۵۴ عن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ [2] بخاری: ۶۰۰۰۔ مسلم: ۲۲۵۲ عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ۔



برکت کے حامل وہ امور ہیں جو اس کے حکم سے حاصل ہوتے اور قدم قدم پر بکھرے نظر آتے ہیں اسی طرح وہ بہت سارے غیر پسندیدہ امور بھی جو اللہ کے حکم سے ٹل جاتے ہیں عقلاً اثبات رحمت پر دلالت کرتے ہیں۔

لوگ شدید قسم کی قحط سالی کا شکار ہیں، زمین خشک پڑی ہے اور آسمان نے بارش روک رکھی ہے، ہریالی کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آتا، ایسے میں اللہ تعالیٰ باران رحمت سے نوازتا ہے، جس سے زمین فصلیں اُگانے لگتی ہے، لوگوں کی پیاس بجھتی ہے اور جانور سیر شکم ہو جاتے ہیں۔ ایسے خوش کن مناظر کے دوران اگر آپ کسی عام آدمی سے بھی دریافت کریں کہ ایسا کیونکر ہوا؟ تو وہ جواب دے گا: یہ رب تعالیٰ کی رحمت ہے، یہ ایسی حقیقت ہے کہ اس میں کبھی بھی کسی کو شک نہیں رہا۔

لہٰذا یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سمعی دلائل سے بھی ثابت ہے اور عقلی دلائل سے بھی۔

اشاعرہ اور معطلہ اللہ تعالیٰ کو رحمت کے ساتھ متصف تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس پر عقل دلالت نہیں کرتی۔ نیز اس بھی لیے کہ رحمت مرحوم کے لیے رقت وضعف سے عبارت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ رحمت سے مراد ارادہ احسان یا خود احسان ہے۔ یعنی وہ مخلوق کو نعمتوں سے نوازتا ہے یا ان کے لیے اس کا ارادہ کرتا ہے۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ ان لوگوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ سے اس عظیم نعمت کو سلب کر لیا جس کی ہر بندہ مومن امید رکھتا ہے۔

آپ جس انسان سے بھی پوچھیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ تو وہ یہی جواب دے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خواستگار ہوں۔

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (الاعراف : ٥٦)

''یقیناً اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔''

مگر وہ اس رحمت کا انکار کرتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو رحمت کے ساتھ موصوف کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم ان کے اس قول کی تردید دو طرح سے کرتے ہیں: تردید بالتسلیم اور تردید بالمنع۔

تردید بالتسلیم کے حوالے سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ مان لیا کہ عقل اس پر دلالت نہیں کرتی مگر سمع تو کرتی ہے اگر رحمت ایزدی ایک دلیل سے ثابت نہیں ہوتی تو دوسری دلیل سے تو ہو رہی ہے، تمام عقل مند لوگوں کے نزدیک یہ قاعدہ عامہ مسلمہ ہے کہ دلیل معین کا انتفاء، انتفاء مدلول کو مستلزم نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ دوسری دلیل سے ثابت ہو جائے گا، ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ رحمت ایزدی عقل سے ثابت نہیں ہوتی مگر وہ نقلی دلائل سے ضرور ثابت ہوتی ہے۔ کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو بہت سارے دلائل سے ثابت ہوتی ہیں۔

رہی **تردید بالمنع** تو اس حوالے سے ہمارا کہنا یہ ہے کہ تمہارا یہ قول کہ عقل رحمت پر دلالت نہیں کرتی۔ سراسر باطل ہے۔ عقل رحمت پر دلالت کرتی ہے، جن نعمتوں کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں، آخر ان کا سبب کیا ہے؟ یقیناً یہ رحمت باری تعالیٰ کا ہی نتیجہ ہیں، اگر اللہ اپنے بندوں پر رحم نہ کرتا تو نہ انہیں نعمتوں سے نوازتا اور نہ ہی ان سے خطرات کو ٹالتا۔

یہ امر مشہود ہے اور ہر خاص وعام اس کا شاہد، ایک عامی شخص بھی اپنی دوکان یا بازار میں بیٹھا اس بات سے بخوبی آگاہ

ہے کہ یہ نعمتیں رحمت حق تعالیٰ کے آثار میں سے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ رحمت کا تو انکار کرتے ہیں مگر طریق تخصیص سے ارادہ رحمت کا اثبات کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ارادہ سمع وعقل سے ثابت ہے، سمع کے ساتھ تو واضح ہے جبکہ عقل کے ساتھ اس لیے کہ تخصیص ارادہ پر دلالت کرتی ہے اور تخصیص کا مطلب ہے، موجودہ ماہیت میں مخلوقات کی تخصیص۔ اور یہ چیز ارادہ پر دلالت کرتی ہے۔ مثلاً اس آسمان کا آسمان، زمین کا زمین، سورج کا سورج اور ستاروں کا ستارے ہونا، یہ چیزیں ارادہ کے سبب سے مختلف ہیں، اللہ نے ارادہ کیا کہ آسمان بن جائے آسمان بن لیا، ارادہ کیا گیا زمین بن جائے، زمین بن گئی، اسی طرح ستارے، سیارے وغیرھا۔

وہ کہتے ہیں کہ تخصیص ارادہ پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ اگر ارادہ نہ ہوتا تو سب کچھ ایک ہی شے ہوتا۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ارادہ پر یہ دلیل نعمتوں کی رحمت پر دلالت کی نسبت سے زیادہ کمزور بھی ہے اور زیادہ مخفی بھی۔ نعمتوں کی رحمت پر دلالت کے علم میں عام وخاص برابر ہیں، جبکہ تخصیص کی ارادہ پر دلالت سے صرف طلبۃ العلم جیسے خاص لوگ ہی آگاہ ہیں۔ تم اس قدر جلی چیز کا انکار اور اس قدر خفی چیز کا اثبات کیسے کرتے ہو؟ کیا اس طرح تم تناقض کا شکار تو نہیں ہو؟

ان آیات سے مستفاد سلوکی امور

جب تک انسان اس امر سے آگا رہے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ رحم فرمانے والا ہے تو اس کا اس کی رحمت کے ساتھ تعلق رہے گا۔ اور وہ اس کا انتظار کرتا رہے گا، پھر اور اس کا یہ اعتقاد اسے ہر وہ سبب اختیار کرنے پر آمادہ کرے گا جو اس کی رحمت ایزدی تک رسائی کرا دے۔ مثلاً: احسان، جس کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ (الاعراف: ٥٦)

''یقیناً اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔''

نیز تقویٰ کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ١٥٦)

''میں جلد ہی اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو متقی بنے رہے۔ زکوٰۃ دیتے رہے اور وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے رہے۔''

اسی طرح ایمان، جو کہ رحمت باری تعالیٰ کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے، کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۝﴾ (الاحزاب: ٤٣) ''وہ اہل ایمان پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

ایمان جس قدر مضبوط ہوگا اللہ کے حکم سے رحمت صاحب ایمان کے اتنی ہی قریب ہوگی۔

آیات صفت رضا

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (المائدۃ: ١١٩)

''اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔''

شرح: ...... اس آیت کا شمار آیات رضیٰ میں ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ موصوف بالرضیٰ ہے، وہ عمل سے بھی راضی ہوتا ہے اور عامل سے بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضیٰ کا تعلق عمل کے ساتھ بھی ہے اور عامل کے ساتھ بھی۔ عمل کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنۡ تَشۡكُرُوۡا يَرۡضَهُ لَكُمۡ﴾ (الزمر: ۷) ''اگر تم شکر کرو گے تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرے گا۔''

نیز یہ ارشاد ربانی:

﴿وَ رَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا﴾ (المائدۃ: ۳) ''اور میں نے اسلام کو تمہارے لیے بطور دین کے پسند کیا۔''

اور جس طرح ایک صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین چیزوں کو پسند کرتا ہے اور تین کو ناپسند......!!''[1]

یہ رضیٰ عمل سے متعلق ہے، اسی طرح رضیٰ عامل سے بھی متعلق ہوا کرتی ہے، مثلاً یہی آیت جسے مؤلفؒ نے ذکر کیا ہے:

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ﴾ (المائدۃ: ۱۱۹) ''اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔''

صفت رضیٰ، اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے جو کہ اس کی ذات میں ہے اور اس سے منفصل نہیں ہے، جس طرح کہ معطلہ کا دعویٰ ہے۔

اگر کوئی شخص آپ سے رضیٰ کی تفسیر کرنے کا مطالبہ کرے اور کہے کہ آپ کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ رضیٰ انسان میں صفت غریزیہ ہے اور کسی انسان کے لیے غرائز کی تفسیر ان کے لفظوں سے زیادہ واضح اور جلی کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر ہم اس کی تفسیر یہ کریں گے کہ رضی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، یہ حقیقی صفت ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے اور یہ صفات فعلیہ میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ مومنوں، پرہیز گاروں، عدل کرنے والوں اور شکر گزاروں سے راضی ہوتا ہے اور کافروں، فاسقوں اور منافقوں سے راضی نہیں ہوتا، بعض لوگوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو پسند نہیں کرتا، بعض اعمال کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا اللہ تعالیٰ کا صفت رضیٰ کے ساتھ متصف ہونا سمعی اور عقلی دلائل سے ثابت ہے۔ اس کا اطاعت گزاروں کو ان کے اعمال وطاعات پر اجر وثواب سے نوازنا اس کی رضیٰ پر دلالت کرتا ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ آپ کا اللہ کی رضیٰ پر ثواب دینے سے استدلال کرنا متنازع فیہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی فاسق شخص کو شکر گزار سے بھی زیادہ نعمتیں عطا کرتا ہے۔

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے معصیت پر مصر فاسق کو عطا کرنا استدراج ہے۔ ایسا اس کی رضیٰ کی وجہ سے نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَ اُمۡلِيۡ لَهُمۡ اِنَّ كَيۡدِيۡ

[1] صحیح مسلم: ۱۷۱۵ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ.

مَتِیْنٌo﴾ (الاعراف: ۱۸۲۔ ۱۸۳)

''اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی ہم انہیں آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہو، اور میں انہیں مہلت دیتا ہوں یقیناً میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اسے پکڑتا ہے تو اسے چھوڑتا نہیں۔''

پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌo﴾ (هود: ۱۰۲) [1]

''اور تیرے رب کی پکڑ اسی طرح ہی ہوتی ہے، جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظالم ہوتی ہیں، یقیناً اس کی پکڑ دکھ دینے والی بڑی سخت ہوتی ہے۔''

مزید فرمایا گیا:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَo فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo﴾ (الانعام: ۴۴۔ ۴۵)

''پھر جب وہ بھول گئے اس کو جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوئے اس پر جو انہیں دیا گیا تھا تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس ہونے لگے۔''

اگر انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مقیم ہو اور اسے اس کی طرف سے نوازا جا رہا ہو تو ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ اللہ کی رضیٰ سے صادر ہو رہا ہے۔

صفات غضب، ناراضی، کراہت اور بغض والی آیات

- مؤلف رحمہ اللہ نے ان صفات کے بارے میں پانچ آیات ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ﴾ (النساء: ۹۳) ''اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اللہ اس پر ناراض ہوگا اور اس پر لعنت بھی کرے گا۔''

کیا قاتل ہمیشہ جہنم میں رہے گا؟

شرح:......[وَمَنْ] .... (من) شرطیہ ہے جو کہ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

[مُؤْمِنًا] .... مومن وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو، اس سے ساتھ کافر اور منافق خارج ہو گئے، لیکن جو شخص کسی ایسے کافر کو قتل کر ڈالے جس کا مسلمانوں سے معاہدہ ہے، یا وہ ذمی ہے یا اسے امان حاصل ہے تو وہ

[1] بخاری: ۴۶۸۶۔ مسلم: ۲۵۸۳ عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ۔

گناہ گار تو ہوگا مگر آیت میں مذکورہ وعید کا مستحق نہیں ہوگا۔

رہا منافق، تو وہ جب تک اپنے نفاق کا اعلان نہ کرے۔ ظاہراً معصوم الدم ہوگا۔

[مُّتَعَمِّدًا] .... یہ لفظ کم سن اور غیر عاقل کے اخراج پر دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ ان کا قصد وارادہ اور عہد معتبر نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ لفظ قتل خطا کے مرتکب کے اخراج پر بھی دلالت کرتا ہے۔

بندہ مومن کو عمداً قتل کرنے والے شخص کو یہ سنگین سزا دی جائے گی۔

[جَهَنَّمُ] ..... آگ کا ایک نام۔

[خٰلِدًا فِيهَا] .... یعنی اس میں ہمیشہ ٹھہرے گا۔

[وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ] ..... صفت غضب اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے شایان شان ثابت ہے، اس کا شمار اس کی صفات فعلیہ میں ہوتا ہے۔

[وَلَعَنَهُ] ..... لعنت کا معنیٰ ہے: بھگا دینا اور اللہ کی رحمت سے دور کر دینا۔

قتل عمد کی یہ چار قسم کی سزا ہے اور پانچویں سزا اس ارشاد ربانی میں مذکور ہے: ﴿وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيمًا﴾ (النساء: ۹۳) یعنی اس کے لیے عذاب عظیم تیار ہے۔

قتل بالعمد کی یہ پانچ سزائیں ہیں مگر ایمان سے معمور دل والوں کو اس جرم سے روکنے کے لیے ایک سزا ہی کافی ہے۔

اہل سنت کے نزدیک خلود فی النار کی سزا صرف کفر پر مرتب ہوتی ہے جبکہ قتل کفر نہیں ہے، تو پھر اس پر یہ سزا کس طرح مرتب ہوگی؟ اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

پہلا جواب: یہ مومن کو قتل کرنے والے کافر کی سزا ہے۔

مگر اس قول کی کوئی اہمیت نہیں، اس لیے کہ کفر کی سزا ہی خلود فی النار ہے، اگرچہ کافر کسی مومن کو قتل کرنے کا نہ ہی مرتکب ہوا ہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا٥ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا٥﴾

(الاحزاب: ٦٤۔ ٦٥)

''بیشک اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے بھڑکنے والا عذاب تیار کیا، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں نہ وہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ مددگار۔''

دوسرا جواب: یہ قتل مومن کو جائز سمجھنے والے کی سزا ہے، اس لیے کہ قتل مومن کو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔

مگر امام احمد اس جواب پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ قتل مومن کو حلال خیال کرنے والا تو ویسے ہی کافر ہے اگرچہ وہ اس کا ارتکاب نہ ہی کرے۔ وہ تو کسی مومن کو قتل کیے بغیر ہی جہنم میں ہمیشہ رہنے کی سزا بھگتے گا، لہٰذا یہ جواب بھی غیر مستقیم ہے۔

تیسرا جواب: یہ جملہ تقدیر شرط پر مبنی ہے، یعنی اگر اللہ اسے سزا دے تو اس کی اصل سزا خلود فی النار ہے۔ مگر یہ جواب بھی محل نظر ہے؟ اس لیے کہ اس صورت میں ﴿فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ﴾ کا کیا فائدہ ہوا؟ اگر اللہ اسے سزا دے تو اس کی سزا یہ ہے، تو اس کا معنی یہ ہوا کہ اب وہ خلود فی النار کا مستحق ہو گیا، اس طرح وہ پہلے والی مشکل دوبارہ پیدا ہو جائے گی جس سے ہم خلاصی نہیں پاسکیں گے۔

ان تین جوابات میں سے ہر جواب پر کوئی نہ کوئی اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے۔

چوتھا جواب: یہ سبب ہے مگر جب کوئی مانع سامنے آئے گا تو سبب نافذ نہیں ہوگا، جس طرح کہ ہم کہتے ہیں: قرابت وراثت کا سبب ہے، لیکن اگر قرابت دار غلام ہوگا تو وارث نہیں بن سکے گا، اور اس کی وجہ مانع کا وجود ہے جو کہ غلامی ہے، قتل عمد خلود فی النار کا سبب ہے، مگر جب قاتل مومن ہوگا تو وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ مگر اس پر بھی یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ پھر اس وعید کا فائدہ کیا ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مومن کو عمداً قتل کرنے والے شخص نے وہ سبب اختیار کر لیا جس کی وجہ سے وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا، اس صورت میں مانع کے وجود میں آنے کا احتمال ہے، وہ وجود میں آ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ لہٰذا وہ سنگین خطرے کے کنارے پر کھڑا ہے۔ اسی لیے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''بندہ مومن اپنے دین سے فراخی میں رہتا ہے جب تک وہ حرام خون کا ارتکاب نہ کرے۔''[1] یعنی جب حرام خون کا ارتکاب کرے گا تو دین میں تنگ ہو جائے گا، یہاں تک کہ اس سے نکل جائے گا۔

اس بنا پر اس جگہ وعید انجام کے اعتبار سے ہوگی اس لیے کہ یہ خدشہ موجود ہے کہ یہ قتل اس کے کفر کا سبب بن سکتا ہے اگر ایسا ہوا تو وہ کفر پر مرے گا اور جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔

اس تقدیر پر آیت میں سبب کے سبب کا ذکر ہے، قتل عمد انسان کے کفر پر مرنے کا سبب ہے اور کفر خلود فی النار کا۔ میرے خیال میں اگر انسان اس میں غور و فکر سے کام لے تو اسے اس میں کوئی اشکال نظر نہیں آئے گا۔

پانچواں جواب: خلود سے مراد مکث طویل ہے، نہ کہ مکث دائم، اس لیے کہ عربی زبان میں خلود کا اطلاق مکث طویل پر بھی ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: فلاں شخص قید میں ہمیشہ رہے گا، جبکہ ایسا ہوتا نہیں، عرب کہتے ہیں: فلاں شخص پہاڑوں کی طرح ہمیشہ رہے گا، حالانکہ سبھی کے علم میں ہے کہ انہیں اڑا دیا جائے گا اور زمین چٹیل میدان کی طرح رہ جائے گی۔

یہ جواب آسان ہے اور اسے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے تائید کا ذکر نہیں کیا، یعنی اس نے یہ نہیں کہا: خالدا فیها ابدا . بلکہ یوں فرمایا: ﴿خٰلِدًا فِيْهَا﴾ جس کا معنی یہ ہے کہ وہ جہنم میں عرصہ دراز تک پڑا رہے گا۔

چھٹا جواب: یہ باب وعید سے ہے اور وعید کے خلاف جانا جائز ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ عدل سے کرم کی طرف انتقال ہے، جو کہ لائق ستائش ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: ٦٨٦٢ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما.

جب آپ اپنے بیٹے سے یہ کہیں گے: واللہ! اگر تو بازار گیا تو میں تجھے لاٹھی سے ماروں گا مگر وہ بازار چلا گیا اور پھر جب واپس آیا تو آپ نے اسے ہاتھ سے پیٹا، جو کہ اس کے لیے ایک آسان سزا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے قاتل کو یہ وعید سنائی پھر اسے معاف کر دیا تو اسے اس کا کرم سمجھا جائے گا۔

مگر درحقیقت یہ جواب بھی قدرے محل نظر ہے۔

زیر مطالعہ آیت کے حوالے سے پیدا ہونے والے اشکال کے یہ چھ جواب دیئے گئے ہیں، جن میں سے اقرب الی الصواب پانچواں اور پھر چوتھا جواب ہے۔

سوال: کیا قاتل توبہ کرنے پر بھی اس وعید کا مستحق ہوگا؟

جواب: قرآنی نص کی رو سے وہ اس وعید کا مستحق نہیں ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ٥ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا ٥ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَّكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ٥﴾

(الفرقان: ٦٧-٧٠)

''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور نہ ہی اس جان کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام قرار دے رکھا ہے مگر ساتھ حق کے اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کو سزا سے سابقہ پڑے گا، قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا، اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر پڑا رہے گا، مگر جو توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتا رہے سو ایسے لوگوں کو اللہ ان کی بدیوں کی جگہ انہیں نیکیاں عنایت فرمائے گا۔''

اس آیت سے یہ واضح ہے کہ جو شخص توبہ کرے یہاں تک کہ قتل سے بھی تو اللہ اس کی برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کر دے گا۔ بنی اسرائیل سے ایک شخص جب ننانوے قتل کر چکا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں توبہ کرنے کا خیال پیدا کر دیا، وہ ایک عابد شخص کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا: میں نے ننانویں آدمیوں کو قتل کر ڈالا ہے، کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ عابد نے اس معاملہ کو سنگین خیال کرتے ہوئے کہا کہ تیری توبہ قبول نہیں ہو سکتی، اس پر اس نے اسے بھی قتل کر ڈالا اور اس طرح سو کی تعداد پوری کر دی، پھر اسے ایک عالم کے پاس جانے کو کہا گیا، وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں سو آدمیوں کا قاتل ہوں، کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا: ہاں، تیرے اور توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ مگر اس بستی کے لوگ ظالم ہیں، تو فلاں بستی میں چلا گیا، اس میں اہل خیر اور نیک لوگ رہتے ہیں، اس پر وہ اپنے شہر سے لے کر خیر و بھلائی والے شہر کی طرف ہجرت کر گیا، ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسے موت نے آلیا۔ اب رحمت اور عذاب کے فرشتے جھگڑنے لگے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ دونوں بستیوں کے درمیان فاصلے کی پیمائش کر لو، وہ جس بستی کے زیادہ

قریب ہوگا اس کا شمار اس بستی والوں میں سے ہوگا۔ جب پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ نیک لوگوں کی بستی کے زیادہ قریب ہے۔اس پر رحمت کے فرشتوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ❶

اگر بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے اس شخص کی توبہ قبول ہوسکتی ہے تو اس امت کے کسی فرد کی کیوں نہیں؟

سوال: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ان کے اس صحیح قول کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی؟ ❷

جواب: اس کا جواب دوطرح سے ہے:

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قاتل عمد کی توبہ کو بعید خیال کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ اسے توبہ کی توفیق نہیں ملتی، جب اسے توبہ کی توفیق نہیں ملے گی تو اس سے قتل کا گناہ ساقط نہیں ہوگا۔لہٰذا اس کا مواخذہ کیا جائے گا۔

۲۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس قول سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد یہ تھی کہ مقتول کے حق سے متعلقہ امور میں قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوگی، اس لیے کہ عمداً قاتل کے ساتھ تین حقوق تعلق رکھتے ہیں: اللہ کا حق، مقتول کا حق اور اس کے اولیاء کا حق۔

(أ) اللہ تعالیٰ کا حق یقیناً توبہ سے ساقط ہو جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ (الزمر: ۵۳) ''کہہ دیجیے! میرے بندوں جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا، یقیناً اللہ سب کے سب گناہ معاف کر دیتا ہے۔''

(ب) مقتول کے اولیاء کا حق اس صورت میں ساقط ہوسکتا ہے کہ مقتول اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دے اور ان سے کہے کہ میں نے تمہارے صاحب کو قتل کیا ہے تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو کر سکتے ہو۔اب ان کی مرضی پر منحصر ہے، چاہیں تو قصاص لے لیں، یا دیت وصول کر لیں یا پھر اسے معاف کر دیں۔

(ج) رہا مقتول کا حق، تو دنیا میں اس سے گلوخلاصی کرانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا۔

ویسے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جب ایسا قاتل خالص توبہ کرے تو اس سے مقتول کا حق بھی ساقط ہو جائے گا۔ مگر اس کا حق رائیگاں نہیں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قاتل کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے جنت میں مقتول کے درجات بلند کر دے گا یا اس کے گناہ معاف کر دے گا، اس لیے کہ خالص توبہ کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتی، اس کی تائید قرآن کی اس آیت کے عموم سے ہوتی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ سے

---

❶ صحیح بخاری: ۳۴۷۰۔ صحیح مسلم: ۳۷۶۶ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ.

❷ صحیح بخاری: ۴۷۶۴.

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾

(الفرقان: ٦٨ تا ٧٠)

اس آیت میں مندرجہ ذیل صفات کا ذکر ہے: غضب، لعنت، اعداد عذاب۔

اور اس میں سلوکی درس یہ ہے کہ مومن کو عمداً قتل کرنے سے خبردار رہنا چاہیے۔

دوسری آیت: ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ﴾ (محمد: ۲۸) ''یہ اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور وہ ناپسند کرتے رہے اللہ کی خوشنودی کو۔''

شرح:..... [ذٰلِكَ].... اس کا مشار الیہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ﴾ (محمد: ۲۷)

''کیا حال ہوگا جب فوت کریں گے انہیں فرشتے وہ مار رہے ہوں گے ان کے چہروں پر اور ان کی پیٹھوں پر۔''

[ذٰلِكَ].... یعنی چہروں اور پیٹھوں پر مارنا۔

[بِأَنَّهُمْ]..... یعنی اس سبب سے ہوگا۔ (باء) سببیّت کے لیے ہے۔

[اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللّٰهَ] .... یعنی انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا، اور وہ اللہ کو ناراض کرنے والا ہر کام کرنے لگے۔

وہ عقیدہ ہو یا قول وفعل۔ مگر جو کام کرنے سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، تو اس بارے میں ان کے رویے کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے:

[وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ]..... یعنی انہوں نے اللہ کی خوشنودی والے کاموں کو ناپسند کیا جس کی وجہ سے وہ اس انجام سے دوچار ہوئے کہ مرتے وقت فرشتے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں۔

آیت میں صفات باری تعالیٰ میں سے سخط اور رضیٰ کا اثبات کیا گیا ہے۔

صفت رضیٰ پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے، جبکہ سخط کا معنی غضب کے معنی کے قریب قریب ہے۔

تیسری آیت: ﴿فَلَمَّا آسَفُونَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (الزخرف: ۵۵) ''پھر جب انہوں نے ہمیں خفا کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔''

شرح:..... [آسَفُونَا]..... یعنی انہوں نے ہمیں خفا کر دیا، ہمیں ناراض کر دیا۔

[لَمَّا]...... اس جگہ شرطیہ ہے، فعل شرط ﴿آسَفُونَا﴾ اور جواب شرط ہے: ﴿انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾

اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو سخط اور غضب کی تفسیر انتقام کے ساتھ کرتے ہیں، اشعریہ وغیرہم سے اہل تعطیل کا کہنا ہے کہ سخط اور غضب سے مراد انتقام یا ارادہ انتقام ہے وہ ان دونوں کی تفسیر کسی ایسی صفت کے ساتھ نہیں کرتے جس سے اللہ تعالیٰ متصف ہو، وہ غضب کی تفسیر انتقام یا ارادہ انتقام کے ساتھ کرتے ہیں، اس طرح وہ غضب کی تفسیر یا تو

ایسے مفعول سے کرتے ہیں جو اللہ سے منفصل ہو اور وہ ہے انتقام یا ارادہ کیونکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں، وہ اس کی کسی بھی ایسی صفت کے ساتھ تفسیر نہیں کرتے جو علی وجہ الحقیقہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے شایان شان ثابت ہو۔

جبکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ سخط وغضب انتقام سے مختلف ہیں، انتقام ان دونوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، جس طرح کہ رضیٰ کا نتیجہ ثواب ہوا کرتا ہے۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان لوگوں پر ناراض ہوتا ہے، غضب ناک ہوتا ہے اور پھر ان سے انتقام لیتا ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ اللہ کے لیے سخط اور غضب کے ثبوت سے عقل انکار کرتی ہے، تو اس کا بھی وہی جواب ہے جو صفت رضیٰ کی بحث میں گزر چکا ہے، اس لیے کہ باب ایک ہی ہے۔

ہم کہیں گے کہ عقل سخط اور غضب پر دلالت کرتی ہے، مجرموں سے انتقام لینا اور کافروں کو عذاب دینا سخط وغضب کی دلیل ہے۔

قرآنی آیت ﴿فَلَمَّا آسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (الزخرف : ٥٥) ''تمہاری تردید کرتی ہے جس میں انتقام کو غضب کا غیر قرار دیا گیا ہے'' اس لیے کہ شرط اور مشروط دو الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں۔

کیا غم اور ندامت اللہ کی صفات ہیں؟

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسف کسی ایسی گزشتہ چیز پر غم اور ندامت سے عبارت ہے جس کا ازالہ کرنا نادم کے بس میں نہ ہو، تو کیا اللہ تعالیٰ کو غم اور ندامت سے متصف قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب انکار کی صورت میں یہ ہے کہ عربی زبان میں آسف کے دو معنی ہیں:

معنی اول: أسف بمعنیٰ غم ، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾ (یوسف : ٨٤) ''ہائے افسوس یوسف کے گم ہونے پر، اور غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں۔''

معنی دوم: أسف کا اطلاق غضب پر بھی ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے، أسف علیہ یأسف ، بمعنیٰ غضب علیه . وہ اس پر ناراض ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی نسبت سے پہلا معنی ممتنع ہے جبکہ دوسرا معنی ثابت ہے، اس لیے کہ اللہ نے اس کے ساتھ اپنا وصف خود بیان کیا ہے: ﴿فَلَمَّا أسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ ''جب انہوں نے ہمیں ناراض کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل صفات کا ذکر ہے: غضب اور انتقام۔

اور سلوکی حوالے سے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی باتوں سے خبردار کیا گیا ہے۔

چوتھی آیت: ﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ﴾ (التوبة : ٤٦)

''مگر اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انہیں روک دیا۔''

شرح: ...... اس سے مراد وہ منافقین ہیں، جو غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شامل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ ان کا اٹھنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا اور اس کی وجہ سے ان کا غیر مخلص ہونا تھا، اللہ تعالیٰ تمام شرکاء سے بڑھ کر شرک سے

بے نیاز ہے، نیز اس لیے بھی کہ اگر وہ آپ کے ساتھ جہادی سفر پر روانہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصویر ہوئے:

﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ﴾ (التوبۃ: ٤٧)

''اگر وہ نکل بھی پڑتے تو وہ تم کو نہ بڑھاتے مگر صرف خرابی میں اور تمہارے درمیان فتنہ وفساد پیدا کرنے کے لیے دوڑے پھرتے۔''

جب وہ غیر مخلص بھی تھے اور تھے بھی فتنہ وفساد پیدا کرنے والے، تو چونکہ اللہ تعالیٰ فساد کو بھی ناپسند کرتا ہے اور شرک کو بھی، لہٰذا اس نے ان کے اٹھنے کو ناپسند کیا، یعنی ان کی ہمتیں جہاد کے لیے نکلنے سے قاصر بنا دیں۔

﴿وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ﴾ (التوبۃ: ٤٦) ''اور کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے سات بیٹھے رہو۔''

یہ بات اللہ تعالیٰ نے ان سے کونی طور پر فرمائی یا وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ دوسروں کی طرح تم بھی گھروں میں بیٹھے رہو، دیکھو فلاں بھی گھر سے نہیں نکلا اور فلاں بھی گھر میں بیٹھا ہے، وہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے جنہیں اللہ نے معذور قرار دے رکھا تھا، مثلاً مریض، اندھا اور لنگڑا۔ وہ کہتے کہ جب نبی ﷺ سفر سے واپس آئیں گے تو ہم معذرت کر لیں گے اور آپ ہمارے لیے اللہ سے معافی مانگ لیں گے۔ اور یہ کچھ کافی رہے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے کراہت کا اثبات کیا گیا ہے جو کہ کتاب وسنت سے بھی ثابت ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ (الاسراء: ٣٨)

''اس کی یہ ساری کی ساری برائی تیرے رب کے ہاں غیر پسندیدہ ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے قیل وقال کو ناپسند کرتا ہے۔''❶ اللہ تعالیٰ کسی عمل کو بھی ناپسند کر سکتا ہے، جیسا کہ: ﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾ (التوبۃ: ٤٦) میں ہے نیز اس قرآنی آیت میں ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ (الاسراء: ٣٨) ''اس کی یہ سب کی سب برائیاں تیرے رب کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔''

اور کسی عامل کو بھی، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: ''بے شک اللہ جب کسی بندے کو ناپسند کرتا ہے، تو جبرئیل علیہ السلام سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو ناپسند کرتا ہوں تو بھی اسے ناپسند کر۔''❷

پانچویں آیت: ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف: ٣) ''اللہ کے ہاں یہ بات بڑی ناراضی کی ہے کہ تم وہ بات کہو جس پر خود عمل نہیں کرتے۔

[كَبُرَ]..... بمعنی عَظُمَ.

[مَقْتًا] ..... یہ تمیز محول عن الفاعل ہے اور مقت شدید نفرت سے عبارت ہے اور (کبر) کا فاعل (أن) اور اس کا مدخول

---

❶ صحیح مسلم: ٢٦٣٧.

❷ صحیح بخاری: ٦١٤٦۔ صحیح مسلم: ١٧٩٦.

ہے یعنی ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ یہ آیت اپنے سے ماقبل کی اس آیت کی تعلیل اور اس کے انجام کا بیان ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف : ۲)

''یہ بات بڑی سنگین ہے کہ انسان دوسروں سے وہ بات کرے جس پر وہ خود عمل نہیں کرتا۔''

جب آپ دوسروں کو کسی بات کی تلقین کرتے ہیں اور خود اس پر عمل نہیں کرتے تو اس کی یا تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں اور لوگوں سے ڈرتے ہوئے انہیں ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یا پھر آپ اپنے آپ کو اس بات سے برتر خیال کرتے ہیں، آپ لوگوں کو اس بات کا حکم دیتے ہیں مگر خود اس پر عمل نہیں کرتے، لوگوں کو اس سے روکتے ہیں مگر خود اس پر عمل کرتے ہیں۔

آیت میں جن صفات کا ذکر ہے، وہ ہیں: مقت اور یہ کہ اس میں تفاوت پایا جاتا ہے بدلیل (کبر مقتا) اور سلوکی اعتبار سے اس بات سے خبردار کیا گیا ہے کہ انسان دوسروں کو تو کسی بات کی تلقین کرے مگر خود اس پر عمل نہ کرے۔

صفت مجیئ اور اتیان پر مشتمل آیات

- مؤلف نے صفت مجیئ اور اتیان کے اثبات پر چار آیات ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِکَةُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ﴾ (البقرۃ: ۲۱۰) ''وہ نہیں انتظار کرتے مگر صرف یہ کہ آ جائے ان کے پاس اللہ بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے بھی اور کام کو تمام کر دیا جائے۔''

[هَلْ یَنْظُرُوْنَ] .... (هَلْ) استفہام بمعنی نفی ہے، یعنی وہ انتظار نہیں کرتے۔ نحوی قاعدہ کی رو سے (الا) جب بھی استفہام کے بعد آئے گا، استفہام نفی کے لیے ہوگا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "هل انت الا اصبع دمیت" [1] یعنی ما انت ''تو نہیں ہے۔''

اس جگہ ﴿یَنْظُرُوْنَ﴾ (ینتظرون) کے معنی میں ہے، اس لیے کہ وہ (إلی) کے ساتھ متعدی نہیں ہے، اگر وہ الی کے ساتھ متعدی ہو تو عام طور پر آنکھ کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں آتا ہے اور جب متعدی بنفسها ہو تو پھر انتظار کرنے کے معنی میں آتا ہے، یعنی یہ تکذیب کرنے والے نہیں انتظار کرتے مگر اس بات کا اللہ ان کے پاس بادلوں کے سائے میں آ جائے اور یہ قیامت کے دن ہوگا۔

[فِیْ ظُلَلٍ] .... فی (مع) کے معنی میں ہے جو کہ مصاحبت کے لیے ہے نا کہ ظرفیت کے لیے، اس لیے کہ اگر وہ ظرفیت کے لیے ہو تو اس کا معنی ہوگا کہ انہوں نے اللہ کو گھیر رکھا ہے۔ حالانکہ مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز اسے گھیر نہیں سکتی،

[1] جب کسی جنگ میں آپ ﷺ کی انگلی خون آلود ہوگئی تو آپ نے فرمایا: ((هل انت الا اصبع دمیت، وفی سبیل الله ما لقیت)) تو ایک انگلی ہی تو ہے جو زخمی ہوگئی ہے، تجھے جس تکلیف کا بھی سامنا کرنا پڑا وہ اللہ کی راہ میں ہی کرنا پڑا۔'' بخاری: ٦١٤٦۔ مسلم: ١٧٩٦.

قیامت کے دن جب اللہ عزوجل اپنے بندوں میں فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائے گا تو ﴿تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ﴾ ''اس دن آسمان بادلوں پر سے پھٹ جائے گا۔''

[فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ] ....الغمام، علماء فرماتے ہیں، غمام کا معنی ہے: سفید رنگ کے بادل، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنا احسان جتلاتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ﴾ ''اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ فرمایا۔'' سفید بادل فضا کو روشن و مستنیر ہی رہنے دیتا ہے جبکہ سیاہ بادلوں کی وجہ سے فضاء تاریک ہو جاتی ہے اور یہ منظر زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

[وَ الْمَلٰٓئِكَةُ] .... رفع کے ساتھ، اس کا عطف لفظ اللہ پر ہے، یعنی یا ان کے پاس فرشتے آئیں، کلمہ ''ملائکہ'' کے اشتقاق کا بیان پہلے گزر چکا ہے، اور فرشتوں کے بارے میں بھی بتایا جا چکا ہے۔

قیامت کے دن فرشتے زمین پر اتریں گے، پہلے آسمان دنیا والے، پھر دوسرے آسمان والے، پھر تیسرے والے اور پھر چوتھے والے، ساتویں آسمان تک۔ اور وہ آکر لوگوں کو گھیر لیں گے۔

قیامت کے دن کا یہ ایک خوفناک منظر ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ ان جھٹلانے والوں کو خبردار کر رہا ہے۔

تیسری آیت: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾ (الانعام: ١٥٨) ''وہ نہیں انتظار کرتے مگر صرف اس بات کا کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب خود آجائے یا تیرے رب کی بعض نشانیاں آجائیں۔''

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ﴾ کے بارے میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا جو گزشتہ آیت کے بارے میں کہا گیا، یعنی یہ لوگ ان احوال میں سے کسی ایک حالت کا انتظار کر رہے ہیں۔

اولاً: ''روحیں قبض کرنے کے لیے فرشتوں کی آمد کا۔'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (الانفال: ٥٠)

''اگر آپ وہ منظر دیکھیں جب فرشتے کافروں کو فوت کر رہے ہوتے ہیں، وہ مار رہے ہوتے ہیں ان کے چہروں پر اور ان کی پیٹھوں پر (اور کہتے ہیں) جلنے کا عذاب چکھو۔''

ثانیاً: قیامت کے دن لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے رب تعالیٰ کی آمد کا۔

ثالثاً: رب تعالیٰ کی بعض آیات کی آمد کا، نبی کریم ﷺ کی تفسیر کے مطابق اس سے مراد مغرب کی طرف سے آفتاب کا طلوع ہونا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ان تین احوال کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کی غرض سے اتریں گے تو

[1] صحیح بخاری: ٤٦٣٦۔ مسلم: ١٥٧ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ.



ان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ﴾ (النساء: ١٨)

''اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو گناہ پر گناہ کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔''

اسی طرح جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو کسی کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ تیسری حالت کو دو حالتوں کے درمیان ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جزاء اور ثمرہ عمل کا وقت ہے اس وقت وہ اپنے اعمال سے چھٹکارا حاصل کرنے کی استطاعت سے محروم ہوں گے۔

اس اور اس سے ماقبل کی آیت کا مقصد مکذبین کو اس بات سے خبردار کرنا ہے کہ اگر قبول توبہ کا وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ اپنی بداعمالیوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکیں گے۔

تیسری آیت: ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّاo وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّاo﴾ (الفجر: ٢١۔٢٢) یقیناً جب زمین کو کوٹ کوٹ کر پست کر دیا جائے گا اور خود تیرا رب اور فرشتے صف در صف ہو کر آ جائیں گے۔''

شرح:...... ﴿كَلَّا﴾ اس جگہ (الا) کی طرح تنبیہ کے لیے ہے۔

﴿دَكًّا﴾ کو اس کی عظمت کی وجہ سے موکد لایا گیا ہے، پہاڑوں اور وادیوں کو کوٹ دیا جائے گا یہاں تک کہ زمین چمڑے کی طرح ہموار ہو جائے گی۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًاo لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًاo﴾ (طٰهٰ: ١٠٦۔١٠٧)

''وہ اسے ایک ہموار زمین کی طرح چھوڑ دے گا، تو اس میں نہ کوئی پستی دیکھے گا اور نہ بلندی۔''

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دکّا تاکید کے لیے نہیں بلکہ تاسیس کے لیے ہو، اس صورت میں اس کا معنی ہوگا: زمین کو یکے بعد دیگرے کوٹ دیا جائے گا۔﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ ''اور خود تیرا رب آئے۔'' یعنی قیامت کے دن۔ جب زمین کو ہموار کر دیا جائے گا، اور لوگوں کو میدان محشر میں اکٹھا کر دیا جائے گا تو پھر اللہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے خود آئے گا۔

[**الْمَلَكُ**]....(الف لام) اس جگہ تعمیم کے لیے ہے، یعنی ہر فرشتہ، اس دن ملائکہ زمین پر اتر آئیں گے۔

[**صَفًّا صَفًّا**] .... یعنی ایک صف کے بعد دوسری صف بنا کر، جس طرح کہ ایک اثر میں وارد ہے: ''آسمان دنیا کے فرشتے اتریں گے اور صف بنائیں گے، ان کے بعد دوسرے آسمان کے اور ان کے بعد تیسرے آسمان کے......''[1]

چوتھی آیت: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا﴾ (الفرقان: ٢٥) ''جس دن آسمان ایک بادل پر سے پھٹے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے اتارا جانا۔''

---

[1] حاکم: ٤/٥٦٩، ٥٧٠۔



شرح: ...... یعنی وہ دن یاد کریں جب آسمان بادل پر سے پھٹے گا۔

[تَشَقَّقُ]...... تنشق سے زیادہ بلیغ ہے، اس لیے کہ اس کا ظاہری مفہوم آہستہ آہستہ پھٹنا ہے یہ بادل دھوئیں کی طرح اٹھے گا اور پھر آہستہ آہستہ پھیل جائے گا۔

آسمان کا بادل کے ساتھ پھٹنا ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: زمین نباتات کے ساتھ پھٹ گئی، یعنی بادل آسمان سے نکلے گا اور پھر مسلسل پھیلتا چلا جائے گا۔

[وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا] ...... یعنی فرشتے آسمانوں سے تھوڑے تھوڑے کر کے اتریں گے، پہلے آسمان دنیا والے پھر دوسرے آسمان والے اور پھر تیسرے آسمان والے......!!

اس آیت کے سیاق میں اللہ تعالیٰ کی آمد کا ذکر نہیں ہے، البتہ اس میں اس کی طرف اشارہ ضرور موجود ہے۔ اور وہ اس طرح کہ آسمان کا بادلوں کے ساتھ پھٹنا اللہ تعالیٰ کی آمد کے لیے ہوگا اور اس کی دلیل گزشتہ آیات ہیں۔ مؤلف رحمہ اللہ یہ چار آیات اللہ تعالیٰ کی صفت مجیئ واتیان (آمد) کے اثبات کے لیے لائے ہیں۔ اہل سنت والجماعت اس امر کا اثبات کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہ نفس نفیس آئے گا، اور یہ اس لیے کہ اس نے اپنی ذات کے لیے خود اس کا اثبات کیا ہے وہ جس کی بات سب سے سچی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اور جس کا کلام علم وصدق اور بیان وارادہ کی کامل ترین صورت پر مشتمل ہوتا ہے، اللہ ہمارے سامنے حق واضح کرنا چاہتا ہے، وہ علم وصدق میں سب سے بڑھ کر ہے اور اس کی بات سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔

سوال: کیا ہمیں اللہ تعالیٰ کی آمد کی کیفیت کا علم ہے؟

جواب: ہمیں اس کا علم نہیں ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں اپنی آمد کے بارے میں تو بتایا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کیسے آئے گا، نیز اس لیے بھی کہ کیفیت کا علم صرف مشاہدہ کرنے، نظیر کا مشاہدہ کرنے یا اس کے بارے میں خبر صادق کے ذریعہ سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور صفات باری تعالیٰ کے بارے میں یہ تینوں چیزیں غیر موجود ہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ جب آپ اس کی ذات کی کیفیت سے ناواقف ہیں تو صفات کی کیفیت سے بھی ناواقف ہی ہوں گے۔ ذات موجود ہے اور حقیقتاً موجود ہے، ہم ذات سے بھی آگاہ ہیں اور معنی ذات سے بھی، اور ہم آمد کے معنی سے بھی آگاہ ہیں، مگر ذات کی کیفیت اور اس کی تشریف آوری کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہیں۔ ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً آئے گا اور اپنے شایان شان کیفیت میں آئے گا مگر وہ کیفیت ہمارے لیے غیر معلوم ہے۔

مخالفین اہل سنت کی تردید

اہل تحریف وتعطیل اس صفت کے بارے میں اہل سنت سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی آمد نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس صفت کے اثبات سے جسم ثابت ہوتا ہے اور اجسام متماثل ہوا کرتے ہیں۔

مگر ان کا یہ دعویٰ وقیاس باطل ہے، اس لیے کہ اسے نص کے بالمقابل پیش کیا گیا ہے، اور نص کا ابطال کرنے والی ہر چیز خود باطل ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:



﴿وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (سباء : ٢٤)

''اور یقیناً ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا پھر کھلی گمراہی میں ہیں۔''

اگر کوئی یہ کہے کہ نص کو باطل قرار دینے والی چیز ہی حق ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ نص باطل قرار پائے گی جبکہ نص کا بطلان امر مستحیل ہے اور اگر وہ یہ کہے کہ نص ہی حق ہے تو پھر یہ دعویٰ بھی باطل ٹھہرے گا اور قیاس بھی۔ پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ آخر اس بات میں کیا مانع ہے کہ اللہ اپنے شایان شان کیفیت میں بہ نفس نفیس تشریف آئے؟

اس کے جواب میں اگر وہ یہ کہیں کہ اس سے تمثیل لازم آتی ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ تمہارا یہ کہنا غلط ہے، اس لیے کہ آنے آنے میں فرق ہوتا ہے، یہاں تک کہ مخلوق کی نسبت سے بھی اس میں اختلاف ہوتا ہے، لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے چلنے والا، صحت منداور چست آدمی کی طرح نہیں چل سکتا، اسی طرح شہر کے کسی بڑے آدمی یا حکمران شخص کی آمد اس شخص کی آمد سے یکسر مختلف ہوتی ہے جس کی کسی حوالے سے بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

سوال: معطلہ قرآنی آیت ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ ''تیرا رب آئے گا'' اور اس جیسی دیگر آیات کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: وہ کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے: تیرے رب کا حکم آئے گا، اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

﴿اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ (النحل : ١) ''اللہ کا حکم آیا ہی آیا، تم اس کی جلدی نہ مچاؤ۔''

اس حوالے سے جس بھی اتیان (آمد) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اس کی اس آیت کے ساتھ تفسیر کرنا واجب ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ جس دلیل سے آپ نے استدلال کیا ہے، وہ آپ کے حق میں نہیں بلکہ آپ کے خلاف جاتی ہے۔ اگر دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ کی مراد اس کے حکم کا اترنا ہے تو پھر (امرہ) کہنے میں کون سا مانع تھا؟

جب اس نے امر کا ارادہ کیا تو تعبیر بھی یہی اختیار فرمائی، اور جب اس کا ارادہ نہ کیا تو یہ تعبیر اختیار نہ فرمائی۔

امر واقع یہ ہے کہ یہ دلیل آپ کے خلاف جاتی ہے۔ اس لیے کہ دوسری آیات میں اجمال نہیں ہے کہ اس کی اس آیت کے ساتھ تفصیل بیان کی جائے۔ ان کا مفہوم ومعنی بالکل واضح ہے، جبکہ بعض آیات تو ایسی تقسیم پر مشتمل ہیں جو کہ مجیئ امر کے ارادہ سے مانع ہیں:

مثلاً: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ﴾ (الانعام : ١٥٨)

''وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کا کہ ان کے پاس فرشتے آ جائیں یا تیرا رب خود آ جائے۔''

کیا اس جیسی تقسیم میں کسی کے لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ رب کے آنے سے مراد اس کے حکم کا آنا ہے؟

سوال: اگر یہ صورت حال ہے تو پھر آپ اس آیت کے بارے میں کیا کہیں گے:

﴿فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ﴾ (المائدۃ : ٥٢)

''ہوسکتا ہے کہ اللہ فتح لے آئے یا کوئی حکم اپنے پاس سے۔''

جواب: اس سے مراد فتح یا امر کی آمد ہے، مگر اللہ نے اسے اپنی طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے ملتی ہے۔عربی زبان کا یہ اسلوب بیان امر معروف ہے، مثلاً جب اتیان کو حرف جر کے ساتھ مقید کیا جائے گا تو اس سے مراد مجرور ہوگا، اور جب اسے بدون قید اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف کہا جائے گا تو اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا حقیقتاً اتیان ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت اتیان و مجییء پر ایمان رکھنے کے فوائد وثمرات

اس صفت پر ایمان رکھنے سے انسان کے دل میں اس ہولناک منظر کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں میں فیصلہ کرنے کی غرض سے آئے گا اور فرشتوں کا نزول ہوگا۔ انسان کے سامنے رب تعالیٰ اپنی شان وشوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا اور مخلوقات اس کا فیصلہ سننے کی منتظر۔ اگر آپ نے نیک اعمال کیے ہوں گے تو ان کی جزا پائیں گے اور بداعمالیوں کی صورت میں ان کی سزا۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ علیحدگی اختیار کرے گا، وہ اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو اسے اپنے اعمال کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا، بائیں طرف دیکھے گا تو ادھر بھی وہی کچھ نظر آئے گا۔ پھر جب اپنے سامنے دیکھے گا تو ادھر جہنم کی آگ نظر آئے گی۔ آگ سے بچ جاؤ اگرچہ کھجور کے آدھے حصے کے ساتھ ہی سہی۔''[1]

بلاشک ایسی عظیم چیزوں پر ایمان لانے سے انسان کے دل میں اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے اور دین پر استقامت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے چہرے کا اثبات

❑ مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفت وجہ (چہرہ) کے اثبات کے لیے دو آیتیں ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ٢٧) ''اور باقی رہے گا چہرہ تیرے رب کا جو جلال والا اور انعام والا ہے۔''

شرح: ......اس آیت کا اس پہلی آیت پر عطف ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمن: ٢٦) ''اس زمین پر موجود سب کو فنا ہونا ہے۔''

اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ پڑھنے کے متصلاً بعد ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ کی تلاوت کرنی چاہیے تاکہ مخلوق کا نقص فناء اور خالق کا کمال بقاء واضح ہو سکے۔

وجہ (چہرہ) کا معنی معلوم ہے جبکہ اس کی کیفیت مجہول ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کی طرح اللہ تعالیٰ کے چہرے کی کیفیت کا بھی علم نہیں رکھتے، مگر اس کے چہرے پر ایمان رکھتے ہیں جو جلال واکرام کے ساتھ موصوف ہے، تروتازگی، عظمت اور نور عظیم کے ساتھ موصوف ہے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (حجابه النور لو كشفه

[1] صحیح بخاری: ٦٥٣٩۔ مسلم: ١٠١٦.

لأحرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه) ❶ ''اس کا پردہ نور ہے۔ اگر وہ اسے کھول دے تو اس کے چہرے کے انوار اس کی مخلوق سے ہر اس چیز کو جلا ڈالیں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔''

(سبحات وجهه) یعنی اس کے چہرے کے انوار وتجلیات، تر وتازگی، رونق اور عظمت وجلال۔

(ما انتهى اليه بصره من خلقه) ''اور اس کی نگاہ کی رسائی ہر چیز تک ہے۔ اس بناء پر اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر رب تعالیٰ کے چہرے سے نور کا یہ پردہ ہٹا دیا جائے تو ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں: یہ چہرہ بڑا باعظمت چہرہ ہے جس کا مخلوقات کے چہروں کے ساتھ مماثل ہونا ممکن ہی نہیں۔ اور اس بناء پر ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقی چہرے کے ساتھ متصف ہے۔ اور یہ عقیدہ اس ارشاد سے ماخوذ ہے: ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ ہمارا یہ بھی عقیدہ کہ رب تعالیٰ کا چہرہ مخلوقات کے چہروں کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتا، اس لیے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔'' اور ہم اس چہرے کی کیفیت سے ناواقف ہیں۔ اس لیے کہ ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۰) ''اور وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

اگر کوئی شخص اس کیفیت کا اپنے دل میں تصور کرنے کی کوشش کرے یا زبان سے اس کا اظہار کرنا چاہے تو ہم اسے ایسا بدعتی اور گمراہ قرار دیں گے، جو اللہ کے بارے میں بدون علم لب کشائی کرتا ہے، جو کہ ہمارے لیے حرام ہے۔ فرمان باری ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الاعراف: ۳۳)

''کہہ دو کہ حرام کیا ہے میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو ان میں سے جو ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں وہ بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾

(الاسراء: ۳۶)

''اور جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ، یقیناً کان، آنکھ اور دل، ان تمام کے تمام اعضاء سے پوچھ ہونی ہے۔''

اس جگہ: ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ﴾ فرما کر ربوبیت کی اضافت محمد ﷺ کی طرف کی گئی ہے جو کہ ربوبیت کی تمام قسموں سے خاص ہے، اس لیے کہ ربوبیت کی دو قسمیں ہیں: عامہ اور خاصہ، خاصہ کی آگے پھر دو قسمیں ہیں: خاصہ أخص اور اس سے بھی برتر خاصہ۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی اپنے رسولوں کی ربوبیت۔

[ذُو]..... یہ وجہ کی صفت ہے اور اس کی دلیل اس کا مرفوع ہونا ہے۔ اگر یہ رب کی صفت ہوتا تو پھر عبارت اس طرح

---

❶ صحیح مسلم: ۱۷۹۔ عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ۔

ہوتی۔" ذی الجلال والاکرام۔"جس طرح کہ اسی صورت میں آگے چل کر آتا ہے:

﴿تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ۷۸)

"بابرکت ہے تیرے رب کا نام جو جلال واکرام والا ہے۔"

[الْجَلَالِ]..... اس کا معنی ہے: عظمت وسلطنت۔

[الْإِكْرَامِ] ..... یہ اکرم سے مصدر ہے، اللہ تعالیٰ مکرَم بھی ہے اور مکرِم بھی۔ اس کا اکرام یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور وہ اکرام کے مستحقین کے لیے مکرِم ہے کہ اس نے ان سے اجر وثواب کا وعدہ کر رکھا ہے۔

رب تعالیٰ اپنے جاہ وجلال اور کمال سلطنت وعظمت کی وجہ سے اس لائق ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے اور اس کی تعریف وثناء بیان کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا اکرام یہ ہے کہ اس کی کما حقہ قدر کی جائے اور اس کی تعظیم بجالائی جائے، اس لیے نہیں کہ وہ تیری طرف سے اکرام کا محتاج ہے بلکہ اس لیے کہ وہ تجھے اس کی جزا دے کر تجھ پر احسان فرمائے۔

دوسری آیت: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸)

"ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ سوائے اس کے چہرے کے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمن: ۲۶) "زمین پر موجود ہر شے فانی ہے۔"

[إِلَّا وَجْهَهُ]..... اسی معنی میں یہ ارشاد باری ہے: ﴿وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ۲۷)

"اور باقی رہے گا چہرہ تیرے رب کا جو جلال واکرام والا ہے۔" یعنی ہر شے فانی اور زوال پذیر ہے مگر اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہمیشہ باقی رہے گا، اسی لیے ارشاد فرمایا:

﴿لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (القصص: ۸۸) "اسی کا حکم نافذ ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

پس وہ ہمیشہ باقی رہنے والا حاکم ہے لوگ اسی کی طرف رجوع کریں گے تاکہ وہ ان کا فیصلہ کر دے۔

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ کا یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ ہر چیز کو فنا ہے، بجز اس چیز کے جس کے ساتھ اس کی خوشنودی کا حصول مقصود ہوگا۔ اور یہ اس لیے کہ آیت کا سیاق اسی معنی پر دلالت کرتا ہے:

﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸)

"اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود مت پکاریں، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے چہرے کے۔"

گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو معبود مت پکارو، اس طرح تم اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کے مرتکب ہوگے، اور تمہارا یہ مشرکانہ عمل ضائع وبیکار جائے گا، ہاں وہ عمل باقی رہے گا، جو آپ مخلصانہ طور پر اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے کریں گے، اس لیے کہ اعمال صالحہ کا ثواب باقی رہے گا وہ تو جنت کی نعمتوں میں بھی فنا نہیں



ہوگا۔ مگر پہلا معنیٰ زیادہ ٹھوس اور قوی ہے۔

جو لوگ لفظ مشترک کے لیے اس کے دونوں معنوں میں جواز کے قائل ہیں، ان کے طریقہ کی رو سے ہم اس آیت کو ان دونوں معانی پر محمول کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے چہرے کے علاوہ ہر شے فانی ہے اور تمام اعمال عبث وبیکار جائیں گے۔ بجز ان اعمال کے جن سے اللہ کی رضا کا حصول مقصود ہوگا۔ الغرض معنی جو بھی کریں یہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے چہرے کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔

چہرے کا شمار صفات ذاتیہ خبریہ میں ہوتا ہے، جن کا مسمّی ہماری نسبت سے ابعاض واجزاء ہیں، ہم اسے صفات ذاتیہ معنویہ میں شمار نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اس طرح ہم ان لوگوں کے ساتھ موافقت اختیار کر لیں گے جو کتاب اللہ میں تحریف کرتے ہوئے اس کی تاویل کرتے ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ چہرہ اللہ تعالیٰ کا جزیا اس کا بعض حصہ ہے، اس لیے کہ اس سے ذات باری تعالیٰ میں نقص کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

اہل تحریف اللہ کے چہرے کی تفسیر اللہ کے ثواب کے ساتھ کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اللہ کے ثواب کے علاوہ ہر شے فانی ہے۔

چہرہ جو کہ صفت کمال ہے انہوں نے اس کی تفسیر ایک مخلوق چیز کے ساتھ کر دی جو کہ اللہ سے الگ ہے، اور جو عدم اور وجود دونوں کے قابل ہے، ثواب حادث ہے جو عدم سے وجود میں آیا اور اگر اللہ اس کی بقاء کا وعدہ نہ کرے تو اس کا عقلاً ارتفاع بھی جائز ہے۔

مختصراً جب انہوں نے چہرے کی تفسیر ثواب سے کر ڈالی تو اس کا شمار امکانیات کے باب میں ہونے لگا جس کا وجود بھی جائز ہوتا ہے اور عدم وجود بھی۔ محرفین کا یہ قول مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر مردود ہے۔

اولاً: ان کا یہ قول لفظ کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے، جس کی رو سے یہ ایک خاص چہرہ ہے ثواب ہرگز نہیں ہے۔

ثانیاً: یہ اجماع سلف کے خلاف ہے، ان میں سے کسی ایک کا بھی یہ قول نہیں ہے کہ چہرے سے مراد ثواب ہے۔ ان کی کتابیں بالکل محفوظ حالت میں ہمارے سامنے پڑی ہیں، صحابہ کرام، ائمہ تابعین اور تبع تابعین سے مروی کوئی ایک بھی ایسی نص پیش نہیں کی جا سکتی کہ ان میں سے کسی نے چہرے کی یہ تفسیر کی ہو۔

ثالثاً: کیا یہ ممکن ہے کہ ثواب کو ﴿ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمٰن: ۲۷) جیسی صفات عظیمہ سے متصف کیا جا سکے؟ نہیں، ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے۔

رابعاً: تم آپ ﷺ کے اس ارشاد کے بارے میں کیا کہو گے: ''اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس کے چہرے کی تجلیاں اس کی مخلوق میں سے ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیں۔''[1] کیا اس کے ثواب کی بھی یہ حیثیت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

---

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

مندرجہ بالا نکات سے ان کے قول کا بطلان بخوبی عیاں ہوگیا، دریں حالات ہمارے لیے ضروری قرار پاتا ہے کہ ہم چہرے کی وہی تفسیر کریں جو اللہ کی مراد ہے۔

سوال: کیا جہاں کہیں بھی کلمہ (الوجہ) اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہوگا اس سے اللہ کا چہرہ ہی مراد ہوگا جو کہ اس کی صفت ہے؟

جواب: اصل تو یہی ہے، جس طرح کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (الانعام: ٥٢)

''اور انہیں دور مت کیجئے جو اپنے رب کو صبح وشام پکارتے ہیں وہ اس کا رخ چاہتے ہیں۔''

نیز...... ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝﴾ (اللیل: ١٩۔٢٠)

''اور کسی کا اس پر ایسا کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ چکانا مقصود ہو مگر صرف اپنے رب اعلیٰ کے رخ کا حصول اور وہ عنقریب اس سے راضی ہو جائے گا۔''

اور ان جیسی دیگر آیات۔

پس اصل تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف چہرے سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ حقیقی چہرہ ہوتا ہے جو اس کی ایک صفت ہے۔ البتہ ایک کلمہ ایسا ہے جس کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ اور وہ ہے:

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ: ١١٥)

یعنی تم نماز ادا کرتے وقت اپنا منہ جدھر بھی پھیرو اللہ کا چہرہ ادھر ہی موجود ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس جگہ (وجہ) سے مراد جہت ہے، اس لیے کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ (البقرۃ: ١٤٨)

''ہر ایک کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرنے والا ہے۔''

یعنی تم جدھر بھی منہ پھیرو ادھر ہی اللہ کی جہت ہے، یعنی وہ جہت کہ اگر تم اس کی طرف منہ کرو گے تو وہ تمہاری نماز قبول فرمائے گا، ان کا کہنا ہے کہ یہ آیت سفر کی حالت کے بارے میں اتری، انسان جب دوران سفر نفل نماز ادا کرے تو وہ کسی بھی طرف منہ ہونے کی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے، یا جب اس پر قبلہ مشتبہ ہو جائے تو تحری کرے اور پھر منہ جس طرف بھی ہو نماز ادا کرے۔

مگر صحیح موقف یہ ہے کہ اس جگہ بھی چہرے سے مراد اللہ تعالیٰ کا حقیقی چہرہ ہے، یعنی تم جدھر بھی منہ پھیرو گے اللہ کا چہرہ ادھر ہی ہے اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب نمازی آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے۔''[1]

[1] صحیح بخاری: ٤٠٠٦۔ صحیح مسلم: ٥٤٧١۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما۔



چونکہ اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے، لہٰذا آپ نے اپنے سامنے تھوکنے سے منع فرمایا ہے۔
جب آپ کسی ایسی جگہ نماز پڑھنا چاہیں جہاں آپ کو قبلہ کی صحیح سمت کا پتہ نہ چل رہا ہو، پھر آپ نے تحری کر کے نماز پڑھ لی اور فی الواقع قبلہ آپ کے پیچھے رہا تو اس حالت میں بھی اللہ آپ کے سامنے ہیں۔
آیت کا یہ معنی صحیح اور آیت کے ظاہر سے موافقت رکھتا ہے، جبکہ پہلا معنی بھی اس کے مخالف نہیں ہے۔ جان لیجئے کہ یہ عظیم الشان چہرہ جو جلال واکرام کے ساتھ موصوف ہے اس کا احاطہ کرنا۔ نہ نواز راہ وصف ممکن ہے اور نہ ہی از راہ تصور، بلکہ آپ جس چیز کو بھی مقدر کریں گے اللہ تعالیٰ اس سے برتر اور عظیم تر ہے۔ ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۰) ''وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

سوال: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (القصص: ۸۸) ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے چہرے کے۔'' میں چہرے سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے ذات مراد لی جائے تو اس صورت میں تحریف کا ڈر ہے اور اگر صفت مراد لی جائے تو بھی آپ خطرے سے دو چار ہوں گے، یہ موقف ان لوگوں نے اختیار کیا ہے جو کما حقہ اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ بھی فانی ہے سوائے اس کے چہرے کے دریں حالات آپ کیا کریں گے؟

جواب: اگر آپ چہرے سے ذات مراد لیتے ہوئے یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ اس کے لیے چہرے کا بھی اثبات کریں، تو یہ بات درست ہے، اور اگر آپ یہ کہیں کہ چہرہ ذات سے عبارت ہے اور چہرے کا اثبات نہ کریں، تو یہ تحریف ہے جو کہ کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہے۔

اس بناء پر اگر یہ کہا جائے کہ اس کے چہرے سے مراد اس کی ذات ہے جو کہ چہرے کے ساتھ متصف ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ اس قول میں اور اہل تحریف کے قول میں واضح فرق ہے، ان کے نزدیک چہرے سے مراد ذات ہے اور اس کے لیے چہرہ ثابت نہیں، جبکہ ہم کہتے ہیں کہ چہرے سے مراد ذات ہے، اس لیے کہ اس کا چہرہ ہے جس کی تعبیر ذات کے ساتھ کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے دو ہاتھوں کا اثبات

- مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات یدین کی دلیل کے طور پر دو آیتیں ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (صٓ: ۷۵) ''تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس نے منع کیا جسے میں نے اپنے دو ہاتھوں کے ساتھ پیدا کیا۔''

شرح: ...... [مَا مَنَعَكَ] .... خطاب ابلیس سے ہو رہا ہے۔

[مَا] .... استفہام اور توبیخ کے لیے ہے، یعنی تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا؟



[لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ].... اللہ تعالیٰ نے (لمن خلقت) نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس جگہ اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، اور یہ ان کے اس وصف کے اعتبار سے ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے انہیں اپنے دو ہاتھوں سے پیدا فرمایا، نہ کہ ان کے وجود کے اعتبار سے۔

اسی لیے جب ابلیس نے آدم علیہ السلام کی توہین کرتے ہوئے ان کی قدر و منزلت کو گھٹانا چاہا تو وہ کہنے لگا: ﴿ءَ أَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا﴾ (الاسراء: ٦١) ''کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا؟''

قاعدہ یہ ہے کہ جب ذوی العقول کو (ما) کے ساتھ تعبیر کیا جائے گا تو اس میں معنی صفت کو ملحوظ رکھا جائے گا نہ کہ معنی عین اور شخص کو۔ اسی سے یہ ارشاد باری ہے:

﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (النساء: ٣)

''پھر نکاح کرو تم جو پسند آئیں تمہیں دوسری عورتوں سے۔''

اس جگہ اللہ نے (ما) فرمایا، (من) نہیں فرمایا، اس لیے کہ مراد عورت کا وجود نہیں بلکہ اس کی صفت ہے۔

اس جگہ فرمایا: ﴿مَا خَلَقْتُ﴾ یعنی جس عظیم موصوف کو میں نے یہ عزت دی کہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔

﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ یہ قائل کے اس قول کی طرح ہے: صنعتُ هذا بیدی، ''میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بنایا۔'' اس جگہ یـــد (ہاتھ) صفت کا آلہ ہے۔ یعنی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا فرمایا، یہ تثنیہ کا صیغہ ہے اور نون تثنیہ کو اضافت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے، ہم تثنیہ اور جمع مذکر سالم کو اعراب دیتے وقت کہتے ہیں، نون اسم مفرد میں تنوین کے عوض میں ہے اور عوض معوض کا حکم رکھتا ہے، جس طرح اضافت کے وقت تنوین حذف ہو جاتی ہے، اسی طرح اضافت کے وقت تثنیہ اور جمع کا نون بھی حذف ہو جاتا ہے۔ آیت میں ابلیس کو اس کے اس جرم پر ڈانٹ پلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اس نے اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے صفت خلق کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس میں اللہ کے لیے دو ہاتھوں کا بھی اثبات کیا گیا ہے، جن کے ساتھ وہ فعل بجا لاتا ہے۔ جس طرح اس جگہ فعل خلق ہے۔ اور جن کے ساتھ وہ قیامت کے دن زمین کو اپنے قبضہ میں لے لے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (الروم: ٦٧)

''اور انہوں نے کماحقہ اللہ تعالیٰ کی قدر شناسی نہیں کی اور قیامت کے دن ساری کی ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔''

جن کے ساتھ وہ اشیاء کو پکڑتا بھی ہے، اللہ تعالیٰ صدقہ اپنے ہاتھ میں لیتا اور اسے اس طرح بڑھاتا ہے جس طرح کوئی انسان اپنے بچھڑے کو پالتا ہے۔ [1]

---

[1] ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ١٤١٠۔ صحیح مسلم: ١١٤.



ارشاد ربانی: ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ سے آدم علیہ السلام کے اس عزوشرف کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔

علماء کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تورات اپنے ہاتھ سے لکھی اور جنت عدن کے پودے اپنے ہاتھ سے لگائے۔''❶

اس مناسبت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ذہن میں رہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔''❷ قبل ازیں ہم اس کی یہ صحیح توجیہ بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی پسندیدہ صورت میں پیدا فرمایا اور تشریف وتکریم کے طور پر اس کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرما دی۔ جس طرح کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی، بیت مشرف اور مساجد کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اس بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حقیقی صورت ہے مگر اس سے تماثل لازم نہیں آتا۔

دوسری آیت: ﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ (المائدة: ٦٤) ''اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ ان کے ہاتھ باندھے جائیں اور اس قول کی وجہ سے ان پر لعنت ہو، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ خرچ کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔''

شرح:......[**اَلْيَهُوْدُ**]...... موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار۔

انہیں یہ نام ان کے اس قول کی وجہ سے دیا گیا:

﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ (الاعراف: ١٥٦) ''یقیناً ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔''

اس بناء پر یہ اسم عربی ہوگا، اس لیے کہ ھاد یھود بمعنی واپس لوٹنا عربی لفظ ہے۔

ایک دوسرے قول کی رو سے اس کا اصل یہوذ ہے، جو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام تھا، اس کی طرف منسوب لوگوں کو یہود کہا جاتا ہے۔ تعریب کے وقت ذال، دال میں تبدیل ہونے سے یہود بن گیا۔

اس لفظ کا اصل کچھ بھی ہو ہمیں اس سے چنداں غرض نہیں ہے، البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہود بنی اسرائیل کا ایک گروہ ہے جس کا شمار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں ہوتا ہے۔

یہود کا اللہ تعالیٰ بُرا کرے کہ انہوں نے اللہ کو معیوب اوصاف سے متصف کیا

یہودیوں کا یہ گروہ بڑا سرکش اور انسانیت سے بیزار واقع ہوا ہے جو کہ ان پر فرعون کے تسلط اور سرکشی کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو برے برے اوصاف کے ساتھ موصوف گردانتے ہیں۔ اللہ ان کا برا کرے، یہ اسی کے مستحق ہیں۔

مثلاً انہوں نے کہا: ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ ''اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔'' یعنی وہ بخیل ہے، اپنے ہاتھ سے کسی کو کچھ نہیں

❶ اسے دارمی نے ''الرد علی بشر المریسی'' ص: ٣٥۔ حاکم: ٢/ ٣١٩۔ بیهقی: الاسماء والصفات، ص: ٤٠٣ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کیا، حاکم نے اسے صحیح کہا، اسے رفع کا حکم حاصل ہے، ملاحظہ ہو: مختصر العلو: ١٠٤۔ حادی الارواح، لابن القیم رحمہ اللہ: ٨٤.

❷ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

دیتا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ﴾ (الاسراء: ٢٩)

یعنی اپنے ہاتھ کو خرچ کرنے سے نہ روکیں۔ اور یہ بھی انہی یہودیوں نے کہا تھا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ﴾ (آل عمران: ١٨١) ''بے شک اللہ فقیر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہودیوں نے یہ، ہرزہ سرائی کی کہ اگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو سب کے سب لوگ خوشحال ہوتے۔ کسی کو نوازنا اور کسی کو محروم رکھنا ہی بخل اور عدم انفاق ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ (البقرة: ٢٤٥)

''وہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضہ حسنہ دے پھر اللہ اسے بڑھا کر اس کے لیے کئی گنا کر دے۔''

تو یہودی نبی کریم ﷺ سے کہنے لگے: محمد! تمہارا رب فقیر ہو گیا ہے اب وہ ہم سے قرضہ مانگنے لگا ہے۔ اللہ انہیں برباد کرے۔

انہوں نے یہ بھی کہا: اللہ عاجز ہے، اس لیے کہ جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو ہفتہ کے دن آرام کیا، چنانچہ یہ دن ان کے لیے عید کا دن قرار پایا۔

[يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ] ..... (ید) یہود اس لفظ کو مفرد کے طور پر لائے جس سے وہ اپنے اس خبث باطن کا اظہار کرنا چاہتے تھے کہ ایک ہاتھ دو ہاتھوں کے مقابلے میں کم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب تثنیہ اور بسط کے ساتھ دیتے ہوئے فرمایا: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ ''کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔''

جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو اس عیب کے ساتھ موصوف گروانا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس یاوہ گوئی کی سزا کے طور پر فرمایا: [غُلَّتْ أَيْدِيْهِمْ] یعنی ان کے ہاتھوں کو خرچ کرنے سے روک دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی سب لوگوں سے زیادہ بخیل ہیں، ان کی اصل شناخت مال وزر جمع کرنا اور پھر اس پر سانپ بن کر بیٹھنا ہے، جب تک انہیں یہ امید نہ ہو کہ ایک پیسے کے بدلے میں انہیں ایک روپیہ نہیں ملے گا تو وہ ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ان کی بڑی بڑی تنظیمیں اور ادارے رفاہی کاموں کے لیے عطیات پیش کرتے ہیں مگر اس کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ کا حصول اور دنیا پر تسلط قائم کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کے ذہن میں یہ اشکال پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن تو انہیں بخیل کہتا ہے جبکہ امر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے، یہودی اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں۔

یہود پر اللہ کا عقاب

[وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا] ..... یعنی انہیں اس، ہرزہ سرائی کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بخل وامساک کے ساتھ متصف کیا تو ان سے کہا گیا کہ اگر اللہ تمہارے بقول بخیل ہے تو پھر وہ تمہیں اپنی رحمت

سے محروم کر رہا ہے اب وہ تمہیں اپنی جود وسخا سے کچھ نہیں دے گا، اس طرح انہیں دو سزائیں دی گئیں۔

۱۔ جس وصف بد کے ساتھ انہوں نے اللہ پر عیب لگایا تھا اسے ان کی طرف پھیر دیا گیا اور ارشاد ہوا: ﴿غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔''

۲۔ انہیں اللہ کی رحمت سے دور کر کے ان کے قول کے مقتضیٰ کو ان پر تھوپ دیا گیا۔ تاکہ وہ اللہ کے جود وسخا اور اس کے فضل وکرم سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں۔

دعویٰ یہود کا ابطال من جانب اللہ

[بِمَا قَالُوْا]..... اس جگہ (باء) سببیت کے لیے ہے اور اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعد لفظ (سبب) کو لانا صحیح ہوتا ہے۔

(مـــا) مصدریہ بھی ہو سکتا ہے اور موصولہ بھی، اگر موصولہ ہوگا تو عائد کو محذوف تسلیم کیا جائے گا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: بالذی قالوہ اور اگر مصدریہ ہوگا تو پھر فعل کو مصدر میں تحویل کیا جائے گا۔ یعنی بقولھم.

اس کے بعد اللہ نے ان کے دعویٰ کو باطل قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔'' اس جگہ ﴿بل﴾ اضراب ابطالی کے لیے ہے۔

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ میں تعبیر کا اختلاف ملاحظہ فرمائیں، اور یہ اس لیے کہ یہ مقام رب تعالیٰ کو جود وسخاء کے ساتھ ممدوح قرار دینے کا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے عطیہ دینا ایک ہاتھ کے عطیہ سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ اور ﴿مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ ان کے قول ﴿مَغْلُوْلَةٌ﴾ کی ضد ہے۔ اللہ رب کائنات کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں اور ان کے عطیہ میں بڑی وسعت ہے۔ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، وہ شب وروز بڑی کثرت کے ساتھ جود وسخا کرتا رہتا ہے، وہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے لے کر خرچ کرتا آرہا ہے مگر جو کچھ اس کے دائیں ہاتھ میں ہے اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔''[1]

اس نے ارض وسماء کی پیدائش سے لے کر آج تک جو کچھ خرچ کیا ہے، اسے کون شمار کر سکتا ہے؟ ایسا کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے، مگر اس کے باوجود اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اسی طرح ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے اور جن وانس ایک میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کریں اور میں ہر ایک کی حاجت پوری کر دوں تو اس سے میرے خزانوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی مگر اس قدر جتنی سمندر میں سوئی ڈبونے سے سمندر میں واقع ہوتی ہے۔''[2]

آپ اس سوئی کی طرف دیکھیں جسے آپ نے سمندر میں ڈبویا اور پھر اسے باہر نکال لیا، اس نے سمندر میں معمولی سی

---

[1] صحیح بخاری: ۷٤۱۱۔ صحیح مسلم: ۹۹۳ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ.

[2] اسے مسلم نے روایت کیا: ۲۵۷۷، اس کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں: ''یہ اہل شام کی بہترین حدیث ہے۔'' جامع العلوم والحکم: ۲/ ۳٤، ابن رجب نے اس کی اپنی کتاب جامع العلوم والحکم میں بڑی تفصیلی شرح کی ہے۔



بھی کمی نہیں کی۔ اس قسم کے صیغے عدم نقص میں مبالغہ کے لیے لائے جاتے ہیں، اس لیے کہ اس صورت میں سمندر میں کمی نہ آنا جانی پہچانی بات ہے۔ جس طرح اس سے سمندر میں کمی آنا امر مستحیل ہے اسی طرح جب جنوں اور انسانوں میں سے ہر ایک ایک فرد میدان میں کھڑا ہو کر اللہ سے سوال کرے اور پھر وہ ان سب کی ضروریات پوری کر دے تو اس سے اللہ کے خزانے میں معمولی سی بھی کمی نہیں آئے گی۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ: ''اس کے خزانے میں اس لیے کمی نہیں آتی کہ ایک چیز اس کی ملکیت سے نکل کر پھر اس کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے۔'' اس لیے کہ اس سے یہ معنی مراد لینا ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ معنی مراد لیا جائے تو پھر بات لغو اور بے مقصد قرار پائے گی۔ اگر آپ کے پاس دس روپے ہوں اور آپ انہیں ایک جیب سے نکال کر دوسری جیب میں ڈال لیں اور پھر کوئی آدمی یہ کہے کہ آپ کے مال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، تو اس کی یہ بات لغو ہوگی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سائلین کو جو کچھ دیا اگر وہ اس کی ملکیت سے خارج بھی ہو جائے تو بھی اس سے اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

ہم پر اللہ تعالیٰ صرف روپے پیسے اور مال ومتاع کی صورت میں خرچ نہیں کرتا، بلکہ بارش کا ایک ایک قطرہ اور غلے کا ایک ایک دانہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے، ہمارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں، وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی ملعون یہودیوں کی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ: ''اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں؟''

نہیں، اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہے، اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں، اس کے عطیات اور انعامات اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اگر وہ یہ کہیں کہ پھر ایسا کیوں ہے کہ اللہ زید کو دیتا ہے اور عمرو کو نہیں دیتا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکمل اختیار کا مالک ہے، اور اس کا ہر کام حکمت بالغہ پر مبنی ہوا کرتا ہے، اسی لیے اس نے ان کے شبہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يُنفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ ''وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔'' وہ کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم، جب کہ کسی کو درمیانی مقدار میں۔ اور یہ سب کچھ اس کی حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے، مگر یہ بات یاد رہے کہ جس کسی کو اس نے کم دیا ہے وہ دوسری جہت سے اس کے فضل کرم اور عطاء سے محروم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے صحت وتندرستی، سماعت وبصارت اور عقل وشعور سے نوازا اور ان کے علاوہ ان گنت نعمتیں عطا فرمائیں، مگر یہودیوں نے اپنی ہٹ دھرمی، سرکشی اور عداوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو صفات عیب سے منزہ تسلیم نہ کرتے ہوئے اس کے بارے میں یہ گستاخانہ بات کہہ ڈالی کہ ''اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔''

گزشتہ دو آیات میں اللہ تعالیٰ کے لیے دو ہاتھوں کا اثبات کیا گیا ہے۔

مگر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو سے زیادہ ہاتھ ہیں اور اس کی دلیل کے طور پر وہ اس قرآنی آیت کو پیش کر سکتا ہے:



﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا﴾ (یس : ۷۱)

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے اس میں سے جو کام کیا ہے ہمارے ہاتھوں نے۔"

اس جگہ (ایدی) جمع کا صیغہ ہے اور ہمیں جمع کو ہی اختیار کرنا چاہیے، اس سے ہم تثنیہ پر بھی عمل کر لیں گے اور اس سے زیادہ پر بھی۔ آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: لفظ (ید) کا استعمال مفرد کے طور پر بھی ہوا ہے، تثنیہ کے طور پر بھی اور جمع کے طور پر بھی۔

جس جگہ یہ مفرد کے طور پر وارد ہوا ہے۔ تو مفرد مضاف چونکہ عموم کا فائدہ دیتا ہے، لہٰذا یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہر ید (ہاتھ) پر مشتمل ہے، مفرد مضاف کے عموم کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (ابراهیم : ٣٤)

"اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو تم انہیں گن نہیں سکو گے۔"

اس جگہ لفظ نعمۃ مفرد اور مضاف ہے جو کہ بہت ساری نعمتوں پر مشتمل ہے، جن کا شمار ممکن نہیں، وہ نہ ایک ہے، نہ ہزار، نہ ملین اور نہ کئی ملین۔ لہٰذا (ید اللہ) کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر تعدد ثابت ہو تو یہ مفرد و مضاف اس سے مانع نہیں ہے۔ اس لیے کہ مفرد مضاف عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

جہاں تک مثنیٰ یا جمع کا تعلق ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے صرف دو ہی ہاتھ ہیں، کتاب وسنت سے بھی یہی کچھ ثابت ہے۔

کتاب اللہ:......ارشاد ہوتا ہے: ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (ص : ۷۵) "جسے میں نے اپنے دو ہاتھوں سے پیدا کیا۔"

چونکہ یہ مقام عزت افزائی کا مقام ہے، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کے دو سے زیادہ ہاتھ ہوتے تو ان کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدة : ٦٤) "بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔"

جس سے یہودیوں کے قول (ید اللہ) کا رد کرنا مقصود ہے، جس میں (ید) مفرد استعمال ہوا ہے، چونکہ یہ مقام کثرت نعم کا متقاضی ہے۔ اور عطاء کے وسائل جس قدر زیادہ ہوں گے عطاء کی اسی قدر کثرت ہوگی، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ دو سے زیادہ ہوتے تو اللہ ان کا ذکر ضرور فرماتا۔

سنت رسول اللہ ﷺ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ زمینوں کو اپنے دائیں ہاتھ سے اور زمین کو دوسرے ہاتھ سے لپیٹ لے گا۔" ❶

آپ ﷺ کا ہی ارشاد مبارک ہے: "اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔" ❷

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے دو سے زیادہ ہاتھوں کا ذکر نہیں فرمایا۔

---

❶ صحیح بخاری: ۷٤۱۲، ٤۸۱۲ صحیح مسلم: ۲۷۸۸، ۲۷۸۷/۲ صحیح مسلم ۱۸۲۸ ❷ صحیح مسلم ۱۸۲۸



پھر علماء سلف کا بھی اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں، ان سے زیادہ نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن وسنت کی نصوص اور اجماع سلف سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں تو پھر اس میں اور اس قرآنی آیت میں تطبیق کی کیا صورت ہے:

﴿مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ﴾ (یٰسٓ : ۷۱) ''وہ جنہیں ہمارے ہاتھوں نے بنایا۔''

اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے (ایدی) کا لفظ وارد ہے جو کہ جمع ہے۔

اس کا جواب اس طرح سے دیا جا سکتا ہے:

یا تو ہم بعض علماء کی طرح یہ کہہ دیں کہ جمع کا اطلاق کم از کم دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس بناء پر ﴿اَیۡدِیۡنَاۤ﴾ دو سے زیادہ پر دلالت نہیں کرتا، یعنی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دو سے زیادہ پر دلالت کرے۔ اس صورت میں چونکہ جمع تثنیہ سے مطابقت رکھتا ہے لہٰذا کوئی اشکال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

سوال: اس کی کیا دلیل ہے کہ جمع کا اطلاق کم از کم دو چیزوں پر ہوتا ہے؟

جواب: اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰہِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا﴾ (التحریم : ٤)

''اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کر لو تو تمہارے دل اسی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔''

وہ عورتیں دو تھیں جبکہ (قلوب) جمع کا صیغہ ہے۔ اور اس سے مراد صرف دو دل ہیں، اس لیے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ﴾ (الاحزاب : ٤)

''اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔''

دو دل نہ تو کسی مرد کے ہیں اور نہ ہی کسی عورت کے۔ اس کی دلیل کے طور پر اس ارشاد ربانی کو بھی پیش کیا جاتا ہے:

﴿فَاِنۡ کَانَ لَہٗۤ اِخۡوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ﴾ (النساء : ۱۱)

''پھر اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔''

﴿اِخۡوَۃٌ﴾ جمع ہے مگر مراد اس سے دو ہیں۔

اس کی یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ نماز کی جماعت دو افراد سے بھی ہو جاتی ہے۔

مگر جمہور اہل سنت کہتے ہیں کہ جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے اور یہ کہ مذکورہ بالا نصوص میں جمع کا دو کی طرف خروج کسی سبب کی وجہ سے ہے۔ اصل قانون یہی ہے کہ جمع کے کم از کم افراد تین ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس جمع سے مراد اللہ کے ہاتھوں کی تعظیم ہے یہ نہیں کہ اس کے ہاتھ دو سے زیادہ ہیں۔

اس جگہ ہاتھ سے مراد نفس ذات ہے جو کہ ہاتھ سے موصوف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ﴾ (الروم : ٤١)



''لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے بحر و بر میں فساد پھیل گیا۔''

اس سے مراد لوگوں کی کمائی ہے، وہ ہاتھوں کی ہو یا دل کی، زبان کی ہو یا کسی اور جزو بدن کی۔ اس جیسی تعبیر سے مقصود فاعل کی ذات ہوا کرتی ہے۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کو اپنے ہاتھوں سے پیدا نہیں فرمایا:

﴿مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ﴾ اور ﴿لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ﴾ میں بڑا فرق ہے۔ گویا کہ پہلی آیت کا معنی ہے: ﴿مِّمَّا عَمِلۡنَا﴾ اس لیے کہ ید سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کہ اس سے موصوف ہے۔ جبکہ ﴿بِیَدَیَّ﴾ سے مراد ذات نہیں بلکہ دو ہاتھ ہیں۔

ہماری اس گفتگو کے ساتھ صفت ید میں پیدا ہونے والا اِشکال دور ہو گیا جو مفرد بھی واقع ہوا ہے، تثنیہ بھی اور جمع بھی۔ مفرد اور تثنیہ میں تطبیق دینا تو بالکل آسان ہے۔ اور وہ اس طرح کہ مفرد مضاف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہر "ید" پر مشتمل ہے۔ جبکہ تثنیہ اور جمع کے درمیان تطبیق کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: جمع سے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے، تین یا اس سے زیادہ، بلکہ اس سے مراد تعظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اپنے لیے ﴿اِنَّا﴾ ﴿نَحۡنُ﴾ ﴿قُلۡنَا﴾ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ حالانکہ وہ واحد و یکتا ہے۔ ایسا صرف تعظیم کے پیش نظر کہا گیا ہے۔

دوسری صورت: یہ کہا جائے کہ جمع کا اطلاق کم از کم دو پر ہوتا ہے۔ اس صورت میں تعارض پیدا ہی نہیں ہوتا۔ رہا یہ ارشادِ باری ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیۡنٰہَا بِاَیۡىدٍ﴾ (الذاریات: ٤٧) ''اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا۔'' اس جگہ (اید) قوت کے معنی میں ہے، اس لیے کہ یہ أَوَ یَئِیدُ کا مصدر ہے یعنی: قوی ''وہ طاقتور ہوا'' اس سے اللہ کی صفت (ہاتھ) مراد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس جگہ اسے اپنی ذات کی طرف مضاف کرتے ہوئے بِاَیۡدِیۡنَا نہیں بلکہ ﴿بِاَیۡىدٍ﴾ فرمایا، یعنی قوت کے ساتھ، اس کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ﴾ (القلم: ٤٢) ''جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی۔''

﴿سَاقٍ﴾ کی تفسیر میں علماء سلف کے دو ل قول ہیں:

پہلا قول: اس سے مراد شدت ہے۔

دوسرا قول: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ہے۔

جنہوں نے آیت کے سیاق اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی [1] حدیث کو پیش نظر رکھا انہوں نے اس جگہ ساق سے اللہ تعالیٰ کی پنڈلی مراد لی۔ اور جنہوں نے صرف آیت کو ہی پیش نظر رکھا انہوں نے کہا کہ اس سے مراد شدّت ہے۔

سوال: آپ اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی ہاتھ ثابت کرتے ہیں جبکہ ہم صرف مخلوقات کے ہاتھوں کو جانتے ہیں، تمہاری کلام

[1] ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بخاری: ۷۴۳۹، اور مسلم: ۱۸۳ نے روایت کیا۔

سے خالق کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے۔

جواب: اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ کے اِثبات سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم خالق کو مخلوق کے مماثل قرار دے رہے ہیں۔ اثبات ید کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع سلف کے حوالے سے ہوتا ہے، جبکہ خالق کی مخلوق کے ساتھ مماثلت کی نفی پر شرع بھی دلالت کرتی ہے اور عقل وحس بھی۔

شرع کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔''

رہی عقل تو اپنی صفات میں خالق کا مخلوق کے ساتھ مماثل ہونا ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بات خالق میں عیب کے زمرے میں آتی ہے، اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔

جہاں تک حس کا تعلق ہے، تو یہ بات ہر انسان کے مشاہدہ میں ہے کہ مخلوقات کے اپنے ہاتھوں میں تفاوت وتباین پایا جاتا ہے۔ کسی کے ہاتھ بڑے ہیں اور کسی کے چھوٹے، کسی کے موٹے اور کسی کے پتلے...... الخ۔ تو ایسے میں خالق کے ہاتھوں کا مخلوق کے ہاتھوں سے تباین اور ان کے ساتھ غیر مماثل ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہوگا۔

اہل سنت والجماعت اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ کا اثبات کرتے ہیں، مگر معتزلہ، جہمیہ، اشعریہ اور ان جیسے کچھ دوسرے اہل تعطیل ان کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی ہاتھ کا اثبات غیر ممکن ہے۔ اس سے مراد قوت ہے، یا نعمت، اس لیے کہ عربی زبان میں ید کا اطلاق قوت اور نعمت پر بھی ہوتا ہے۔

نواس بن سمعان کی صحیح حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کرے گا کہ میں نے اپنے کچھ ایسے بندے نکالے ہیں کہ ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی میں (یدان) قوت نہیں ہے'' [1] اس حدیث میں وارد لفظ (یـدان) قوت کے معنی میں ہے، ان لوگوں سے مراد یاجوج وماجوج ہیں۔

رہا (یـد) بمعنی نعمت تو اس کا استعمال بہت زیادہ ہے، مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ کے قاصد نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''لو لا ید لك عندی لم أجزك بها لا جبتك'' [2] اس جگہ لفظ (ید) نعمت کے معنی میں ہے۔ متنبّی کہتا ہے:

وَكَـمْ لِظَلَامِ اللَّيْلِ عِنْدَكَ مِنْ يَدٍ	تُـحَـدِّثُ أَنَّ الْـمَـانَوِيَّةَ تَكْذِبُ

''تجھ پر رات کی تاریکیوں کے کتنے ہی ایسے احسانات ہیں جو بتاتے ہیں کہ مانو یہ جھوٹ بولتے ہیں۔''

مانو یہ ایک مجوسی فرقہ ہے جن کا عقیدہ ہے کہ تاریکی شر کو جنم دیتی ہے اور روشنی خیر کو۔ متنبّی اپنے ممدوح سے کہتا ہے کہ تو

---

[1] صحیح مسلم: ۲۹۳۷ عن النواس بن سمعان۔

[2] صحیح بخاری: ۲۷۳۲، ۲۷۳۱ قریش مکہ کے قاصد کا نام عروہ بن مسعود تھا۔

مجھے رات کے وقت بہت زیادہ عطیات سے نوازتا ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مانو یہ فرقہ کے لوگ جھوٹ بولتے ہیں اس لیے کہ تیری رات خیر لے کر آتی ہے۔

اس بنا پر ان لوگوں کے نزدیک (ید) سے مراد نعمت ہے نہ کہ حقیقی ید (ہاتھ) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی ہاتھ کے اثبات سے تجسیم لازم آتی ہے۔ اور اجسام متماثل ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ اللہ کو جسم تسلیم کریں گے تو اس چیز کو ارتکاب کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں منع فرمایا ہے:

﴿فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ (النحل: ٧٤) ''تم اللہ کے لیے مثالیں بیان نہیں کرو۔''

اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ کی حقیقت کا اثبات کرنے والے! یہ ہماری سعادت مندی کی دلیل ہے کہ ہم کہتے ہیں: پاک ہے وہ ذات جو اعراض و ابعاض اور اغراض سے منزہ ہے۔

ہمارے پاس اس کے کئی جواب ہیں۔

اولا: ''یـــدٌ'' کی نعمت اور قوت کے ساتھ تفسیر کرنا ظاہر لفظ کے خلاف ہے۔ اور ظاہر لفظ کے خلاف ہر چیز مردود ہوتی ہے۔ اِلَّا یہ کہ اس پر کوئی دلیل قائم ہو۔

ثانیاً: یہ موقف اجماع سلف کی خلاف ہے۔ تمام سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ یدٌ سے مراد حقیقی ید (ہاتھ) ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ آپ جس اجماع سلف کی بات کرتے ہیں، وہ اجماع کہاں ہے؟ مجھے خلفاء راشدین سے مروی کوئی ایک بھی ایسا لفظ دکھا دیں جس میں انہوں نے یہ کہا ہو کہ اللہ کے ہاتھ سے مراد حقیقی ہاتھ ہے۔

اس شخص سے میں یہ کہوں گا کہ آپ ابو بکر و عمر، عثمان و علی، دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور بعد ازاں کے ائمہ سے مروی کوئی ایسا لفظ بتا دیں جس میں انہوں نے یہ کہا ہو کہ ہاتھ سے مراد قوت ہے یا نعمت۔

مگر یہ اس کی طاقت سے باہر ہے۔

اگر ان کے پاس ظاہر لفظ کے خلاف کوئی معنی ہوتا تو وہ اس کا اظہار بھی کرتے اور وہ ان سے منقول بھی ہوتا۔ جب انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ظاہر لفظ کو اپنایا ہے اور یہ کہ اس پر ان کا اجماع ہے۔

اس اصول سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی ایسی چیز منقول نہ ہو جو کتاب و سنت کے ظاہر کے خلاف ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی اس کے سوا اور کوئی رائے نہیں ہے، اور یہ اس لیے کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا، اور نبی علیہ الصلاۃ والسلام انہی کی زبان میں ان سے مخاطب ہوئے۔ اس سے ضروری قرار پاتا ہے کہ انہوں نے کتاب و سنت کو ان کے ظاہری مفہوم میں سمجھا، جب اس کے خلاف ان سے کوئی بات منقول نہیں ہوگی تو ان کا قول یہی ہوگا۔

ثالثاً: اگر ارشاد باری: ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ جیسی مثالوں میں ہاتھ سے مراد نعمت یا قوت لی جائے تو اس سے غاية امتناع ممتنع ہو جاتی ہے، اس لیے کہ یہ مفہوم صرف دو نعمتوں کو مستلزم ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کسی شمار میں نہیں آ سکتیں۔ نیز یہ اس امر کو بھی مستلزم ہے کہ قوت کی دو قسمیں ہیں حالانکہ قوت ایک ہی معنی میں متعدد نہیں ہو سکتی۔

ارشاد باری: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدہ: ٦٤) میں تو تاویل کی بنیاد پر دو ہاتھوں سے نعمت مراد لینا ممکن ہے لیکن ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ سے یہ مراد لینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے جبکہ ان دونوں آیتوں میں مذکور دو ہاتھوں سے قوت مراد لینا ممتنع ہے، اس لیے کہ قوت میں تعدد نہیں ہوتا۔

رابعاً: اگر ہاتھ سے قوت مراد لی جائے تو پھر آدم کو ابلیس پر کوئی فضیلت حاصل نہیں رہتی، بلکہ ساری مخلوق کے کسی فرد پر بھی انہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں رہتی، اس لیے کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ کی قوت سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ہاتھوں سے مراد قوت ہی ہو تو پھر ابلیس کے خلاف احتجاج درست قرار نہیں پاتا۔ اس لیے کہ ابلیس کہہ سکتا تھا کہ میرے رب! اگر تو نے آدم کو اپنی قوت سے پیدا کیا ہے تو تو نے مجھے بھی تو اپنی قوت سے ہی پیدا کیا ہے، اسے مجھ پر فضیلت کیونکر حاصل ہے؟

خامساً: جس ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ثابت کیا ہے اور اس کا ذکر ایسی مختلف وجوہ پر ہوا ہے کہ اس سے نعمت یا قوت مراد لینا ممتنع ہے، مثلاً اس کی انگلیوں کا ذکر ہوا ہے اسے کھولنے اور بند کرنے کا ذکر ہوا ہے، اور اسے دایاں کہا گیا ہے۔ یہ سب چیزیں اس سے قوت مراد لینے کے راستے میں رکاوٹ ہیں، اس لیے کہ قوت کو ان اوصاف کے ساتھ موصوف نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے یہ بات واضح ہوگئی کہ محرفین کا یہ قول متعدد وجوہ کی بناء پر باطل ہے کہ ہاتھ سے مراد قوت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے دو آنکھوں کا اثبات

❑ مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے لیے دو آنکھوں کے لیے تین آیات ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ ''اپنے رب کے حکم پر صبر کیجئے، یقیناً آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔''

شرح: ......خطاب اس جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو رہا ہے۔

لغت میں صبر، حبس کے معنی میں ہے۔ اسی سے عربوں کا یہ قول ہے: قُتِلَ صبرًا یعنی اسے اس حال میں قتل کیا گیا کہ اسے قتل کرنے کے لیے محبوس کر دیا گیا تھا۔

جبکہ شرع میں اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کے احکام کے لیے نفس پر روک لگائے رکھنا۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کی دو قسمیں ہیں: شرعیہ اور کونیہ، احکام شرعیہ سے مراد اوامر ونواہی ہیں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا اوامر پر صبر کرنا، جبکہ اس کی معصیت سے صبر کرنا، نواہی سے صبر کرنا ہے۔ اور احکام کونیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اقدار ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر پر صبر کرنا۔

بعض لوگوں کے اس قول کا یہی معنی ہے، صبر کی تین قسمیں ہیں: اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا، اس کی معصیت سے صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی تکلیف دہ اقدار پر صبر کرنا۔



ارشاد باری: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ صبر کی ان تینوں قسموں کو متناول ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی معصیت سے صبر کرنا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی اقدار پر صبر کرنا۔

یعنی اپنے رب کے شرعی اور کونی حکم پر صبر کیجئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر کی جن تین قسموں کا علماء نے ذکر کیا ہے وہ ارشاد ربانی: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ میں داخل ہیں اور وجہ دخول یہ ہے کہ حکم کونی ہوگا یا شرعی۔ اور شرعی حکم اوامر ونواہی پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو کئی چیزوں کا حکم دیا، کئی امور سے منع فرمایا، اور کئی چیزیں آپ کے مقدر میں کر دیں۔ اوامر کا بیان ان جیسی آیات میں آیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ (المائدہ: ٦٧) "اے رسول! جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا اسے ان تک پہنچا دیں۔" ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ﴾ (النحل: ١٢٥) "بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف۔" یہ احکام بڑی عظمت کے حامل ہیں۔ اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کو کہا جائے تو وہ اس پر آسانی سے عمل کرے گا، لیکن دعوت وتبلیغ کا کام امر دشوار ہے، کیونکہ اس کے لیے دوسروں کے سخت رویے اور مخالفانہ طرز عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کہ یقیناً بڑا مشکل کام ہے۔

جہاں تک نواہی کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شرک سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الانعام: ١٤) "اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہونا۔"

﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ (الزمر: ٦٥)

"اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔"

اور ان جیسی دیگر آیات۔ رہے قدری احکام، تو آپ علیہ السلام کو اپنی قوم کی طرف سے ایسی قولی اور فعلی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا جن پر آپ ﷺ جیسے لوگ ہی صبر کر سکتے تھے۔

ان لوگوں نے آپ کو زبان سے ایذائیں پہنچائیں، آپ کا مذاق اڑایا، تحقیر کی، لوگوں کو آپ سے بیزار کرایا۔ اور اپنے فعل وعمل سے آپ ﷺ کو ستایا۔ آپ کعبۃ اللہ میں اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز تھے کہ اسی حالت میں آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی لا کر رکھ دی گئی۔ [1] اس اذیت سے بڑھ کر اور کیا اذیت ہو سکتی تھی۔ یہ سبھی کے علم میں تھا کہ حرم میں داخل ہونے والے ہر شخص کو امن حاصل ہوتا ہے، نہ صرف یہ کہ مشرکین مکہ اسے اذیت رسانی سے باز رہتے بلکہ اسے پوری پوری عزت دیتے، اسے نبیذ کھلاتے اور آب زمزم پلاتے۔ جبکہ محمد ﷺ کو سجدہ کی حالت میں اس جیسی اذیت سے دوچار کرتے۔

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ صحیح بخاری: ٣٨٥٤، صحیح مسلم ١٧٩٤.

یہ تو حرم مکی کے اندر کی حالت تھی، بیرون حرم آپ ﷺ کے ساتھ ان کا سلوک اس سے بھی شرم ناک ہوتا وہ گندی اور بد بودار چیزیں اٹھا کر لاتے اور آپ کے گھر کے دروازے پر ان کا ڈھیر لگا دیتے۔

آپ طائف تشریف لے گئے تو بستی کے آوارہ اور بدمعاش لوگ راستے کے دونوں طرف کھڑے ہو کر آپ پر پتھر برسانے لگے، انہوں نے پتھر مار مار کر آپ کو لہولہان کر دیا یہاں تک کہ آپ کی ایڑیاں خون سے رنگین ہو گئیں، آخر کار کہ آپ نے قرن الثعالب میں پہنچ کر دم لیا۔ ❶

آپ ﷺ نے اللہ کے حکم پر صبر کیا، مگر یہ صبر ایسے بندہ مومن کا تھا جسے اس بات کا مکمل یقین تھا کہ اس کا انجام میرے حق میں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ ان سے فرما چکا تھا: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آپ کسی سے یہ کہیں کہ آپ میرے دل میں بستے ہیں، آپ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ پھر جس سے رب تعالیٰ یہ فرمائے کہ آپ میری آنکھوں کے سامنے ہیں تو یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

آپ میری آنکھوں کے سامنے ہیں، کا معنی یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ عربوں میں یہ تعبیر بڑی معروف ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے نزدیک آپ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، میں ہر طرح سے آپ کا خیال رکھوں گا اور آپ کی پوری پوری حفاظت کروں گا آپ میرے پاس آخری حد تک محفوظ و مامون ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت کے لیے آنکھ کا اثبات کیا گیا ہے لیکن اس کا ورود صیغہ جمع کے ساتھ ہوا ہے جس کی وجہ ہم عنقریب بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ

آنکھ کا شمار صفات ذاتیہ خبریہ میں ہوتا ہے، ذاتیہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ تک متصف رہے گا اور خبریہ اس لیے کہ ہماری نسبت سے اس کا مسمیٰ اجزا اور ابعاض ہیں۔

ہماری آنکھ چہرے کا بعض حصہ ہے اور چہرہ جسم کا بعض حصہ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ہمارے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بعض ہے، اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ وارد نہیں ہوا، نیز اس لیے بھی کہ یہ خالق میں تجزءٔ کا متقاضی ہے، بعض اجزاء کے فقدان سے کل کی بقاء بھی جائز ہوتی ہے اور اس کا فقدان بھی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفات باقی رہنے والی ہیں، ان کا فقدان کبھی بھی ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی دو آنکھیں ہونے پر حدیث نبوی

نبی کریم ﷺ کی ایک صحیح حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صرف دو آنکھیں ہیں، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے دجال کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ: ''وہ کانا ہے جبکہ تمہارا رب کانا نہیں ہے۔'' ❷

دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: ''وہ دائیں آنکھ سے کانا ہے۔'' ❸

---

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری: ۳۲۳۱، صحیح مسلم: ۱۷۹۵۔

❷ صحیح بخاری: ۳۰۵۷۔ صحیح مسلم: ۱۶۹۔ ❸ صحیح بخاری: ۷۴۰۷۔ مسلم: ۱۶۹۔

بعض لوگ حدیث کے الفاظ "انـه اعور" کا معنی: ''عیب دار'' کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ عور العین سے ماخوذ نہیں ہے، مگر یہ تحریف اور بخاری وغیرہ کے ان صحیح الفاظ سے تجاہل ہے: "اعـور عيـن اليـمنى كان عينه عنب طافية" ❶ ''وہ دائیں آنکھ سے کانا ہے، گویا کہ اس کی آنکھ پھولا ہوا انگور ہے۔''

نیز عربی زبان میں (اعور) کا لفظ صرف آنکھ کے کانے پن کے لیے بولا جاتا ہے، البتہ (عَوَرَ) اور (عوار) سے مطلق عیب مراد لیا جا سکتا ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صرف دو آنکھیں ہیں۔

اور وجہ دلالت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی دو سے زیادہ آنکھیں ہوتیں تو آپ علیہ السلام فرماتے کہ تمہارے رب کی کئی آنکھیں ہیں، اس سے دجال کے رب نہ ہونے کی زیادہ وضاحت ہو جاتی۔

نیز اس لیے بھی کہ اگر اس کی دو سے زیادہ آنکھیں ہوتیں، تو چونکہ یہ بات اس کے کمال کی مظہر تھی، لہٰذا اسے بیان نہ کرنا اس کی ثناء کا موقع کھو دینے کے مترادف ہوتا چونکہ کثرت، کمال وتمام اور قوت پر دلالت کرتی ہے لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کی آنکھیں کثیر تعداد میں ہوتیں تو آپ ﷺ اس کی ضرور وضاحت فرماتے تاکہ ہم اس کمال پر اعتقاد سے محروم نہ رہتے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الصواعق المرسلۃ'' میں ایک حدیث ذکر کی ہے، مگر وہ منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: "ان العبد اذا قام فى الصلاة قام بين عينى الرحمان" ❷ ''یقیناً بندہ جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو رحمان کی دو آنکھوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔'' اس حدیث میں دو آنکھوں کا ذکر ہے، مگر جیسا کہ ہم نے بتایا یہ حدیث ضعیف ہے، ہم اپنے اس عقیدہ کے لیے دجال کے بارے میں وارد صحیح حدیث پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ بالکل واضح ہے۔

اس حدیث کو عثمان بن سعید داری نے "الرد على بشر المريسى" اور ابن خزیمہ نے ''کتاب التوحید'' میں ذکر کیا ہے ابوالحسن الاشعری اور ابوبکر الباقلانی نے اس پر سلف کے اجماع کا ذکر کیا ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دو آنکھیں ہیں، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔

سوال: معروف ائمہ سلف ارشاد باری تعالیٰ: ﴿بِأَعْيُنِنَا﴾ کی تفسیر: مر ای منا کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی آپ ایسی جگہ میں ہیں جہاں ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ جبکہ آپ کہتے ہیں کہ تحریف حرام اور ممتنع ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

جواب: ائمہ سلف نے اس کی تفسیر لازم کے ساتھ کی ہے، اور وہ اصل یعنی آنکھ کا بھی اثبات کرتے ہیں، جبکہ اہل تحریف اس کا معنی تو یہی کرتے ہیں مگر وہ آنکھ کا اثبات نہیں کرتے۔ اہل سنت رؤیت کے ساتھ آنکھ کا بھی اثبات کرتے ہیں۔

---

❶ اس کی تخریج گزشتہ حدیث میں گزر چکی ہے۔

❷ الصواعق": ۲۵٦/۱۔ شیخ البانی، الضعیفة: ۱۰۲٤۔ میں فرماتے ہیں: یہ حدیث بڑی ضعیف ہے، اسے عقیلی نے "الضعفاء: ص ۲٤" بزار نے اپنی "مسند: ۵۵۳" میں ذکر کیا ہے۔

معطلہ کا اعتراض: تم ہماری طرف سے تاویل پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہو، جب کہ خود تم نے ارشاد باری ﴿فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ میں تاویل کر کے اسے اس کے ظاہر سے نکال دیا، تم اپنے دعوے کے مطابق ظاہر آیت پر عمل کرو، ویسے ہم آپ کو یہ بتائے دیتے ہیں کہ اگر تم ظاہر پر عمل کرو گے تو کفر کا ارتکاب کرو گے اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تناقض کا شکار ہو گے، تم کبھی تاویل کے جواز کا فتویٰ دیتے ہو اور کبھی عدم جواز کا، اور اسے تحریف سے موسوم کرتے ہو، کیا یہ اللہ کے دین میں من پسندانہ فیصلہ نہیں ہے؟ اس اعتراض کا جواب: ہم بصد خوشی ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔ ہمارا طریقہ یہی ہے اور ہم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ معطلہ کا کہنا ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ کی آنکھ میں ہیں، آنکھ کے وسط میں ہیں، آپ کہتے ہیں: زید بالبیت، زید بالمسجد (باء) ظرفیت کے لیے ہے، لہٰذا اس کا یہ معنی ہوگا کہ زید گھر کے اندر ہے، زید مسجد کے اندر ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ﴿فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ کا معنی ہوگا: ''آپ ہماری آنکھوں کے اندر ہیں'' اگر آپ یہ معنی کریں گے تو کفر کا ارتکاب کریں گے اس لیے کہ اس طرح تم نے اللہ کو مخلوق قرار دے دیا اور تم حلولیہ بن گئے۔ اور اگر یہ معنی نہیں کرو گے تو تناقض کا شکار ہو جاؤ گے۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے: معاذ اللہ، پھر معاذ اللہ اور پھر معاذ اللہ کہ تمہارا ذکر کردہ معنی ظاہر قرآن ہو۔ اگر تم اس مفہوم کے ظاہر قرآن ہونے کا اعتقاد رکھتے ہو تو پھر یہ کفر ہے، جو شخص ظاہر قرآن کے کفر کا اعتقاد رکھتا ہے وہ کافر و گمراہ ہے۔

تم لوگ اس قول سے اللہ کے سامنے توبہ کرو کہ یہ لفظ کا ظاہری مفہوم ہے اور تمام عرب شعراء و ادباء سے سوال کرو کہ کیا اس قسم کی عبارت سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ جس انسان کی طرف سے آنکھ سے دیکھا جاتا ہے وہ آنکھ کے پپوٹے میں موجود ہوتا ہے؟ تم اہل لغت میں سے جس سے چاہو پوچھ لو، زندوں سے بھی پوچھ لو اور مردوں سے بھی۔

عربی زبان کے اسالیب بیان کا جائزہ لینے کے بعد آپ اس بات سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے کہ جس معنی کے لیے تم نے ہمیں مورد الزام ٹھہرایا ہے اس کا عربی زبان میں کوئی وجود نہیں ہے، چہ جائیکہ اسے رب تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اسے رب تعالیٰ کی طرف مضاف کرنا کفر اور واجب الانکار ہے۔ یہ معنی لغوی، شرعی اور عقلی اعتبار سے بھی نا قابل تسلیم ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ تم ﴿بِأَعْيُنِنَا﴾ میں (باء) کی تفسیر کس چیز کے ساتھ کرو گے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس کی تفسیر مصاحبت کے ساتھ کریں گے۔ جب آپ کسی سے کہیں کہ: آمنت بعینی تو اس کا مطلب ہوگا: میری آنکھ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہیں دیکھ رہی ہے اور تم سے جدا نہیں ہوگی۔ اس طرح اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ: میرے نبی! اپنے رب کے حکم پر صبر کیجیے، آپ ہماری حفاظت اور ذمہ داری میں ہیں، ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ آپ کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس جگہ (بـــاء) کا ظرفیت کے لیے ہونا غیر ممکن ہے، اس سے نبی کریم ﷺ کا اللہ کی آنکھ میں موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ محال ہے۔

نیز اس لیے بھی کہ جب اس کے ساتھ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کے خطاب کیا گیا اس وقت آپ زمین پر تھے۔ اس سے بھی ان



لوگوں کے اس دعویٰ کا بطلان ہوتا ہے کہ ظاہر قرآن اس امر کا متقاضی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں ہیں۔

دوسری آیت: ﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ o تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ﴾ (القمر: ۱۳۔ ۱٤) ''اور ہم نے اسے تختوں اور میخوں والی کشتی میں سوار کرلیا، وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، یہ اس کے انتقام کے لیے تھا جس کا انکار کیا گیا تھا۔''

شرح: ......[وَحَمَلْنٰهُ]....ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے۔

[وَحَمَلْنَاهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ]....یعنی ہم نے نوح کو ایسی کشتی میں سوار کرلیا جو تختوں اور میخوں والی تھی۔ نوح علیہ السلام کشتی تیار کر رہے تھے، اس دوران جب ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس سے گزرتے تو وہ آپ کا مذاق اڑاتے۔ اس پر آپ ان سے فرماتے:

﴿اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ﴾ (ھود: ۳۸)

''اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو یقیناً ہم بھی تم سے تمسخر کریں گے، جیسے تم تمسخر کر رہے ہو۔''

جناب نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی نگرانی میں کشتی تیار کرنے لگے، اور اس نے ان سے فرمایا: ﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا﴾ (ھود: ۳۷) ''ہمارے حکم کے مطابق اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک کشتی بناؤ۔'' وہ کشتی بنا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور اسے بنانے کا طریقہ انہیں الہام کر رہا تھا۔

جب کشتی تیار ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ کہ وہ تختوں اور کیلوں والی تھی۔ ﴿ذَاتِ﴾ صاحبۃ کے معنی میں ہے۔ (الالواح) تختیاں۔ (الدسر) وہ اشیاء جن کے ساتھ لکڑیاں جوڑی جاتی ہیں، مثلاً کیل اور رسیاں وغیرہا، اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد کیل ہیں۔

[تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا] .... یعنی تختوں اور کیلوں سے تیار کردہ کشتی اللہ تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔ اس جگہ اعین سے صرف دو آنکھیں مراد ہیں۔ اور اس کے رب تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس جگہ (باء) مصاحبت کے لیے ہے۔ کشتی اس پانی پر تیر رہی تھی جو آسمان سے برسا اور زمین سے بہہ نکلا۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی: ﴿اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (القمر: ۱۰) ''بیشک میں مغلوب ہوں، میری مدد فرما۔''

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ o وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا﴾ (القمر: ۱۱۔۱۲)

''تو پھر ہم نے تیز بارش کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے اور زمین سے چشمے جاری کر دیے۔''

یہ کشتی اللہ تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے رواں دواں تھی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: ﴿عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ مگر یہ کیوں نہیں فرمایا: وحملنه علی السفينة یا حملنه علی فلك ، کہ ہم نے اسے کشتی پر سوار کیا......؟

جواب: پہلی تعبیر اختیار کرنے اور دوسری ترک کرنے کی تین وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ: آیات کے کلمات اور ان کے فواصل میں تناسب کا خیال رکھنا۔ اگر اللہ یوں فرمایا: وحملنه علی فلك ، تو یہ آیت اپنے ماقبل اور مابعد کی آیت سے ہم آہنگ نہ ہوتی۔ اسی طرح "علی سفینة" کہنے سے بھی یہی صورت حال پیدا ہوتی۔ چونکہ آیات کے کلمات اور ان کے فواصل میں تناسب قائم رکھنا مقصود تھا، لہٰذا فرمایا گیا: ﴿عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾

دوسری وجہ: تاکہ لوگوں کو کشتیاں بنانے کا پتا چل جائے اور اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ حضرت نوح کی کشتی لکڑی کے تختوں اور کیلوں سے تیار کی گئی تھی۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر: ۱۵)

"اور یقیناً ہم نے اسے ایک نشان عبرت کے طور پر چھوڑا تو کیا ہے کوئی عبرت حاصل کرنے والا۔"

اللہ تعالیٰ نے کشتی سازی کا علم مخلوق کے لیے نشان عبرت کے طور پر باقی رکھا۔

تیسری وجہ: اس سے اس کی مضبوطی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور وہ اس طرح کہ یہ کشتی لکڑی کے تختوں اور کیلوں سے تیار کردہ تھی۔ اس جگہ تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ اس طرح اس کے مواد پر ترکیز کی گئی۔ موصوف سے ہٹ کر وصف کے ذکر کرنے کی نظیر یہ ارشاد باری ہے:

﴿اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ﴾ (سباء: ۱۱) "یہ کہ کشادہ زرہیں بنائیں۔" اللہ تعالیٰ نے "دروعا سابغات" نہیں فرمایا، جس سے مقصود ان زرہوں کے فائدہ کو اہمیت دینا ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ کھلی ہوں اور پوری ہوں۔

تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا اس کے بارے میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا جو ہم ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ کے ضمن میں کہہ آئے ہیں۔

تیسری آیت: ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ (طٰهٰ: ۳۹) "اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے۔"

شرح: ......خطاب موسیٰ علیہ السلام سے ہو رہا ہے۔

﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾ مفسرین کا اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

پہلا قول: اس کا معنی ہے، میں نے تجھ سے محبت کی۔

دوسرا قول: اس کا معنی ہے، میں نے تجھ پر لوگوں کی محبت ڈال دی، یعنی جو کوئی بھی تجھے دیکھے گا تجھ سے محبت کرنے لگے گا۔ اور اس کا شاہد یہ ہے کہ فرعون کی بیوی انہیں دیکھتے ہی ان سے محبت کرنے لگی اور پھر بول اٹھی: ﴿لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (القصص: ۹) "اسے قتل مت کرنا شاید یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔"

سوال: کیا اس آیت کو ان دونوں معنوں پر محمول کرنا ممکن ہے؟

جواب: ممکن ہے، اور یہ اس قاعدہ کی بناء پر ہے کہ جب کوئی آیت ایسے دو معنوں کا احتمال رکھتی ہو جن میں منافات نہ ہو تو اسے دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے، موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بھی محبوب ہیں اور لوگوں کے بھی۔ لوگ انہیں دیکھتے تو ان سے محبت کرنے لگتے اور امر واقع یہ ہے کہ یہ دونوں معنی متلازم ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''ان سے اللہ نے بھی محبت کی اور اپنی مخلوق کے دلوں میں بھی ان کی محبت ڈال دی۔''

پھر فرمایا: ﴿وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ﴾ صنع کسی چیز کو مخصوص انداز میں بنانا اور تیار کرنا، مثلاً لکڑی کے دروازے بنانا، یا اس سے کشتی تیار کرنا۔

ہر چیز کی صفت اس کے حسب حال ہوتی ہے، صناعة البیت، گھر تعمیر کرنا، صناعة الحدید: مثلاً لوہے، اسٹیل کے برتن یا انجن وغیرہ بنانا۔ صنع الادمی، انسان کی عقلی اور بدنی تربیت کرنا، اس کی بدنی تربیت غذا سے ہوتی ہے، جبکہ عقلی تربیت آداب واخلاق وغیرہا سے۔

موسیٰ علیہ السلام کی تربیت اللہ کی آنکھوں کے سامنے ہوئی، جب فرعونیوں نے انہیں دریا سے باہر نکالا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ رکھا حالانکہ وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کر دیتے تھے، مگر اللہ نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے وہ آل فرعون کی گود میں تربیت پائے گا۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو مارا جا رہا ہے وہ آل فرعون کے گھر پُر امن ماحول میں پروان چڑھے گا۔ قدرت ایزدی کا یہ منظر قابل دید ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی تربیت کا ایک دل آویز پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں دودھ پلانے والی عورتوں کے سامنے پیش کیا گیا مگر انہوں نے کسی ایک عورت کا بھی دودھ نہ پیا۔

﴿وَ حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ﴾ (القصص : ۱۲)

''اور ہم نے اس سے قبل ہی ان پر دوسری دائیوں کے دودھ حرام کر دیئے تھے۔''

ان کی بہن ان کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی جب اس نے یہ صورت حال دیکھی تو آل فرعون سے کہنے لگی:

﴿ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰۤی اَہۡلِ بَیۡتٍ یَّکۡفُلُوۡنَہٗ لَکُمۡ وَ ہُمۡ لَہٗ نٰصِحُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ (القصص : ۱۲)

''کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کے بارے میں بتاؤں جو تمہارے لیے اس کی کفالت کریں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں؟''

وہ خوشی سے اس پر آمادہ ہو گئے، تو ان کی بہن کہنے لگے: تم میرے ساتھ چلو، اس پر وہ ان کے ساتھ ہو لیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ﴾ (القصص : ۱۳)

''پھر ہم نے اسے اس کی ماں کے پاس واپس لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو۔''

اگر چہ موسیٰ شیر خوار بچے تھے مگر انہوں نے کسی بھی عورت کا دودھ نہ پیا، اب دودھ پلانے کے لیے اگر انہیں ان کی ماں کے پاس بھیج دیا گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کمال اور اس کے وعدہ کا ایفاء تھا۔

اس لیے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کہا تھا:

﴿فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (القصص : ۷)

''پھر جب تو اس پر خطرہ محسوس کرے تو اسے دریا میں پھینک دینا اور نہ خوف کھانا اور نہ غمگین ہونا، یقیناً ہم اسے تیرے پاس واپس لائیں گے اور اسے رسولوں میں سے بنائیں گے۔''

اپنے بیٹے پر جس ماں کی شفقت کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا، اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اپنے لخت جگر کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دے۔

اگر ایمان اس خاتون کا ہم رکاب نہ ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز اپنے بیٹے کو دریا میں نہ پھینکتی۔ اگر کسی ماں کا بیٹا صندوق میں بند ہو کر دریا میں گر جائے تو وہ اپنی جان پر کھیل کر اسے دریا سے باہر لے آئے، مگر یہ کیسی ماں ہے جو اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے دریا میں پھینک رہی ہے؟ یہ اس کا اپنے رب پر اعتماد اور اس کے وعدہ پر بھروسا ہی ہے کہ وہ اسے خود آگے بڑھ کر دریا کی لہروں کے حوالے کر رہی ہے۔

سوال: ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ مفرد کے ساتھ ہے، جبکہ قبل ازیں اس کا ذکر جمع کے ساتھ ہوا ہے۔ کیا یہ کیا اس کے منافی نہیں ہے؟

جواب: ہرگز منافی نہیں ہے، اس لیے کہ مفرد مضاف عام ہوتا ہے، آنکھ کے حوالے سے اللہ کے لیے جو کچھ بھی ثابت ہو، وہ اس پر مشتمل ہوگا، اس طرح مفرد اور جمع کے درمیان یا مفرد اور تثنیہ کے درمیان منافات نہیں رہتی۔

سوال: تثنیہ اور جمع کے درمیان تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: اگر تو جمع کا اطلاق کم از کم دو پر ہوتا ہے تو اس صورت میں منافات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہو تو پھر اس جمع سے مراد تین نہیں بلکہ تعظیم کا اظہار اور جمع کی ضمیر اور مضاف الیہ کے درمیان تناسب قائم رکھنا ہوگا۔

اہل تحریف و تعطیل آنکھ کی تفسیر رؤیت بدون آنکھ کے ساتھ کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ﴿بِاَعْيُنِنَا﴾ کا مطلب ہے، ہماری رؤیت، مگر آنکھ کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا اثبات ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ جسم کا ایک جزء ہے، اگر ہم اللہ کے لیے آنکھ ثابت کریں گے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم اس کے لیے تجزیہ اور جسم

ثابت کر رہے ہیں اور یہ ممتنع ہے، آنکھ کا ذکر صرف رؤیت کی تاکید کے لیے ہے، گویا کہ ہم تجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ہماری آنکھیں ہوں۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ تمہارا یہ موقف کئی وجوہ سے غلط ہے۔

پهلی وجه: تمہارا یہ کہنا ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔

دوسری وجه: یہ اجماع سلف کے خلاف ہے۔

تیسری وجه: اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ آنکھ سے مراد صرف رؤیت ہے۔

چوتهی وجه: جب اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لیے آنکھ ثابت کرے اور ہم اس سے رؤیت مراد لیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ وہ اس آنکھ سے دیکھتا ہے، اس وقت آیت میں اس بات کی دلیل ہوگی کہ وہ آنکھ حقیقی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے صفت سمع و بصر کا اثبات

❏ مؤلف نے ان صفات کے اثبات کے لیے سات آیات ذکر کی ہیں:

پهلی آیت: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ﴾ (المجادلة: ۱) ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی التجا سن لی جو آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں جدال کر رہی تھی اور اللہ کے سامنے شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ یقیناً اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

شرح:......[قَدْ]......تحقیق کے لیے ہے۔

مُجَادِلَة: ''جھگڑا کرنے والی، جدل وجدال کرنے والی۔'' اس سے مراد وہ عورت ہے جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے شوہر کی شکایت کرنے لگی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے اس سے ظہار کر لیا تھا۔

ظهار: ظہار یہ ہوتا ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے، یا اس طرح کی کوئی اور بات کہہ دے۔

دور جاہلیت میں ظہار کو طلاق بائنہ سمجھا جاتا تھا، جب اس عورت کے خاوند نے اس سے ظہار کر لیا تو وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کرتے ہوئے کہنے لگی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق بائن دے دی ہے، جبکہ میں اس کے بچوں کی ماں ہوں، وہ ابھی آپ سے مصروف گفتگو ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں اس کے مسئلہ کا حل بتا دیا۔

ان آیات میں شاہد یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ﴾ جس سے اللہ تعالیٰ کے لیے صفت سمع کا اثبات ہو رہا ہے، اور یہ کہ وہ تمام آوازیں سنتا ہے، وہ جس قدر بھی دور اور جس قدر بھی پوشیدہ ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''بابرکت ہے وہ ذات (یا فرمایا: سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں) جس کی سماعت نے تمام

آوازوں کو گھیر رکھا ہے، میں گھر کے ایک کونے میں تھی اور اس کی بعض باتیں مجھے بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

سمع کے اضافت کی قسمیں

اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف سمع کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ سمع بمعنی ادراک الصوت، اس کا تعلق مسموعات کے ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ سمع بمعنی استجابت، اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کرنے والے کی دعا کو قبول فرمالیا ہے۔

سمع بمعنی ادراک الصوت کی اقسام

سمع بمعنی ادراک الصوت کی تین قسمیں ہیں:

الف:......جس سے تہدید مقصود ہوتی ہے۔

ب:......جس سے تائید مقصود ہوتی ہے۔

ج:......جس سے اللہ تعالیٰ کے محیط ہونے کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

۱۔ جس سمع سے مقصود تہدید ہوتی ہے، اس کی مثال یہ ارشاد باری ہے:

﴿اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ﴾ (الزخرف: ۸۰)

''کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان ہم ان کی مخفی باتوں اور سرگوشیوں کو نہیں سن سکتے۔''

نیز یہ ارشاد ربانی:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ﴾ (آل عمران: ۱۸۱)

''یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ فقیر اور ہم غنی ہیں۔''

۲۔ جس سمع سے تائید مقصود ہوتی ہے اس کی مثال یہ قرآنی آیت ہے:

﴿اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی﴾ (طٰہٰ: ٤٦)

''بے شک میں تم دونوں (موسیٰ وہارون) کے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ وہارون کی نصرت وحمایت کرنے کی غرض سے انہیں یہ بتایا کہ وہ ان کے ساتھ ہے، جو کچھ وہ کہیں گے اور جو کچھ ان سے کہا جائے گا وہ اسے سن رہا ہوگا، وہ انہیں بھی دیکھ رہا ہوگا اور جس کی طرف انہیں بھیجا جا رہا ہے اسے بھی۔ وہ کیا کریں گے اور ان کے ساتھ کیا کچھ کیا جائے گا، وہ اسے بھی دیکھ رہا ہوگا۔

۳۔ جس سمع کے ساتھ اس کے محیط ہونے کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اس کی مثال بھی یہ آیت ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَکِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ (المجادلة: ۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے خاوند کے بارے میں آپ سے جدال کر رہی تھی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے شکایت کر رہی تھی۔''

دوسری آیت: ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ (آل عمران : ۱۸۱) ''یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے یہ کہا کہ بے شک اللہ فقیر اور ہم غنی ہیں۔''

شرح: ......[لَقَدْ] .... جملہ مؤکدہ باللام (قد)قسم مقدر ہے، اور تقدیری عبارت اس طرح ہے، واللہ، اس طرح یہ جمع تین مؤکدات کے ساتھ موکدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو فقیر اور اپنے آپ کو غنی کہنے والے ملعون یہودی تھے۔ انہوں نے اسے معیوب قرار دیتے ہوئے فقیر کہنے کی ہرزہ سرائی کی۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ (البقرۃ: ۲۴۵)

''وہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے، پھر اللہ اسے بڑھا کر اس کے لیے کئی گنا کر دے۔''

تو وہ نبی کریم ﷺ سے کہنے لگے: محمد! تمہارا رب فقیر ہو گیا ہے، اب وہ ہم سے قرضہ مانگنے لگا ہے۔

تیسری آیت: ﴿اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (الزخرف: ۸۰) ''کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی مخفی باتوں اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے ہیں، کیوں نہیں، ان کے پاس ہمارے فرشتے لکھتے جاتے ہیں۔''

شرح: ......[اَمْ]....اس جیسی ترکیب میں عربی زبان کے علماء کہتے ہیں کہ یہ معنیٰ (بل) اور ہمزہ کو متضمن ہے، یعنی: (اَمْ يَحْسَبُوْنَ) میں اضراب بھی ہے، اور استفہام بھی، یعنی: بل ایحسبون أنا لا نسمع سرھم ونجواھم.

السِّرّ: راز۔ ساتھی کے ساتھ خفیہ طور پر کی گئی بات۔ جسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ سکے۔

نجویٰ: سرگوشی۔ یہ راز سے قدرے اونچی آواز میں ہوتی ہے، جسے چند لوگ کرتے اور اس پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

نداء: ساتھی کے ساتھ بلند آواز میں کی گئی بات۔ اس طرح کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہوں۔

چونکہ یہ لوگ گناہوں کی باتیں مخفی طور پر کرتے اور ان کے ساتھ سرگوشیاں کیا کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى﴾

[بَلٰى] .... صرف ایجاب ہے، یعنی بلى نسمع . ہم ضرور سنتے ہیں اور اس پر مزید یہ کہ ﴿رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ یعنی ان کے پاس موجود ہمارے فرشتے ان کی مخفی باتیں اور سرگوشیاں لکھتے رہتے ہیں، اس جگہ رسل سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں اولاد آدم کے اعمال لکھنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اسرار و رموز اور ان کی سرگوشیاں سنتا ہے۔

چوتھی آیت: ﴿اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾ (طٰہٰ: ۴۶) ''بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔''

شرح: ......خطاب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے فرماتا ہے: ﴿اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾ یعنی میں تمہاری باتیں بھی سنتا ہوں اور جو باتیں تم سے کی جائیں گی انہیں بھی سنتا ہوں۔ میں تمہیں بھی دیکھتا

ہوں اور اسے بھی جس کی طرف تمہیں بھیجا جا رہا ہے، اسی طرح جو کچھ تم کرو گے اسے بھی دیکھتا ہوں اور اسے بھی جو کچھ تمہارے ساتھ کیا جائے گا۔

یہ اس لیے کہ ان سے بدسلوکی قول کے ساتھ کی جائے گی یا فعل کے ساتھ، اگر قول سے ہوگی تو اللہ اسے سن لے گا اور اگر فعل سے ہوگی تو اللہ اسے دیکھ لے گا۔

پانچویں آیت: ﴿اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰىo﴾ (العلق: ١٤) ''کیا وہ نہیں جانتا کہ یقیناً اللہ دیکھتا ہے؟''

شرح: ......[اَلَمْ يَعْلَمْ] .... میں ضمیر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰىo عَبْدًا اِذَا صَلّٰىo اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓىo اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰىo اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰىo اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰىo﴾ (العلق: ٩۔ ١٤)

''کیا تو نے اس شخص کا حال دیکھا جو بندہ (خاص) کو روکتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیا تو نے دیکھا کہ اگر وہ بندہ حق پر ہو، یا وہ تقویٰ کی ہدایت کر رہا ہو، کیا تو نے دیکھا کہ اگر وہ (دوسرا شخص) جھٹلا رہا ہو یا روگردانی کر رہا ہو، کیا اسے نہیں معلوم کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔''

مفسرین بتاتے ہیں کہ اس شخص سے مراد ابو جہل ہے۔ [1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے صفت رؤیت کا اثبات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف رؤیت کے دو معنی ہیں:

معنی اول: رؤیت بمعنی علم۔

معنی دوم: مبصرات کی رؤیت، یعنی آنکھ کے ساتھ ان کا ادراک کرنا۔

رؤیت بمعنی علم کی مثال قیامت کے بارے میں یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًاo وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًاo﴾ (المعارج: ٦۔٧)

''یقیناً وہ اسے دور دیکھتے ہیں جبکہ ہم اسے قریب دیکھتے ہیں۔''

اس جگہ رؤیت علم کے معنی میں ہے، اس لیے کہ دن ایسا جسم نہیں ہے جیسے دیکھا جا سکے۔ لہٰذا ﴿وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا﴾ کا معنی ہوگا، ہم اسے قریب جانتے ہیں۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى میں رؤیت علم کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور رؤیت بصری کے معنی میں بھی، اور ان دونوں معنوں میں کوئی منافات نہیں ہے، اسے دونوں معنوں پر محمول کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ یہ آدمی کیا کرتا اور کیا کہتا ہے اور وہ اسے دیکھتا بھی ہے۔

چھٹی آیت: ﴿اَلَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُo وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَo اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُo﴾

[1] ملاحظہ ہو: الدر المنثور: ٦/ ٦٢٦.

(الشعراء: ۲۱۸۔ ۲۲۰) ''جو آپ کو جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا رہتا ہے۔''

شرح: ......اس آیت سے قبل کی آیت کے الفاظ ہیں: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝﴾ (الشعراء: ۲۱۷) ''آپ بھروسا رکھیں بڑے قوت والے بڑے رحم والے پر۔'' اس جگہ رؤیت سے مراد رؤیت بصر ہے۔ اس لیے کہ ارشاد ربانی ﴿الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝﴾ کا علم کے معنی میں ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کا علم آپ کے اٹھتے وقت بھی ہوتا ہے اور اس سے قبل بھی۔ نیز ﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝﴾ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس جگہ رؤیت سے مراد رؤیت بصر ہے۔

آیت کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ آپ کو اس وقت بھی دیکھتا ہے جب آپ ﷺ اکیلے نماز کے لیے اٹھتے ہیں اور اس وقت بھی جب آپ ﷺ باجماعت نماز میں نمازیوں کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یعنی جب آپ اٹھتے ہیں تو اس وقت جو اللہ آپ کو دیکھتا ہے وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اس جگہ ضمیر فصل (ھو) حصر کا فائدہ دے رہی ہے، تو کیا یہ اس معنی میں حصر حقیقی ہے کہ محصور فیہ کے علاوہ محصور کا وجود ہی نہیں ہے یا یہ حصر اضافی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک اعتبار سے حصر حقیقی ہے، اور ایک اعتبار سے حصر اضافی، اس لیے کہ اس جگہ (السمیع) سے مراد ایسا وجود ہے جس کی سماعت کامل اور ہر مسموع کی مدرک ہو۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اس اعتبار سے یہ حصر حقیقی ہے، جہاں تک مطلق سمع کا تعلق ہے تو وہ انسان کو بھی حاصل ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝﴾ (الدھر: ۲)

''یقیناً ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا فرمایا تاکہ اسے آزمائیں، پھر ہم نے اسے خوب سننے والا خوب دیکھنے والا بنایا۔''

اسی طرح انسان بھی (علم) ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝﴾ (الذاریات: ۲۸) ''اور انہوں نے اسے علم والے بچے کی بشارت سنائی۔''

لیکن علم کامل اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ آیت میں سمع اور رؤیت کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

ساتویں آیت: ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۰۵) ''اور کہہ دو کہ عمل کرتے رہو، عنقریب دیکھ لے گا اللہ تمہارے عمل کو اور اس کے رسول اور دوسرے مومن بھی۔''

شرح: ......**فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ** کے ضمن میں ابن کثیر رحمہ اللہ اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں: مجاہد کا قول ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے اس کی وعید ہے کہ عنقریب ان کے اعمال اس کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور جنہیں رسول اللہ ﷺ بھی دیکھ لیں گے اور اہل ایمان بھی۔ اور یہ سب کچھ قیامت کے دن



ہو کر رہے گا اور اسے اللہ دنیا میں بھی لوگوں پر ظاہر کرے گا۔

اس جگہ رؤیت، علمی اور بصری دونوں طرح کی رؤیت کو شامل ہے۔

اور آیت میں ان دونوں کا اثبات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و رؤیت پر ایمان لانے کے فوائد

اللہ تعالیٰ کی صفت رؤیت پر ایمان رکھنے سے انسان کے دل میں معصیت کا ارتکاب کرتے وقت اللہ کا ڈر پیدا ہوتا اور اطاعت کرتے وقت اس سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں، اس لیے کہ ہمارا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے وہ ہمارے گناہوں کی ہمیں سزا کرا دے گا اور نیکیوں کے اجر وثواب سے نوازے گا۔

جہاں تک سمع کا تعلق ہے تو چونکہ انسان کا اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ میرا اللہ میری ہر بات سن رہا ہے، لہٰذا وہ وہی بات کرے گا جو اللہ کو پسند آئے اور ہر اس بات سے اجتناب کرے گا جو اسے ناراض کر دے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے صفت مکر وکید اور محال کا اثبات

- مؤلف نے چار آیات میں مندرجہ ذیل قریب المعنی تین صفات ذکر کی ہیں: محال، مکر اور کید۔

محال کے بارے میں **پہلی آیت**: ﴿وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ﴾ ''اور وہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

شرح: ......اس آیت کا دوسرا معنی یہ کیا گیا ہے: ''اور وہ سخت تدبیر کرنے والا ہے۔ اس معنی کی رو سے محال، حیلہ سے ماخوذ ہوگا، جس کا مطلب ہے: دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے حیلہ گری سے کام لینا۔ مؤلف نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ وہ اسے مکر وکید پر مشتمل آیات کے سیاق میں لائے ہیں، مکر کی تفسیر میں علماء فرماتے ہیں: دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے مخفی اسباب اختیار کرنا بایں طور کہ اسے اس کا احساس تک نہ ہو۔

مکر کسی جگہ قابل تعریف ہوتا ہے اور کسی جگہ قابل مذمت، اگر وہ مکر کرنے والے کے مقابلہ میں ہو تو قابل تعریف ہوگا، اس لیے کہ یہ اس امر کا متقاضی ہے کہ آپ اس سے قوی ہیں اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور موقع پر ہو تو قابل مذمت ہوگا اور خیانت کہلائے گا، اس کی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنے آپ کو صرف مقابلہ وتقیید کی صورت میں موصوف کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ (النحل: ۵۰)

''انہوں نے بھی خوب تدبیر کی اور ہم نے بھی اور وہ سمجھ نہیں رہے تھے۔''

﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ﴾ (الانفال: ۳۰) ''وہ بھی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا۔''

اللہ رب العزت کو مکر کے ساتھ علی الاطلاق موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اللہ مکر کرنے والا ہے۔



نہ صبر کے طور پر اور نہ ہی تسمیہ کے طور پر، اسی طرح یوں بھی نہیں کہا جا سکتا کہ: اللہ کائد (مکر کرنے والا) ہے۔ نہ خبر کے انداز میں اور نہ ہی تسمیہ کے انداز میں۔ اور یہ اس لیے کہ جیسا کہ ہم نے ابھی بنایا یہ معنی ایک حالت میں لائق ستائش ہوتا ہے اور دوسری حالت میں لائق مذمت، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی علی الاطلاق موصوف کرنا درست نہیں ہے۔ رہا یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ٥٤) ''اور اللہ خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہت بہتر ہے۔'' تو یہ وصف کمال ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے: "امکر الماکرین" نہیں بلکہ ﴿خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ فرمایا۔ یعنی اس کا مکر صرف خیر ہے۔ لہٰذا اسے ﴿خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ کہنا درست ہے، اسی طرح مقابلہ کے موقع پر بھی اسے مکر سے موصوف کرتے ہوئے یوں کہنا درست ہے: ''اللہ تعالیٰ مکر کرنے والوں کے ساتھ مکر کرتا ہے۔''

مکر کے بارے میں **دوسری آیت:** ﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ٥٤) ''انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

شرح: ...... یہ آیت حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں اتری، جنہیں قتل کرنے کی غرض سے یہودیوں نے خفیہ تدابیر کیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو ناکام بناتے ہوئے انہیں زندہ اوپر اٹھالیا، اور ان میں سے کسی ایک پر ان کی مشابہت ڈال دی اور یہ وہ شخص تھا جس نے انہیں قتل کرنے کی سازش میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، جب یہ شخص حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کے ارادے سے ان کے پاس آیا تو اس وقت انہیں اوپر اٹھا لیا گیا۔ اتنی دیر میں دوسرے لوگ بھی اندر آ گئے، انہوں نے کہا تو عیسیٰ ہے۔ اس نے کہا کہ میں عیسیٰ نہیں ہوں۔ مگر انہوں نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ تو ہی عیسیٰ ہے، اور یہ اس لیے کہ اس پر عیسیٰ بن مریم کی مشابہت ڈال دی گئی تھی، چنانچہ انہوں نے اس آدمی کو قتل کر ڈالا جو عیسیٰ ابن مریم کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر یہاں آیا تھا، اور اس طرح اس کا مکر خود اس کے لیے ہی جان لیوا ثابت ہوا، جس پر اللہ نے فرمایا:

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ٥٤)

''انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور اس نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

مکر کے بارے میں ہی **تیسری آیت:** ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (النمل: ٥٠) ''اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی اور وہ شعور نہیں رکھتے۔''

شرح: ...... حضرت صالح علیہ السلام جس بستی میں رہ کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے تھے اس میں نو بدنصیب آدمی ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے سے کہنے لگے: ﴿تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ﴾ (النمل: ٤٩) ''تم اللہ کی قسمیں اٹھاؤ کہ ہم اس (صالح) پر اور اس کے ساتھیوں پر ضرور شب خون ماریں گے۔''

﴿ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۝﴾ (النمل: ٤٩)

''اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت موجود ہی نہیں تھے اور یقیناً ہم اپنی بات میں سچے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو رات کا انتظار کرنے کے لیے ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے تو غار کا راستہ بند ہوگیا اور وہ اس کے اندر ہی ہلاک ہوگئے...... جبکہ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کوئی گزند نہ پہنچی، اسی کے بارے میں اللہ فرماتا ہے: ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا﴾

مَكْرًا کو دونوں جگہوں میں نکرہ لایا گیا ہے جو کہ تعظیم کے لیے ہے، یعنی انہوں نے بہت بڑا مکر کیا اور ہم نے اس سے بھی بڑا مکر کیا۔

چوتھی آیت کید کے بارے میں: ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًاO وَّاَكِيْدُ كَيْدًاO﴾ (الطارق: ۱۵۔ ۱۶) ''بیشک وہ اپنی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں اپنی کر رہا ہوں۔''

شرح: ......[اِنَّهُمْ] .... یعنی کفار مکہ ﴿يَكِيْدُوْنَ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ﴿كَيْدًا﴾ یعنی وہ لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کی دعوت سے متنفر کرنے کے لیے ایسی ایسی تدبیریں کرتے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی لیکن اللہ تعالیٰ کی تدبیر ان سے کہیں بڑی اور بھاری ہے۔

[وَاَكِيْدُ كَيْدًا].... یعنی میری تدبیر ان کی تدبیروں سے بڑی ہے۔

ان کی ایک تدبیر اور مکر کا اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اس طرح ذکر فرمایا ہے:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾ (الانفال: ۳۰)

''اور جب کافر لوگ تمہارے بارے یہ تدبیریں کر رہے تھے کہ وہ تمہیں قید کر دیں یا قتل کر دیں یا (مکہ سے) نکال دیں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے جان چھڑانے کے لیے کفار مکہ کے سامنے تین تجاویز تھیں۔ [1]

۱۔انہیں قید کر دیا جائے۔ ۲۔قتل کر دیا جائے۔ ۳۔مکہ سے باہر نکال دیا جائے۔

ابلیس لعین کے مشورے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کی رائے کو بہترین رائے قرار دیا گیا، ابلیس نجدی شیخ کے روپ میں ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: قریش مکہ کے دس قبائل سے دس جوانوں کا انتخاب کر کے ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک تلوار دے دو اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ آور ہو کر انہیں بیکبار قتل کر ڈالیں، اس طرح ان دس قبائل میں ان کا خون رائیگاں ہو جائے گا، بنو ہاشم ان جوانوں میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کر سکیں گے اس وقت وہ دیت قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور تمہاری جان اس سے چھوٹ جائے گی۔ اس پر وہ کہنے لگے: یہ رائے بڑی وزنی ہے۔ اور پھر ان کا اس بات پر اتفاق ہوگیا۔ [2] انہوں نے یہ تدبیر کی مگر اللہ کی تدبیر اس سے بہتر ثابت ہوئی، وہ اس طرح کہ مشرکین مکہ اپنے اس مذموم ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان دس سورماؤں کے سروں میں خاک ڈالتے ہوئے بحفاظت اپنے گھر سے باہر نکل گئے۔ اس وقت آپ اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے۔

---

[1] تفسیر در منثور: ۳/ ۳۲٤۔

[2] ملاحظہ فرمائیں: سیرت ابن ھشام: ۱/ ٤۲۷۔ تفسیر در منثور: ۳/ ۳۲٤۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾ (یٰس : ۹)
''اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنادی اوران کے پیچھے بھی، پھر ہم نے ان پر پردہ ڈال دیا پس وہ دیکھ نہیں سکتے۔''

وہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انتظار کرتے رہے اور آپ ﷺ انہیں چیرتے ہوئے کہیں دور نکل گئے اور انہیں پتا بھی نہ چل سکا۔ [1]

دریں حالات یہ کہنا درست ہوگا کہ اللہ کی تدبیران کی تدبیر پر بھاری ثابت ہوئی، اس لیے کہ اس نے ان کے عزائم کو خاک میں ملاتے ہوئے اپنے رسول ﷺ کو ان کے درمیان سے بحفاظت نکال لیا اور آپ سفر ہجرت پر روانہ ہو گئے۔

اس جگہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝﴾ (الطارق : ۱۵۔ ۱۶) اس میں تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کی تدبیران کی تدبیر سے کہیں بڑی تھی۔

اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت ومعاونت کرنے والوں کے لیے اسی طرح تدبیریں کیا کرتا ہے اور انہیں تائید ونصرت سے نوازا کرتا ہے۔ فرمان باری ہے:

﴿كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ﴾ (یوسف : ۷۶) ''اسی طرح ہم نے تدبیر کی یوسف (علیہ السلام) کے لیے۔''

یعنی ہم نے ایسا کام کیا جس سے یوسف اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوگئے اور کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہوا یہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر فضل عظیم ہے کہ وہ اسے اس کے دشمن سے اس قسم کی خفیہ تدبیر کے ساتھ مامون ومحفوظ رکھے۔

مکر، کید اور محال کی تعریف

سوال: مکر وکید اور محال کی تعریف کیا ہے؟

جواب: اہل علم ان کی تعریف یوں کرتے ہیں: دشمن پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے خفیہ تدابیر کرنا۔ ان سے اگر کوئی اچھا فعل مقصود ہو تو یہ محمود ہوتی ہیں۔ بصورت دیگر مذموم۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن ود کو دعوت مبارزت دی، جب وہ میدان میں اترا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ چلا کر کہنے لگے: میں دو آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں نہیں اترا، اس پر عمرو نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ابھی اس نے گردن موڑی ہی تھی کہ انہوں نے اس کی گردن پر اس زور سے تلوار کا وار کیا کہ اس کا سرتن سے جدا ہوگیا۔ [2]

یہ دھوکا ہے، لیکن جائز اور قابل ستائش ہے، اس لیے کہ یہ آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عزت دینے یا مبارکباد پیش کرنے کے لیے میدان میں نہیں اترا تھا وہ انہیں قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تھا، لہٰذا آپ نے اس کے خلاف تدبیر کی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

مکر، کید اور محال اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ میں سے ہیں، جن کے ساتھ اسے علی الاطلاق موصوف کرنا جائز نہیں ہے،

---

[1] محمد بن کعب قرظی سے صحیح سند کے ساتھ مرسل۔ ملاحظہ ہو: السيرة النبوية الصحيحة از ڈاکٹر ضیاء العمری: ۱/ ۲۰۷. مزید دیکھیں: طبقات از ابن سعد: ۱/ ۲۲۸۔

[2] ملاحظہ ہو: سلسلة الاحاديث الضعيفة : ۱/ ۵۷۷۔



اس لیے کہ یہ کبھی قابل تعریف ہوتی ہیں اور کبھی قابل مذمت، قابل تعریف ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسری صورت میں نہیں، مثلاً اس طرح کہا جا سکتا ہے: اللّٰہ خیر الماکرین ''اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے، اللّٰہ ماکر باالماکرین ''اللہ تدبیر کرنے والوں کے ساتھ تدبیر کرتا ہے۔

استہزاء بھی اسی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں علی الاطلاق یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ مذاق کرنے والا ہے، اس لیے کہ استہزاء لہو ولعب کی ایک قسم ہے جو کہ اللہ تعالیٰ سے منفی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾ (الدخان: ۳۸)

''اور ہم نے زمینوں، آسمانوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔''

مگر اس کی طرف سے استہزاء، ایسا کرنے والوں کے مقابلہ میں جائز اور قابل تعریف ہوگا، جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ (البقرة: ۱۵)

''اور منافقین جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ الگ ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق کرنے والے ہیں اللہ ان کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔''

اہل سنت اللہ تعالیٰ کے لیے ان معانی کا اثبات علی سبیل الحقیقہ کرتے ہیں، جبکہ اہل تحریف کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا کسی بھی صورت جائز نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ مشاکلہ لفظیہ کے باب سے ہے۔ ان کا معنی الگ الگ ہے۔ جس طرح کہ ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (المائدة: ۱۱۹) ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے۔'' مگر ہم کہتے ہیں کہ تمہارا یہ موقف ظاہر نص اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔

سوال: ہمارے سامنے خلفاء راشدین میں سے کسی ایک کا کوئی ایسا قول پیش کریں جس میں انہوں نے بتایا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے مکر، کید، استہزاء اور خداع سے ان کے حقیقی معانی مراد ہیں۔

جواب: ان لوگوں نے قرآن پڑھا اور اس پر ایمان لائے، ان کا اس متبادر معنی کو کسی دوسرے معنی کی طرف منتقل نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس معنی کو تسلیم کیا اور اسے باقی رکھا اور یہ اجماع ہے، جس کے بارے میں ہمارے لیے یہی کہنا کافی ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے بھی ظاہر کلام کے خلاف کچھ منقول نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ منقول ہے کہ اس نے رضا کی تفسیر ثواب کے ساتھ اور کید کی سزا کے ساتھ کی ہو۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ تم کہتے ہو کہ اس پر سلف کا اجماع ہے مگر وہ اجماع ہے کہاں؟ اس کا جواب یہ کہ نصوص کے ظاہری مفہوم کے خلاف ان سے کچھ منقول نہ ہونا ہی اجماع کی دلیل ہے۔



ان صفات کے اثبات سے مستفاد امور

صفت مکر پر ایمان رکھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور اور محارم شرعیہ کے خلاف حیلہ جوئی سے باز رہتا ہے، محارم شرعیہ کے خلاف حیلہ جوئی سے کام لینے والوں کو اگر معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ ان سے بہتر اور جلدی تدبیر کرنے والا ہے۔تو وہ یقیناً ایسا کرنے سے باز آ جائیں گے۔

بسا اوقات انسان کوئی ایسا کام کرتا ہے جو بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نظر نہیں آتا مگر وہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں ہوتا۔لہٰذا وہ اس کے ارتکاب سے باز رہتا ہے۔

خرید وفروخت اور دیگر سماجی امور میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

مثلاً ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے قرض کے طور پر دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا ٹھیک ہے، مگر آپ کو اس کے عوض بارہ ہزار روپے واپس کرنا ہوں گے، لیکن چونکہ یہ صریح سود اور حرام ہے، لہٰذا وہ اس سے اجتناب کرے گا، لیکن اگر وہ کوئی چیز ایک سال کے ادھار پر بارہ ہزار روپے میں فروخت کرے اور بائع ومشتری کے درمیان تحریری معاہدہ بھی ہو جائے۔ پھر وہ خریدار سے یہ مطالبہ کرے کہ مجھے یہ چیز نقد کے طور پر دس ہزار روپے میں فروخت کر دے، اور وہ اس قیمت میں اسے فروخت کر دے اور پھر ان کے درمیان اس حوالے سے تحریری معاہدہ بھی ہو جائے۔

تو بظاہر یہ بیع درست ہے مگر یہ حیلہ ہے، جب اس شخص کو معلوم ہوا کہ اس کے لیے دس ہزار کے عوض بارہ ہزار لینے جائز نہیں ہیں تو اس نے ایک چیز بارہ ہزار میں ادھار فروخت کر کے اسے دس ہزار نقد میں خرید لیا۔

کبھی کوئی انسان حیلہ جوئی پر مبنی اس قسم کے معاملات کو تسلسل کے ساتھ اپنائے رکھتا ہے، اس لیے کہ لوگوں کو ان میں کوئی قابل اعتراض چیز نظر آتی مگر وہ عند اللہ اس کے محارم کے خلاف حیلہ ہوتا ہے، کبھی کبھی اللہ اس قسم کے ظالم کی رسی دراز کر دیتا ہے مگر جب پکڑنے پر آتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں، سود خوری کی وجہ سے اس کے مال وزر میں اضافہ ہو سکتا ہے مگر اس کا انجام غربت وافلاس کی صورت میں سامنے آتا ہے، لوگوں میں یہ جملہ بڑا مشہور ہے کہ حیلہ جوئی میں زندگی گزارنے والا فقیر ہو کر مرتا ہے۔ نکاح وطلاق کے امور میں حیلہ سازی کی مثال عصر حاضر میں مروجہ نکاح حلالہ ہے، مثلاً ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اب وہ شرعاً اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی نہ کرے اور وہ اسے از خود طلاق نہ دے دے۔ مگر اس کے پاس اس کا کوئی دوست آیا اور اس کے ساتھ اس شرط پر نکاح کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ جماع کرنے کے بعد اسے طلاق دے دے گا۔ اور پھر اس نے اس کے ساتھ شب بسری کے بعد اسے طلاق دے دی۔ جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو پہلے شوہر نے اس کے ساتھ دوبارہ شادی کر لی۔ اب بظاہر تو یہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو گئی لیکن درحقیقت حلال نہیں ہوئی اس لیے کہ یہ حیلہ ہے۔

جب ہمیں معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ خیر الماکرین ہے اور وہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے تو ہم محارم شرعیہ کے خلاف حیلہ جوئی سے کوسوں دور رہیں گے۔



صفت عفو، مغفرت، رحمت، عزت اور قدرت

❑ مؤلف نے ان صفات کے اثبات کے ضمن میں چار قرآنی آیات ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا﴾ (النساء: ١٤٩)

''اگر تم بھلائی ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا برائی سے درگزر کرو، تو یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والا، بہت قدرت والا ہے۔''

شرح: ......یعنی اگر تم لوگوں کے سامنے نیکی کرو یا اسے ان سے چھپا کر کرو، وہ اللہ کے علم میں ہے اور اس پر کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنْ تُبْدُوا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (الاحزاب: ٥٤)

''تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا اس کو مخفی رکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا بخوبی علم ہے۔''

مگر یہ سمجھنے کے لیے غور وفکر سے کام لینا ضروری ہے۔

[أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ] .... عفو کا معنی ہے سزا سے درگزر کرنا۔ اگر کسی شخص نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی اور آپ نے درگزر سے کام لیا۔ تو آپ کا یہ طرز عمل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، لیکن درگزر سے کام لینے والے کی تعریف اس امر سے مشروط ہے کہ اس کا یہ عمل اصلاح احوال کے ساتھ مربوط ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ (الشوریٰ: ٤٠) ''پس جو شخص درگزر سے کام لے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔''

یہ اس لیے کہ کبھی عفو و درگزر سرکشی اور زیادتی میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے اور کبھی اس سے باز آ جانے کا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے زیادتی کرنے والے کے رویے میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی۔

١۔ اگر درگزر سے کام لینا سرکشی میں اضافہ کا سبب بنتا ہو تو اس موقع پر وہ قابل مذمت ٹھہرے گا اور کبھی اس سے روکا بھی جا سکے گا۔ مثلاً ہم ایک مجرم کو معاف کر رہے ہیں اور ہمیں معلوم ہے یا ظن غالب یہ ہے کہ اگر ہم نے اسے معاف کیا تو وہ اس سے بھی بڑے جرم کا ارتکاب کرے گا، تو اس موقعہ پر درگزر سے کام لینے والی کی ستائش نہیں بلکہ اس کی مذمت کی جائے گی۔

٢۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عفو و درگزر سے کام لینا جرم وزیادتی سے رک جانے کا سبب بن جاتا ہے، بایں طور کہ مجرم شرمسار ہوتا ہے اور اس بات کا عہد کرتا ہے کہ جس شخص نے میرے بارے میں عفو وگزر سے کام لیا ہے میں نہ صرف یہ کہ دوبارہ اس پر زیادتی نہیں کروں گا، بلکہ کسی دوسرے پر بھی نہیں کروں گا، تو اس جگہ عفو ودرگزر سے کام لینا قابل ستائش بھی ہوگا اور مطلوب بھی اور کبھی واجب بھی۔

٣۔ کبھی عفو ودرگزر سے کام لینا غیر مؤثر ثابت ہوتا ہے اور اس سے زیادتی کرنے والے کے رویے میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی۔ ایسے میں عفو ودرگزر سے کام لینا بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی﴾ (البقرۃ: ۲۳۷) ''اور اگر تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

اور اس جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَوۡ تُخۡفُوۡہُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا﴾ یعنی اگر تم برائی سے درگزر کرو گے تو اللہ تم سے درگزر فرمائے گا۔ یہ حکم اس جواب سے ماخوذ ہے: ﴿فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا﴾ یعنی وہ تم سے بدلہ لینے کی بھرپور طاقت رکھنے کے باوجود تم سے درگزر فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ عفو اور قدیر کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے، اس لیے کہ عفو کا کمال یہ ہے کہ وہ قدرت کے باوجود ہو، بے بسی کی وجہ سے معاف کرنے والا لائق ستائش نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ انتقام لینے سے قاصر ہے، عفو کامل یہ ہے کہ انسان بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود درگزر سے کام لے۔ عفو اور قدیر کو ایک جگہ پر ذکر کرنے کی یہی وجہ ہے۔

العفو: اپنے بندوں کے گناہوں سے درگزر کرنے والا۔ عام طور پر عفو کا تعلق ترک واجبات کے ساتھ اور مغفرت کا ارتکاب محرمات کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

القدیر: قدرت والا، قدرت ایسی صفت ہے جس کی وجہ سے فاعل بے بسی کے بغیر فعل کی سرانجام دہی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ آیت صفت عفو اور قدرت کو متضمن ہے۔

دوسری آیت مغفرت اور رحمت کے بارے میں: ﴿وَلۡیَعۡفُوۡا وَلۡیَصۡفَحُوۡا اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾ (النور: ۲۲) ''انہیں معاف کر دینا اور درگزر سے کام لینا چاہیے کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے ہو کہ اللہ تمہیں بخش دے؟''

شرح: ...... یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ کے بیٹے تھے اور یہ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان تراشی اور ناروا جسارت کی۔

واقعۂ افک [1] کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ کچھ منافقین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عزت و آبرو کو پامال کرنے کے لیے زبان درازی کی، جس سے درحقیقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر کو داغدار کرنا اور آپ کو رسوا کرنا چاہتے تھے۔ والعیاذ باللہ۔ جبکہ اللہ نے انہیں رسوا کر دیا۔ اور فرمایا:

﴿وَالَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَہٗ مِنۡہُمۡ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ﴾ (النور: ۱۱)

''اور ان میں سے جس نے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگانے والوں کی اکثریت منافقین پر مشتمل تھی جبکہ چند ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس سازش کا شکار ہو گئے جو تقویٰ وصلاح میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ ان لوگوں میں مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان تراشی کے حوالے سے لب کشائی کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ وہ آئندہ کے لیے ان

[1] واقعہ افک کو صحیح بخاری: ۴۷۵۷۔ ۴۷۵۸ اور صحیح مسلم: ۲۷۷۰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔



پر اپنا مال خرچ نہیں کریں گے، یاد رہے کہ ان کے جملہ اخراجات سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی جیب سے پورے فرمایا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا﴾ (النور: ۲۲)

''اور نہ قسمیں اٹھائیں تم میں سے مال والے اور وسعت والے یہ کہ وہ خرچ نہیں کریں گے قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے والوں پر انہیں معاف کر دینا اور درگزر سے کام لینا چاہیے۔''

یہ تمام اوصاف حضرت مسطح رضی اللہ عنہ میں پائے جاتے تھے، آپ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے قرابت دار بھی تھے، مسکین بھی تھے اور مہاجر فی سبیل اللہ بھی۔

﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (النور: ۲۲)

''کیا تم یہ پسند نہیں کرتے ہو کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

یہ سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں اللہ کی قسم ہمیں یہ پسند ہے کہ اللہ ہمیں بخش دے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے مسطح کے اخراجات بحال کر دیئے۔

یہ تو اس آیت کا شان نزول تھا۔ اب ہم اس کی تفسیر کی طرف آتے ہیں:

[وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا] ..... یہ لام، لام امر ہے، اور اس کے ساکن ہونے کی وجہ اس کا واؤ کے بعد آنا ہے۔ نحوی قاعدہ کی رو سے واؤ کے بعد لام امر ساکن ہوتی ہے۔ جیسے کہ اس جگہ ہے۔ اسی طرح وہ (فاء) اور (ثم) کے بعد بھی ساکن ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ﴾ (الطلاق: ۷)

''اور جس شخص کی روزی اس پر تنگ کر دی گئی ہو تو وہ خرچ کرے اس سے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ﴾ (الحج: ۲۹) ''پھر انہیں اپنی میل کچیل دور کرنی چاہیے۔''

لام کا یہ حکم اس کے لام امر ہونے کی صورت میں ہے، اور اگر وہ لام تعلیل ہو تو پھر ساکن نہیں بلکہ مکسور ہوگی۔ اگرچہ ان حروف کے بعد ہی کیوں نہ آئے۔

[وَلْيَعْفُوا]..... یعنی گناہ کی سزا دینے سے درگزر کریں۔

[وَلْيَصْفَحُوا] ..... یعنی وہ اس بات سے اعراض کریں اور اس بارے گفتگو سے بھی پرہیز کریں، یہ صفحة العنق سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے: گردن کی جانب، انسان جب اعراض کرتا ہے تو اس وقت اس کی گردن کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ عفو اور صفح میں فرق یہ ہے کہ انسان کبھی معاف تو کر دیتا ہے مگر اس بات کو بھولتا نہیں بلکہ اس زیادتی اور بدسلوکی کو وقتاً

فوقتاً یاد کرتا رہتا ہے۔اس اعتبار سے صفح مجرد عفو سے زیادہ بلیغ ہے۔

[اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ] .... (الا) پیش کش کرنے کے لیے ہے، اور اس کا جواب ہے: کیوں نہیں، ہمیں یہ بات پسند ہے۔

[وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ] .... (غفور) یا تو مبالغہ کے لیے اسم فاعل ہے یا صفت مشبہ۔دوسری صورت میں یہ صفت لازم ثابت پر دلالت کرتی ہے جو کہ صفت مشبّہ کا تقاضا ہے، جبکہ پہلی صورت میں یہ صیغہ تکثیر کی طرف محول ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑی کثرت کے ساتھ معاف فرمایا کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ صیغہ دونوں چیزوں کا جامع ہے، یہ صفت مشبّہ بھی ہے، اس لیے کہ مغفرت اللہ تعالیٰ کی دائمی صفت ہے، نیز یہ ایسا فعل بھی ہے جو اس کی طرف سے بکثرت واقع ہوا کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی مغفرت کس قدر زیادہ اور کس قدر باعظمت ہے۔

[رَحِيْـــمٌ] .... یہ بھی اسم فاعل اور مبالغہ کے صیغہ کی طرف محول ہے، رحم سے اسم فاعل تو رحیم آتا ہے، مگر رحمت باری تعالیٰ کی کثرت ووسعت اور مرحومین کی کثرت کی وجہ سے اسے مبالغہ کے صیغہ رحیم میں تحویل کر دیا گیا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان دونوں اسموں کو ایک ساتھ ذکر کیا اس لیے کہ یہ دونوں ملتے جلتے معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ مغفرت باری تعالیٰ مکروب اور گناہ کے آثار کے زوال کا پیغام لے کر جبکہ رحمت ایزدی حصول مطلوب کی بشارت لے کر آتی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: ''تو میری رحمت ہے میں تیرے ساتھ جس پر چاہوں گا رحم کروں گا۔''[1]

تیسری آیت عزت کے بارے میں: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (المنافقون: ۸) ''اور اللہ کے لیے ہے عزت اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے۔''

یہ آیت منافقوں کے اس قول کے جواب میں نازل ہوئی: ﴿لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ (المنافقون: ۸) ''اگر ہم مدینہ واپس لوٹے تو اس سے عزت والا ذلیل کو ضرور باہر نکال دے گا۔'' وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ہم معزز ہیں جبکہ محمد ﷺ اور مومنین ذلیل ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ بڑے باعزت ہونا تو بڑی دور کی بات ہے ان کی تو میرے نزدیک سرے سے ہی کوئی عزت ہی نہیں ہے عزت تو اللہ کے لیے ہے، اس کے رسول کے لیے ہے اور مومنین کے لیے ہے۔

منافقین کے قول کا اصل مقتضی یہ ہے کہ رسول ﷺ اور اہل ایمان ہی وہ لوگ ہیں جو انہیں مدینہ سے نکال باہر کریں گے اس لیے کہ معزز وہ ہیں نہ کہ منافقین، وہ تو ذلیل ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر زور دار آواز کو اپنے اوپر ٹوٹنے والی آفت خیال کرتے ہیں، ان کے ڈرپوک اور بزدل ہونے کا یہ عالم ہے کہ مومنوں کے سامنے جاتے ہیں تو اپنے مومن ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور اپنے جیسے منافق شیطانوں کے پاس جاتے ہیں تو انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم صرف مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔اور یہ ذلت کی انتہا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: ۴۸۵۰۔ صحیح مسلم: ۲۸۴۵ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔



جہاں تک مومنوں کا تعلق ہے تو وہ اپنے دین کی وجہ سے باعزت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: ٦٤)

''پس اگر وہ پھر جائیں تو تم کہہ دو کہ تم گواہ ہو جاؤ کہ بیشک ہم مسلمان ہیں۔''

وہ اپنے مسلمان ہونے کا کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے عزت کا اثبات ہو رہا ہے۔

عزت کی اقسام

اہل علم بتاتے ہیں کہ عزت کی تین قسمیں ہیں: عزت قدر، عزت قہر اور عزت امتناع۔

۱۔ **عزت قدر:** اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ رب العزت بڑی قدر و منزلت والا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

۲۔ **عزت قهر:** اسے غلبہ کی عزت بھی کہتے ہیں، یعنی اللہ ہر چیز پر غالب اور ہر چیز پر زبردست ہے۔ یہ ارشاد باری اسی معنی میں ہے: ﴿وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ﴾ (ص: ٢٣) یعنی گفتگو میں مجھ پر غالب آ گیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ غالب ہے اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا بلکہ وہ ہر شے پر غالب ہے۔

۳۔ **عزت امتناع:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی نقص لاحق نہیں ہو سکتا، یہ قوت و صلابت سے ماخوذ ہے۔ اسی سے عربوں کا یہ قول ہے: أرض عزاز . یعنی سخت زمین۔

یہ عزت کے وہ معانی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہے جو اس کے کمال قہر و سلطان، کمال صفات اور پورے طور پر ہر نقص سے منزہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

[وَلِرَسُولِهِ وَ لِلْمُؤْمِنِينَ] ...... یعنی عزت رسول ﷺ کے لیے ہے، نیز اہل ایمان کے لیے ہے۔ اس امر سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ جس عزت کا اثبات اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ اور اہل ایمان کے لیے کیا ہے وہ اللہ کی عزت جیسی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسے کمزوری بھی لاحق ہو سکتی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (آل عمران: ١٢٣)

''اور یقیناً اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جبکہ تم کمزور تھے۔''

وہ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر کسی حکمت کی وجہ سے کبھی مغلوب بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً انہیں جنگ احد میں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو سکا، اور غزوہ حنین میں بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوئے۔ [1] جو کہ عزت میں کمی کی مظہر ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی عزت میں کمی آنا کبھی بھی ممکن نہیں ہے۔

الغرض! جس عزت کا اثبات اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور اہل ایمان کے لیے کیا ہے وہ اس عزت جیسی نہیں ہے جس کا اثبات اس نے اپنی ذات کے لیے کیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیں: فتح الباری: ٢٩/٨.

اور یہ بات اس قاعدہ عامہ سے ماخوذ ہے کہ اسماء کے اتفاق سے نہ تو مسمیات کا تماثل لازم آتا ہے اور نہ ہی صفات کے اتفاق سے موصوفین میں تماثل لازم آتا ہے۔

چوتھی آیت: یہ عزت کے بارے میں ہے: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (ص : ۸۲) ''مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔''

اس جگہ (باء) قسم کے لیے ہے، ابلیس نے دیگر صفات سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی، اس لیے کہ یہ مقام ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کا تھا، گویا کہ اس نے یہ کہا کہ مجھے تیری اس عزت کی قسم جس کی وجہ سے تجھے ساری مخلوق پر غلبہ حاصل ہے میں اولاد آدم کو گمراہ کروں گا اور ان پر غلبہ حاصل کروں گا، یہاں تک کہ وہ رشد و ہدایت کو ترک کر کے گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مگر اس سے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے مستثنیٰ ہیں، شیطان انہیں گمراہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ (الحجر : ٤٢) ''تجھے میرے بندوں پر کوئی غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔''

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے صفت عزت کا اثبات ہے۔

دوسری آیت میں اس امر کا اثبات ہے کہ شیطان بھی صفات باری تعالیٰ کا اقرار کرتا ہے، دریں حالات ایسا کیوں ہے کہ اولاد آدم میں سے کچھ لوگ تمام صفات باری تعالیٰ یا ان میں سے بعض کا انکار کرتے ہیں؟ کیا ایسا تو نہیں کہ شیطان ان منکرین صفات سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ عقل رکھتا ہے؟

ان صفات سے مستفاد امور

جب ہمیں معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ درگزر سے کام لینے والا بھی ہے اور قادر مطلق بھی، تو ہمارا یہ عقیدہ ہم پر اس امر کو واجب قرار دے گا کہ ہم اس سے ہمیشہ عفو و کرم کے خواستگار رہیں، اور اس سے یہ اُمید رکھیں کہ وہ ہم سے سرزد ہونے والی تقصیرات سے درگزر فرمائے گا۔

اسی طرح جب ہمارا اللہ تعالیٰ کے عزیز و غالب ہونے پر ایمان ہوگا تو ہمارے لیے کوئی ایسا کام کرنا ممکن نہیں رہے گا جس کی وجہ سے ہم اس کے خلاف جنگ کرنے کے مرتکب ہوں۔

مثلاً: سودی لین دین کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ رویہ محاربہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (البقرہ : ۲۷۹) ''پھر اگر تم نہیں رکتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے خبر دار ہو جاؤ۔'' جب ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ عزت والا ہے۔ اور وہ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا تو ہمارے لیے اللہ کے ساتھ محاربہ کے لیے پیش قدمی کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

اسی طرح ڈاکہ زنی بھی محاربہ ہے۔

﴿إِنَّمَا جَزَاؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ

تُقَطَّعَ اَيْدِيهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ (المائدہ: ۳۳)

''ان لوگوں کی سزا جو اللہ اوراس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کریں، یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ یا سولی دے دی جائے یا مخالف طرف سے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک سے نکال دیا جائے۔''

جب ہمیں معلوم ہوگا کہ ڈاکہ زنی اللہ سے جنگ کرنا ہے اور یہ کہ عزت اللہ کے لیے ہے تو ہم اس عمل سے باز آ جائیں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی غالب ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے وصف عزت پر ایمان لانے سے یہ درس بھی ملتا ہے کہ صاحب ایمان شخص کو اپنے دین میں ٹھوس ہونا چاہیے اور کوئی کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو اس کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، ہاں اہل ایمان کے ساتھ اس کا رویہ ملائمت اور نرمی پر مبنی ہونا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے اسم کا اثبات

❑ مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے لیے اسم کے اثبات کی دلیل کے طور پر ایک آیت ذکر کی ہے جبکہ اس کی تنزیہ اور تمثیل کی نفی کے لیے متعدد آیات لائے ہیں۔

اثبات اسم کی قرآنی دلیل:

﴿تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾ (الرحمن: ۷۸)

''تیرے رب کا نام بابرکت ہے جو جلال اور عزت والا ہے۔''

شرح: ......[تَبَارَكَ]......علماء فرماتے ہیں: اگر برکت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے: وہ باعظمت و برتر ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ (المومنون: ۱٤)

''بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

اگر اس کے ساتھ اللہ کے اسم کو صوف کیا جائے تو پھر اس کا معنی ہوگا: برکت اللہ کے نام سے ہوتی ہے۔ یعنی جس چیز کے ساتھ اللہ کا نام آ جائے اس میں برکت ہو جاتی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں آتا ہے: ''جس بھی اہم کام کا آغاز اللہ کے نام کے ساتھ نہ ہو وہ بے برکت ہوتا ہے۔''[1]

---

[1] مسند امام احمد (بتحقیق احمد شاکر): ۸٦۹۷۔ صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان بتحقیق شعیب الأرناؤوط: ۱/۱۷۳۔ ارواء الغلیل: ۱، ۲۰۱.

اگر جانور کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ حرام اور مردار ہو جاتا ہے۔ حلال، طیب و طاہر اور مردار، نجس اور خبیث میں بہت فرق ہے۔

اگر انسان وضو یا غسل جنابت کرتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو اسے طہارت حاصل ہو جاتی ہے اور اگر نہ پڑھے تو ایک قول کی رو سے اسے طہارت حاصل نہیں ہوتی۔

اگر انسان کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو شیطان اس کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتا اور اگر نہ پڑھے تو وہ کھانا کھانے میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔

اگر انسان وظیفہ زوجیت ادا کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہوئے یہ دعا پڑھ لے: ((اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا .)) ''میرے اللہ! ہمیں شیطان سے دور رکھ اور جو تو ہمیں رزق دے اس سے شیطان کو دور رکھ۔''[1] پھر اگر ان کے مقدر میں اولاد ہو تو اسے شیطان کبھی بھی ضرر نہیں پہنچائے گا اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی اولاد شیطانی ضرر کا نشانہ بن جاتی ہے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس جگہ (تبارك) برتر اور باعظمت ہونے کے معنی میں نہیں بلکہ اس معنی میں ہے: کہ اللہ کے نام سے برکت پیدا ہوتی ہے، یعنی جب کسی چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے تو وہ اس کے لیے باعث برکت ہوتا ہے۔

[ذِیْ الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ] ....(ذی) صاحب کے معنی میں ہے اور یہ (اسم) کی نہیں بلکہ (رب) کی صفت ہے اگر یہ (اسم) کی صفت ہوتا تو پھر (ذی) نہیں بلکہ ''ذو'' ہوتا۔

[الْجَلَالِ].... عظمت کے معنی میں ہے، یعنی وہ فی نفسہ عظیم ہے۔

[وَالْاِکْـرَامِ] .... تکریم کے معنی میں ہے، یعنی اس کی عظمت مومنین کے دلوں میں ہے۔ وہ اس کی تکریم کرتے ہیں اور وہ اہل ایمان کی تکریم کرتا ہے۔

اللہ کی تنزیہ اور اس سے نفی مثل کے بارے میں صفات منفیہ پر مشتمل آیات

پہلی آیت: ﴿فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّاo﴾ (مریم: ٦٥) ''اسی کی عبادت کریں اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہیں، کیا تم اس کے کسی ہم نام کو جانتے ہو؟''

شرح:...... یہاں سے مؤلف صفات سلبیہ یا صفات نفی کا آغاز کرتے ہیں۔

ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ صفات باری تعالیٰ ثبوتیہ بھی ہیں اور سلبیہ یعنی منفیہ بھی، اس لیے کہ کمال اثبات و نفی کے بغیر متحقق نہیں ہوتا، یعنی کمالات کا اثبات اور نقائص کی نفی۔

---

[1] صحیح بخاری: ٣٢٧١۔ صحیح مسلم: ١٤٣٤۔

[فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ] .... (فا) قبل ازیں کے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ (مریم: ٦٥) پر متفرع ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا ذکر کیا اور پھر اس پر اپنی عبادت کے وجوب کو متفرع فرمایا، اس لیے کہ ربوبیت کا اقرار کرنے والے پر الوہیت وعبودیت کا اقرار کرنا لازم ہو جاتا ہے، بصورت دیگر تناقض لازم آئے گا۔

[فَاعْبُدْهُ] .... یعنی از راہ تعظیم ومحبت اس کے سامنے عاجزی وانکساری کا اظہار کریں، عبادت سے مراد متعبد بہ بھی ہوتا ہے۔ اور تعبد بھی جو کہ عبد کے فعل سے عبارت ہے۔

[وَ اصْطَبِرْ] .... اصل میں اصتبر تھا، علت تصریفی کی وجہ سے تاء کو طاء میں تبدیل کر دیا گیا۔ الصبر: حبس نفس سے عبارت ہے۔ کلمہ (اصطبر) (اصبر) سے زیادہ بلیغ ہے، اس لیے کہ وہ مشقت پر دلالت کرتا ہے۔

یعنی صبر کیجئے اگر چہ وہ آپ کو ناگوار ہی گزرے، اور اس طرح ثابت قدم رہیں جس طرح میدان جنگ میں ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ ثابت قدم رہتا ہے۔

[لِعِبَادَتِهٖ] .... لام (علی) کے معنی میں ہے، یعنی عبادت پر صبر کیجئے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طٰہٰ: ١٣٢) ''اپنے گھر والوں کو نماز کی تلقین کریں اور اس پر صبر کریں۔'' ایک دوسرے قول کی رو سے لام اپنے اصل پر ہی ہے۔ یعنی عبادت کے لیے صبر کریں۔

[هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا] .... (ھل) استفہام کے لیے ہے اور اس میں تحدی کے معنی کی آمیزش ہے، یعنی اگر تم سچے ہو تو پھر بتاؤ۔ ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ ''کیا تم اس کے کسی ہم نام کو جانتے ہو؟'' سمی: شبیہ اور نظیر سے عبارت ہے، یعنی کیا تم کسی ایسی نظیر کو جانتے ہو جو اس کے نام جیسا استحقاق رکھتی ہو؟

اس کا جواب نفی میں ہے۔

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ میں ذکر کردہ صفت کا شمار صفات سلبیہ میں ہوتا ہے۔

سوال: آپ قبل ازیں کہہ چکے ہیں کہ صفات سلبیہ ثبوت کو متضمن ہوتی ہیں۔ اس جگہ نفی کون سے ثبوت کو متضمن ہے؟

جواب: اس جگہ نفی کمال مطلق کو متضمن ہے، اس طرح آیت کا معنی ہوگا: کیا تم اس کے کمال مطلق کی وجہ سے جس میں کوئی بھی اس جیسا نہیں ہے اس کے کسی ہم نام کو جانتے ہو؟

دوسری آیت: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص: ٤) ''اور اس کا کوئی بھی ہمسر نہیں ہے۔''

شرح: ...... چونکہ نکرہ سیاق نفی میں ہے لہٰذا عام ہے۔

[كُفُوًا] .... اس میں تین قراءات ہیں: كُفُوًا، كُفْأً اور كُفُؤًا. اگر یہ ہمزہ کے ساتھ ہو تو فاء ساکن ہوگی یا مضموم اور اگر واؤ کے ساتھ ہو تو پھر واؤ مضموم ہوگی اور بس۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی کا پتا چلتا ہے جو اسے واو کے ساتھ بھی (فاء) کی تسکین کے ساتھ (كُفْوًا) پڑھتے ہیں۔

اس آیت میں بھی اللہ کے کفو (ہمسر) کی نفی ہے اور یہ اس کی صفات کے کمال کی وجہ سے ہے، پس کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ نہ علم وقدرت ہیں، نہ سمع وبصر میں، نہ عزت وحکمت میں اور نہ ہی اس کی دیگر صفات میں۔

تیسری آیت: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۲) ''اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ جبکہ تم جانتے بھی ہو۔''

شرح:...... یہ قبل ازیں کے اس ارشاد باری پر متفرع ہے:

﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَo الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۱-۲۲)

''اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعے سے تمہارے لیے پھلوں سے رزق نکالا۔''

جو کہ توحید ربوبیت پر مشتمل ہے۔ پھر فرمایا: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی الوہیت میں اللہ کے شریک نہ بناؤ۔ اس لیے کہ تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی شریک نہیں، جب تم یہ بات جانتے ہو تو پھر اپنے علم کے خلاف اس کے شریک اس لیے کہ جن لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے وہ ربوبیت میں اللہ کے شریک نہیں بناتے تھے۔ چنانچہ اس کا معنی ہوگا: جس طرح تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی طرح الوہیت میں بھی کسی کو اس کا شریک نہیں بناؤ۔

[اَنْدَادًا] .... (ند) کی جمع ہے۔ کسی چیز کی ند وہ شے ہوتی ہے جو اس کی ہمسر اور اس کے مشابہ ہو۔ عرب کہتے ہیں: هذا ند له یعنی یہ اس کا مقابل اور ہمسر ہے۔

[وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ] .... یعنی (وانتم تعلمون انه لا ندله) ''اور تمہیں علم ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں۔'' یہ جملہ حالیہ ہے اور ذوالحال (لا تجعلوا) کی واؤ ہے، جبکہ اس کا مفعول محذوف ہے۔ اس جگہ جملہ حالیہ، صفت کاشفہ ہے جو کہ حکم کی تعلیل جیسی ہوتی ہے گویا کہ فرمایا گیا: اللہ کے شریک نہ بناؤ کس طرح بناتے ہو؟

یہ صفت بھی سلبیہ ہے جو کہ ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ سے مفہوم ہے۔ یعنی اس کے شریک مت بناؤ اس لیے کہ اس کی کمال صفات کی وجہ سے اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں۔

چوتھی آیت: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ: ۱۶۵)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ اوروں کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت رکھتے ہیں۔''

شرح:...... [وَمِنَ] .... مِنْ تبعیضیہ ہے، اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کی جگہ لفظ (بعض) لایا جا سکتا ہے۔ یعنی: بعض



الناس.

[مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا] .... یعنی وہ محبت میں انہیں اللہ کے شریک بناتے ہیں، جیسا کہ اللہ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ انداد سے مراد محبت سے عام چیز ہے، یعنی وہ اللہ کے ایسے شریک بناتے ہیں جن کی وہ اس طرح عبادت کرتے ہیں جس طرح اللہ کی عبادت کرتے ہیں، ان کے لیے اس طرح نذر مانتے ہیں جس طرح اللہ کے لیے نذر مانتے ہیں، اس لیے کہ وہ ان سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں۔

غیر اللہ کے ساتھ اللہ جیسی محبت کرنا شرك فی المحبة کہلاتا ہے۔

اس کا انطباق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو اللہ جیسی محبت رسول اللہ کے ساتھ کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے ایسی محبت کرنا ضروری ہے جو اللہ سے محبت جیسی نہ ہو، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہے۔ پھر جو لوگ اللہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا؟

آگے بڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور اللہ کے لیے محبت میں فرق سمجھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ غیر اللہ سے اللہ جیسی یا اس سے زیادہ محبت کریں، یہ شرک ہے اور اللہ کے لیے محبت کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کی محبت کے تابع رہ کر کسی چیز سے محبت کریں۔

ان آیات سے مستفاد اُمور

ان آیات سے ہم مندرجہ ذیل فوائد حاصل کر سکتے ہیں:

اولاً: جب ہمیں معلوم ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ موصوف ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اس کی تعظیم و توقیر کریں گے، اور جب ہمارا اس بات پر یقین ہوگا کہ اللہ عزوجل اکرام کے ساتھ موصوف ہے تو ہم اس سے اس کے فضل و کرم کی امید رکھیں گے، اور اس کی کما حقہ تعظیم وتوقیر بجا لائیں گے۔

ثانیاً: ارشاد ربانی: ﴿فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ﴾ سے یہ سلوکی فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ بندہ اپنے رب کی بندگی کا فریضہ ادا کرے اور اس کے لیے ثابت قدم رہے اس دوران نہ اسے اکتاہٹ محسوس ہو اور نہ تھکاوٹ، قرآنی آیات: ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ (مریم: ٦٥)، ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص: ٤) اور ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (البقرة: ٢٢) میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کی گئی ہے، ان آیات کے مطالعہ سے انسان دلی طور پر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص وعیب سے منزہ ہے، نہ کوئی اس کا مثیل ہے اور نہ کوئی شریک۔ اس احساس کے بعد انسان بقدر استطاعت حق تعالیٰ کی تعظیم وتوقیر کرنے لگ جاتا ہے۔

رابعاً: ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (البقرة: ١٦٥) سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ ایک انسان کی کسی دوسرے انسان کے ساتھ اللہ جیسی محبت نہیں ہونی چاہیے۔

پانچویں آیت: ﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ

وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴾ (الاسراء: ۱۱۱) ''اور کہہ دو کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور بادشاہت میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ ہی ناتوانی سے بچنے کے لیے اسے کسی حمایتی کی ضرورت ہے اور اس کی بڑائی بیان کرتے رہو جس طرح کہ بڑائی بیان کرنے کا حق ہے۔''

شرح: ......[قُلِ].... اس جیسے مواقع پر خطاب یا تو خاص رسول اللہ ﷺ سے ہوتا ہے یا ہر اس شخص سے جس کے ساتھ خطاب کرنا درست ہو۔ اگر تو خطاب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہو تو وہ قصد اول کے طور پر آپ کے ساتھ خاص ہوتا ہے اور آپ کی امت آپ کے تابع ہوتی ہے۔

اگر یہ عام ہو تو قصد اول کے طور پر رسول اللہ ﷺ اور دوسروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

[اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ] .... اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے، اور یہ کہ حمد، محبت اور تعظیم کے ساتھ محمود کو کمال کے ساتھ موصوف کرنے سے عبارت ہے۔

[لِلّٰهِ] .... اس جگہ (لام) استحقاق اور اختصاص کے لیے ہے۔

استحقاق کے لیے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جاتی ہے اور وہ لائق حمد وثناء ہے، اور اختصاص کے لیے اس طرح کہ جس حمد کے ساتھ اللہ کی حمد بیان کی جاتی ہے وہ اس حمد جیسی نہیں ہوتی جس کے ساتھ اس کے غیر کی حمد بیان کی جاتی ہے، اللہ کی حمد کامل ترین، عظیم ترین ہوتی ہے۔ زیادہ عام اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔

[اَلَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا] .... اس کا شمار صفات سلبیہ میں ہوتا ہے، اس نے کسی کو اپنی اولاد اس لیے نہیں بنایا کہ اس کی صفات درجہ کمال کی ہیں اور اس کی غیروں سے بے نیازی بھی ایسی ہی ہے، نیز اس لیے بھی کہ وہ بے مثل و بے مثال ہے، اگر اس کی اولاد ہوتی تو وہ اس کی مثل ہوتی اگر اس کی اولاد ہوتی تو وہ اس کا محتاج ہوتا اگر اس کی اولاد ہوتی تو وہ ناقص ہوتا، اس لیے کہ اس کی مخلوق سے کسی کا اس کے مشابہ ہونا نقص ہے اور وہ نقص سے مبرّا ہے۔

[وَلَدًا].... یہ مذکر ومونث کو شامل ہے اور اس میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین کا رد ہے۔

یہودیوں نے عزیر کو اللہ کی اولاد قرار دیا۔

نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی اولاد قرار دیا۔ اور مشرکین نے کہا کہ فرشتے اللہ کی اولاد ہیں۔

[وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ] .... یہ ارشاد ربانی ﴿لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ پر معطوف ہے۔ یعنی وہ اللہ جس کا اس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں، نہ خلق میں، نہ ملک میں اور نہ تدبیر میں۔

اللہ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی مخلوق ہے اور اس کی ملکیت میں ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے اس کی تدبیر کرتا ہے اور اس بارے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ﴾

(سبا: ۲۲)

''کہہ دیجئے! انہیں بلاؤ جن کو تم اللہ کے علاوہ معبود خیال کرتے ہو، وہ کسی چیز کے ذرہ برابر بھی مالک نہیں ہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔''

یعنی معین صورت میں: ﴿وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ﴾ (سباء: ۲۲) ''اور ان میں ان کی کوئی شراکت بھی نہیں ہے۔'' یعنی عمومی صورت میں: ﴿وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ﴾ (سباء: ۲۲) ''اور نہ ان میں سے اس کا کوئی مددگار ہے۔'' آسمانوں اور زمین میں ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کی مدد نہیں کی۔ ﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ﴾ (سباء: ۲۳) ''اور اس کے ہاں شفاعت نفع نہیں دیتی مگر جسے وہ اجازت دے۔'' اس طرح وہ جملہ اسباب منقطع ہو گئے جن کے ساتھ مشرکین اپنے جھوٹے معبودوں کے بارے میں وابستگی اختیار کیے ہوئے تھے۔

[وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ] ..... اس جگہ (من) تعلیل کے لیے ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ○﴾ (یونس: ٦٢۔ ٦٣)

''خبردار! یقیناً جو اللہ کے دوست ہیں، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔''

اللہ تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں فرماتا ہے: ''جس نے میرے ولی سے عداوت رکھی میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔''[1] اس جگہ جس ولی کی نفی کی گئی ہے وہ وہ ہے جو اسے عاجزی و ناتوانی سے بچائے۔ اور یہ اس لیے کہ اللہ ناتواں نہیں ہے، ساری قوتیں اسی کے پاس ہیں، کمال عزت کی وجہ سے اسے کسی بھی طرح سے ناتوانی لاحق نہیں ہو سکتی۔

[وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا] ..... یعنی اپنی زبان اور دیگر جوارح سے اللہ کی بڑائی بیان کریں اور دل میں بھی یہ اعتقاد رکھیں کہ وہ ہر چیز سے بڑا ہے، اور یہ کہ آسمانوں اور زمین میں اسی کی بڑائی ہے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا معمول یہ تھا کہ وہ اوپر چڑھتے وقت اللہ کی بڑائی بیان کرتے۔[2] ایسا حالت سفر میں ہوتا اور یہ اس لیے کہ اوپر چڑھتے وقت انسان کے دل میں دوسروں پر برتری کا خیال آ سکتا ہے، لہٰذا برتری کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے (اللہ اکبر) پڑھنا چاہیے۔

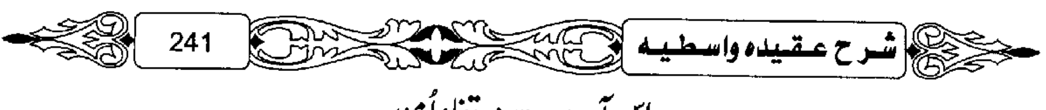
اسی طرح وہ نیچے اترتے وقت (سبحان اللہ) پڑھا کرتے، اس لیے کہ نزول پستی ہے، ایسے میں بندہ سبحان اللہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو اس پستی سے منزہ بتاتا ہے۔

[تَكْبِيْرًا] ..... یہ مصدر موکد ہے اور اس سے مقصود تعظیم ہے، یعنی کبرہ تکبیرا عظیما ''اس کی تکبیر عظیم بیان کریں۔''

---

[1] صحیح بخاری: ٦٥٠٢ عن ابی هریرة رضی اللہ عنه.

[2] صحیح بخاری: ۲۹۹۳ عن جابر رضی اللہ عنه.



اس آیت سے مستفاد اُمور

انسان کو یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ کل کائنات کا اکیلا ہی مالک ہے اور وہ باعزت وسلطان ہے، نیز یہ کہ وہ جس طرح صفات کمال پر لائق ستائش ہے، اسی طرح نقائص وعیوب سے منزہ ہونے کی وجہ سے بھی قابل حمد وستائش ہے۔

چھٹی آیت: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (التغابن: ۱) ''تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

شرح: ......[يُسَبِّحُ] ......یعنی ہر چیز نقص اور عیب کی ہر ہر صفت سے اسے منزہ بیان کرتی ہے۔ (سبح) متعدی بنفسہا بھی ہوتا ہے اور متعدی باللام بھی۔

متعدی بنفسہا ہونے کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ (الفتح: ۹) ''اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کرو۔'' جبکہ متعدی باللام ہونے کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، وہ تمام سورتیں جن کا آغاز (سبح) سے ہوتا ہے وہاں یہ متعدی باللام ہی ہے۔

﴿وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ یہ عام ہے، لہٰذا ہر شے کو شامل ہے۔

تسبیح کی دو قسمیں ہیں: تسبیح بزبان مقال اور تسبیح بزبان حال۔

تسبیح بزبان حال، تسبیح کی یہ قسم عام ہے۔ ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (الاسراء: ٤٤) ''ہر چیز اس کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے۔''

تسبیح بزبان مقال یہ بھی عام ہے مگر اس سے کفار خارج ہیں، اس لیے کہ وہ زبان سے اللہ کی تسبیح بیان نہیں کرتے، اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (الحشر: ۲۳) ''پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔'' ﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (الصافات: ۱۵۹) ''پاک ہے اللہ اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔'' کفار ومشرکین اللہ کی تسبیح بیان نہیں کرتے اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے اور اس کا وصف اس چیز کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہے۔

تسبیح بزبان حال کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں موجود ہر شے کی حالت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عبث اور نقص سے پاک ہے، حتیٰ کہ اگر غور کیا جائے تو کافر کی حالت بھی اللہ تعالیٰ کے ہر نقص اور عیب سے منزہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ تسبیح بزبان مقال کا مطلب زبان سے سبحان اللہ پڑھنا ہے۔

﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ یہ آخری صفات، صفات ثبوتیہ ہیں، اور ان کا مفہوم پہلے بتایا جا چکا ہے۔ مگر (يسبح لله) صفت سلبیہ ہے، اس لیے کہ اس کا معنی ہے: اللہ کو ان چیزوں سے منزہ قرار دینا جو اس کے

شایاں نہیں ہیں۔

ساتویں اور **آٹھویں آیت**: ﴿تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا﴾ (الفرقان: ۱۔۲) ''بابرکت ہے وہ ذات جس نے فرقان کو اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ سب جہانوں کو ڈرانے والا بن جائے، وہ جس کی بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین میں، اور اس نے اولاد نہیں بنائی۔ اور نہ ہی بادشاہت میں اس کا کوئی شریک ہے، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کا ٹھیک اندازہ لگایا۔''

شرح:......[تَبَارَكَ]...... بمعنی: تعالیٰ وتعاظم ''وہ اعلیٰ و برتر اور باعظمت ہے۔''

[الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ]...... فرقان کو نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

[الْفُرْقَانَ]..... اس سے مراد قرآن ہے، اس لیے کہ وہ حق و باطل، کافر و مسلم، نیک و بد، ضار و نافع وغیرہا میں خط امتیاز کھینچنے والا ہے، قرآن سارے کا سارا فرقان ہے۔

[عَلٰی عَبْدِهٖ]..... عبد سے مراد محمد ﷺ ہیں، آپ پر تنزیل قرآن کی بات کرتے وقت آپ علیہ السلام کی عبودیت کا ذکر کرنا نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ ترین مقام کی نشاندہی کرتا ہے، ایک دوسرے مقام پر یہی انداز اختیار کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ (الکھف: ۱)

''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری۔''

اسی طرح آپ ﷺ کا دفاع کرتے اور مخالفین قرآن کو چیلنج کرتے وقت بھی آپ کی عبودیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا﴾ (البقرۃ: ۲۳) ''اور اگر تم اس چیز سے شک میں ہو جسے ہم نے اپنے بندے پر اتارا۔''

اسی طرح معراج کے ساتھ آپ کی تکریم کے موقع پر فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (الاسراء: ۱)

''پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کروائی اپنے بندے کو مسجد حرام سے۔''

اور سورۂ نجم میں فرمایا:

﴿فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی ۝﴾ (النجم: ۱۰) ''پھر اس نے وحی بھیجی اپنے بندے کی طرف جو بھی بھیجی۔''

یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبودیت کے ساتھ موصوف کرنا درجہ کامل میں شمار ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت ہی آزادی کی حقیقت ہے۔ جو اللہ کی عبادت نہیں کرتا وہ غیر اللہ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے کی ذلت سے دوچار ہوتا ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [1]

[1] الكافية الشافية لابن القيم بشرح ابن عيسى : ۲/ ٤٦٦.

هَرَبُوْا مِنَ الرِّقِّ الَّذِیْ خُلِقُوْا لَهُ وَبُلُوْا بِرِقِّ النَّفْسِ وَالشَّیْطَانِ

''انہیں جس غلامی کے لیے پیدا کیا گیا تھا اس سے راہ فرار اختیار کر گئے اور نفس اور شیطان کی غلامی میں جکڑ دیئے گئے۔''

لوگوں کو جس غلامی کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت وبندگی ہے، لوگ اس غلامی سے بھاگے اور اپنے نفوس اور شیطان کے غلام بن گئے، جو بھی انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی سے جان چھڑاتا ہے وہ اپنی خواہشات اور شیطان کی عبودیت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ﴾ (الجاثیة: ۲۳)

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، اور اللہ نے اسے علم کی بنیاد پر گمراہ کر دیا ہے۔''

[لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا]..... اس جگہ لام تعلیل کے لیے ہے اور (لیکون) میں ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لیے کہ ان کا ذکر زیادہ قریب ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿لِتُنْذِرَ بِهٖ﴾ (الاعراف: ۲) ''تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں۔'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (الانعام: ۱۹) ''تاکہ میں اس قرآن کے ساتھ تمہیں بھی ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے۔''

منذر: نبی کریم ﷺ کی ذات ہے۔

[لِلْعٰلَمِیْنَ]..... جن وانس کو شامل ہے۔

[الَّذِیْ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ]..... اس کا معنی قبل ازیں گزر چکا ہے۔

[وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهُ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ] ..... ان دونوں صفات کے معنی گزر چکے ہیں، یہ دونوں سلبی صفات ہیں۔

[وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا] ..... خلق: کسی چیز کو خاص انداز میں ایجاد کرنا۔ تقدیر برابر کرنے کے معنی میں ہے، یا ازل میں قضاء کے معنی میں، مگر پہلا معنی زیادہ صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری ہے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی﴾ (الاعلیٰ: ۲) ''جس نے پیدا کیا پھر برابر کیا۔''

ان آیات سے مستفاد امور

ہم پر اللہ کی عظمت سے آگاہ ہونا اور اسے ہر نقص وعیب سے منزہ قرار دینا واجب ہے، اس طرح اللہ کے ساتھ ہماری محبت میں اضافہ ہوگا اور ہم پہلے سے زیادہ اس کی تعظیم وتوقیر کرنے لگیں گے۔

سورۃ الفرقان کی ان دو آیتوں سے قرآن عظیم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، قرآن مرجع عباد ہے اگر کوئی انسان امور کی حقیقت سے آگاہ ہونے کا متمنی ہو تو اسے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اس لیے کہ اسے اللہ نے فرقان کے نام سے



موسوم کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ﴾ (الفرقان : ۱)

تربیتی حوالے سے ہم یہ استفادہ کر سکتے ہیں کہ چونکہ محمد ﷺ اللہ کے بندۂ خاص ہیں، لہٰذا ہم آپ کے ساتھ اپنی محبت کو یقینی بنائیں اور اس میں دن بہ دن اضافہ کرتے چلے جائیں۔

نیز چونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے آخری رسول ہیں، لہٰذا آپ کے بعد نبوت کے کسی بھی دعویٰ کی ہرگز ہرگز تصدیق نہ کریں۔ اس لیے کہ آپ سب جہانوں کے رسول ہیں۔ اگر آپ کے بعد کسی نے رسول ہونا ہوتا تو آپ کی رسالت اس کی آمد پر ختم ہو جاتی اور اس طرح آپ سب لوگوں کے رسول نہ رہتے۔

نویں اور **دسویں آیت:** ﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○﴾ (المومنون: ۹۱۔۹۲) ''اللہ نے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، تب لے جاتا ہر معبود اس کو جو اس نے پیدا کیا ہوتا اور ضرور ان کا ایک دوسرے پر غالب آ جاتا، اللہ پاک ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں، وہ جاننے والا ہے۔ غیب اور ظاہر کو، پس وہ بلند ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔''

شرح: ......اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے لیے اولاد بنانے یا اپنے ساتھ کسی اور کے الٰہ ہونے کی نفی فرما رہا ہے، اس نفی کی تاکید (وَلَدٍ) اور (اِلٰـهٍ) پر (من) کے داخل ہونے سے ہو رہی ہے، اس لیے کہ نفی کے سیاق میں حرف جر کی زیادتی تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔

[مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ].... یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اپنی اولاد کے طور پر پسند نہیں کیا، نہ عزیر کو، نہ مسیح کو، نہ ملائکہ کو اور نہ ہی کسی اور کو، اس لیے کہ وہ سب سے بے نیاز ہے۔

جب اس نے کسی کو اولاد بنانے کی نفی کر دی تو اس سے اس کے باپ ہونے کی نفی بطریق ہوگی۔

[مِنْ اِلٰهٍ] ....اله بمعنی مالوہ ہے، جس طرح بناء بمعنی مبنی اور فراش بمعنی مفروش ہے، اسی طرح الفه بمعنی مالوہ ہے، یعنی معبود جس کے سامنے عاجزی وانکساری کی جائے۔ یعنی اللہ کے ساتھ کوئی حقیقی الٰہ نہیں ہے، جہاں تک معبودان باطلہ کا تعلق ہے تو وہ موجود تو ہیں مگر چونکہ باطل ہیں لہٰذا کالعدم ہیں، لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔

[اِذًا].... یعنی اگر اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہوتا تو اس صورت میں ﴿لَذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ہر ایک کے لیے اپنا اپنا ملک خاص ہوتا اور جس نے جو پیدا کیا ہوتا وہ اس کے ساتھ منفرد ہوتا، ایک کہتا کہ یہ میری مخلوق ہے اور دوسرا کہتا کہ یہ میری ہے۔

اس صورت میں ہر کوئی دوسرے پر غالب آنا چاہتا، اب اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہوتی وہ دو حال سے خالی نہ ہوتی۔ یا تو دونوں برابر رہتے اور دونوں ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے سے عاجز و بے بس رہتے۔ پھر جب ان میں سے ہر

ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے سے عاجز آ جاتا تو ان میں سے کسی کا بھی الٰہ ہونا صحیح نہ ہوتا، اس لیے کہ الٰہ عاجز نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہوتی کہ ان میں سے ایک دوسرے پر غالب آ جاتا اور پھر غالب آنے والا الٰہ قرار پاتا۔ دریں حالات ضروری ٹھہرتا ہے کہ کائنات کا ایک ہی الٰہ ہو اور پوری کائنات کا نظام چلانے پر اکیلا ہی قادر ہو۔

جب ہم کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صدور ایک ہی مدبر سے ہوا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ تناقض کا شکار ہوتی۔ مثلاً ایک الٰہ کہتا کہ میں مغرب کی طرف سے سورج چڑھانا چاہتا ہوں اور دوسرا کہتا کہ میں اسے مشرق سے چڑھانا چاہتا ہوں، ظاہر ہے دونوں کے ارادوں کا متفق ہونا بڑا بعید ہوتا اور ہر ایک اپنی رائے دوسرے پر تھونپنا چاہتا۔

ہمارے مشاہدے میں کبھی ایسا نہیں آیا کہ سورج کبھی ادھر سے طلوع ہوا ہو اور کبھی ادھر سے یا کسی دن تاخیر سے طلوع ہوا ہو، اس لیے کہ دوسرے نے اسے بروقت طلوع ہونے سے روک دیا ہے یا وہ وقت سے پہلے طلوع ہو گیا ہو، اس لیے کہ پہلے نے دوسرے کو اسے اسی وقت طلوع کرانے کا حکم دیا ہے۔

کل کائنات میں وحدت اور تناسق وتناسب ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مدبر ایک ہے اور وہ ہے اللہ جل جلالہ۔

اللہ تعالیٰ نے عقلی دلیل کے ساتھ اس بات کو واضح فرما دیا کہ تعدد الٰہۃ کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔

سوال: کیا ان کا کسی ایک بات پر متفق ہو جانا اور ہر ایک کا اپنی اپنی مخلوق کے ساتھ منفرد ہونا ممکن نہیں ہے؟

جواب: اگر ایسا ممکن ہوتا اور واقعی ایسا ہو بھی جاتا تو اس سے کائنات کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ پھر ان کا کسی بات پر متفق ہونا صرف اس بات کا نتیجہ ہوتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ڈر رہے تھے۔ اس صورت میں ان میں سے کوئی ایک بھی ربوبیت کے قابل نہ ہوتا۔

[سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ].... یعنی اللہ اس چیز سے منزہ ہے، جس کے ساتھ ملحدین اور مشرکین اس کا وصف بیان کرتے ہیں اور اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں جو اس کے شایان نہیں ہیں۔

[عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ].... غیب وہ چیز ہوتی ہے جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو اور شہادت وہ جو لوگوں کے مشاہدہ میں ہو۔

[فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ] .... یعنی وہ ان بتوں سے برتر ومنزہ ہے جنہیں مشرکین نے اللہ کے ساتھ معبود بنا رکھا ہے۔ ان دو آیات میں مندرجہ ذیل صفات نفی کا ذکر ہے:

اللہ تعالیٰ کا اولاد سے منزہ ہونا۔

الوہیت میں شریک سے منزہ ہونا۔

اور یہ نفی اس کے کمال غنی اور کمال ربوبیت والوہیت کی وجہ سے ہے۔

گیارھویں آیت: ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٧٤) ''اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو، بیشک اللہ جانتا ہے جبکہ تم نہیں جانتے۔''

شرح:......یعنی اللہ کے لیے مثالیں مت بناؤ۔ مثلاً یہ کہنا کہ اللہ کی مثال یہ ہے یا عبارت میں کسی کو اس کا شریک بنانا۔
[اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ]..... یعنی اللہ جانتا ہے کہ وہ بے مثل ہے، اس کی کوئی مثال نہیں، اور اس نے یہ بات تمہیں بھی بتائی ہے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔'' ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ٥﴾ (الاخلاص: ٤) ''اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔'' اور ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا٥﴾ ''کیا آپ اس کا کوئی ہم نام جانتے ہیں؟'' اور ان جیسی دیگر آیات۔ پس اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

ہمارے نقص علم کی یہی دلیل کافی ہے کہ کسی کو یہ تک علم نہیں ہے کہ اسے آئندہ دن کیا کرنا ہے۔

﴿وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ (لقمان: ۳۵) ''اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کچھ کمائے گا۔''

اور یہ کہ انسان اس روح کی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں ہے جو اس کے پہلوؤں میں موجود ہے۔

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا٥﴾

(الاسراء: ۸۵)

''اور وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیں کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔''

سوال: آپ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥﴾ (النحل: ۷٤) اور ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۲) ''اللہ کے شریک مت بناؤ اور تم جانتے ہو۔'' میں کس طرح تطبیق دیں گے؟ پہلی آیت میں لوگوں کے لیے علم کی نفی اور دوسری میں اس کا اثبات ہے۔

جواب: ثانی الذکر آیت میں اللہ تعالیٰ ان مشرکین سے مخاطب ہے جو کہ عبادت و الوہیت میں اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ اللہ نے ان سے فرمایا: ﴿وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی تمہیں معلوم ہے کہ ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ٥ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥﴾ (البقرۃ: ۲۱-۲۲)

''اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعے سے تمہارے لیے پھلوں سے رزق نکالا۔ پس تم اللہ کے شریک نہ بناؤ اور تم جانتے ہو۔''

مگر اس جگہ صفات کے باب میں ارشاد ہوا ہے: ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ ''اللہ کی مثالیں مت بیان مت کرو۔'' مثلاً: اللہ کا ہاتھ فلاں چیز کے ہاتھ جیسا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے لیے علم کا اثبات باب ربوبیت کے ساتھ خاص ہے، جبکہ اس کی نفی باب الوہیت کے ساتھ خاص ہے، اس حیثیت سے کہ انہوں نے اس میں اللہ کے شریک بنائے اور اس طرح جاہل کے مقام پر اتر آئے۔ یہ آیت کمال کے حوالے سے کمال صفات باری تعالیٰ کو متضمن ہے اور وہ یوں کہ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔ اس آیت سے جو مسلکی فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں کامل طور پر رب تعالیٰ کی تعظیم و توقیر کرنی چاہیے، اس لیے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اس کا کوئی مثیل نہیں تو ہم ازراہ خوف ورجاء اس کے ساتھ تعلقات استوار کریں گے اور اس کی تعظیم بجا لائیں گے اور ہمیں علم ہو جائے گا کہ کسی بھی سلطان، بادشاہ، رئیس یا وزیر کا اس سے مماثل ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان کی بادشاہت، ریاست یا وزارت کی عظمت جیسی بھی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی بھی مثیل نہیں ہے۔

بارھویں آیت: ﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف: ۳۳) ”فرما دیجئے! میرے رب نے صرف فواحش کو حرام کیا، ظاہر کو بھی اور باطن کو بھی اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اور یہ کہ کہو تم اللہ کے بارے میں جو کچھ تم نہیں جانتے ہو۔“

شرح:......[قُلْ]......خطاب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہو رہا ہے، یعنی لوگوں کے سامنے اعلان فرما دیجئے۔

[اِنَّمَا]...... حصر کے لیے ہے۔

[حَرَّمَ] ...... بمعنی: منع، اس مادہ کا اصل (ح، ر، م) منع کرنے پر دلالت کرتا ہے، اسی سے حریم البئر ہے یعنی کنویں کو ناجائز تصرف سے محفوظ رکھنے والی زمین۔

[الْفَوَاحِشَ]...... فاحشۃ کی جمع ہے، بے حیائی والے کام، مثلاً زنا اور لواطت وغیرہ۔

زنا کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً﴾ (الاسراء: ۳۲) ”زنا کے قریب بھی مت جاؤ بے شک یہ بے حیائی کا کام ہے۔“ اور قوم لوط کے متعلق فرمایا کہ لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ﴿اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ﴾ (الاعراف: ۸۰) اور زنا کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ انسان اس عورت سے شادی کر لے جو اس کے لیے جائز نہیں جیسے رضاع، مصاہرت وغیرہ۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا وَ سَآءَ سَبِیْلًا﴾ (النساء: ۲۲) ”اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں مگر جو کچھ پہلے ہو چکا، بے شک وہ بے حیائی اور ناراضی کا کام ہے اور بہت برا طریقہ ہے“ بلکہ یہ کام تو زنا سے بھی زیادہ سنگین ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تین برائیاں گنوائی ہیں جبکہ زنا کی دو۔

[مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ] ...... اس کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے: جس قول وفعل کی قباحت ظاہر ہو یا مخفی، دوسرا معنی یہ کیا گیا ہے: جن فواحش کا ارتکاب لوگوں کے سامنے کیا جائے یا ان سے چھپ کر۔ یہ فاعل کے فعل کے اعتبار سے نہ کہ عمل کے اعتبار سے۔



[وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ] ..... یعنی اللہ نے گناہ اور بدون حق زیادتی کو بھی حرام کیا ہے۔

[اَلْبَغْیِ]..... لوگوں پر زیادتی کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ (الشوریٰ: ٤٢) ''الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں بغیر حق کے زیادتی کرتے ہیں۔''

[اَلْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ] ..... میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر زیادتی بدون حق ہوتی ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ زیادتی کی دو قسمیں ہیں: حق کے ساتھ زیادتی اور بدون حق زیادتی۔

اس بناء پر یہ وصف، وصف کاشف کے باب سے ہے، جسے علماء صفت کاشفہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جو کہ اپنے موصوف کے لیے تعلیل کا حکم رکھتی ہے۔

[وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا] ..... یہ جملہ گزشتہ جملہ پر معطوف ہے، یعنی میرے رب نے اس بات کو بھی حرام کیا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔

سلطان، حجت کے معنیٰ میں ہے، حجت کو سلطان سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معاشرہ قوت حاصل کرتا ہے۔ ﴿بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ یہ قید بھی کاشف ہے، اس لیے کہ کسی بھی مشرک کے پاس شرک کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

[وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ]..... یعنی اس نے تم پر یہ بھی حرام کیا ہے کہ تم اللہ کے بارے میں وہ بات کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ وہ بات اس کی ذات کے بارے میں ہو، اسماء وصفات کے بارے میں ہو یا اس کے افعال واحکام کے بارے میں۔

یہ پانچ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہم پر حرام قرار دیا ہے۔

اس میں ان مشرکین کی تردید ہے، جنہوں نے ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا جنہیں اللہ نے حرام نہیں فرمایا تھا۔

سوال: اس آیت میں صفت سلبیہ کہاں ہے؟

جواب: اس ارشاد ربانی میں: ﴿وَ اَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یہ دونوں صفات سلبیہ کے قبیل سے ہیں۔ ﴿وَ اَنْ تُشْرِکُوْا﴾ یعنی اللہ کے کمال کی وجہ سے کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ ﴿وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اسی طرح اس کے کمال کی وجہ سے اس کے بارے میں لاعلمی پر مبنی بات مت کرو۔ اس آیت سے تربیتی سلوکی فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم ان پانچ امور سے اجتناب کریں جن کے حرام ہونے کی اللہ نے صراحت فرمائی ہے۔

اہل علم فرماتے ہیں: ان پانچ امور کے حرام ہونے پر جملہ شرائع کا اجماع ہے۔

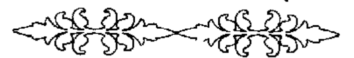
اللہ تعالیٰ کے بارے میں لاعلمی پر مبنی بات کرنے میں اسماء وصفات پر مشتمل کتاب وسنت کی نصوص میں تحریف کرنا بھی داخل ہے۔ اس لیے کہ نصوص صفات میں تحریف کرنے والا دو طرح سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بات کرتا ہے جس کا



اسے علم نہیں ہوتا۔

۱۔ وہ بدون علم ظاہر کی نفی کرتا ہے۔

۲۔ بدون دلیل اس کے خلاف کا اثبات کرتا ہے۔



اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا

❑ مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کا اثبات کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا سات مقامات میں ذکر آیا ہے:

پہلا مقام: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (الاعراف : ٥٤) ''بیشک تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔ پھر مستوی ہوا عرش پر۔''

شرح:......[اللّٰهُ]..... (اِنَّ) کی خبر ہے۔

[خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ]..... یعنی وہ آسمانوں اور زمین کو بڑی مضبوطی کے ساتھ عدم سے وجود میں لایا۔

[فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ]..... ان دنوں کی مدت ہمارے دنوں جتنی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر نکرہ کے طور پر کیا ہے۔ لہٰذا انہیں معروف معنیً پر ہی محمول کیا جائے گا۔

ان ایام کا آغاز اتوار کے دن سے اور اختتام جمعہ کے دن پر ہوا۔

ان میں سے چار دن زمین کے لیے صرف ہوئے اور دو دن آسمان کے لیے۔ اس کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِیْنَ○﴾ (فصلت : ۹۔ ۱۰)

''پوچھیں کہ کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور تم بتوں کو اس کے شریک بناتے ہو، یہ رب ہے تمام جہانوں کا، اور اسی نے اس میں اس کے اوپر سے پہاڑ بنائے اور اس میں برکت رکھ دی اور مقدر کیا اس میں اس کا سامان معیشت چار دنوں میں جو یکساں ہے سب سوال کرنے والوں کے لیے۔''

اس جگہ چار دنوں کی وضاحت موجود ہے۔ آگے چل کر فرمایا:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ○ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾ (فصلت : ۱۱۔۱۲)

''پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف اور وہ دھواں ہی دھواں تھا اور فرمایا اس سے اور زمین سے کہ تم دونوں خوشی خوشی آؤ یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا: ہم آتے ہیں خوشی خوشی، پھر مکمل کیا انہیں سات آسمان دو دنوں میں۔''

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (ثم) ترتیب کے لیے ہے۔

[اسْتَوٰی].... علا کے معنی میں ہے: ''وہ بلند ہوا۔''

عرش کے لغوی معنی

[الْعَرْشِ].... عرش سے مراد مخلوقات کا احاطہ کرنے والی چھت ہے، ہم عرش کے مادہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ سے کوئی ایسی صحیح حدیث مروی نہیں ہے جس سے ہمیں اس بارے میں کوئی ہی حاصل ہو سکتی ہو۔ البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ عرش الٰہی رب تعالیٰ کی کل مخلوقات سے بڑا ہے۔

اصل کے اعتبار سے عربی زبان میں عرش سے مراد بادشاہ کا تخت ہوتا ہے، اور یہ سبھی کے علم میں ہے کہ تخت شاہی اس قدر عظیم الشان ہوتا ہے کہ اس کی اور کہیں نظیر نہیں ملتی۔

اہل سنت کا ایمان ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عرش پر مستوی ہے اور یہ استواء اس کے شایان شان ہے اور یہ مخلوق کے استواء کے مماثل ہرگز نہیں ہے۔

الاستواء کی تفسیر سلف کے نزدیک

اہل سنت کے نزدیک استواء کا معنی علو اور استقرار ہے۔

علمائے سلف سے استواء کی تفسیر میں چار معانی وارد ہیں: علا، ارتفع، صعد اور استقر، بلند ہونا، قرار پکڑنا پہلے تینوں کلمات ایک ہی معنی میں ہیں جبکہ استقر کا معنی ان سے مختلف ہے۔ یعنی قرار پکڑنا۔

اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اگر استوی (علی) کے ساتھ متعدی ہو تو وہ جملہ استعمالات میں اسی معنی میں آتا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَی الْفُلْكِ﴾ (المومنون : ۲۸)

''پھر جب بیٹھ جائے تو اور وہ جو تیرے ساتھ ہیں کشتی پر۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ٥ لِتَسْتَوُوْا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ﴾ (الزخرف : ۱۲۔ ۱۳)

''اور بنائی ہیں تمہارے لیے کشتیاں اور چوپائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تا کہ تم برابر ہو کر بیٹھو ان کی پشتوں پر، پھر جب تم ان پر ٹھیک ہو کر بیٹھ جاؤ تو اپنے رب کا احسان یاد کرو۔''



اہل تعطیل کے نزدیک الاستواء کی تفسیر

جبکہ اہل تعطیل کے نزدیک استواء سے مراد استیلاء (غلبہ) ہے۔

انہوں نے اس تحریف کے لیے دلیل موجب اور دلیل سالب سے استدلال کیا ہے۔

دلیل موجب کے طور پر وہ شاعر کا یہ قول پیش کرتے ہیں:

قَدِ اسْتَوَی بِشْرٌ عَلَی الْعِرَاقِ   مِنْ غَیْرِ سَیْفٍ أَوْ دَمٍ مِهْرَاقِ

''بشر بن مروان تلوار استعمال کیے بغیر اور خون بہائے بغیر عراق پر غالب آ گیا۔''

اہل تعطیل کے دلائل

وہ کہتے ہیں کہ اس جگہ استوی (استولی) کے معنی میں ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اس جگہ استوٰی علی العراق کا غلب علی العراق کے معنی میں ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

رہی دلیل سلبی، تو ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم تمہارے معنی کی رو سے یہ ثابت کریں کہ اللہ عرش پر مستوی ہے تو اس سے اس کا عرش کا محتاج ہونا لازم آئے گا اور یہ مستحیل ہے اور لازم کا استحالہ ملزوم کے استحالہ پر دلالت کرتا ہے۔

پھر اس سے اس کا مجسم ہونا بھی لازم آئے گا، اس لیے کہ کسی چیز کا کسی دوسری چیز پر استواء یعنی علو یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ جسم ہے۔

پھر اس سے اس کا محدود ہونا بھی لازم آئے گا، اس لیے کہ جو کسی چیز پر مستوی ہوتا ہے وہ محدود ہوتا ہے، جب آپ اونٹ پر مستوی ہوں گے تو آپ ایک معین علاقہ میں محدود ہوں گے اور محدود چیز پر ہوں گے۔

معطلہ کے دلائل کا ردّ

مگر معطلہ کے اس موقف کی تردید کئی وجوہ سے ممکن ہے۔

اولاً: تمہاری یہ تفسیر سلف کی اس تفسیر کے مخالف ہے جس پر ان کا اجماع ہو چکا ہے اور اس اجماع کی دلیل یہ ہے کہ ان سے ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ظاہر کی مخالفت کرتے ہوئے کوئی دوسرا موقف اختیار کیا ہو، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ استوی (استولیٰ) کے معنی میں ہے۔

ثانیاً: تمہاری یہ تفسیر ظاہر لفظ کے مخالف ہے اس لیے کہ استواء کا مادہ جب (علیٰ) کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو علو اور استقرار کے معنی میں ہوتا ہے، وہ قرآن اور کلام عرب میں اس طرح اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ثالثاً: اس پر کئی لوازم باطلہ لازم آتے ہیں:

۱۔ مثلاً: تمہاری اس تفسیر سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا، اس وقت وہ عرش پر غالب نہیں تھا، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ٥٤)



''اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر عرش پر مستوی ہوا۔''
(ثُمَّ) ترتیب کا فائدہ دیتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ آسمانوں اور زمین کے تخلیقی عمل کی تکمیل سے پہلے عرش غیر اللہ کے پاس تھا۔

۲۔ لوازم باطلہ میں سے یہ بات بھی ہے کہ ہمارا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ زمین، درختوں اور پہاڑوں پر مستوی ہے، اس لیے کہ اس کا ان چیزوں پر غلبہ ہے۔

یہ لوازم باطلہ ہیں، اور لازم کا بطلان ملزوم کے بطلان پر دلالت کرتا ہے۔

جہاں تک شعر سے استدلال کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے۔

۱۔ اس شعر کی سند اور اس کے رواۃ کی ثقاہت ثابت کیجئے مگر ان سے یہ کسی بھی صورت ثابت نہیں ہو سکے گا۔ [1]

۲۔ یہ شاعر کون ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے یہ شعر عربی زبان میں بگاڑ آنے کے بعد کہا ہو؟ اس لیے کہ عربی زبان میں تبدیلی آنے کے بعد اس سے استدلال کرنا درست بھی نہیں ہے اور وہ دلیل بھی نہیں بن سکتا۔ جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور غیر عرب اقوام عربوں میں گھل مل گئیں تو عربی زبان میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ اس شعر میں بھی اس امر کا امکان موجود ہے کہ یہ عربی زبان میں بگاڑ پیدا ہونے کے بعد کا ہو۔

۳۔"استوی بشر علی العراق" کی ''استولیٰ'' کے ساتھ تفسیر کی قرینہ تائید کرتا ہے، اس لیے کہ بشر کا عراق کے اوپر چڑھ کر اس پر اس طرح جم کر بیٹھ جانا جس طرح تخت پر بیٹھا جاتا ہے، امر دشوار ہے لہٰذا ہم اس کی تفسیر (استولیٰ) کے ساتھ کرنے کے لیے مجبور ہیں۔

ویسے اس کا ایک دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ اس شعر میں استواء، علو کے معنی میں ہے، اس لیے کہ علو کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ علو حسی، جس طرح کہ چارپائی یا تخت پر ہمارا استواء۔

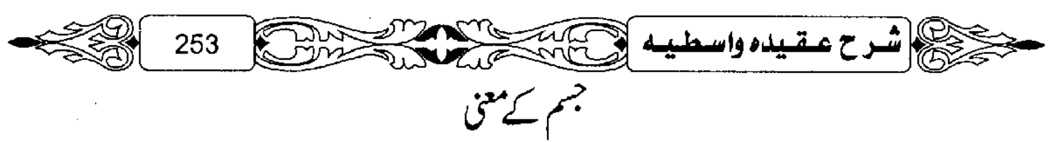
۲۔ اور علو معنوی، جو کہ غلبہ کے معنی میں ہے۔

اس اعتبار سے ''عراق پر بشر کا استوا'' قہر وغلبہ کے معنی میں ہوگا۔

رہا تمہارا یہ قول کہ استواء کی علو کے ساتھ تفسیر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے لیے جسم لازم آتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے جو چیز بھی لازم آتی ہو، وہ مبنی برحق ہوتی ہے اور ہمارے لیے اس کا التزام واجب ہوتا ہے، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلام اللہ اور کلام رسول اللہ کا لازمی تقاضا ہو، اگر اس کا لازم ہونا ثابت ہوتا ہو تو ہو جائے اور ہم اسے ضرور تسلیم کریں گے۔

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نقل صحیح سے اس شعر کا عربی ہونا ثابت نہیں ہوتا، کئی ائمہ لغت اسے خود ساختہ قرار دیتے ہیں۔ اگر حدیث سے استدلال کرنے کے لیے اس کا صحیح ہونا ضروری ہوتا ہے تو آپ کسی ایسے عربی شعر سے کس طرح استدلال کر سکتے ہیں جس کی سند کے بارے میں ہی کچھ معلوم نہ ہو، جبکہ ائمہ لغت نے اس پر اعتراضات بھی کیے ہوں؟'' مجموع الفتاوی: ۱۵/ ۱۴۶.



جسم کے معنی

اگر تو اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اللہ کی کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اس کے لیے لازی اور اس کے شایان شان صفات سے متصف ہو، تو تمہارا یہ قول باطل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی ذات ہے جو کہ صفات کے ساتھ متصف ہے اور یہ کہ اس کا چہرہ بھی ہے اور ہاتھ بھی، آنکھیں بھی ہیں اور قدم بھی۔

اگر جسم سے تمہاری مراد ایسا جسم ہے جو گوشت، خون اور ہڈیوں وغیرہا سے مرکب ہو، تو یہ اللہ کے لیے ممتنع ہے اور یہ اس قول کا لازی نتیجہ نہیں ہے کہ اللہ کے استواء علی العرش سے مراد اس پر اس کا علو ہے۔

حد کے معنی

رہا ان کا یہ قول کہ اس سے اس کا محدود ہونا لازم آتا ہے۔

تو اس کا تفصیلی جواب یہ ہے کہ محدود ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟

اگر تو اس کے محدود ہونے سے تمہاری مراد یہ ہے کہ عرش اس کے لیے محیط ہے، تو یہ باطل ہے، لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے اگرچہ وہ عرش اور عرش کے علاوہ بھی ہر شے سے بڑا ہے، اور اس سے عرش کا اس کے لیے محیط ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ اس کا محیط ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ ہر شے سے عظیم اور بڑا ہے۔ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔

جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ اس سے اس کا عرش کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اس کا محتاج ہونا لازم نہیں آتا، اس لیے کہ اس کے عرش پر مستوی ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ عرش کے اوپر ہے، مگر یہ علو خاص ہے، اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ عرش اسے اٹھاتے ہوئے ہے، نہ تو اسے عرش اٹھا سکتا ہے اور نہ آسمان۔ اور جس لازم کا تم نے دعویٰ کیا ہے وہ ممتنع ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے نقص ہے، اور یہ استواء حقیقی سے لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ ہم استواء علی العرش کا یہ معنی نہیں کرتے کہ عرش اسے اٹھائے ہوئے، وہ تو خود محمول ہے:

﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ﴾ (الحاقة: ۱۷)

''اس دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتوں نے اپنے اوپر اٹھا رکھا ہوگا۔''

فرشتے اسے اب بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس نے اللہ کو نہیں اٹھا رکھا اور نہ ہی وہ اس کا محتاج ہے، بحمد اللہ ہمارے اس مسکت جواب سے ان کے سلبی دلائل بھی باطل قرار پائے۔

اہل سنت والجماعت کے معطلہ پر کردہ ردّ کا خلاصہ

ہماری طرف سے ان کی گفتگو کی تردید کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

اولاً: ان کا یہ قول ظاہر نص کے خلاف ہے۔



ثانیاً: اجماع صحابہ اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔

ثالثاً: عربی زبان میں ''استوی'' ''استولیٰ'' کے معنی میں مستعمل نہیں ہے اور اس کے لیے جس عربی شعر سے انہوں نے استدلال کیا ہے، تو یہ استدلال ناقص ہے۔

رابعاً: اس پر لوازم باطلہ لازم آتے ہیں، مثلاً یہی کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے قبل عرش غیر اللہ کی ملکیت میں تھا۔

ایک دفعہ ابوالمعالی الجوینی اشاعرہ کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے استواء علی العرش سے انکار کرتے بلکہ اس کے علو بالذات کا بھی انکار کرتے ہوئے کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ موجود تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اور وہ اب بھی اسی طرح ہے، جس طرح پہلے تھا۔'' اس سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے استواء علی العرش ہونے کا انکار کرتا تھا، یعنی وہ تھا مگر عرش نہیں تھا اور وہ اب بھی اسی حالت میں ہے، یعنی نہ عرش ہے اور نہ وہ اس پر مستوی۔ ان کی یہ باتیں سن کر ابوالعلاء الہمذانی کہنے لگے: ''استاذ محترم! عرش اور استواء علی العرش کی بات ایک طرف رکھیں۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ یہ سمعی دلیل سے ثابت ہے اور اگر اس کے بارے میں ہمیں اللہ نہ بتاتا تو ہمیں اس کا علم نہ ہوتا۔ ہمیں اس ضرورت کے بارے میں بتائیں جسے ہم اپنی جانوں میں پاتے ہیں، کہ کوئی عارف جب بھی یا اللہ کہتا ہے، اس کے دل میں علو کا خیال آتا ہے'' یہ سن کر ابوالمعالی مبہوت رہ گئے اور سر پکڑ کر کہنے لگے: ہمذانی نے میری حیرت گم کر دی، ہمذانی نے مجھے حیران کر دیا، اور یہ اس لیے کہ یہ فطری دلیل ہے جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

دوسرا مقام: ﴿اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (یونس : ۳) ''بیشک تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر مستو ہوا۔''

شرح:......اس آیت کی تفسیر میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا جو ہم پہلی آیت کے ضمن میں لکھ آئے ہیں۔

تیسرا مقام: ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (الرعد : ۲) ''اللہ تو وہ ہے جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے (جیسے کہ) تم اسے دیکھ بھی رہے ہو۔''

شرح: ......[بِغَیْرِ عَمَدٍ] ....کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آسمان مطلقاً ستونوں کے بغیر ہی کھڑے ہیں؟ یا ستون تو ہیں مگر ہمیں دکھائی نہیں دیتے؟ اس بارے مفسرین کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک ﴿تَرَوْنَهَا﴾ ﴿عَمَدٍ﴾ کی صفت ہے، یعنی ایسے ستونوں کے بغیر جو تمہیں دکھائی دیتے ہوں، جبکہ کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ ﴿تَرَوْنَهَا﴾ جملہ مستانفہ ہے، اور اس کا معنی یہ ہے کہ آسمان ستونوں کے بغیر ہیں، جیسے کہ تم دیکھ بھی رہے ہو، یہ معنی زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ آسمانوں کے سرے سے ستون ہیں ہی نہیں، نہ مرئی اور نہ غیر مرئی۔

[ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ]..... شاہد اس جملہ میں ہے۔ اور اس کا مفہوم و معنی اوپر گزر چکا ہے۔

چوتھا مقام: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ (طٰهٰ : ۵) ''رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔''

شرح: ......[عَلَی الْعَرْشِ].....کو مقدم لایا گیا حالانکہ وہ ﴿اسْتَوٰی﴾ کا معمول ہے، جس سے مقصود افادۂ حصر

تخصیص ہے۔ نیز یہ بتانا ہے کہ وہ عرش کے علاوہ کسی چیز پر مستوی نہیں ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ﴾ کے ذکر سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وہ علو وعظمت کے باوصف رحمت کے ساتھ موصوف ہے۔

پانچواں مقام: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ﴾ (الفرقان: ٥٩) ''پھر رب رحمان عرش پر مستوی ہوا۔''

شرح:......[الرَّحْمٰنُ] ..... ﴿اسْتَوٰى﴾ کا فاعل ہے۔

چھٹا مقام: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (السجدہ: ٤) ''اللہ تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اسے چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔''

شرح:......اس آیت کی تفسیر میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا جو ہم سورۃ الاعراف اور سورۂ یونس کی دو آیتوں کی تفسیر کے ضمن میں لکھ آئے ہیں، البتہ اس جگہ ﴿وَ مَا بَيْنَهُمَا﴾ کا اضافہ ہے یعنی آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے۔ ان دونوں کے درمیان مخلوقات میں سے کچھ کا ہمیں علم ہے۔ مثلاً سورج، چاند ستارے اور بادل، جبکہ بعض ابھی تک پردۂ خفاء میں ہیں۔

ساتواں مقام: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الحدید: ٤) ''وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔''

شرح:......یہ سات مقامات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے استوی کو (علی) کے ساتھ متعدی فرمایا ہے۔

اصل مادہ س و ی ہے

علماء فرماتے ہیں، اس مادہ (س و ی) کا اصل کمال پر دلالت کرتا ہے، مثلاً ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى﴾ (الاعلیٰ: ٢) ''یعنی اس نے اپنی مخلوق کو کامل بنایا۔''

اس مادہ کو عربی زبان میں چار طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ (الیٰ) کے ساتھ متعدی، (علیٰ) کے ساتھ متعدی، واؤ کے ساتھ متعدی اور مجرد کے طور پر (علیٰ) کے ساتھ متعدی کرنے کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الحدید: ٤) اور اس کا معنی ہے: علی اور استقر۔ وہ بلند ہوا، اس نے قرار پکڑا۔

(الیٰ) کے ساتھ متعدی ہونے کی مثال یہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (البقرۃ: ٢٩) ''پھر اس نے آسمان کی طرف قصد کیا اور انہیں برابر کیا سات آسمان۔''

کیا اس کا معنی بھی (علیٰ) کے ساتھ متعدی جیسا ہے؟ اس بارے مفسرین کا اختلاف ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے، تفسیر ابن جریر رحمہ اللہ کا ظاہر مفہوم یہی ہے۔ اس طرح: ﴿اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ﴾ یعنی اس نے آسمان کی طرف ارادہ کیا، اس جگہ استواء قصد وتوجہ کے معنی کو متضمن ہے، اس لیے کہ وہ (الیٰ) کے ساتھ متعدی ہے۔

واؤ کے ساتھ مقرون ہونے کی مثال عربوں کا یہ قول ہے: استوی الماء والخشبة . یعنی پانی اور لکڑی مساوی

ہوگئے۔اور مجرد کی مثال یہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى﴾ (القصص: ١٤) ''اور جب موسیٰ جوانی کو پہنچے اور پورے توانا ہوگئے۔''یعنی کامل ہوگئے۔

تنبیہ: ......اگر ہم یہ کہیں کہ استواء علی العرش کا معنی عرش پر بلند ہونا ہے،تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد عرش پر مستوی ہوا،تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ قبل ازیں عالی نہیں تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے،اس لیے کہ استواء علی العرش مطلق علو سے خاص ہے،یعنی ایسا علو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص اور کل مخلوقات کو شامل ہے۔اللہ تعالیٰ کے لیے علو ازل تا ابد ثابت ہے اور وہ عرش پیدا کرنے سے پہلے بھی ہر چیز پر عالی تھا۔عرش پر عدم استواء سے اس کا عدم علو لازم نہیں آتا۔آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس نے عرش پر علو خاص اختیار فرمایا:

سوال: ہم آیہ کریمہ سے جو کچھ سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرتے وقت عرش پر مستوی نہیں تھا مگر کیا وہ انہیں پیدا کرنے سے پہلے عرش پر مستوی تھا یا نہیں؟

جواب: اس کا بہتر علم اللہ کے پاس ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ کا اپنے عرش پر استواء صفات فعلیہ سے ہے یا ذاتیہ سے؟

جواب: اس کا شمار صفات فعلیہ میں ہوتا ہے،اس لیے کہ یہ اس کی مشیت سے متعلق ہے اور اس کی مشیت سے تعلق رکھنے والی ہر صفت کا شمار صفات فعلیہ میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس کی مخلوق پر علو کا اثبات

☐ مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اس کی مخلوق پر علو کے اثبات کے لیے چھ آیات ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ (آل عمران: ٥٥) ''اے عیسیٰ! یقیناً میں تجھے پورا پورا لینے والا ہوں۔اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔''

شرح: ......خطاب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے ہو رہا ہے،جنہیں اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے صرف ماں سے پیدا فرمایا، یہی وجہ ہے کہ انہیں ان کی ماں کی طرف منسوب کرتے ہوئے عیسیٰ بن مریم کہا جاتا ہے۔

علماء کی رائے

[اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ]....اس میں علماء کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ بمعنی قابضك ہے،یعنی میں تجھے قبض کرنے والا ہوں،عرب کہتے ہیں: توفی حقه ، اس نے اپنا حق وصول کرلیا۔

دوسرا قول: ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ کا معنی ہے: میں تجھے سلانے والا ہوں،اس لیے کہ نیند بھی ایک طرح سے وفات



ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ﴾ (الانعام: ٦٠) ''اور وہ وہی ہے جو تم کو رات میں فوت کرتا ہے۔''

تیسرا قول: ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ یعنی میں تجھے موت دینے والا ہوں۔ اسی سے یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا﴾ (الزمر: ٤٢)

''اللہ قبض کر لیتا ہے (لوگوں کی) روحیں ان کی موت کے وقت۔''

یہ آخری قول بعید ہے اس لیے کہ حضرت عیسیٰ کو موت نہیں آئی، وہ آخری زمانے میں نزول فرمائیں گے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ (النساء: ١٥٩)

''اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہو گا مگر وہ اس کی موت سے قبل اس پر ایمان لائے گا۔''

ایک قول کی رو سے اس سے مراد عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی موت ہے۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ آخر زمانے میں نزول فرمائیں گے۔ دوسرے قول کی رو سے اس کا مطلب ہے کہ اہل کتاب میں سے جس بھی فرد کو جب موت آتی ہے وہ عیسیٰ ابن مریم پر ایمان لے آتا ہے۔ یہاں تک کہ یہودی بھی، مگر یہ قول ضعیف ہے، نیند اور موت کے اقوال کے درمیان اس طرح تطبیق دینا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کی اور پھر انہیں نیند کی حالت میں ہی اوپر اٹھا لیا، اس طرح ان اقوال میں منافات باقی نہیں رہتی۔

[وَرَافِعُكَ اِلَیَّ] .... شاہد اس میں ہے، اس لیے کہ ﴿اِلَیَّ﴾ غایت کا فائدہ دیتا ہے اور ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مرفوع الیہ عالی و برتر ہے، اور یہ اللہ کے علو کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص یہ موقف اختیار کرے کہ اس سے مراد مقام و مرتبہ کی رفعت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ (آل عمران: ٤٥) ''وہ دنیا و آخرت میں معزز ہو گا۔'' مگر اس کا یہ موقف درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس جگہ رفع کو اس لفظ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے جو کہ جسمانی رفع کے ساتھ مختص ہے، اس سے مقام و مرتبہ کی بلندی مراد نہیں ہے۔

علو کی اقسام

آپ کے علم میں ہے کہ علو باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں: علو معنوی اور علو ذاتی۔

۱۔ علو معنوی پر اہل قبلہ کا اجماع ہے، یعنی اہل سنت کے ساتھ اہل بدعت کا بھی اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ معنوی اعتبار سے اعلیٰ و برتر ہے۔

۲۔ جہاں تک علو ذاتی کا تعلق ہے تو اہل سنت اس کا اثبات کرتے ہیں جبکہ اہل بدعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ ذاتی اعتبار سے عالی نہیں ہے۔

علو ذات پر اہل سنت کے دلائل

علو ذات پر اہل سنت کے دلائل حسب ذیل ہیں:

اولاً: کتاب علو ذاتی پر کتاب اللہ کی دلالت میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے، اس کی یہ دلالت کبھی علو کے ذکر کے ساتھ ہے اور کبھی فوقیت کے ذکر کے ساتھ۔ کبھی اس بات کا ذکر ہوتا ہے کہ چیزوں کا نزول اس کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی یہ ذکر کہ بعض اشیاء کا اس کی طرف صعود ہوتا ہے اور کبھی یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ آسمان میں ہے۔

علو کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں: ﴿وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) ''وہ سب سے بلند سب سے بڑا ہے۔''
﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ (الاعلیٰ: ۱) ''اپنے سب سے بلند رب کی تسبیح بیان کریں۔''

فوقیت کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں: ﴿وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (الانعام: ۱۸) ''اور وہ اپنے بندوں پر زبردست ہے۔'' ﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝﴾ (النحل: ۵۰) ''وہ (فرشتے) اپنے اوپر سے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔''

اس کی طرف سے نزول اشیاء کی مثالیں: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (السجدہ: ۵) ''وہی تدبیر کرتا ہے کام کی آسمان سے زمین تک۔'' ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (الحجر: ۹) ''بے شک ہم نے ہی ذکر اتارا۔''

رب تعالیٰ کی طرف اشیاء کے صعود کی مثالیں: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ (فاطر: ۱۰) ''اسی کی طرف چڑھتے ہیں پاکیزہ کلمات، اور نیک عمل انہیں بلند کرتے ہیں۔'' اسی طرح: ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾ (المعارج: ٤) ''چڑھتے ہیں فرشتے اور روح الامین اس کی طرف۔''

اس کے آسمان میں ہونے کی مثال ہے: ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ﴾ (الملك: ۱٦) ''کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے۔''

ثانیاً: دلالت سنت: یہاں تک سنت کا تعلق ہے تو نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر سے تواتر کے ساتھ اس پر دلائل موجود ہیں:

ا۔ آپ ﷺ کے متعدد ارشادات ہیں علو اور فوقیت کا ذکر آیا ہے: مثلاً آپ ﷺ کا یہ فرمان: سبحان ربی الاعلی . [1] ''پاک ہے میرا رب جو سب سے اعلیٰ ہے۔'' اسی طرح آپ ﷺ نے آسمانوں کا ذکر کیا تو فرمایا: واللہ فوق العرش . [2] ''اور اللہ عرش کے اوپر ہے۔'' آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا اس طرح ذکر فرمایا: ''کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے ہو، جب کہ میں اس کا امین ہوں جو آسمان میں ہے۔'' [3]

---

[1] صحیح مسلم: ۷۷۲ من حدیث حذیفة رضی اللہ عنه .

[2] اسے ابن خزیمہ نے کتاب التوحید: ۱/ ۲٤٤۔ میں لالکائی نے شرح السنه: ٦٥٩ میں اور طبرانی نے الکبیر: ۹/ ۲۲۸۔ میں روایت کیا، ہیثمی مجمع: ۱/ ۸٦ میں فرماتے ہیں: اسے طبرانی نے روایت کیا اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ نیز بیہقی نے الاسماء والصفات: ۸۵۱۔ ابو الشیخ نے کتاب العظمة: ۲۷۹ اور دارمی نے الرد علی الجهمية: ۸۱ میں روایت کیا، ذہبی العلو میں فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔ مختصر العلو: ٤۸ من حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنه .

[3] صحیح بخاری: ٤۳۵۱۔ صحیح مسلم: ۱۰٦٤ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنه .

۲۔ جہاں تک آپ ﷺ کے فعل کا تعلق ہے تو آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفہ کے دن تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام کے بہت بڑے اجتماع کے سامنے خطبہ حج دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "الا هل بلغت؟" کیا میں نے تم لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: "الا هل بلغتُ؟" انہوں نے پھر کہا: ہاں، اس پر آپ نے فرمایا: اللّٰھم اشھد. ''میرے اللہ گواہ رہنا۔'' اس دوران آپ اپنی انگلی کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ فرماتے اور اسے لوگوں کی طرف جھکاتے۔'' [1]

آپ ﷺ کا دعا کرتے وقت دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھانا بھی اسی قبیل سے ہے۔ جس سے بالفعل علو ذات کا اثبات ہوتا ہے۔

۳۔ رہی تقریر، تو معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ان کے پاس ایک لونڈی کو لایا گیا، وہ اسے آزاد کرنا چاہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا: ''اللہ کہاں ہے؟'' وہ کہنے لگی: آسمان میں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''میں کون ہوں؟'' اس نے جواب دیا: آپ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سن کر آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اسے آزاد کر دو، یقیناً یہ مومنہ ہے۔'' [2]

یہ لونڈی پڑھی لکھی نہیں تھی، اور لونڈیاں عام طور پر جاہل ہی ہوتی ہیں، مگر وہ بھی جانتی تھی کہ اس کا رب آسمان میں ہے۔ جبکہ اولاد آدم سے گمراہ لوگ اس کے آسمان میں ہونے کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں: وہ عالم کے اوپر ہے نہ نیچے نہ دائیں اور نہ بائیں۔ یا وہ ہر جگہ موجود ہے۔

علو ذات پر یہ تھے کتاب وسنت سے دلائل۔

ثالثاً: دلالت اجماع عہد رسول اللہ ﷺ سے لے کر آج تک علماء سلف کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ آسمان میں ہے۔ اگر آپ یہ سوال کریں کہ ان کا اس پر اجماع کیسے ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ میں علو، فوقیت، اس کی طرف سے اشیاء کے اترنے اور اس کی طرف ان کے چڑھنے کا ذکر تکرار کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ علماء سلف کا انہیں ان کے ظاہر پر محمول کرنا اور ان کی مخالفت نہ کرنا ان کی طرف سے ان کے مدلول پر اجماع کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی لیے شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس پر سلف کا اجماع ہے۔'' مزید فرماتے ہیں: ''ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ: اللہ آسمان میں نہیں ہے، یا اللہ زمین میں ہے، یا اللہ نہ تو عالم میں داخل ہے اور نہ اس سے خارج، نہ متصل ہے اور نہ منفصل، یا اس کی طرف حسی اشارہ کرنا جائز نہیں ہے۔''

رابعاً: دلالت عقل، اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ یا اوپر ہوگا یا نیچے، مگر اس کا نیچے ہونا محال ہے، اس لیے کہ یہ نقص ہے جو اس امر کو مستلزم ہے کہ اس کی مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے اوپر ہو، اس صورت میں اسے نہ تو علو تام

---

[1] صحیح مسلم: ۱۲۱۸۔ من حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ .

[2] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔



حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی پورا غلبہ۔ جب اس کا نیچے ہونا محال ہے تو پھر علو واجب ہوگا۔

اس حوالے سے ایک دوسری عقلی دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ تمام عقلاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علو صفت کمال ہے اور جب وہ صفت کمال ہے تو اس کا اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہونا ضروری ہے اس لیے کہ کمال کی ہر صفت مطلقاً اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے۔

ہم ''مطلقاً'' کہہ کر کمال نسبی سے احتراز کرنا چاہتے ہیں جو ایک حالت میں کمال ہوتا ہے اور دوسری میں نقص، مثلاً نیند نقص ہے مگر جو اس کا محتاج ہو اور اس کی وجہ سے اپنی عملی قوت بحال کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے کمال ہے۔

خامساً: الفطرة: جہاں تک دلالت فطرت کا تعلق ہے تو وہ غیر متنازع اور مسلمہ امر ہے، ہر شخص فطری طور پر اس بات سے آگاہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے لیے اچانک کوئی ایسی غیر پسندیدہ صورت حال پیدا ہو جائے جس کا ازالہ آپ کے بس میں نہ ہو تو آپ اس کے دفعیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور آپ کے دل میں آسمان والے کا خیال آتا ہے، یہاں تک کہ علو ذات کے منکرین کے ہاتھ بھی آسمان کی طرف اٹھتے ہیں نہ کہ زمین کی طرف۔

یہ ایک فطری تقاضا ہے جس سے انکار کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔

کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض جانور بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے۔ مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بارش کی دعا کرنے کے لیے باہر نکلے تو ایک چیونٹی کو پیٹھ کے بل لیٹے ہوئے دیکھا، اس نے اپنی ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا رکھی تھیں، اور وہ کہہ رہی تھی: ''یا اللہ! ہم بھی تیری مخلوق ہیں، ہم تیری باران رحمت سے بے نیاز نہیں۔'' اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ''لوگو! واپس لوٹ چلو، تم پر دوسروں کی دعا سے باران رحمت کا نزول ہوگا۔''[1] یہ ایک فطری الہام ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ رب تعالیٰ کا آسمان پر ہونا فطری طور پر معلوم ہے۔

واللہ! اگر علو ذات باری تعالیٰ کے منکرین کی فطرت میں بگاڑ پیدا نہ ہو چکا ہوتا تو وہ کسی بھی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اس امر سے آگاہ ہوتے کہ اللہ آسمان پر ہے، اس لیے کہ جس چیز پر فطرت دلالت کرتی ہو اس کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

منکرین علو ذات کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ اختیار کر لیا جائے تو اس سے اس کا ایک جہت میں جسمانی طور پر محدود ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ ممتنع ہے۔

مگر ہم اس کا جواب یہ دیں گے:

اولاً: ان جیسی تعلیلات کے ساتھ دلالت نصوص کو باطل قرار دینا جائز نہیں ہے اگر اس چیز کو جائز قرار دے دیا جائے تو پھر نصوص شرعیہ کے تقاضوں کو پامال کرنے کے شوقین ہر شخص کے لیے اس قسم کی کمزور تعلیلات کا سہارا لینا ممکن ہو جائے گا۔

---

[1] یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

جب خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے علو کا اثبات کیا ہے، رسول اللہ ﷺ اور سلف صالحین نے اس کے لیے علو ذات کا اثبات کیا ہے، تو پھر کسی بھی شخص کے اس قول کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی طور پر عالی ہونا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تسلیم کرنے سے یہ یہ کچھ ہو سکتا ہے۔

ثانیاً: پھر ہم تم سے یہ بھی دریافت کریں گے کہ اس حد اور جسم سے کیا مراد ہے جس کے لیے تم نے ہمارے خلاف اتنی زوردار چڑھائی کر رکھی ہے؟ کیا حد سے تمہارے نزدیک مخلوقات میں سے کوئی ایسی چیز مراد ہے جس نے اللہ تعالیٰ کا احاطہ کر رکھا ہو؟ اگر ایسا ہے تو یہ باطل اور اللہ تعالیٰ سے منفی ہے اور یہ اثبات علو سے ہرگز لازم نہیں آتا۔

ثالثاً: یا تم حد سے یہ مراد لیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جدا ہے اور اس میں حلول کیے ہوئے نہیں ہے؟

اگر تمہاری مراد یہ ہے تو یہ من حیث المعنیٰ صحیح ہے، مگر ہم اپنی زبان سے یہ لفظ نہیں بولیں گے، نہ نفیاً اور نہ ہی اثباتاً، اس لیے کہ یہ لفظ وارد نہیں ہوئے۔

رہا جسم، تو اس کے بارے میں بھی ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تمہارے نزدیک اس سے مقصود ایسا جسم ہے جو گوشت پوست اور ہڈیوں کا مرکب ہوتا ہے؟ اگر جسم سے مراد اس قسم کا جسم ہے تو یہ باطل اور اللہ تعالیٰ سے منفی ہے۔ اس لیے کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

یا پھر جسم سے مراد ایسا جسم ہے جو قائم بنفسہ ہو اور اپنے شایان شان اوصاف سے متصف ہو؟ تو یہ من حیث المعنیٰ حق ہے مگر ہم یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں کریں گے، نہ نفیاً اور نہ ہی اثباتاً اس لیے کہ ان کا ورود بھی معدوم ہے۔

ایسی جہت کے بارے میں بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جہت ہے جو اس کو محیط ہے؟ تو یہ باطل ہے، اثبات علو سے یہ لازم نہیں آتا، یا پھر اس سے مراد ایسی جہت علو ہے جس نے اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر رکھا۔ تو یہ حق ہے اور جس کی اللہ سے نفی کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری آیت: ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ (النساء: ۱۵۸) ''بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔''

شرح: ......[بَلْ]....اضراب ابطالی کے لیے ہے، جس سے یہودیوں کے اس قول کا ابطال کرنا مقصود ہے:

﴿اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًاۢ ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾ (النساء: ۱۵۷۔ ۱۵۸)

''یقیناً ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کو قتل کیا ہے، جب کہ نہ وہ انہیں قتل کر سکے اور نہ انہیں سولی دے سکے، لیکن ان کے لیے مسیح کی تشبیہ بنا دی گئی تھی اور یقیناً جن لوگوں نے اس میں اختلاف کیا وہ اس کے متعلق شک میں ہیں، انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے مگر صرف ظن کی پیروی کرنا، وہ یقیناً انہیں قتل نہیں کر سکے، بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا، اور اللہ بڑا غالب، بڑی حکمت والا ہے۔''

شاہد، ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ میں ہے، جو اس امر میں صریح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ عالی ہے، اس لیے کہ کسی چیز کو کسی چیز کی طرف اٹھانا اس کے علو کو مستلزم ہوتا ہے۔

تیسری آیت: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ (فاطر: ۱۰) ''اس کی طرف چڑھتے ہیں پاکیزہ کلمات اور صالح عمل ان کلمات کو بلند کرتے ہیں۔''

شرح:...... [اِلَيْهِ]....یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف۔

[يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ] .... ﴿الْكَلِمُ﴾ اس جگہ اسم جمع ہے، اس کا مفرد "کلمة" ہے اور "کلمة" کی جمع کلمات آتی ہے، ﴿الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ ہر اس کلمہ کو شامل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً تلاوت قرآن، ذکر، علم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، پس اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والا ہر کلمہ، کلمہ طیبہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتا اور اس تک پہنچتا ہے، اللہ رب العزت عمل صالح کو بھی اپنی طرف اٹھاتا ہے۔

کلمات طیبہ اللہ کی طرف صعود کرتے ہیں، اور عمل صالح کو اللہ اوپر اٹھاتا ہے، اور یہ علو ذات کی دلیل ہے۔

چوتھی آیت: ﴿يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۝﴾ (الغافر: ۳۶۔ ۳۷) ''اے ہامان! میرے لیے ایک اونچا سا محل بنا، تاکہ میں اس پر چڑھ کر آسمانوں کے راستوں پر پہنچ جاؤں، پھر میں موسیٰ کے معبود کو جھانک کر دیکھ لوں اور یقیناً میں تو اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں۔''

شرح:...... ہامان فرعون کا وزیر تھا، جس نے اسے محل تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔

[صَرْحًا].... بلند محل۔

[لَعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ].... یعنی تاکہ میں ان راستوں تک پہنچ سکوں جو مجھے آسمان تک پہنچا دیں۔

[فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى] .... یعنی میں موسیٰ کے معبود کو دیکھ لوں، اور اس تک براہ راست رسائی حاصل کر لوں۔ اور یہ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، اس پر فرعون نے اپنی قوم کو ایک بلند و بالا محل تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ اس کے اوپر چڑھے اور پھر یہ کہنا شروع کر دے کہ مجھے تو ادھر کچھ نظر نہیں آیا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے ایسا از راہ مذاق کہا ہو۔

صورت حال جو بھی ہو، فرعون نے اپنی رعایا کو مطمئن کرنے کے لیے یہ ضرور کہا: ﴿اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا﴾ کہ یقیناً میں اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ جب کہ اسے یقین تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سچے ہیں، اس کا اظہار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد سے ہوتا ہے: ﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَاۗئِرَ﴾ (الاسراء: ۱۰۲) ''تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کو نہیں اتارا مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے سمجھانے کے لیے۔'' فرعون نے اس سے انکار نہیں بلکہ اس تاکیدی خبر کا اقرار کیا تھا۔ اس کے اس علم کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:



﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ (النمل: ١٤)

''اور انہوں نے محض ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان آیات کا انکار کیا، جبکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔''

اس میں شاہد یہ ہے کہ فرعون کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ کو دیکھنے کے لیے بلند و بالا محل تعمیر کرنے کا حکم دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے فرعون اور آل فرعون سے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، اور اس سے علو ذات کا اثبات ہوتا ہے۔

پانچویں اور **چھٹی آیت**: ﴿ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝﴾ (الملك: ١٧-١٦) ''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس (اللہ) سے جو آسمان میں ہے یہ کہ دھنسا دے وہ تم کو زمین میں پھر اچانک وہ لرزنے لگے، کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے یہ کہ وہ تم پر پتھروں کی بارش برسا دے پھر تم جلد ہی جان جاؤ کہ میرا ڈرانا کیسا ہوا؟''

شرح: ......اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے، مگر اس نے اپنی ذات سے اس بات کا کنایہ کیا، اس لیے کہ مقام اس کی عظمت کے اظہار کا ہے۔ نیز اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ وہ لوگوں کے اوپر ہے ان پر قادر و غالب ہے اور یہ کہ ان کا نگہبان ہے، اس لیے کہ عالی و برتر کا اپنے ماتحتوں پر غلبہ ہوا کرتا ہے۔

[فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ]...... یعنی زمین مضطرب ہونے لگے۔

اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ واللہ ہم بے خوف نہیں ہیں، بلکہ کثرت معاصی کی صورت میں ہم لوگوں کو یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ ہمیں کہیں زمین میں دھنسا نہ دیا جائے۔

[اَمْ اَمِنْتُمْ]...... اس جگہ (ام) (بل) اور ہمزہ کے معنی میں ہے۔ یعنی بل أأمنتم .

[اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا]...... الحاصب: اوپر سے پتھروں کی بارش کی صورت میں آنے والا عذاب، جیسا کہ قوم لوط اور اصحاب الفیل پر اس قسم کا عذاب مسلط کیا گیا تھا، اس کے برعکس خسف وہ عذاب ہوتا ہے، جو نیچے کی طرف سے آئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر دو قسم کے عذاب سے خبردار کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا﴾ (العنكبوت: ٤٠)

''پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑا، ان میں سے کچھ پر تو ہم نے پتھروں کی بارش برسائی، جبکہ ان میں سے کچھ کو چنگھاڑ نے پکڑا، کچھ کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کچھ ایسے تھے جن کو ہم نے غرقاب کر دیا۔''

یہ عذاب کی چار قسمیں ہیں، جن میں سے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ دو قسم کے عذاب کا ذکر کیا ہے: سنگ باری کرنا اور زمین میں دھنسا دینا۔

شاہد ارشاد باری تعالیٰ ﴿مَنْ فِي السَّمَآءِ﴾ میں ہے۔

اور جو آسمان میں ہے، وہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہے، جو کہ کے علو بالذات کی دلیل ہے۔

مگر اس جگہ ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ (فی) ظرفیت کے لیے ہے، پھر جب اللہ آسمان میں ہے اور (فی) ظرفیت کے لیے ہے تو ظرف، مظروف کے لیے محیط ہوتی ہے مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ الماء فی الكأس "پانی گلاس میں ہے۔" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گلاس پانی کے لیے محیط ہے اور وہ پانی سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ءَ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ﴾ تو اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ آسمان اللہ تعالیٰ کے محیط ہے اور یہ باطل ہے، پھر جب آیت کا ظاہری مفہوم باطل ہے تو ہمیں علم الیقین حاصل ہے کہ یہ اللہ کی مراد نہیں ہے، اس لیے کہ کتاب وسنت کے ظاہر کا باطل ہونا ممکن نہیں ہے۔ تو اس اشکال کا کیا جواب ہے؟

علماء نے اس کا جواب دو طرح سے دیا ہے:

۱۔ آسمان کو علو کے معنی میں لیا جائے جو کہ نہ صرف عربی زبان میں بلکہ قرآن مجید میں بھی وارد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَۃٌۢ بِقَدَرِهَا﴾ (الرعد: ۱۷)

"اسی نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے اپنی اپنی وسعت کے مطابق نالے بہہ پڑے۔"

اس جگہ آسمان سے مراد علو ہے، اس لیے کہ بارش کا پانی بادلوں سے اترتا ہے نہ کہ آسمان سے جو محفوظ چھت ہے، جبکہ بادل آسمان اور زمین کے درمیان علو میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ﴾ (البقرة: ۱٦٤)

"اور بادلوں میں بھی (نشانیاں) ہیں جو کہ آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہے۔"

اس طرح ﴿مَّنۡ فِی السَّمَآءِ﴾ کا معنی ہوگا، جو علو میں ہے۔

اس کے بعد یہ اشکال باقی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ علو میں ہے، نہ تو اس کے محاذات میں کوئی چیز ہے اور نہ ہی اس کے اوپر۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ (فی) کو (علیٰ) کے معنی میں لیا جائے، جو کہ اس معنی میں عربی لغت کے علاوہ قرآن مجید میں بھی مستعمل ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے جادوگروں کے بارے میں کہا تھا:

﴿وَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ﴾ (طٰهٰ: ۷۱)

"اور میں تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔"

اس جگہ (فی) (علیٰ) کے معنی میں ہے، یعنی علی جذوع النخل . یہ اشکال اس صورت میں بھی باقی نہیں رہتا۔

سوال: اس آیت اور مندرجہ ذیل آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی:

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ﴾ (الزخرف: ۸٤)

"اور وہ جو آسمان میں بھی الٰہ ہے، اور زمین میں بھی الٰہ ہے۔"

نیز......﴿وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الۡاَرۡضِ یَعۡلَمُ سِرَّکُمۡ وَ جَهۡرَکُمۡ﴾ (الانعام: ۳)

"اور وہ اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی وہ جانتا ہے تمہارے پوشیدہ کو بھی اور ظاہر کو بھی۔"

جواب: پہلی آیت میں ظرف اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے لیے ہے۔ یعنی اس کی الوہیت آسمان میں بھی ثابت ہے اور زمین میں بھی۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان امیر فی المدینة ومكة . ''فلاں شخص مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں امیر ہے۔'' جبکہ وہ ذاتی طور پر ان میں سے کسی ایک شہر میں موجود ہوتا ہے، مگر اس کی امارت دونوں شہروں پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی الوہیت آسمان میں بھی ہے اور زمین میں بھی، مگر وہ خود آسمان میں ہے۔ جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے، تو اس کے بارے میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا جو اس سے ماقبل کی آیت میں کہا گیا۔

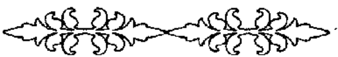
[وَ هُوَ اللّٰهُ] .... یعنی وہ ایسا اللہ ہے جس کی الوہیت آسمان میں بھی ہے، اور زمین میں بھی جبکہ وہ خود آسمان پر ہے۔ اس طرح آیت کا معنی ہوگا: آسمانوں میں بھی وہی الہ ہے اور زمین میں بھی، آسمانوں میں بھی اسی کی الوہیت ہے اور زمین میں بھی اسی کی۔

اس آیت کو ﴿وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ﴾ پر وقف کر کے بھی الگ سے پڑھا گیا ہے اور پھر اس سے آگے ﴿وَ فِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ﴾ کو الگ سے پڑھا گیا ہے، یعنی اس کی ذات آسمانوں میں ہے، اور وہ زمین میں تمہارے پوشیدہ اور ظاہری امور کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ کا علو کے ساتھ آسمانوں پر ہونا، زمین میں تمہارے اندرونی اور بیرونی امور کے علم سے مانع نہیں ہے۔

مگر اس معنی میں قدرے ضعف ہے، اس لیے کہ اس معنی کی صورت میں قرآنی آیت کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے الگ ہو جاتا اور اس کا باہمی ارتباط ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا پہلا جواب زیادہ صائب ہے۔

ان آیات کے سلوکی فوائد

جب انسان اس بات سے بخوبی آگاہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر ہے تو اس سے اسے اس کے مکمل غلبہ اور مخلوق پر اس کی گرفت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا، پھر وہ اس سے خائف بھی ہوگا اور اس کی تعظیم و توقیر بھی کرے گا اور اس طرح جب انسان اپنے رب سے خائف ہوگا اور اس کی تعظیم کرے گا تو پھر وہ تقویٰ اختیار کرتے ہوئے واجبات کی ادائیگی کا فریضہ سرانجام دے گا اور محرمات شرعیہ کے ارتکاب سے اجتناب کرے گا۔



اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوقات کے ساتھ معیت کا اثبات

شرح: ...... مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت کے دلائل پیش کرتے وقت انہیں علو کے بعد ذکر کرنا نامناسب خیال؟ کیا اس لیے کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس سے ہر چیز کے اوپر ہونے اور بندوں کے ساتھ ہونے میں تناقض پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات بڑی مناسب تھی کہ علو ذات کی آیات کے ذکر کے بعد ان آیات کا ذکر کیا جائے جن سے اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت کا اثبات ہوتا ہے۔



اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت کے حوالے سے چند امور زیر بحث آئیں گے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مبحث اول:......اقسام معیت:

معیت ایزدی کی دو قسمیں ہیں: عامہ اور خاصہ۔

معیت خاصہ کی پھر دو قسمیں ہیں: کسی شخص کے ساتھ مقید ہونا اور کسی وصف کے ساتھ مقید ہونا۔

جہاں تک معیت عامہ کا تعلق ہے تو وہ ہر شخص کو شامل ہے، وہ مومن ہو یا کافر، نیک ہو بد۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (الحدید: ٤) ''تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔''

ا: معیت خاصہ جو کسی وصف کے ساتھ مقید ہو اس کی مثال یہ فرمان باری ہے:﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ﴾ (النحل: ١٢٨) ''یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے اور ان کے ساتھ بھی جو خاص نیکوکار ہیں۔''

ب: وہ معیت خاصہ جو کسی معین شخص کے ساتھ خاص ہو، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا نبی مکرم ﷺ کے بارے میں یہ ارشاد ہے:﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ: ٤٠) جب وہ (محمد ﷺ) اپنے ساتھی (ابوبکر رضی اللہ عنہ) سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کریں، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی طرح اس نے موسیٰ وہارون علیہما السلام سے فرمایا:﴿إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ (طٰہٰ: ٤٦) ''یقیناً میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔''

معیت کی یہ قسم کسی وصف کے ساتھ مقید معیت سے زیادہ خاص ہے۔

پس معیت کے کئی درجات ہیں: عامہ مطلقہ، خاصہ، جو کسی وصف کے ساتھ مقید ہو، خاصہ، جو کسی شخص کے ساتھ مقید ہو، معیت کی تمام اقسام سے زیادہ خاص وہ معیت ہے جو کسی شخص کے ساتھ مقید ہو، اس کے بعد وصف کے ساتھ مقید اور پھر معیت عامہ کا درجہ ہے۔

معیت عامہ ازراہ علم وقدرت، سمع وبصر اور ربوبیت کے دیگر معانی کی رو سے مخلوق کے احاطہ کو مستلزم ہے۔ جبکہ معصیت خاصہ اپنی دونوں قسموں کے ساتھ نصرت وتائید کو مستلزم ہے۔

مبحث دوم: ......کیا معیت سے مراد حقیقی معیت ہے یا یہ علم وقدرت، سمع وبصر اور ربوبیت ایزدی کے دیگر معانی سے کنایہ ہے؟

ائمہ سلف رحمہم اللہ میں سے اکثریت کا قول ہے کہ یہ علم وقدرت، سمع وبصر اور دیگر معانی ربوبیت سے کنایہ ہے، وہ ارشاد باری تعالیٰ:﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اس کا تمہیں بخوبی علم ہے، وہ تمہارے اقوال کو سنتا اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے، وہ تم پر قادر ہے، تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے...... اس طرح وہ اس کی تفسیر اس کے لازم کے ساتھ کرتے ہیں۔

جبکہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس کتاب اور اپنی دیگر کتب میں معیت کو اس کی حقیقت پر محمول کرنے کو پسند کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونا حق ہے اور یہ اپنی حقیقت پر محمول ہے، لیکن اس کی معیت ایک انسان کی دوسرے



انسان کے ساتھ معیت جیسی نہیں ہے، بایں طور کہ وہ اس کی جگہ میں اس کے ساتھ ہوسکتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اس کے علو کے باوجود اس کے لیے ثابت ہے۔ پس اللہ ہمارے ساتھ ہے حالانکہ وہ ہر چیز سے اوپر اپنے عرش پر عالی و برتر ہے۔ یہ کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے کہ وہ ہر اس جگہ میں ہمارے ساتھ موجود ہو جس جگہ ہم موجود ہوتے ہیں۔

اس بناء پر معیت اور علو ذات کے درمیان تطبیق دینے کی ضرورت لاحق رہے گی۔

مؤلف رحمہ اللہ نے اس کے لیے ایک مستقل فصل قائم کی ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے چل کر آئے گی اور جس میں وہ بتائیں گے کہ علو ذات اور معیت میں کوئی منافات نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات میں اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے، وہ قرب کے باوجود عالی ہے اور علو کے باوصف قریب ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ اس کے لیے چاند کی مثال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، عرب کہتے ہیں: ہم چلتے رہے جبکہ چاند ہمارے ساتھ تھا۔ حالانکہ چاند آسمان پر ہوتا ہے۔ جب اس کا یہ عالم ہے تو پھر آسمانوں سے اوپر ہونے کے باوجود خالق اپنی مخلوق کے ساتھ کیوں نہیں ہوسکتا، جبکہ اس کی نسبت سے مخلوق کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ [1]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے اس قول سے اہل سنت پر بعض اہل تعطیل کے اس اعتراض کی تردید ہوتی ہے کہ تم دوسروں کو تاویل کرنے سے منع کرتے ہو جبکہ معیت کی تاویل کرتے ہوئے خود یہ کہتے ہو کہ یہ علم وقدرت، سمع و بصر اور ان جیسے دوسرے امور ربوبیت کے معنی میں ہے۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ معیت اپنے حقیقی معنی پر محمول ہے، مگر اس کا وہ مفہوم نہیں ہے جو جہمیہ وغیرہم نے سمجھا ہے کہ وہ ہر جگہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، بعض علماء سلف کی طرف سے معیت کی علم وقدرت اور ان جیسی دوسری چیزوں کے ساتھ تفسیر کرنا تفسیر باللازم ہے۔

مبحث سوم: ......کیا معیت کا شمار صفات ذاتیہ میں ہوتا ہے یا صفات فعلیہ میں؟

یہ بحث قدرے تفصیل طلب ہے۔

معیت عامہ کا شمار تو صفات ذاتیہ میں ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ سے اپنی مخلوق کا اپنے علم وقدرت، سمع و بصر اور ان جیسے دیگر امور سے احاطہ کر رکھا ہے۔

جہاں تک معیت خاصہ کا تعلق ہے تو یہ فعلی صفت ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔

ہر وہ صفت جو کسی سبب سے مربوط ہو اس کا شمار صفات فعلیہ میں ہوتا ہے، ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ رضا کا شمار صفات فعلیہ میں ہوتا ہے اس لیے کہ وہ کسی سبب سے مربوط ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ سبب معرض وجود میں آئے گا، اللہ تعالیٰ کی رضیٰ بھی وجود میں آجائے گی۔ اسی طرح معیت خاصہ ہے جب تقویٰ یا اس جیسے اس کے دیگر اسباب کسی شخص میں پائے جائیں گے، اسے اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جائے گی۔

---

[1] ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی: ۵/ ۱۰۳۔



مبحث چہارم: ......معیت حقیقی ہے یا نہیں؟

سطور بالا میں ہم نے بتایا ہے کہ بعض سلف مفسرین معیت کی تفسیر اس کے لازم سے کرتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے اسے اس کی حقیقت پر محمول کرتے ہیں، مگر یہ ایسی معیت ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان اور اس کے ساتھ خاص ہے، مؤلف نے اس جگہ اور اپنی دیگر تالیفات میں یہی موقف اختیار کیا ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر ہمارے ساتھ ہے، اس لیے کہ یہ باطل و مستحیل ہے۔

مبحث پنجم: ......کیا معیت اور علو میں تناقض ہے؟

جواب: تین وجوہ کی بناء پر ان میں کوئی تناقض نہیں ہے:

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے جب اپنی ذات کا وصف بیان کیا تو معیت اور علو کو ایک ساتھ بیان کیا اگر ان دونوں میں باہم تناقض ہوتا تو اس کا ان دونوں کے ساتھ اپنا وصف بیان کرنا صحیح نہ ہوتا۔

دوسری وجہ: علو اور معیت کے مابین سرے سے کوئی تناقض ہے ہی نہیں، ممکن ہے کہ ایک چیز عالی بھی ہو اور وہ آپ کے ساتھ بھی ہو، مثلاً عرب کہا کرتے ہیں: ہم چل رہے تھے اور چاند ہمارے ساتھ تھا، سورج ہمارے ساتھ تھا اور ہم چلے جا رہے تھے، قطب ستارا ہمارے ساتھ تھا اور ہم رواں دواں تھے، حالانکہ سورج، چاند اور قطب ستارا یہ سب کے سب آسمان میں ہیں، اگر مخلوق کے حوالے سے علو اور معیت کا اجتماع ممکن ہے تو خالق کے حوالے سے ان کا اجتماع بطریق اولیٰ ممکن ہے۔

اگر کوئی فوجی آفیسر کسی اونچے پہاڑ پر کھڑا ہو کر اپنے زیر کمان جوانوں سے کہے کہ تم دور دراز کے فلاں مقام پر معرکہ میں کود پڑو اور میں تمہارے ساتھ ہوں، اور وہ دوربین سے ان کی طرف دیکھ رہا ہو، تو اس کا یہ کہنا درست ہوگا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اس لیے کہ اگرچہ وہ ان سے بہت دور ہے مگر وہ انہیں اس طرح دیکھ رہا ہے گویا کہ وہ جوان اس کے سامنے موجود ہوں، اگر یہ کچھ مخلوق کے حق میں ممکن ہے تو خالق کے حق میں غیر ممکن کیوں ہے؟

تیسری وجہ: اگر ان دونوں کا اجتماع مخلوق کے حق میں مشکل ہو تو بھی خالق کے حق میں ان کا اجتماع مشکل نہیں ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی بہت بڑی ہے، خالق کی صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ دونوں میں فرق بالکل واضح ہے۔

نبی کریم ﷺ سفر کی حالت میں یہ دعا پڑھا کرتے: اللهم انت الصاحب فی السفر والخليفة فی الاهل. [1] ''میرے اللہ! تو سفر میں ساتھی اور اہل و عیال میں خلیفہ ہے۔'' اس طرح علیہ الصلاۃ والسلام نے دوران سفر اللہ تعالیٰ کو اپنا ساتھی اور اپنے اہل خانہ میں اپنا خلیفہ قرار دے کر دونوں چیزوں کو ایک ساتھ جمع فرما دیا، حالانکہ یہ مخلوق کی نسبت سے غیر ممکن ہے۔

ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جب نمازی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی۔ غور کیجئے کہ بے شمار نمازی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھ رہے ہوتے ہیں، جبکہ کتنے ہی:

---

[1] صحيح مسلم: ١٣٤٢ـ عن ابن عمر رضي الله عنه.

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ یہ جواب دیتا ہے: ''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔''❶

گویا کہ اللہ تعالیٰ کا بیک وقت حقیقتاً ہمارے ساتھ ہونا اور حقیقتاً اپنے عرش پر موجود ہونا ممکن ہے، ان دونوں میں تعارض صرف انہیں لوگوں کو نظر آئے گا، جو اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق سے مماثل قرار دینا چاہیں گے اور اللہ کی معیت کو اس کی مخلوق کی معیت جیسی تسلیم کریں گے۔

مذکورہ بالا سطور میں ہم نے یہ بات واضح کر دی کہ علو اور معیت کی نصوص میں تطبیق دینا ممکن ہے اگر یہ حقیقت آپ پر واضح ہوگئی تو بہت خوب، وگرنہ بندہ مومن پر یہ کہنا واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لایا، اور میں نے اس بات کی تصدیق کی جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں فرمائی یا اس کے رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمائی۔ اسے اس کا انکار کرتے ہوئے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ: بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟

اگر وہ یہ سوال کرے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرا یہ سوال کرنا بدعت ہے، اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے یہ سوال نہیں کیا، حالانکہ وہ تجھ سے کہیں بہتر تھے اور جن سے وہ سوال کر سکتے تھے، وہ تیرے مسئول سے کہیں زیادہ علم رکھنے والے، زیادہ سچے، زیادہ خیر خواہ اور زیادہ فصیح المقال تھے، ان کی تصدیق کیجئے اور کس طرح؟ اور کیونکر؟ کے الفاظ سے گریز کیجئے۔ یہ ایمان کا تقاضا ہرگز نہیں، ایمان صرف تسلیم ورضا سکھاتا ہے۔

مندرجہ ذیل ارشاد ربانی میں غور کیجئے:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا﴾ (الحدید: ٤)

آیت کی تمام ضمیریں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہیں، اسی طرح ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ (الحدید: ٤) کی ضمیر کا مرجع بھی ذات باری تعالیٰ ہے۔ از روئے ایمان ہم پر آیت کے ظاہر پر ایمان لانا واجب ہے۔ ہمیں یقین کی حد تک یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ معیت اس بات کی متقاضی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں ہمارے ساتھ ہو، بلکہ وہ ہمارے ساتھ بھی ہے اور عرش عظیم پر مستوی بھی۔ اگر ہم اس معیت پر ایمان رکھیں تو اس سے ہم پر یہ لازم آئے گا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں اور تقویٰ اختیار کریں ایک حدیث میں آتا ہے: ''بہترین ایمان یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا علم ہو کہ آپ جہاں بھی ہوں گے اللہ آپ کے ساتھ ہوگا۔''❷

---

❶ صحیح مسلم: ۳۹۵۔ عن ابی هریرة رضی الله عنه.

❷ اسے طبرانی نے الکبیر اور الاوسط میں ذکر کیا، ملاحظہ ہو: مجمع الزوائد: ۱/ ۶۰۔ نیز بیہقی نے الاسماء والصفات: ۹۰۷۔ اور ابونعیم نے الحلیة: ۶/ ۱۲٤ میں روایت کیا۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف الجامع: ۱۰۰۲۔ میں ضعیف کہا ہے۔ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے: تزکیة النفس ان یعلم ان الله معه حیث کان. اسے بیہقی نے السنن: ٤/ ۹۵۔ ابن عاصم نے الاحاد والمثانی: ۱۰٦۲ میں اور فسوی نے المعرفة والتاریخ: ۱/۲٦۹ میں۔ صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: السلسلة الصحیحة: ۱۰٤٦.



اس کے برعکس حلولیہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے، آپ مسجد میں ہوں یا بازار میں، گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، وہ ہر جگہ آپ کے ساتھ ہے، حتیٰ کہ اگر آپ غسل خانے میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس جگہ بھی آپ کے ساتھ ہوگا۔

بحث ششم:......حلولیہ کا شبہ اور ان کی تردید:

حلولیہ اس شبہ میں گرفتار ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ کہ اللہ ذاتی طور پر ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے، قرآنی الفاظ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ کے ظاہری مفہوم پر مبنی ہے اس لیے کہ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ ، ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى﴾ ، ﴿يَعْلَمُ﴾ ، ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ (الحدید: ٤) کی تمام ضمیریں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہیں، جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو ہمارے نزدیک اس کا معروف مفہوم کسی جگہ ایک ساتھ ہونا اور باہم اختلاط ہے۔

ان لوگوں کی تردید کئی وجوہ سے ممکن ہے:

اولاً: اس آیت کا ظاہر وہ نہیں ہے جو تم نے بتایا ہے، اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو آیت میں تناقض ہوتا، بایں طور کہ وہ عرش پر مستوی بھی ہے، اور ہر جگہ ہر انسان کے ساتھ بھی۔ جبکہ کلام اللہ میں تناقض کا پایا جانا امر مستحیل ہے۔

ثانیاً: تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ ''معیت کا مفہوم صرف کسی جگہ میں مخالطت یا مصاحبت ہے'' عربی لغت میں معیت مطلق مصاحبت سے عبارت ہے اور یہ اپنے مدلول کے اعتبار سے تمہارے زعم سے کہیں زیادہ وسعت کی حامل ہے۔

معیت کبھی اختلاط کی متقاضی ہوتی ہے، کبھی مصاحبت فی المکان کی اور کبھی مطلق مصاحبت کی، اگرچہ مکان مختلف ہو۔

١۔ اختلاط کی متقاضی معیت کی مثال کسی کا یہ کہنا ہے: مجھے پانی کے ساتھ دودھ پلائیں، یعنی پانی ملا دودھ پلائیں۔

٢۔ مصاحبت فی المکان کی متقاضی معیت کی مثال آپ کا یہ قول ہے: میں نے فلاں شخص کو فلاں شخص کی معیت میں پایا وہ اکٹھے چلتے اور اکٹھے پڑاؤ کرتے ہیں۔

٣۔ اس معیت کی مثال جو نہ تو اختلاط کا تقاضا کرتی ہے اور نہ مشارکت فی المکان کا، کسی کا یہ قول ہے: فلاں شخص اپنے لشکر کے ساتھ ہے، حالانکہ وہ کنٹرول روم میں بیٹھا اسے ہدایات دے رہا ہوتا ہے، اس مثال میں نہ تو اختلاط ہے۔ اور نہ جگہ میں مشارکت۔

کہا جاتا ہے: فلاں شخص کی بیوی اس کے ساتھ ہے، حالانکہ وہ مشرق میں ہوتی ہے اور اس کا خاوند مغرب میں۔ جب یہ کہا جاتا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ (النحل: ١٢٨) ''یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔'' تو یہ ارشاد مکان میں اختلاط یا مشارکت کا متقاضی نہیں ہے، بلکہ یہ ایسی معیت ہے جو اللہ کے شایان شان ہے اور اس کا مقتضی تائید ونصرت ہے۔

ثالثاً: اللہ تعالیٰ کو جگہ جگہ موجود تسلیم کرنا اس کی تنقیص کے مترادف ہے، وہ تو اپنی تعریف کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں اپنے عرش پر مستوی ہونے کے باوجود اپنی مخلوق کے ساتھ ہوں وہ جس قدر بھی نیچے کیوں نہ ہو، مگر جب تم اسے عرش

سے زمین پر آئے تو ذات باری میں تنقیص کے مرتکب ہوئے۔

رابعاً: تمہارے اس قول سے دو باتوں میں سے ایک ضرور لازم آتی ہے، جبکہ وہ دونوں ممتنع ہیں، یا تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے کئی اجزاء ہیں اور ان میں سے ہر جزء کسی جگہ موجود ہوتا ہے، یا پھر اللہ ایک نہیں بلکہ کئی ہوں اور ہر اللہ ضرورت کے مطابق ہر جگہ موجود ہو۔

خامساً: تمہارا یہ قول اس بات کو بھی مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں حلول کیے ہوئے ہے، جو کہ وحدۃ الوجود کے قائلین کے لیے سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ جب کہ یہ قول باطل اور اس کا مقتضیٰ کفر ہے۔

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر ہمارے ساتھ ہے، وہ کافر ہے، اسے اس عقیدہ سے توبہ کرنے کو کہا جائے اور اس پر حق اشکارا کیا جائے، اگر وہ اس سے رجوع کرلے تو فبہا، ورنہ اسے قتل کرنا واجب ٹھہرے گا۔

آیات معیت

پہلی آیت: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ (الحدید: ٤) ''وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔''

شرح: ......شاہد اس ارشاد باری میں ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ اس میں معیت عامہ کا بیان ہے، اس لیے کہ یہ از روئے علم وقدرت اور سمع وبصر مخلوق کے احاطہ کا متقاضی ہے۔

دوسری آیت: ﴿مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ (المجادلة: ٧) ''نہیں ہوتا کوئی مجمع تین سرگوشی کرنے والوں کا مگر وہ (اللہ) ان میں چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ کا مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے وہ جہاں بھی ہوں پھر وہ قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال کی خبر دے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

شرح: ......[مَا یَكُوْنُ]......(یکون) تامہ ہے، یعنی نہیں پایا جاتا۔

[مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ]......یہ صفت کی موصوف کی طرف اضافت کے باب سے ہے۔ جس کی اصل عبارت یوں ہے: من ثلاثة نجوىٰ، اور (نجوی) کا معنی ہے: سرگوشی کرنے والے۔

[اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ]......اللہ تعالیٰ نے (الا وھو ثالثھم) نہیں فرمایا، اس لیے کہ یہ غیر جنس سے ہے، غیر جنس سے ہونے کی صورت میں اگلا عدد لایا جاتا ہے، جبکہ جنس سے ہونے کی صورت میں وہی عدد ذکر کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو نصاریٰ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی:



﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ (المائدۃ: ۷۳)

''یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ تینوں کا تیسرا ہے۔''

انہوں نے ''ثـالـث اثنين'' اس لیے نہیں کہا کہ وہ ان کے خیال میں ان کا ہم جنس ہے، وہ ان تینوں کو ہی معبود سمجھتے تھے۔ لہٰذا جب وہ ان کے خیال میں ان کا ہم جنس تھا تو انہوں نے ﴿ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ کہہ دیا۔

[وَلَا خَـمْـسَةٍ اِلَّا هُـوَ سَـادِسُهُمْ] .... اللہ تعالیٰ نے طاق عدد کا ذکر کرتے ہوئے تین اور پانچ کا ذکر فرمایا جبکہ جفت عدد سے خاموشی اختیار فرمائی، مگر وہ ﴿وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ﴾ میں داخل ہے۔ تین سے کم میں دو کا اور پانچ سے زیادہ میں چھ اور اس سے زیادہ کا جفت عدد داخل ہے۔ یعنی دو یا دو سے زیادہ جتنے بھی لوگ جس جگہ میں بھی سرگوشیاں کریں گے اللہ ان کے ساتھ ہوگا۔

یہ معیت عامہ ہے، اس لیے کہ یہ مومن و کافر، اور نیک و بد ہر ایک کو شامل ہے اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم وقدرت، سمع وبصر اور تدبیر وغیرہا کے ساتھ ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔

[ثُـمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ] .... یعنی یہ معیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کے جملہ اعمال اللہ تعالیٰ کے شمار میں ہیں اور وہ انہیں قیامت کے دن ان کی خبر دے گا اور پھر اس پر ان کا محاسبہ کرے گا، خبر دینے سے مراد اس کا لازم ہے جو کہ احتساب سے عبارت ہے، لیکن اگر وہ مومن ہوں گے تو اللہ ان کے اعمال کا شمار تو کرے گا مگر پھر ان سے فرمائے گا:

''میں نے دنیا میں تمہارے گناہوں پر پردہ ڈالے رکھا اور آج انہیں معاف کرتا ہوں۔''[1]

[اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ] .... اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، وہ موجود ہو یا معدوم، جائز ہو یا واجب یا پھر ممتنع۔

تیسری آیت: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ٤٠) ''غم نہ کریں یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

شرح: ...... یہ بات نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمائی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ٤٠)

''اگر تم اس کی مدد نہیں کرو گے تو یقیناً مدد کی تھی اس کی اللہ نے۔ جب نکال دیا تھا اس کو کافروں نے، وہ دو کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ کہہ رہا تھا اپنے ساتھی سے کہ غم نہ کر یقیناً اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہجرت مدینہ کے دوران میں تین مواقع پر نبی ﷺ کی مدد فرمائی۔

اولاً: جب کفار نے آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے باہر نکال دیا۔ ﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

ثانیاً: غار ثور میں قیام کے دوران۔ ﴿اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾

ثالثاً: غار ثور کے منہ پر مشرکین کے کھڑا ہونے کے وقت ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ جب مشرکین

---

[1] بخاری و مسلم کی اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے۔

آپ ﷺ کا تعاقب کرتے ہوئے غار ثور کے سامنے کھڑے ہو گئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: ''اللہ کے رسول! اگر ان میں سے کسی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔'' ❶ یعنی ہم خطرے میں ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی فرعون اور آل فرعون سے بھاگ کر سمندر کے قریب پہنچے اور پھر فرعونی سپاہ کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو کہنے لگے: ﴿إِنَّا لَمُدْرَكُونَ٥﴾ (الشعراء: ٦١) ''یقیناً ہم پکڑے گئے۔'' تو موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے:

﴿كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ﴾ (الشعراء: ٦٢)

''ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ عنقریب میری راہنمائی کرے گا۔''

جبکہ اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ''غم نہ کر یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' یوں آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے ساتھی کو مکمل طور پر امن ہونے کا یقین دلایا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ: ''ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' اس جگہ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کی نہی اس غم کو بھی شامل ہے، جو لاحق ہو چکا اور اس غم کو بھی جو آئندہ چل کر مستقبل میں لاحق ہونے والا تھا۔

حزن: غم کی شدت کو کہا جاتا ہے۔

[إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا] .... یہ معیت خاصہ ہے، جو کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مقید ہے۔ جو کہ از روئے علم وقدرت اور سمع وبصر کے احاطہ کے ساتھ تائید ونصرت کی بھی متقاضی ہے، چنانچہ کفار ومشرکین غار ثور کے اوپر کھڑے رہنے کے باوجود انہیں دیکھ نہ سکے اور یوں اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر کے انہیں ناکام واپس جانے پر مجبور کر دیا، اور یہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ اس دوران مکڑی نے غار کے دروازے پر جالا بن دیا اور ایک کبوتری نے وہاں انڈے دے دیئے اور جب مشرکین نے یہ کیفیت دیکھی تو وہ واپس مڑ گئے۔ تو یہ واقعہ غیر معتبر ہے۔ ❷

اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت کا مزہ تو تب ہے کہ غار کا راستہ صاف طور پر کھلا ہو اور اس تک رسائی میں کوئی حسی مانع بھی موجود نہ ہو مگر کفار پھر بھی اس میں موجود کسی کو دیکھ نہ سکیں اور یوں ناکام وخاسر سر پر خاک ڈالتے واپس لوٹ جائیں۔ کبوتری کا انڈے دینا اور مکڑی کا جالا بننا، بعید تو ہے ہی یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس بات کے بھی خلاف ہے کہ ''اگر ان لوگوں میں سے کسی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔''

بعض مؤرخین (عفا اللہ عنهم) کبھی کبھی ایسی عجیب وغریب، شاذ اور منکر باتیں بھی لکھ دیا کرتے ہیں، جنہیں نہ تو عقل قبول کرتی ہے اور نہ ہی از راہ نقل ان کی صحت ثابت ہوتی ہے۔

چوتھی آیت: ﴿إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ (طٰه: ٤٦) ''یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا ہوں۔''

---

❶ صحیح بخاری: ٣٦٥٣۔ صحیح مسلم: ٢٣٨١ عن انس بن مالك رضی الله عنه.

❷ هیثمی اسے مجمع: ٦/ ٥٣۔ میں بزار اور طبرانی کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس کی سند میں کچھ راویوں کو میں نہیں جانتا۔'' اسے ابن سعد نے الطبقات: ١/ ٢٢٩ میں روایت کیا ہے، شیخ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے، الضعیفة: ١١٢٨.

شرح: ...... جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا تو فرمایا:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝﴾

(طٰهٰ: ٤٣ـ ٤٦)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، یقیناً وہ سرکش ہوگیا ہے، اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا، شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے اس پر وہ دونوں کہنے لگے: یقیناً ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا سرکش ہو جائے گا، اللہ نے فرمایا: تم ڈرو نہیں، یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔''

[اَسْمَعُ وَ اَرٰی]..... جملہ مستانفہ ہے، جس سے مقصود اس معیت خاصہ جو کہ سمع ورؤیت سے عبارت ہے، کے مقتضیٰ کو بیان کرتا ہے اور یہ سمع ورؤیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان دونوں کی نصرت وتائید اور اس فرعون سے بچاؤ کا تقاضا کرتی ہیں جس کے بارے میں انہوں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا: ''کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا سرکشی پر اتر آئے گا۔''

پانچویں آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝﴾ (النحل: ١٢٨) ''یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔''

شرح: ...... اس سے قبل فرمایا گیا ہے:

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝﴾ (النحل: ١٢٦ـ ١٢٧)

''اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو انہیں اتنا ہی دکھ پہنچاؤ جتنا دکھ انہوں نے تمہیں پہنچایا ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھا ہے، آپ صبر کیے رہیے اور آپ کا صبر تو بس اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور آپ ان پر غم نہ کریں اور نہ ان چالوں سے جو یہ لوگ چلتے رہتے ہیں تنگ دل ہوں۔''

مجرم کو اس کے جرم کے مطابق سزا دینا تقویٰ ہے، اس سے زیادہ ظلم وعدوان، اور معاف کر دینا احسان ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تقویٰ شعار لوگوں اور محسنین کے ساتھ ہے۔

یہ معیت خاصہ ہے جو کہ صفت کے ساتھ مقید ہے، یعنی ہر وہ شخص جس کا شمار محسنین اور متقی لوگوں میں ہوگا اللہ اس کے ساتھ ہوگا۔ اس آیت سے ہمیں تقویٰ واحسان اختیار کرنے کا درس ملتا ہے، اس لیے کہ ہم میں سے ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے کہ اللہ اس کے ساتھ رہے۔

چھٹی آیت: ﴿وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (الانفال: ٤٦) ''اور صبر کرو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

شرح: ...... ہم عرض کر چکے ہیں کہ صبر کا مطلب ہے نفس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کا پابند بنانا، اسے اللہ تعالیٰ کی



معصیت سے روکنا اور اسے قضاء وقدر پر ناراض ہونے سے باز رکھنا۔ چاہے یہ سب کچھ زبان کے ساتھ ہو، دل کے ساتھ ہو یا جوارح کے ساتھ۔ صبر کی بہترین قسم رب تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا اور پھر اس کی معصیت سے صبر کرنا ہے، اس لیے کہ انسان کو ان دونوں چیزوں میں اختیار حاصل ہے، وہ چاہے تو اوامر شرعیہ کی تعمیل کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے، اسی طرح اگر وہ چاہے تو محرمات شرعیہ کو ترک کر دے اور اگر چاہے تو ان کا ارتکاب کرتا رہے کہ قضا وقدر پر صبر کرنا صبر کا آخری مرتبہ ہے، اس لیے کہ اگر آپ چاہیں یا نہ چاہیں تقدیر نے واقع ہو کر رہنا ہے، اگر آپ چاہیں تو باعزت لوگوں کی طرح صبر کر لیں اور اگر چاہیں تو جانوروں کی طرح بے بس ہو کر خاموش ہو رہیں۔

صبر بڑا بلند پایہ مقام ومرتبہ ہے جو کسی قابل صبر چیز پر صبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، مگر جن کی راہوں پر پھول بچھے ہوں اور لوگ ان کے اشارہ ابرو کے منتظر ہوں، تو یہ اعزاز ان کا مقدر بننے والا نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو شاکر بھی بنایا اور صابر بھی۔

شاکر تو یوں کہ آپ اس قدر طویل قیام فرماتے کہ پاؤں پر ورم آ جاتا اور پھر فرماتے: ''کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' [1]

صابر یوں کہ آپ ﷺ نے ہر طرح کی اذیت پر صبر کیا، آپ ﷺ کو نہ صرف یہ کہ اپنی قوم کی طرف سے بلکہ یہودیوں اور منافقوں کی طرف سے بھی اذیتیں دی گئیں مگر آپ نے کبھی بھی صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ساتویں آیت: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرہ: ۲۴۹) ''کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بہت بڑی جماعت پر غالب آ گئی اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

شرح: ......[كَمْ]...خبریہ ہے اور تکثیر کا فائدہ دے رہا ہے، یعنی کئی دفعہ ایسا ہوا کہ چھوٹی سی جماعت بہت بڑی جماعت پر غالب آ گئی، یا متعدد چھوٹی چھوٹی جماعتیں، متعدد بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں، مگر اپنی قوت کے ساتھ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن یعنی اس کی قدرت اور اس کے ارادہ سے غالب آئیں۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تھوڑی سی جماعت اپنے دشمنوں پر غالب آ گئی، حالانکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

جنگ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ کرنے کے ارادے سے نہیں بلکہ ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے ساز وسامان پر قبضہ کرنے کے لیے نکلے تھے۔ جب ابوسفیان کو ان کی آمد کا علم ہوا تو اس نے یہ اعلان کرنے کے لیے ایک شخص کو مکہ مکرمہ بھیجا کہ اپنا قافلہ بچالو، محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اسے لوٹنے کے لیے مدینہ سے نکل پڑے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ قافلہ قریش مکہ کے بہت زیادہ سامان خورد ونوش پر مشتمل تھا، پیغام ملتے ہی مکہ کے بڑے بڑے رؤساء اور سردار اپنی شان وشوکت اور قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ ابوجہل کہنے لگا: اللہ کی قسم! ہم واپس نہیں لوٹیں گے، یہاں تک کہ بدر کے مقام پر پہنچ کر وہاں تین دن قیام کریں گے اس دوران ہم اونٹ ذبح کریں گے، شراب نوشی

[1] یہ حدیث صحیح بخاری وصحیح مسلم کی ہے اور اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

کریں گے، محافل موسیقی کا انعقاد ہوگا، جس سے عربوں پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور پھر کبھی بھی ہمارا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کرسکیں گے۔ ❶

بحمد اللہ وہ محافل موسیقی تو نہ سجا سکے، البتہ ابوجہل اور دوسرے مقتولین کا ماتم کرتے ضرور نظر آئے۔

ان لوگوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی، اور وہ ہر روز نو سے دس اونٹ نحر کرتے تھے جبکہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے رفقاء کی تعداد تین سو چودہ تھی۔ ❷ اوران کے پاس صرف ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے، جن پر وہ باری باری سوار ہوتے۔ مگر اس بے سروسامانی کے باوجود انہوں نے بڑے بڑے سرداران قریش کو قتل کر ڈالا، یہاں تک کہ جب ان کی لاشیں دھوپ میں پڑی رہنے کی وجہ سے گل سڑ گئیں تو انہیں گھسیٹ کر میدان بدر کے ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا۔

اہل ایمان کی یہ جماعت اگرچہ تعداد کے اعتبار سے بہت چھوٹی تھی مگر اللہ نے اسے بہت بڑی جماعت پر غالب کر دیا جو کہ اس کے صبر کا ثمرہ تھا۔ ﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اس جماعت نے ہر طرح کا صبر کیا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر بھی اور اس کی معصیت سے بھی، اور دوران جہاد پیش آنے والی ہر قسم کی تھکاوٹ اور مشقت کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، اس لیے کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔'' اس عقیدہ سے ہم کون سے ثمرات حاصل کر سکتے ہیں؟

اولاً: جب ہمارا اس بات پر ایمان ہوگا کہ اللہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے، تو ہمارا یہ عقیدہ ہمارے لیے اس بات کو ضروری قرار دے گا کہ ہم مکمل طور پر اس کی اطاعت کریں اور اس کی معصیت سے باز رہیں۔

ثانیاً: بایں طور کہ اس نے ہمیں جس جگہ موجود رہنے کا حکم دیا ہے وہ اس جگہ سے ہمیں غیر حاضر نہ پائے۔'' اور جس جگہ آنے جانے سے ہمیں منع کیا ہے ہمیں وہاں حاضر نہ پائے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات کلام

❑ مؤلف رحمہ اللہ نے اس جگہ کلام اللہ پر دلالت کرنے والی قرآنی آیات کا ذکر کیا ہے، نیز یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے:

پہلی اور دوسری آیت: ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء: ۸۷) ''اور اللہ سے بات میں سچا کون ہے؟'' ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (النساء: ۱۲۲) ''اور اللہ سے بات میں سچا کون ہے؟''

شرح: ......[مَنْ]..... نفی کے معنی میں اسم استفہام ہے، صیغہ استفہام کے ساتھ نفی لانا مجرد نفی لانے سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ استفہام کی صورت میں اس میں تحدی کے معنی کی آمیزش ہوتی ہے، گویا کہ اللہ فرما رہا ہے، اللہ سے زیادہ سچی بات والا کوئی نہیں ہے اور اگر تو اس کے برعکس خیال کرتا ہے تو پھر بتا کہ اللہ سے زیادہ سچا کون ہے؟

❶ اسے ابن جریر طبری نے روایت کیا ہے: ٦١٢٦٢.   ❷ ملاحظہ فرمائیں، فتح الباری: ۷/ ۲۹۱.



[حَدِيْثًا]، [قِيْلًا]......﴿اَصْدَقُ﴾ کی تمییز ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں اثبات کلام ﴿اَصْدَقُ﴾ سے ماخوذ ہے، اس لیے کہ صدق کے ساتھ کلام کو ہی موصوف کیا جاتا ہے اسی طرح اثبات کلام ﴿حَدِيْثًا﴾ سے بھی ماخوذ ہے، اور یہ اس لیے کہ حدیث کلام سے عبارت ہے، نیز یہ ﴿قِيْلًا﴾ سے بھی ماخوذ ہے، جس سے مراد قول ہے اور قول صرف لفظ کی صورت میں ہوتا ہے۔

اور اس میں کسی بھی طرح سے کذب کا کوئی وجود نہیں ہے۔

تیسری آیت: ﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ (المائدة: ۱۱۶) ''اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ بن مریم!''

شرح:......[يٰعِيْسَى]...... قول کا مقول ہے۔

اس آیت میں اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتا ہے اور یہ کہ اس کا قول سنا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس کا قول کلمات اور جملوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور حروف سے تشکیل پاتا ہے۔

لہٰذا اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی کلام کے ساتھ تکلم فرماتا ہے، جب چاہے، جسے چاہے اور جو چاہے، حروف کے ساتھ اور آواز کے ساتھ، اور اس کی آواز مخلوق کی آوازوں سے مماثل نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ یہ حروف ہیں اور آواز بھی، اس لیے کہ اللہ نے جو کچھ فرمایا اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سن رہے تھے، مگر اس کی آواز مخلوق کی آوازوں کے مماثل نہیں ہے، اس لیے کہ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

چوتھی آیت: ﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ (الانعام: ۱۱۵) ''اور تیرے رب کے کلمات سچائی اور عدل میں پورے ہیں۔''

شرح:......[كَلِمَتُ] مفرد ہے، دوسری قراءت میں جمع کے ساتھ (كلمات) ہے۔ اور دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ اس لیے کہ (کلمہ) مفرد مضاف ہے، لہٰذا یہ عام ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلمات صدق اور عدل میں پورے ہیں، صدق کے ساتھ موصوف چیز خبر ہوتی ہے۔ جبکہ عدل کے ساتھ حکم موصوف ہوتا ہے، اسی لیے مفسرین فرماتے ہیں [1] اس کے کلمات اخبار میں سچے اور احکام میں عادلانہ ہیں۔ اس کی فراہم کردہ اخبار کو کسی بھی طرح سے کذب لاحق نہیں ہو سکتا اور اس کے احکام ہر طرح کے ظلم و جور سے مبرا ہیں۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمات کو صدق اور عدل کے ساتھ موصوف کیا، لہٰذا وہ اقوال ہیں، اس لیے کہ قول پر ہی صدق یا کذب کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔

پانچویں آیت: ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء: ۱٦٤) ''اور اللہ موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔''

شرح:......[اَللّٰهُ]...... فاعل ہے، کلام کا صدور اس سے ہوا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲٦۹.

[تَكْلِيْمًا] .... مصدر مؤکد ہے، جس کے بارے میں علماء فرماتے ہیں کہ یہ مجاز کے احتمال کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ: جاء زيد. ''زید آیا'' تو اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر آیا، اور اس معنی کا بھی احتمال ہے کہ اس کی خبر آئی، اگرچہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، لیکن اگر آپ تاکید کے انداز میں یوں کہیں: جاء زيد نفسه، یا جاء زيد زيد. تو اس سے مجاز کی نفی ہو جائے گی۔

پس اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنا، حروف اور آواز کے ساتھ حقیقی کلام تھا جسے انہوں نے اپنے کانوں سے سنا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان بات چیت ہوئی، جس طرح کہ سورۂ طٰہٰ وغیرہا میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

چھٹی آیت: ﴿مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ (البقرة: ٢٥٣) ''ان میں سے کچھ ایسے بھی جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوا۔''

شرح: ......[مِنْهُمْ] .... یعنی رسولوں میں سے۔

[مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ] .... اسم کریم ﴿اللّٰهُ﴾ كَلَّمَ کا فاعل ہے، اور اس کا مفعول محذوف ہے، یعنی: کلمه الله.

ساتویں آیت: ﴿وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ﴾ (الاعراف: ١٤٣) ''اور جب آیا موسیٰ ہمارے وقت پر اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے۔''

شرح: ...... اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے اور یہ اس لیے کہ کلام موسیٰ علیہ السلام کی آمد پر ہوا، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کا کلام اس کی مشیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کا قول باطل قرار پاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام وہ معنی ہے جو قائم بالنفس ہے اور اس کا رب تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

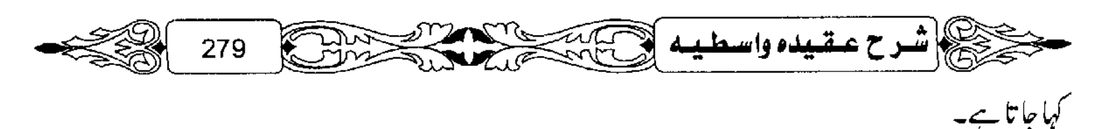
نیز اس سے بعض لوگوں کے اس گمان کی بھی تردید ہوتی ہے کہ صرف حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا تھا، جس کے لیے انہوں نے کلام اللہ ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا٥﴾ (النساء: ١٦٤) میں تحریف کرتے ہوئے اسم کریم کو منصوب پڑھا اور موسیٰ کو فاعل قرار دے دیا۔

آٹھویں آیت: ﴿وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا٥﴾ (مریم: ٥٢) ''اور ہم نے اسے کوہ طور کی دائیں جانب سے بلایا اور اسے سرگوشی کے لیے قریب کیا۔''

شرح: ......[نَادَيْنٰهُ] .... فاعل کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے، جبکہ مفعول کی موسیٰ کی طرف۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بلایا۔

[نَجِيًّا] .... حال ہے، اور یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔

مناداۃ اور مناجاۃ میں فرق یہ ہے کہ مناداۃ بعید کے لیے ہوتی ہے اور مناجاۃ قریب کے لیے اور دونوں ہی کو کلام



کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مناداۃ یا مناجاۃ کے انداز میں کلام کرنا علماء سلف کے اس قول میں داخل ہے کہ: ''وہ جس طرح چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔''

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کلام کرتا ہے، وہ مناداۃ کی صورت میں ہو یا مناجاۃ کی صورت میں۔

نویں آیت: ﴿وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (الشعراء: ۱۰) ''اور جب تمہارے رب نے موسیٰ کو بلایا کہ ظالم لوگوں کے پاس جائیں۔''

شرح:......[وَاِذْ نَادٰی].... یعنی وہ وقت یاد کریں جب تمہارے رب نے موسیٰ کو بلایا۔

شاہد ﴿رَبُّكَ مُوْسٰٓی﴾ ہے۔ رب تعالیٰ نے نداء کی تفسیر: ﴿اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ کے ساتھ فرمائی ہے، نداء اس کے آواز ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور ﴿اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ اس کے حروف ہونے پر۔

دسویں آیت: ﴿وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ﴾ (الاعراف: ۲۲) ''اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کہ کیا میں نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا تھا۔''

شرح:......[وَ نَادٰىهُمَا].... مفعول بہ کی ضمیر آدم وحواء کی طرف لوٹتی ہے۔

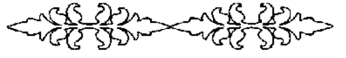
[اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ].... اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس درخت سے روکا تھا۔ اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس سے قبل کلام فرمایا تھا، اور یہ کہ اللہ کا کلام آواز اور حروف کے ساتھ ہوتا ہے اور اس بات کی بھی کہ اس کا تعلق اس کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ قول نہی کے بعد کا ہے۔

گیارھویں آیت: ﴿وَ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ (القصص: ۶۵) ''اور جس دن وہ ان کو آواز دے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟''

یعنی وہ دن یاد کریں جب اللہ انہیں آواز دے گا۔ یہ قیامت کے دن ہوگا اور آواز دینے والا اللہ ہوگا۔ اس آیت میں اثبات کلام دو طرح سے کیا گیا ہے: نداء سے بھی اور قول سے بھی۔

مذکورہ بالا آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقی کلام کے ساتھ کلام فرماتا ہے، جب چاہے، جو چاہے اور جیسے چاہے۔ اس کا یہ کلام حروف کے ساتھ ہوتا ہے، قابل سماعت آواز کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ مخلوق کے کلام کے مماثل نہیں ہوتا۔

اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے۔



اس بات کا اثبات کہ قرآن کلام اللہ ہے

شرح:......اب مؤلف رحمہ اللہ وہ قرآنی آیات ذکر کرنے چلے ہیں، جو قرآن کے کلام اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں:



اس مسئلہ میں معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان بہت زیادہ نزاع رہا ہے اور اس کی وجہ سے اہل سنت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس بارے میں جن لوگوں کو بڑی اذیتوں سے دو چار کیا گیا ان میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا نام سرفہرست ہے، جن کے بارے میں بعض علماء کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے فتنۂ ارتداد کے ایام میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے اور فتنۂ خلق قرآن کے مشکل ترین ایام میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ذریعے اسلام کی نصرت وحفاظت فرمائی۔'' ❶

خلیفہ مامون نے لوگوں کو خلق قرآن کا عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کیا اور اس کے لیے اس نے اس قدر متشددانہ رویہ اختیار کیا کہ اس نے کتنے ہی ایسے علماء کو قتل کر ڈالا جنہوں نے یہ عقیدہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، جبکہ بہت سارے علماء جانیں بچانے کے لیے مختلف تاویلیں گھڑنے لگے۔

مثلاً یہی کہ یہ جبر واکراہ کی حالت ہے اور مجبور آدمی جب زبان سے کلمہ کفر ادا کرے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو اس کا یہ عمل قابل معافی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح رحمہما اللہ نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ قرآن کلام اللہ ہے، یہ اللہ کی مخلوق نہیں ہے، ان کے خیال میں ان پر جس قدر بھی تشدد روا رکھا جائے اس سے ان کے لیے خلاف حق بات کرنے کا جواز پیدا نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یہ جہاد کا وقت ہے اکراہ اس صورت میں عفو ودرگزر کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب کوئی شخصی قسم کا مسئلہ درپیش ہو، مگر جب مسئلہ شریعت کے تحفظ کا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی شریعت کی حفاظت کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اگر اس وقت امام احمد رحمہ اللہ قرآن کے مخلوق ہونے کا فتویٰ جاری کر دیتے تو سب لوگ اسے تسلیم کر لیتے مگر آپ ثابت قدم رہے، اور مذموم حکومتی ہتھکنڈوں اور ایذا رسانیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے "القرآن کلام اللّٰہ" کے کلمہ حق کے علمبردار بنے رہے اور پھر بہتر انجام سے سرخرو ہوئے۔ وللہ الحمد

الغرض! قرآن کے بارے میں گفتگو کرنا عمومی طور پر کلام اللہ کے بارے میں گفتگو کا ہی حصہ ہوتا ہے مگر جب اس بارے میں ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اور معتزلہ واہل سنت کے درمیان یہ شدید قسم کا نزاعی مسئلہ بن گیا تو لوگ قرآن کے بارے میں الگ سے گفتگو کرنے لگے۔

پہلی آیت: ﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ٦) ''اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو حتیٰ کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔''

شرح: ......[اَحَدٌ]......بعض علماء نحو کے نزدیک یہ محذوف فعل کا فاعل ہے، جس کی تفسیر اس کا مابعد کرتا ہے، اس بناء پر تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ وان استجارك احد من المشركين فاجره . اس کی دوسری مثال یہ ارشاد باری ہے:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ (الانشقاق: ١)

❶ یہ علی بن المدینی کا قول ہے، ملاحظہ ہو: محنة الامام احمد بن حنبلؒ: ج ٣١۔ از عبدالغنی القدسیؒ۔ نیز سیر اعلام النبلاء: ١١/ ١٩٦۔

اس جگہ السَّمَآءُ محذوف فعل کا فاعل ہے اور تقدیری عبارت اس طرح ہے: اذا انشقت السماء ، اس بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿اَحَدٌ﴾ فاعل مقدم ہے اور فعل (استجار) مؤخر۔ اس صورت میں تقدیری عبارت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿اَحَدٌ﴾ مبتدا اور ﴿اسْتَجَارَكَ﴾ اس کی خبر ہے۔

میرے نزدیک نحویوں کے آسان ترین قول کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔ بشرطیکہ کوئی شرعی مانع نہ ہو۔

[اسْتَجَارَكَ]..... یعنی وہ آپ کے جوار کا طالب ہو اور جوار عصمت وحمایت کے معنی میں ہے۔

[حَتّٰى يَسْمَعَ]..... ﴿حَتّٰى﴾ غایت کے لیے ہے۔ معنی یہ ہے: اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ کا طالب ہو تا کہ وہ کلام اللہ کو سن سکے تو اسے پناہ دے دیں یہاں تک کہ وہ کلام اللہ کو سن لے، کلام اللہ سے مراد بالاتفاق قرآن مجید ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ﴿فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ فرمایا، اس لیے کہ کلام اللہ اثر کیا کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ (ق: ۳۷) ''یقیناً اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو صاحب دل ہو یا وہ کان لگائے اور وہ خود بھی متوجہ ہو۔'' کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو کتاب اللہ کو سن کر ایمان لے آئے، مگر اس کے لیے اسے مکمل طور پر سمجھنا شرط ہے۔

اہل سنت کا عقیدہ کہ قرآن کلام اللہ ہے اور اس کے دلائل

[كَلٰمَ اللّٰهِ]..... اللہ تعالیٰ نے کلام کو اپنی ذات کی طرف مضاف کیا، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن، کلام اللہ ہے۔

قرآن کے بارے میں اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے، منزل من اللہ ہے، غیر مخلوق ہے، اسی کی طرف سے اس کا آغاز ہوا اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

قرآن کے کلام اللہ ہونے کی دلیل: ﴿فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبة: ٦) ''اسے پناہ دے دیں حتیٰ کہ وہ کلام اللہ کو سن لے۔''

اس کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرة: ١٨٥) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔'' ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر: ١) ''بیشک ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں اتارا۔'' ﴿وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ (الاسراء: ١٠٦) ''اور ہم نے اسے آہستہ آہستہ نازل کیا۔''

قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی دلیل: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (الاعراف: ٥٤) ''خبردار! مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔'' اس جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خلق اور امر کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیا ہے، اس لیے کہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے اور قرآن کا شمار امر میں ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ (الشوریٰ: ٥٢)

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف قرآن وحی کیا روح اپنے حکم سے، آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنایا ہے، ہم اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔''

جب قرآن امر ہے اور خلق کا قسیم ہے، تو وہ غیر مخلوق قرار پایا، اس لیے کہ اگر قرآن مخلوق ہوتا تو پھر یہ تقسیم صحیح نہ ہوتی۔

یہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی سمعی دلیل ہے۔

رہی اس کی عقلی دلیل، تو ہم کہتے ہیں کہ قرآن کلام اللہ ہے اور کلام ایسا وجود نہیں ہے جو از خود قائم ہو یہاں تک کہ اللہ سے الگ ہو جائے۔ اگر اس کی یہ کیفیت ہوتی تو ہم اسے مخلوق تسلیم کر لیتے۔ یہ کلام متکلم بہ کی صفت ہے، پھر جب وہ متکلم بہ کی صفت ہے اور اللہ کی طرف سے ہے تو وہ غیر مخلوق ہوگی، اس لیے کہ تمام کی تمام صفات غیر مخلوق ہیں۔

نیز اگر قرآن مخلوق ہوتا تو امر و نہی اور خبر و استخبار کا مدلول باطل قرار پاتا، اس لیے کہ اگر یہ صیغے مخلوق ہوتے تو پھر محض شکلیں ہوتے جنہیں اس پر تخلیق کیا گیا ہوتا اور ان کی اپنے معنی پر کوئی دلالت نہ ہوتی۔ قرآن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی گئی ہے، جبرئیل امین علیہ السلام کی طرف بھی اور حضرت محمد ﷺ کی طرف بھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کی مثال یہ ارشاد باری ہے: ﴿فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ﴾ (التوبة: ٦) ''اسے پناہ دے دیں حتیٰ کہ وہ کلام اللہ کو سن لے۔''

جبرئیل امین علیہ السلام کی طرف اضافت کی مثال یہ ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝﴾ (التکویر: ١٩۔٢٠) ''یقیناً یہ پیغام ہے فرشتے عالی مرتبت کا، جو صاحب قوت عرش والے کے نزدیک اونچے درجے والا ہے۔'' اور محمد ﷺ کی طرف اس کی اضافت کی مثال یہ قرآنی فرمان ہے: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝﴾ (الحاقة: ٤٠۔٤١) ''یقیناً وہ قرآن پیغام ہے بڑے باعزت پیامبر کا اور وہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔'' جبرئیل امین اور نبی کریم ﷺ کی طرف قرآن کی اضافت ان کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے ہے، اس لیے نہیں کہ ان سے اس کی ابتدا ہوئی۔

قول و الیہ یعود کے معنی ومفہوم

قرآن کے بارے میں اہل سنت کے اس عقیدہ کہ: وہ اسی کی طرف لوٹ جائے گا'' کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ اس کا پہلا مفہوم وہ ہے جو بعض آثار میں وارد ہوا کہ قرآن کو ایک ہی رات میں اٹھا لیا جائے گا، لوگ صبح اس حالت میں کریں گے کہ قرآن ان کے پاس نہیں ہوگا، نہ ان کے سینوں میں اور نہ ہی مصاحف میں، اللہ اسے اوپر اٹھا لے جائے گا۔ [1]

---

[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی اس روایت کو طبرانی نے روایت کیا، اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں، بجز شداد بن معقل کے اور وہ بھی ثقہ ہے، ملاحظہ ہو: مجمع الزوائد: ٧/ ٣٣٠۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں، اس کی سند صحیح ہے مگر یہ روایت موقوف ہے فتح الباری: ١٣/١٦ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی اسی جیسی مرفوع حدیث بھی ہے، جسے ابن ماجہ نے روایت کیا اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری: ١٣/١٦ میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا، ملاحظہ ہو: الصحیحة، از البانی۔

یہ اس وقت ہوگا۔ واللہ اعلم۔ جب لوگ قرآن سے کلیتاً اعراض کرلیں گے، وہ نہ تو اس کی تلاوت کریں گے، نہ اس پر عمل کریں گے اور نہ ہی قرآنی عقیدہ رکھیں گے۔ ایسے حالات میں قرآن کو اٹھا لیا جائے گا، اس لیے کہ قرآن اس بات سے بالاتر ہے کہ وہ لوگوں میں اس طرح باقی رہے کہ وہ اسے ترک کردیں، اس سے منہ موڑ لیں اور اس کی تعظیم وتوقیر سے ہاتھ کھینچ لیں یہ۔ واللہ اعلم۔ آخر زمانے میں [1] کعبہ مشرفہ کو گرائے جانے کی نظیر ہے۔ جب سرزمین حبشہ سے ایک سیاہ رنگ اور کوتاہ قد آدمی اپنے لشکر کے ساتھ مسجد حرام میں آئے گا اور کعبہ مشرفہ کا ایک ایک پتھر اکھاڑ کر اسے سمندر میں پھینک دے گا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے کعبہ مشرفہ کو گرانا ممکن بنا دے گا، جبکہ اس مقصد کے لیے مکہ مکرمہ پر چڑھائی کرنے والے ابرہہ کو اس نے مسجد حرام تک پہنچنے سے قبل ہی تہہ وتیغ کر ڈالا تھا، اس لیے کہ اسے علم تھا کہ وہ عنقریب نبی مکرم ﷺ کو مبعوث فرمائے گا اور پھر ان کے ہاتھوں مسجد حرام کی ہیبت وعظمت بحال ہوگی۔ مگر آخر زمانے میں محمد ﷺ کے بعد کسی کو نبی بنا کر مبعوث نہیں کیا جائے گا اور جب لوگ بیت اللہ کی تعظیم وتوقیر سے رخ موڑ لیں گے تو اس پر حبشہ کے اس شخص کو مسلط کر دیا جائے گا، یہ رفع قرآن کی نظیر ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ قرآن از روئے وصف اللہ کی طرف لوٹ جائے گا، یعنی اللہ کے سوا کسی کو بھی اس کے ساتھ موصوف نہیں کیا جائے گا، متکلم بالقرآن اللہ تعالیٰ ہوگا اور وہی اس کے ساتھ موصوف ہوگا۔

ہمارے لیے ان دونوں معنوں کو صحیح قرار دینے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

قرآن کریم کے بارے میں یہ اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے۔

معتزلہ کا عقیدہ کہ قرآن کلام اللہ نہیں اور ان کے دلائل

جبکہ معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں بلکہ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔

وہ اس کے لیے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کرتے ہیں: **پہلی آیت:** ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيلٌ﴾ (الزمر: ٦٢) ''اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔'' چونکہ قرآن بھی ایک چیز ہے لہٰذا وہ ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ کے عموم میں داخل ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ وجود صرف دو ہیں، ایک خالق کا اور دوسرا مخلوق کا، اللہ خالق ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ مخلوق ہے۔

اس کا جواب دو طرح سے ہے:

الاول: قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی ایک صفت ہے اور خالق کی صفات غیر مخلوق ہیں۔

الثانی: ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ یہ تعبیر عام ہے، مگر کبھی اس سے مراد خاص ہوا کرتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ملکہ سباء کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (النمل: ٢٣) ''اسے ہر چیز دی گئی۔''

---

[1] ملاحظہ ہو، مسند أحمد: ۲/ ۲۲۰۔ عن عبداللّٰه بن عمر رضی اللّٰه عنه۔ صحیح بخاری: ۱۵۹۱، صحیح مسلم: ۲۹۰۹۔ عن ابی هریرة رضی اللّٰه عنه. کتاب اشراط الساعة از شیخ یوسف وابل، ص: ۲۳۱۔



حالانکہ اس کے ملک سے کئی چیزیں خارج تھیں، مثلاً حضرت سلیمان کی سلطنت۔

سوال: کیا قرآن کے منزل اور مخلوق ہونے میں کوئی فرق ہے؟

جواب: ہاں، ان دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے، جس کی وجہ سے امام احمد رحمہ اللہ کے دور میں فتنہ خلق قرآن نے سر اٹھایا اور لوگوں کو بڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔

اگر ہم قرآن کو منزل من اللہ کہتے ہیں، تو اس کی صراحت خود قرآن میں اس طرح کی گئی ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ﴾ (الفرقان : ۱)

''بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل فرمایا۔''

اور اگر ہم اسے مخلوق کہتے ہیں تو اس سے مندرجہ ذیل امور لازم آئیں گے۔

اولاً: اس سے قرآن کی تکذیب لازم آئے گی، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوری : ۵۲) ''اسی طرح ہم نے آپ کی طرف قرآن یعنی اپنا امر بھیجا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اپنے رسول ﷺ کی طرف وحی قرار دیا ہے اگر قرآن مخلوق ہوتا تو اسے وحی کہا جانا درست نہ ہوتا، جب وہ وحی ہے تو اس سے اس کا غیر مخلوق ہونا لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہی تکلم فرمایا ہے۔

ثانیاً: اگر ہم اسے مخلوق کہیں گے تو اس سے امر و نہی اور خبر و استخبار کے مدلول کا ابطال لازم آئے گا، اس لیے کہ اگر یہ صیغے مخلوق ہوتے تو صرف ایسی شکلیں قرار پاتے جنہیں اس صورت میں تخلیق کیا گیا، جس طرح کہ سورج کو اس کی صورت پر، چاند کو اس کی صورت پر اور ستاروں کو ان کی صورتوں پر پیدا کیا گیا ہے، یوں نہ کوئی امر رہتا اور نہ نہی، نہ خبر اور نہ ہی استخبار۔ مثلاً کلمہ (قل) (لا تقل) (قال فلان) اور (هل قال فلان) یہ سب کے سب اس صورت پر نقوش ہوتے اور امر و نہی، اور خبر و استخبار پر ان کی دلالت باطل ہو جاتی، یہ محض نقوش و صور بن کر رہ جاتے اور ان کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

اسی لیے ابن قیم رحمہ اللہ ''نونیہ'' میں فرماتے ہیں: ''خلق قرآن کے اس قول سے امر و نہی کا ابطال لازم آتا ہے، اس طرح امر یوں ہوتا گویا کہ اسے اس صورت پر پیدا کیا گیا ہے علاوہ اس کے کہ اس کا مدلول معتبر ہو، اور نہی کو اس صورت پر پیدا کیا گیا ہے علاوہ اس کے کہ اس کا مدلول ہو، اور یہی حال خبر و استخبار کا ہوتا۔''

ثالثاً: اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور اللہ نے اسے اضافت خلق کے طور پر اپنی طرف مضاف کیا ہے تو انسان یا غیر انسان کے ہر کلام پر، کلام اللہ کا اطلاق درست ہوتا، اس لیے کہ مخلوق کا کلام بھی مخلوق ہوتی ہے۔ ان تین وجوہات کی بناء پر قرآن کے مخلوق ہونے کا قول باطل ہو جاتا ہے۔

رابعاً: جب تم کلام کے مخلوق ہونے کو جائز بناؤ گے تو اس سے تم پر اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو مخلوق قرار دینا لازم آئے گا، اس لیے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا تمہیں کہنا ہوگا کہ اس کی سمع بھی مخلوق ہے اور اس کی بصر بھی......

اگر تم یہ کہو کہ سمع سامع کے ساتھ قائم ایک معنی ہے۔ جسے نہ اس سے سنا جا سکتا ہے اور نہ دیکھا جا سکتا ہے بخلاف کلام

کے، اس لیے کہ ایسا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہوا میں آوازیں پیدا کر دے اور وہ سن لی جائیں اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہوا میں آوازیں پیدا کر دے اور وہ سن لی جائیں، تو اس صورت میں مسموع ہوا کی صفت ہوگا...... جس کے تم بھی قائل نہیں ہو، تم صفت کو اس کے موصوف کے غیر کی طرف کس طرح لوٹا سکتے ہو؟ یہ چار وجوہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خلق قرآن کا عقیدہ یکسر باطل ہے، ویسے اگر اتنی ہی بات ہوتی کہ اس عقیدہ سے امر ونہی اور خبر واستخبار کا ابطال لازم آتا ہے تو عقیدہ خلق قرآن کو باطل قرار دینے کے لیے بھی کچھ کافی تھا۔

دوسری آیت: ﴿وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة : ۷۵) ''تحقیق ان میں سے ایک فریق اللہ کے کلام کو سنتا تھا پھر وہ اسے سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر دیتا تھا اور وہ اسے جانتے تھے۔''

شرح: ...... یہ ارشاد اس ارشاد باری تعالیٰ کے سیاق میں ہے ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ ''کیا تم اس بات کا طمع رکھتے ہو کہ وہ تم پر یقین کر لیں گے۔''

[يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ].... کلام اللہ سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے، جو کہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت کلام کرنا ہو، جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ طے شدہ وقت کے لیے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تو وہ اسے سن رہے تھے، مگر انہوں نے اسے سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر ڈالی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے پہلے احتمال کا کسی مفسر نے ذکر نہیں کیا۔

صورت حال جو بھی ہو اس سے اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام مسموع آواز کے ساتھ ہوتا ہے، اور کلام متکلم کی صفت ہے اس سے الگ چیز نہیں ہے، اس سے یہ واجب قرار پاتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے کسی غیر کا نہیں۔

[يُحَرِّفُوْنَهٗ].... اس سے معنوی تحریف مراد ہے۔

[مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ].... ان کی بدکرداری اور اللہ تعالیٰ کے خلاف دیدہ دلیری کی انتہا ہے کہ انہوں نے کلام اللہ کو سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر ڈالی، مزید یہ کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس میں تحریف کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لاعلمی میں معنوی تحریف کرنے والے کا معاملہ اس آدمی کے معاملہ سے آسان ہے جو جاننے اور سمجھنے کے بعد تحریف کرتا ہے۔

تیسری آیت: ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (الفتح : ۱۵) ''وہ کلام اللہ کو تبدیل کر دینا چاہتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ تم ہمارے پیچھے ہرگز نہیں چل سکتے، اللہ نے پہلے ہی اسی طرح فرما دیا ہے۔''

شرح: ...... اس آیت سے بھی اس امر کا اثبات ہو رہا ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے۔ ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ.... الخ﴾ ضمیر ان بادیہ نشین لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ﴾ (الفتح : ١٥)

''عنقریب کہیں گے پیچھے رہ جانے والے جب تم غنیمتوں کی طرف چلو گے تاکہ انہیں حاصل کرو کہ ہمیں بھی اجازت دیں ہم بھی تمہارے پیچھے چلیں۔''

ان لوگوں کا ارادہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روانہ ہو کر اللہ کے کلام میں تبدیلی کر ڈالیں، مگر اللہ تعالیٰ غنیمتیں ان لوگوں کے لیے لکھ چکا تھا، جو صلح حدیبیہ کے وقت آپ ﷺ کے ساتھ تھے، مگر جو لوگ صرف مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوئے ان کا ان میں کوئی حق نہیں ہوگا۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے قول کا اثبات ہے۔﴿كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾

چوتھی آیت: ﴿وَ اتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ (الکهف : ٢٧) ''اور پڑھتے رہیں جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کے کلمات کو۔''

شرح:...... [مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ] ...یعنی قرآن مجید، وحی صرف قول کی صورت میں ہوتی ہے، لہٰذا وہ غیر مخلوق ہے۔

[مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ] ....اللہ تعالیٰ نے کتاب کو اپنی ذات کی طرف مضاف فرمایا، اس لیے کہ قرآن کا متکلم وہی ہے اور اس نے اسے جبریل علیہ السلام کی وساطت سے محمد کریم ﷺ پر نازل فرمایا۔

[لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ] .... یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ خود ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ میں تبدیل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ اِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (النحل : ١٠١)

''اور جب ہم بدل دیتے ہیں کوئی آیت دوسری آیت کی جگہ جبکہ اللہ خوب واقف ہے، اس سے جو وہ اتارتا ہے تو وہ کہنے لگتے ہیں یہ آیتیں تو تو خود گھڑ لیتا ہے، بلکہ ان میں سے اکثر بے علم ہیں۔''

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ کلمات کونیہ و شرعیہ دونوں کو شامل ہے۔ کلمات کونیہ میں سے تو کوئی بھی چیز مستثنیٰ نہیں ہے، کسی کے لیے بھی اللہ کے کلمات کونیہ کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی کو موت دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اسے تبدیل کرنے کی کوئی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔ جب وہ کسی کو فقر و فاقہ سے دوچار کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے تبدیل کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا، جب رب کائنات قحط سالی کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔

کائنات میں اس قسم کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتے ہیں:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾ (یٰس : ٨٢)

''اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''



جہاں تک کلمات شرعیہ کا تعلق ہے تو ان میں کفار ومنافقین کی طرف سے تبدیلی کی جا سکتی ہے، معنوی طور پر بھی، لفظی طور پر بھی اور دونوں طرح سے بھی۔

ارشاد باری: ﴿لِكَلِمٰتِهٖ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

پانچویں آیت: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۝﴾ (النمل: ٧٦) ''یقیناً یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل پر اکثر حصہ اس کا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔''

شرح: ......اس آیت میں شاہد: ﴿يَقُصُّ﴾ ہے، اس لیے کہ بیان صرف قول کی صورت میں ہو سکتا ہے، جب قرآن بیان کرتا ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ عزوجل کا کلام ہے، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے یہ قصص بیان فرمائے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ﴾ (یوسف: ٣) ''ہم آپ سے ایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں اس کے ذریعہ سے جو ہم نے یہ قرآن آپ کے پاس وحی سے بھیجا ہے۔'' اگر یہی بات ہے تو پھر قرآن مجید کلام اللہ ہے۔

اس بات کا اثبات کہ قرآن منزل من اللہ ہے

- اب مؤلف رحمہ اللہ وہ قرآنی آیات ذکر کرنے چلے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے:

پہلی آیت: ﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ﴾ (الانعام: ١٥٥) ''اور یہ ایسی کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے یہ خیر وبرکت والی ہے۔''

شرح: ...... [هٰذَا]....مشار الیہ قرآن ہے۔

[كِتٰبٌ] .... بمعنی مکتوب ہے، اس لیے کہ یہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، بزرگ فرشتوں کے ہاتھوں میں موجود صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے، اور ہمارے پاس موجود صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے۔

[مُبٰرَكٌ]....یعنی خیر وبرکت والی ہے۔

قرآن بابرکت کتاب ہے، اس لیے کہ وہ سینوں کی بیماریوں کے لیے باعث شفاء ہے، جب کوئی انسان اسے تدبر وتفکر کے ساتھ پڑھتا ہے، تو وہ دل کو بیماریوں سے شفا دیتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الاسراء: ٨٢)

''اور ہم اتارتے ہیں قرآن جو کہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

قرآن اپنے اتباع کیے جانے میں بابرکت ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے ظاہری اور باطنی اعمال کی اصلاح ہوتی ہے۔

قرآن اپنے آثار عظیمہ کے اعتبار سے بھی بابرکت ہے۔ مسلمانوں نے قرآن کی بنیاد پر بلاد کفر کے خلاف جہاد کیا، اللہ

فرماتا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ (الفرقان: ٥٢) ''اوران سے اس کے ساتھ زوردار انداز میں جہاد کریں۔''
مسلمانوں نے اس قرآن کے ساتھ مشرق ومغرب کو فتح کیا یہاں تک اس کے مالک بن گئے، اب بھی اگر ہم قرآن کی طرف رجوع کریں تو اپنے اسلاف کی طرح زمین کے مشرق ومغرب کے مالک بن سکتے ہیں۔

قرآن اس اعتبار سے بھی خیر و برکت کا حامل ہے کہ اس کی تلاوت کرنے والا ہر حرف کے بدلے دس نیکیوں ❶ کا حق دار بن جاتا ہے۔ مثلاً لفظ (قَالَ) تین حروف پر مشتمل ہے، اس کی تلاوت کرنے والے کو تیس نیکیاں عطا کی جاتی ہیں اور یہ قرآن کی برکت ہے، ہم کتاب اللہ کی چھوٹی چھوٹی آیات کی تلاوت کر کے بے شمار نیکیاں سمیٹ سکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ قرآن خیر وبرکت کی حامل کتاب ہے، ہر قسم کے فیوض و برکات اس قرآن عظیم سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ شاہد ارشاد باری تعالیٰ ﴿اَنْزَلْنٰهُ﴾ میں ہے۔

قرآن کا منزل من اللہ ہونا اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

دوسری آیت: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ (الحشر: ٢١) ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم اسے ضرور دیکھ لیتے کہ وہ اللہ کے ڈر سے دبا اور پھٹا جا رہا ہے۔''

شرح: ...... پہاڑ انتہائی سخت چیز ہے، جن پتھروں سے پہاڑ تشکیل پاتے ہیں ان کی سختی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرۃ: ٧٤) ''پھر سخت ہو گئے دل تمہارے اس کے بعد، پس وہ پتھروں جیسے سخت ہو گئے بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔''

[خَاشِعًا] .... یعنی ذلیل ہو کر، دب کر۔

[مُتَصَدِّعًا] .... یعنی اللہ تعالیٰ کے سخت ڈر کی وجہ سے پھٹنے والا۔

مگر قرآن پہاڑوں پر نہیں بلکہ ہمارے دلوں پر اترا اور ان کے دلوں کا حال یہ ہے کہ وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو چکے ہیں، نہ کھلتے ہیں اور نہ حق کو قبول کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ

جب اہل ایمان پر قرآنی آیات کا نزول ہوتا ہے تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں، مگر جن کے دلوں میں بیماریوں نے ڈیرے جما رکھے ہیں تو وہ ان کی غلاظتوں اور نجاستوں میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔ والعیاذ باللہ

یعنی ان کے دل پہلے سے بھی سخت ہو جاتے ہیں اور ان کی نجاستیں بھی مزید بڑھ جاتی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلك.

یہ کلام اللہ کی عظمت ہے کہ اگر اسے پہاڑ جیسی ٹھوس چیز پر بھی اتارا جاتا تو وہ دب جاتا اور پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

یہ ارشاد باری اس بات کی دلیل ہے کہ پہاڑوں میں بھی احساس پایا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، نبی کریم ﷺ نے جبل احد کے بارے میں فرمایا تھا: ''یہ جبل احد ہے یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔'' ❷

---

❶ اسے ترمذی: ٢٩١٠۔ دارمی: ٣١١٩ اور حاکم: ١/٥٥٥ نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا، نیز ملاحظہ ہو۔ ابو نعیم: الحلیہ: ٦١٢٦٣.

❷ صحیح بخاری: ٤٤٢٢۔ صحیح مسلم: ١٣٩٢ عن ابی حمید الساعدی رضی اللہ عنہ.

یہ حدیث قرآن مجید میں مجاز کا اثبات کرنے والوں کی تردید کرتی ہے، جس کے لیے وہ اس قرآنی آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيدُ أَنْ يَّنقَضَّ﴾ (الکهف : ۷۷)

''پھر انہوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو ٹوٹ کر گر جانا چاہتی تھی۔''

وہ کہتے ہیں کہ بھلا دیوار کس طرح ارادہ کر سکتی ہے؟

مگر ہم کہتے ہیں کہ اللہ العلیم الخبیر فرماتا ہے کہ وہ گرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی اور تم کہتے ہو کہ وہ ارادہ کر ہی نہیں سکتی۔ کیا تمہارا یہ کہنا معقول ہے؟

قرآنی نص کے بعد آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ دیوار کس طرح ارادہ کرتی ہے؟

اس جگہ ہم اپنے آپ سے سوال کر سکتے ہیں کہ کیا ہمیں ہر چیز کا علم دیا گیا ہے؟

ہرگز نہیں، ہمیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے۔

اللہ عالم الغیب والشہادۃ کے اس ارشاد کے بعد کہ: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْأَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ وَ إِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (الاسراء: ٤٤) ''ساتوں آسمان، زمین اور جو ان میں ہے وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور ہر چیز اس کی تسبیح بیان کرتی ہے، مگر ان کی تسبیح کو تم نہیں سمجھتے ہو۔''

کیا تسبیح ارادہ کے بغیر ہی ہو جاتی ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ﴾ یہ لام اختصاص کے لیے ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چیزیں رب تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے میں مخلص ہیں، کیا بلا ارادہ اخلاص کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس سے ثابت ہوا کہ ہر شے ارادہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿وَ إِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ﴾ ''ہر چیز تسبیح بیان کرتی ہے۔'' ہم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ عموم کا صیغہ ہے۔ (ان) بمعنی (ما) نافیہ ہے، اور ﴿مِنْ شَيْءٍ﴾ نفی کے سیاق میں نکرہ ہے۔ لہٰذا یہ ہر شے کا احاطہ کرتا ہے۔

میرے مسلمان بھائی! اگر تیرا دل قرآن سے متاثر نہیں ہوتا تو اس کا قصور وار اپنے آپ کو ٹھہرا، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے کہ اگر قرآن کو پہاڑوں پر اتارا جاتا تو وہ بھی پھٹ جاتے۔ قرآن آپ کے دل پر پڑھا جاتا ہے مگر وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کی مدد فرمائے۔

تیسری، چوتھی اور **پانچویں آیت:** ﴿وَ إِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَّ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِينَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ۝﴾ (النحل: ۱۰۱-۱۰۳) ''اور جب ہم بدل دیتے ہیں کسی آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ خوب واقف ہے اس سے جو وہ اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تو انہیں خود گھڑ لیتا ہے بلکہ ان میں سے اکثر بے علم ہیں، کہہ دیجئے کہ

اسے اتارا ہے روح القدس (جبریل) نے تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تا کہ وہ ثابت قدم رکھے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور وہ سراسر ہدایت اور بشارت ہے اطاعت گزاروں کے لیے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے ایک شخص سکھاتا ہے، جس زبان کی طرف یہ غلط نسبت کرتے ہیں وہ غیر عربی ہے جبکہ یہ زبان صاف صاف عربی ہے۔''

شرح:......[وَ اِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ] ....یعنی جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کی جگہ رکھ دیں، یہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں مذکور نسخ کی طرف اشارہ ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرة: ١٠٦)

''اگر ہم منسوخ کر دیں کسی آیت کو یا اسے بھلا دیں تو ہم اس سے کہیں بہتر لے آتے ہیں یا اس جیسی ہی۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب کسی آیت کو منسوخ کر دے تو اس کی جگہ دوسری آیت لے آتا ہے، اس کا نسخ لفظاً ہو یا حکماً۔

[وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ] .... یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کا محل وقوع انتہائی خوبصورت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا آیت کی جگہ دوسری آیت کو لانا بے مقصد نہیں ہوتا، بلکہ اس کا صدور علم سے ہوتا ہے اور مخلوق کی اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی تبدیلی میں رسول کریم ﷺ کا کوئی کردار نہیں ہوتا، بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جسے وہ اپنے علم سے اتارتا ہے، ایک آیت کی جگہ دوسری آیت اپنے علم سے لاتا ہے، اور تبدیلی آپ ﷺ کی طرف سے نہیں کی جاتی۔ فرمان باری ہے:

﴿وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ (یونس: ١٥)

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری صاف صاف آیتیں تو کہتے ہیں وہ لوگ جو نہیں امید رکھتے ہم سے ملنے کی کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آ ؤ یا اسے بدل ڈالو۔''

ان کے اس سوال کا کیا جواب دیا گیا؟ ان کے ایک مطالبہ کا جواب دیا گیا، جب کہ دوسرے سے خاموشی اختیار کر لی گئی، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ﴾ (یونس: ١٥)

''آپ کہہ دیجئے کہ مجھے اسے اپنی طرف سے بدلنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔''

آپ یہ نہیں فرمایا کہ: ''میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن نہیں لا سکتا۔'' کیوں؟ اس لیے کہ جب اس میں تبدیلی کرنا ممکن نہیں ہے تو اس کی جگہ دوسرا قرآن لانا بطریق اولیٰ ممتنع ہے۔

الغرض ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ لانا وہ لفظاً ہو یا حکماً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

[قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ]..... یہ جملہ ﴿اِذَا﴾ کا جواب ہے۔

[اِنَّمَآ اَنْتَ].....اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔



[مُفْتَرٍ] .... بمعنی کذاب ہے، یعنی آپ کل یہ کہہ رہے تھے اور آج یہ کہہ رہے ہیں، یہ کذب ہے، آپ افتراء پرواز ہیں۔ مگر ان کا یہ قول حماقت پر مبنی ہے، اگر وہ امعان نظر سے کام لیتے تو وہ علم الیقین کی حد تک جان لیتے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لے کر آتا ہے۔ اور یہ بات نبی کریم ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے، اس لیے کہ دروغ گو اپنی پہلی بات کے برعکس بات کرنے سے آخری حد تک محتاط رہتا ہے، اس لیے کہ اسے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ اس طرح لوگوں کو اس کی کذب بیانی کا پتا چل جائے گا، اگر مشرکین کے دعوے کے مطابق آپ ﷺ جھوٹے ہوتے تو آپ اپنی پہلی بات کے خلاف کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتے، اس لیے کہ اس سے تو آپ کی کذب بیانی کھل کر سامنے آجاتی ہے، اس کے برعکس پہلی چیز کے برخلاف کوئی چیز اور لانا آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ یہ اضراب ابطالی ہے، جس کا معنی ہے: میں افتراء پرداز نہیں ہوں، لیکن ان میں سے زیادہ تر علم نہیں رکھتے اگر وہ اہل علم ہوتے تو انہیں اس بات کا بھی علم ہوتا کہ ایک آیت کا کسی دوسری آیت کی جگہ میں آنا رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے۔

[رُوحُ الْقُدُسِ] .... اس سے مراد جبرئیل امین ہیں، انہیں اس وصف کے ساتھ موصوف کرنے کی وجہ ان کا خیانت سے پاک ہونا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝﴾

(التکویر: ۱۹۔ ۲۱)

''یقیناً یہ قول ہے فرشتے عالی مرتبت کا، جو صاحب قوت ہے عرش والے کے پاس، اونچے درجے والا ہے، اس کی بات مانی جاتی ہے، وہاں امانت دار بھی ہے۔''

اللہ نے ﴿مِن رَّبِّكَ﴾ فرمایا: ''مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' نہیں فرمایا۔ جو کہ ربوبیت خاصہ کی طرف اشارہ ہے، نبی کریم ﷺ کی اللہ کی طرف سے ربوبیت، خاص سے خاص ترین ربوبیت ہے۔

[بِالْحَقِّ] .... یہ نازل کا وصف ہے یا نزول بہ کا۔

اگر یہ نازل کا وصف ہے تو اس کا معنی ہوگا: اس کا نزول حق ہے کذب نہیں ہے۔

اور اگر یہ منزول بہ کا وصف ہے تو پھر اس کا معنی ہے: جو اسے لے کر آیا ہے وہ حق ہے۔

اس جگہ یہ دونوں ہی مراد ہیں، قرآن اللہ کی طرف سے بھی حق ہے اور وہ اترا بھی حق کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَبِالْحَقِّ أَنزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (الاسراء: ۱۰۵) ''ہم نے اسے حق کے ساتھ اتارا اور وہ حق کے ساتھ اترا۔'' قرآن بھی حق ہے اور اس کی تعلیمات بھی مبنی برحق ہیں۔

[لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا] .... یہ تعلیل بھی ہے اور عظیم ثمرہ بھی۔ اللہ تعالیٰ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو ثابت قدم بھی رکھتا ہے، انہیں حق آشنا بھی بناتا ہے اور حق پر انہیں تقویت بھی دیتا ہے۔



[وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ] .... یعنی قرآن ہدایت ہے، جس کے ساتھ وہ ہدایت پاتے ہیں، وہ مینارہ نور ہے جس سے وہ روشنی حاصل کرتے ہیں، اور ان کے لیے بشارت ہے جس کے ساتھ وہ خوش ہوتے ہیں۔ بشارت اس لیے کہ جو کوئی قرآن پر عمل کرے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کا شمار سعادت مند اور خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى o وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى o فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى o﴾ (اللیل: ۵۔۷)

''مگر جس نے اللہ کے لیے دیا اور پرہیز گار رہا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم عنقریب اسے آسان طریقہ کی توفیق دیں گے۔''

لہٰذا انسان جب اپنے اندر خیر محسوس کرے، اس پر ثابت قدم رہتا نظر آئے اور اپنے آپ کو اس کی طرف متوجہ پائے تو اسے اس پر خوش ہونا چاہیے۔

اسے اس لیے خوش ہونا چاہیے کہ یہ اس کے لیے بشارت ہے، ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص کا جنت اور جہنم میں ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے۔'' اس پر وہ کہنے لگے: کیا ہم عمل چھوڑ کر اسی بات پر توکل نہ کرلیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، تم عمل کرتے ہو، ہر ایک کو وہ کام کرنے کی توفیق دے دی جائے گی جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔'' پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى o وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى o فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى o وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى o وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى o فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى o﴾ [1] (اللیل: ۵۔۱۰)

''مگر جس نے اللہ کی راہ میں دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم عنقریب اسے آسان طریقہ کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا رہا اور نیک بات کو جھٹلاتا رہا، تو ہم عنقریب اس کے لیے سختی کو آسان کر دیں گے۔''

جب تو دیکھے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے رشد و ہدایت سے نوازا ہے، اعمال صالحہ کی توفیق بخشی ہے، اچھی چیزوں اور اچھے لوگوں کے ساتھ محبت عطا کی ہے تو پھر خوش ہو جا، اس لیے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیرا شمار سعادت مند لوگوں میں ہوتا ہے۔

[وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ] .... اللہ تعالیٰ نے ﴿نَعْلَمُ﴾ فرمایا، ''لقد علمنا'' نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ وہ یہ بات بار بار اور مسلسل کہتے تھے، لہٰذا اسے مضارع کے ساتھ تعبیر کرنا ماضی کے ساتھ تعبیر کرنے سے زیاد موزوں تھا، ماضی کے ساتھ تعبیر کی صورت میں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ انہوں نے یہ بات زمانہ ماضی میں کہی تھی، وہ اسے مسلسل نہیں دہراتے رہتے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ قریش مکہ کہنے لگے: جس قرآن کو محمد ﷺ لے کر آیا ہے یہ اس کے رب کی طرف

---

[1] صحیح بخاری: ٤٩٤٥۔ صحیح مسلم: ٢٦٤٧ عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔



سے نہیں ہے، بلکہ وہ کسی ایسے شخص کی طرف سے ہے جو اسے پڑھاتا ہے اور اسے گزشتہ اقوام کے قصے سناتا ہے، پھر جنہیں لے کر وہ ہمارے پاس آجاتا ہے اور ہم سے کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

العیاذ باللہ! انہوں نے یہ تو دعویٰ کر دیا کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے، مگر جب ان سے یہ کہا گیا کہ اس کی مثل پیش کرو تو ایسا کرنے سے قاصر رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس افترا پردازی کو یہ فرما کر باطل قرار دے دیا: ﴿لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ﴾

﴿یُلْحِدُوْنَ﴾ مائل ہونے کے معنی میں ہے، اس لیے کہ ان کا قول امر صائب سے انحراف اور حق سے دور ہے۔

[اَعْجَمِیٌّ] .... غیر فصیح الکلام کو کہتے ہیں اگرچہ وہ عربی ہی میں کیوں نہ ہو اور عجمی (ہمزہ کے بغیر) عجم کی طرف منسوب ہے اگرچہ وہ عربی میں گفتگو کرتا ہو۔ اس شخص کی زبان عجمی تھی جس شخص کی طرف یہ غلط طور پر قرآن کو منسوب کرتے تھے، وہ شخص غیر عرب تھا اور فصاحت کے ساتھ عربی نہیں بول سکتا تھا۔

[وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ] .... یعنی وہ خود بیّن ہے اور غیر کے لیے مبیّن۔ قرآن عربی کلام ہے جو کہ فصیح ترین کلام ہے، پھر اس کا صدور اس عجمی شخص سے کیسے ہو سکتا ہے جو صاف طور پر عربی بول بھی نہیں سکتا؟

ان آیات میں شواہد مندرجہ ذیل ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ﴾

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ﴾ اور ﴿وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ﴾

یہ تمام شواہد اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کلام اللہ اور منزل من اللہ ہے۔

مؤلف نے ان آیات کے بعد کی آیت کو اس لیے ترک کر دیا کہ اس میں شاہد نہیں ہے، مگر اس میں ایک فائدہ ہے۔ جسے ہم بتا دیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَا یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝﴾ (النحل: ۱۰۴۔ ۱۰۵)

’’جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دے گا جھوٹ تو وہ لوگ باندھتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔‘‘

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں ہے، اللہ نہ تو انہیں ہدایت دے گا اور نہ ہی وہ اس کی آیات سے فائدہ اٹھا سکیں گے، ان پر ہدایت کے دروازے بند ہیں، والعیاذ باللہ

یہ حقیقت بہت بڑے فائدہ کی حامل ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتا اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا اور اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی آیات پر ایمان رکھتا ہے اللہ اسے ہدایت سے نوازتا ہے۔

ہم ایسا پاتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتا وہ ان کی حقیقت تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پاتا، مثلاً وہ

کہتا ہے کہ اللہ تو علو میں ہے وہ آسمان دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ ایسے شخص سے ہم کہیں گے کہ تم ایمان لے آؤ ہدایت پا لو گے، جب آپ اس بات پر ایمان لے آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً نزول فرماتا ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے لیے مستحیل نہیں ہے، بات اللہ کے حوالے سے ہو رہی ہے اور اللہ کے مماثل کوئی چیز نہیں ہے۔

ان میں بعض لوگ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ﴾ (الکھف: ٧٧) کے بارے میں کہتے ہیں کہ دیوار کس طرح ارادہ کرتی ہے؟

اس شخص سے ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب آپ اس بات پر ایمان لے آئیں گے کہ دیوار ارادہ کرتی ہے تو آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے۔

اس قاعدہ کو آپ کے نزدیک اساسی حیثیت حاصل ہونی چاہیے: ایمان لے آئیں ہدایت میسر آ جائے گی۔

جو لوگ آیات اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اللہ انہیں ایمان کی دولت سے محروم رکھتا ہے، قرآن ان پر مشتبہ رہتا ہے اور وہ اس سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے لیے اور تمہارے لیے ہدایت کے خواستگار ہیں۔

ان آیات بینات سے مستفاد سلوکی امور

جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس قرآن عظیم کے ساتھ رب العالمین نے تکلم فرمایا، تو یہ ایمان ہم پر اس امر کو واجب قرار دے گا کہ ہم قرآن کریم کی تعظیم کریں، اس کا پورا پورا احترام کریں، اس میں موجود اوامر کی تعمیل کریں اور منصیات و محذورات سے اجتناب کریں اور اللہ نے جو کچھ اپنے بارے میں اور اپنی سابقہ ولاحقہ مخلوق کے بارے میں فرمایا ہے اس کی تصدیق کریں۔

اس بات کا اثبات کہ قیامت کے دن اہل ایمان اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوں گے

☐ اس ضمن میں مؤلف رحمہ اللہ نے رویت باری تعالیٰ کے اثبات کی آیات ذکر کی ہیں:

پہلی آیت: ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القیامۃ: ٢٢-٢٣) ''اس دن کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

شرح: ...... [نَاضِرَةٌ] .... تر و تازہ، خوبصورت، یہ نضارہ (ضاد کے ساتھ) سے ماخوذ ہے جو کہ حسن کے معنی میں ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝﴾ (الانسان: ١١) ''اللہ انہیں اس دن کی سختی سے بچا لے گا اور انہیں حسن و تازگی اور خوش دلی دے گا۔''

[إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ] .... ﴿نَاظِرَةٌ﴾ (ظاء کے ساتھ) یہ نظر سے ماخوذ ہے ہے، اس جگہ نظر کو (الی) کے ساتھ

متعدی کیا گیا ہے، جو کہ غایت پر دلالت کرتا ہے۔ چہروں سے صادر ہونے والی نظر آنکھ کے ذریعہ سے ہوتی ہے، جبکہ دلوں سے صادر ہونے والی نظر بصیرت، تدبر اور تفکر کے ساتھ ہوتی ہے اس جگہ نظر چہروں سے رب تعالیٰ کی طرف صادر ہو رہی ہے اور اس کی دلیل ﴿اِلٰی رَبِّهَا﴾ ہے۔

یہ آیت کریمہ اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ خوبصورت اور تروتازہ چہرے جب اپنے رب کی طرف دیکھیں گے تو ان کے حسن میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت کے دن چہرے آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، اہل سنت کا یہی قول ہے۔ وہ اپنے اس قول کے لیے مؤلف کی طرف سے ذکر کردہ قرآنی آیات اور احادیث متواترہ سے استدلال کرتے ہیں۔ [1]

اس بارے میں وارد نصوص قطعی ثبوت اور قطعی دلالت کی حامل ہیں اس لیے کہ وہ کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت متواترہ میں سے ہیں۔

اہل سنت کا قول ہے کہ اس جگہ آنکھوں سے دیکھنا حقیقت پر مبنی ہے مگر اس سے ادراک لازم نہیں آتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳) ''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔''

اسی طرح علم بالقلب سے بھی ادراک لازم نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰه: ۱۱۰) ''وہ از روئے علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

ہم اپنے دلوں سے اپنے رب کا علم رکھتے ہیں مگر ہم اس کی کیفیت اور حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے ہم قیامت کے دن اپنی آنکھوں سے رب تعالیٰ کو دیکھیں گے، مگر اس کا ادراک نہیں کر سکیں گے۔

دوسری آیت: ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾ (المطففين: ۳۵) ''تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔''

شرح: ...... [**الْاَرَائِكِ**] .... أَرِيكَةٌ کی جمع ہے، آراستہ و پیراستہ شاہانہ تخت۔

[**يَـنـظُـرُوْنَ**] .... منظور الیہ کا ذکر نہیں کیا گیا، لہٰذا یہ حکم ہر اس چیز کے لیے عام ہے، جسے دیکھ کر وہ لطف اندوز ہوں گے۔ جن میں سے سب سے باعظمت اور پُر از نعمت چیز اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝﴾ (المطففين: ۲٤)

''آپ ان کے چہروں میں نعمتوں کی تروتازگی پہچان لیں گے۔''

اس آیت کا سیاق اس ارشاد ربانی جیسا ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القيامة: ۲۳)

''اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔'' وہ ہر اس چیز کو دیکھ رہے

---

[1] ملاحظہ فرمائیں، شرح السنة از لالکائی: ٤٩٩۔ الشریعة از آجری ص: ٢٥١۔ السنة از عبداللّٰه بن إمام احمد: ١/ ٢٢٩۔ کتاب الروایة، از امام دارقطنی اور حادی الارواح از ابن قیم رحمه اللّٰه، ٢٠٤۔



ہوں گے جسے دیکھ کر انہیں خوشی میسر آئے۔

برے ساتھیوں کو دیکھنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے جنہیں جہنم میں عذاب دیا جارہا ہوگا، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ○ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ○ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا اَئِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ○﴾ (الصافات: ۵۰۔۵۳)

''ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا، میرا ایک ہم نشین تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تو بھی مرکر دوبارہ اٹھنے کی تصدیق کرنے والوں میں ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ زندہ کر کے بدلہ دیا جائے گا۔''

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے کہے گا: ﴿هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ○﴾ (الصآفات: ۵۴) ''کیا تم جھانک کر دیکھنا چاہتے ہو؟'' ﴿هَلْ﴾ تشویق کے لیے ہے، پھر جب وہ اس ہم نشین کو جھانک کر دیکھے گا۔ ﴿فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ﴾ (الصآفات: ۵۵) ''تو اسے جہنم کے وسط میں دیکھے گا۔''

سبحان اللہ! یہ مومن شخص اعلیٰ علیین میں ہوگا اور اس کا ہم نشین جہنم کی اتھاہ گہرائیوں میں، مگر وہ اس قدر دوری کے باوجود اسے دیکھ لے گا۔

اہل جنت کی نظر اہل دنیا کی نظر جیسی نہیں ہوگی، جنت میں انسان دو ہزار سال کی مسافت سے دیکھ لے گا، وہ دور سے دور چیز کو بھی قریب سے قریب چیز کی طرح دیکھ سکے گا جو کہ جنت کی نعمتوں کے کمال کا ایک پہلو ہے، اگر جنتی شخص کی نظر اس کی دنیا میں نظر جیسی ہوتی تو وہ جنت کی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہوسکتا، اس لیے کہ اس صورت میں وہ قریبی چیزیں ہی دیکھ پاتا اور ان میں سے بھی زیادہ تر اس پر مخفی رہتیں۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر کہے گا:

﴿تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴾ (الصافات: ۵۶) ''اللہ کی قسم تو تو قریب تھا کہ مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے گمراہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہتا تھا اسی لیے فرمایا: ﴿اِنْ كِدْتَّ﴾ یعنی بیشک تو قریب تھا۔ ﴿اِنْ﴾ مثقلہ نہیں بلکہ مخففہ ہے۔

﴿وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ○﴾ (الصافات: ۵۷۔۵۸)

''اور اگر مجھ پر میرے رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میرا شمار بھی جہنم میں حاضر کیے گئے لوگوں میں ہوتا، کیا ہم مرنے والے نہیں ہیں؟''

گزشتہ زمانوں میں لوگ اس قسم کے امور میں بحث کیا کرتے تھے کہ بھلا اونچے مکان میں موجود شخص نیچے موجود شخص سے کس طرح مخاطب ہوسکتا اور اسے کس طرح دیکھ سکتا ہے؟

مگر عصر حاضر میں انسان کی بنائی ہوئی ایسی چیزیں معرض وجود میں آ گئی ہیں جن کی مدد سے انسان بہت دور بیٹھے دوسرے انسان سے بات بھی کرسکتا ہے اور اسے دیکھ بھی سکتا ہے۔



یہ اس امر کے باوجود ہے کہ ہمارے لیے اخروی چیزوں کو دنیوی چیزوں پر قیاس کرنا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا ﴿یَنظُرُوْنَ﴾ عام ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھ رہے ہوں گے، ان نعمتوں کو بھی دیکھ رہے ہوں گے جن سے وہ خود لطف اندوز ہو رہے ہوں گے اور دوزخیوں کو دے جانے والے عذاب کو بھی دیکھ رہے ہوں گے۔

سوال: اہل جنت دوزخیوں کو ملعون کرتے اور انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ان کی طرف کیسے دیکھیں گے؟

جواب: دنیا میں ان دوزخیوں نے اہل جنت کو کس قدر اذیتیں پہنچائیں اور انہیں کس حد تک آلام ومصائب سے دوچار کیا، یہ امر کسی سے مخفی نہیں ہے، اس حوالے سے ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ o وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ o وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ o وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَالُّوْنَ o وَمَا اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حَافِظِیْنَ o فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ o عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنظُرُوْنَ o﴾

(المطففین: ۲۹۔ ۳۵)

''یقیناً مجرم لوگ ایمان والوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور جب ان پر سے گزرتے تو حقارت سے آپس میں آنکھیں مارتے تھے اور جب اپنے والوں کی طرف لوٹتے تو خوش خوش لوٹتے، اور جب ایمان والوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یقیناً یہ لوگ گمراہ ہیں، جبکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے، تو آج ایمان والے کافروں سے ہنسی کر رہے ہیں، تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔''

یہ مجرم لوگ جہنم کی گہرائی میں پڑے ہوں گے اور مومن انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا سراسر عدل ہے کہ جن اہل ایمان کو دنیا میں تنگ کیا جاتا تھا آج وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر خوش ہو رہے ہیں اور اپنا مذاق اڑانے والوں کو جہنم میں پڑے دیکھ رہے ہیں۔

تیسری آیت: ﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ﴾ (یونس: ۲۶) ''محسنین کے لیے بھلائی ہے اور مزید کچھ اور بھی۔''

شرح: ...... [لِلَّذِیْنَ] .... خبر مقدم اور [الْحُسْنٰی] .... مبتدا مؤخر ہے اور اس سے مراد جنت ہے۔

[زِیَادَةٌ] .... اس سے مراد دیدار الٰہی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ [1]

نبی کریم ﷺ کی تفسیر کی رو سے یہ آیت رؤیت باری تعالیٰ کے ثبوت کی دلیل ہے، آپ علیہ الصلاۃ والسلام سب لوگوں سے زیادہ قرآن مجید کے معانی کے عالم ہیں اور آپ ﷺ نے اس کی تفسیر دیدار الٰہی سے فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہونا جنت کی نعمتوں پر مزید اضافہ ہے۔

رؤیت باری تعالیٰ جنت کی نعمتوں کی جنس سے نہیں ہے، نہریں، پھل، پاک بیویاں ...... یہ سب بدنی نعمتیں ہیں جبکہ

[1] صحیح مسلم: ۱۸۱۔ عن صهیب رضی الله عنه.

دیدار الٰہی دلی نعمت ہے، جنت میں اہل جنت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوگی۔ اللہ ہمیں بھی اپنے دیدار سے مشرف فرمائے۔ یہ ایک بے نظیر نعمت ہے۔ جنت کی نہریں، اس کے پھل اور دوسری کوئی بھی نعمت اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے اسے ﴿زِيَادَةٌ﴾ یعنی جنت پر اضافہ قرار دیا ہے۔

چوتھی آیت: ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ (ق: ۳۵) ''ان کے لیے اس میں وہ کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے ہاں مزید کچھ اور بھی ہے۔

شرح:......[لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا]....یعنی انہیں جنت میں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے۔

ایک صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں گھوڑے بھی ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ نے تجھے جنت میں داخل کر دیا تو پھر اگر تو یہ چاہے گا کہ تو سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر جہاں چاہے اڑتا پھرے تو تیری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔'' ایک اعرابی کہنے لگا: اللہ کے رسول! کیا جنت میں اونٹ بھی ہوں گے؟ اس لیے کہ مجھے اونٹ بہت پسند ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اعرابی! اگر اللہ نے تجھے جنت میں داخل کر دیا تو تجھے اس میں ہر وہ چیز مل جائے گی جو تیرا دل چاہے گا اور جس سے تیری آنکھیں لذت حاصل کر سکیں گی۔ [1]

اہل جنت کی تمام خواہشات پوری ہوں گی

جنتی آدمی جو کچھ بھی چاہے گا اسے میسر آ جائے گا۔ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اسے اولاد کی خواہش ہوگی تو اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (الزخرف: ۷۱)

''اور اس میں وہ سب کچھ ہوگا جس کو دل چاہیں گے اور جس سے آنکھیں لذت محسوس کریں گی۔''

[وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ] .... یعنی ہمارے ہاں ان کی چاہت سے بھی زیادہ ہے، ایک صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جو آدمی سب سے آخر میں جنت میں داخل ہوگا اسے اللہ تعالیٰ نعمتوں پر نعمتیں دیتا چلا جائے گا...... اور اس سے پوچھے گا: اب راضی ہے؟ اور آخر میں فرمائے گا، تیرے لیے اس سے دس گنا مزید ہے۔ [2] جو کہ اس کی چاہت سے بہت زیادہ ہوگا۔

اکثر علماء نے ''مزید'' کی وہی تفسیر کی ہے جو نبی کریم ﷺ نے فرمائی اور وہ ہے: اللہ تعالیٰ کے چہرہ انور کی زیارت کرنا۔ رؤیت باری تعالیٰ کے ثبوت میں مؤلف نے چار آیات ذکر کی ہیں۔

پانچویں آیت: اس آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ نے رؤیت باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔

﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (المطففين: ۱۵)

---

[1] مسند احمد: ۵/ ۳۵۲۔ ترمذی: ۲۵۴۳۔ شرح السنۃ: ۴۳۸۵ اس حدیث کو البانی نے ضعیف سنن الترمذی: ۴۵۹ میں ضعیف کہا ہے۔

[2] صحیح مسلم: ۱۸۸۔ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔



''ہرگز نہیں، وہ اس دن اپنے رب سے پردے میں ہوں گے۔''

شرح:...... اور اس کی زیارت سے محروم رہیں گے۔

اس آیت میں وجہ دلالت یہ ہے کہ جب اہل غضب اللہ تعالیٰ سے پردے میں ہوں گے تو اہل رضیٰ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے، یہ استدلال بڑا قوی ہے، اس لیے کہ اگر سب ہی پردے میں ہوتے تو ان کا خاص طور پر ذکر نہ ہوتا۔

اسی طرح کل آیات پانچ ہوگئیں۔ جبکہ ہمارے لیے ان آیات کے ساتھ اس آیت کو ملانا بھی ممکن ہے۔

﴿لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (الانعام: ۱۰۳)

''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں جب کہ وہ آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے۔''

جس کا ذکر رؤیت باری تعالیٰ کے منکرین کی تردید کے ضمن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں یہ ہے اہل سنت کا عقیدہ اور اس کے لیے ان کے دلائل، یہ ایک واضح حقیقت ہے جس کا انکار کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے۔

اہل تعطیل، جہمیہ، معتزلہ اور اشاعرہ کے سمعی اور عقلی دلائل

جبکہ اس حوالے سے اہل تعطیل میں سے جہمیہ، معتزلہ اور اشاعرہ وغیرہم ان سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس کے لیے وہ بعض سمعی اور عقلی دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔

سمعی دلائل: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَ کَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَ لٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا﴾ (الاعراف: ۱٤۳)

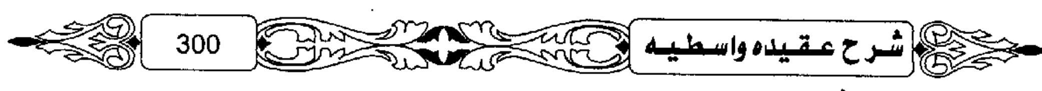
''اور جب آیا موسیٰ ہمارے وقت پر اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے تو وہ کہنے لگے، میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں، اللہ نے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر تو وہ اپنی جگہ پر قائم رہا تو پھر تم بھی مجھے دیکھ لو گے، پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

وجہ دلالت یہ ہے کہ حرف (لَنْ) نفی مؤبد کے لیے ہے، نفی خبر ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر مبنی برصدق ہوا کرتی ہے اور وہ منسوخ بھی نہیں ہو سکتی۔ اس دعویٰ کی تردید کئی طرح سے کی جا سکتی ہے۔

اولاً: یہ دعویٰ محض دعویٰ ہی ہے کہ (لَنْ) نفی موبد کے لیے ہے۔

ابن مالک ''کافیہ'' میں فرماتے ہیں:

وَمَنْ رَأَى النَّفْيَ بِلَنْ مُؤَبَّدَا　　فَقَوْلَهُ أَرْدُدْ وَسِوَاهُ فَاعْضُدَا



یعنی حرف (لن) کو نفی موبد تسلیم کرنے کا قول مردود ہے۔

ثانیا: موسیٰ علیہ السلام نے آخرت میں رؤیت باری تعالیٰ کا مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ اس کا مطالبہ اسی وقت کے لیے کیا تھا، ان کے مطالبہ کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ یعنی میں تجھے اسی وقت دیکھنا چاہتا ہوں، جس کے جواب میں اللہ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ یعنی تو مجھے اس وقت دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا، پھر اللہ نے ان کے سامنے پہاڑ کی مثال رکھی، وہ اس طرح کہ اس نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا، ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ﴾ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ کی یہ حالت دیکھی تو انہیں معلوم ہو گیا کہ مجھ میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے کی طاقت نہیں ہے اور وہ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا محال ہے، اس لیے کہ دنیا میں انسانی حالت دیدار حق کی متحمل نہیں ہو سکتی، آخر یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس کا پردہ نور کا ہے، اگر وہ اسے کھول دے تو اس کے چہرے کی تجلیات ہر اس چیز کو جلا ڈالیں جہاں تک اس کی مخلوق سے اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔

مگر آخرت میں رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے، اس لیے کہ اس دن لوگ ایسے عالم میں ہوں گے جس میں ان کے احوال دنیا میں ان کے احوال سے مختلف ہوں گے، جیسا کہ کتاب وسنت کی نصوص سے ثابت ہے۔

ثالثا: آخرت میں رویت حق تعالیٰ کا استحالہ اس کے منکرین کے نزدیک اس بات پر مبنی ہے کہ اس کے اثبات سے اللہ تعالیٰ کے حق میں نقص لازم آتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے واجب کیا ہے اور اس کے حق میں مستحیل کیا ہے، یا پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے رؤیت کی درخواست میں حد سے تجاوز کیا اور اس سے اس چیز کا مطالبہ کیا جو اس کے شایان نہیں تھا، تو کیا رؤیت کے منکرین حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ علم رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے واجب کیا ہے اور اس کے حق میں مستحیل کیا ہے؟ اور یہ پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ آیت منکرین رؤیت کے خلاف دلیل ہے نہ کہ ان کے حق میں۔

اور یوں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہر وہ دلیل جس سے باطل یا حق سے انکار پر استدلال کیا جائے گا۔ وہ اسے پیش کرنے والے کے خلاف جائے گی نہ کہ اس کے حق میں۔ منکرین رؤیت کی دوسری دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ (الانعام: ۱۰۳)

''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں جب کہ وہ آنکھوں کا ادراک کیے ہوئے ہے اور وہ باریک بین بہت خبر رکھنے والا ہے۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیت میں ادراک کی نفی ہے جبکہ رؤیت ادراک کو مستلزم نہیں ہوتی، کیا آپ نہیں جانتے کہ آدمی سورج کو دیکھتا تو ہے مگر وہ اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔

جب ہم رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس رؤیت سے اس کا ادراک بھی ہو گیا



ہے اس لیے کہ ادراک مطلق رؤیت سے زیادہ خاص ہے۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ادراک کی نفی اصل رؤیت کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اور یہ اس لیے کہ اخص کی نفی اعم کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اس بنا پر بھی آیت ان کے حق میں نہیں بلکہ ان کے خلاف دلیل ہے۔

عقلی دلیل: رؤیت باری کے منکرین عقلی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اثبات رؤیت سے اللہ تعالیٰ کے لیے جسم کا ہونا لازم آتا ہے جو کہ اللہ کے لیے ممتنع ہے، اس لیے کہ یہ تشبیہ اور تمثیل کو مستلزم ہے۔

ان باطل دلائل کی تردید

اس دلیل کی تردید: اگر اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے، تو ضرور آئے، مگر ہم علم الیقین کی حد تک جانتے ہیں کہ وہ مخلوق کے اجسام سے مماثل نہیں ہے، اس لیے کہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

مگر جسم کی نفی یا اثبات کا قول متکلمین کی اختراع ہے، کتاب وسنت میں اس کی نفی وارد ہے اور نہ اثبات۔ منکرین رؤیت نے اہل اثبات کے دلائل کے بے جان سے جوابات دیئے ہیں، مگر اس دوران ان کی طرف سے روا رکھی گئی تحریف کسی سے مخفی نہیں ہے۔

ان آیات سے اخذ کردہ سلوکی فوائد

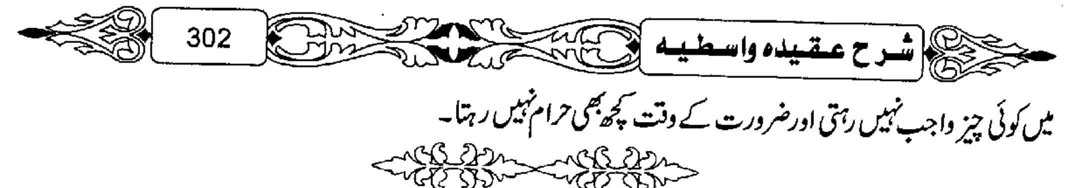
رؤیت باری تعالیٰ پر ایمان سے انسانی کردار وعمل پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جب انسان کو معلوم ہو کہ اس کے ثواب کی آخری منزل دیدار الٰہی سے مشرف ہونا ہے تو اس سے ساری کی ساری دنیا اس کی نظروں میں بے وقعت ہو کر رہ جائے گی۔

جب آپ کو علم ہوگا کہ آپ عنقریب اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو واللہ دنیا آپ کی نگاہوں میں کسی بھی قدر وقیمت کی حامل نہیں رہے گی۔

دیدار الٰہی کے مقابلے میں دنیا کی واقعی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خالق کائنات کے رخ زیبا کی زیارت ایسا عظیم ثمرہ ہے جس کے حصول کے لیے شائقین ہمیشہ سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

جب آپ کو دیدار الٰہی کی قدر وقیمت کا اندازہ ہو جائے گا تو کیا آپ اس تک رسائی کے لیے کوشش کریں گے یا نہیں؟ آپ کی طرف سے اس کا جواب یقیناً اثبات میں ہوگا، اور اس کے لیے آپ ہر ممکن کوشش کرتے نظر آئیں گے۔

درحقیقت رؤیت باری تعالیٰ کا انکار بہت بڑی محرومی ہے، اور اس پر ایمان رکھنا انسان کو اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے ہمیشہ متحرک رکھتا ہے اور وہ اس منزل تک رسائی کے لیے آگے بڑھتا رہتا ہے، دین اسلام، آسان ترین دین ہے، راہ دین میں اسے جب بھی کوئی مشکل پیش آئے گی، دین اس کے لیے آسانی پیدا کر دے گا اور قدم قدم پر اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتا چلا جائے گا اور اگر کبھی اس پر عمل کرنا ممکن نہیں رہے گا تو وہ ساقط ہو جائے گا، اس لیے کہ بے بسی کے عالم



میں کوئی چیز واجب نہیں رہتی اور ضرورت کے وقت کچھ بھی حرام نہیں رہتا۔

قرآن تدبر کرنے والے کے لیے راہنما ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهٰذَا الْبَابُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ كَثِيْرٌ ، وَمَنْ تَدَبَّرَ الْقُرْآنَ طَالِبًا لِلْهُدٰى ، تَبَيَّنَ لَهُ طَرِيْقُ الْحَقِّ .))

''کتاب اللہ میں اس باب کی بڑی کثرت ہے، جو شخص ہدایت کا طالب بن کر قرآن میں تدبر کرے گا اس کے لیے حق کا راستہ واضح ہو جائے گا۔''

شرح:...... [وَهٰذَا الْبَابُ] ...... یہ باب الاسماء والصفات کی طرف اشارہ ہے۔

[فِي كِتَابِ اللّٰهِ كَثِيْرٌ] ...... اس لیے کہ آپ کتاب اللہ کی ہر آیت میں غالباً اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کوئی اسم، اس کے افعال میں سے کوئی فعل یا اس کے احکام میں سے کوئی حکم ضرور پائیں گے، بلکہ اگر آپ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب اللہ کی ہر آیت صفات باری تعالیٰ میں سے کوئی نہ کوئی صفت ہے، اس لیے کہ قرآن کریم، کلام اللہ ہے اور اس کی ہر آیت اللہ تعالیٰ کی کسی صفت پر مبنی ہے۔

[وَمَنْ تَدَبَّرَ الْقُرْآنَ] ...... کسی چیز میں تدبر کرنے کا معنی اس میں غور وفکر کرنا ہے، گویا کہ انسان کبھی اس کے آگے کی طرف سے آتا ہے اور کبھی پیچھے کی طرف سے، پس وہ الفاظ کے مفاہیم ومعانی کو سمجھنے کے لیے انہیں بار بار دہراتا ہے۔

قرآن میں تدبر کا تو یہ طریقہ ہے، رہی نیت، تو اسے قرآن سے ہدایت اخذ کرنے کا طالب ہونا چاہیے، وہ قرآن میں تدبر اپنے قول کی تائید کرنے یا غلط انداز میں مجادلہ کرنے کے لیے نہ کرے بلکہ طلب حق کے ارادہ سے کرے، جس کا نتیجہ بقول مؤلف یہ نکلے گا کہ اس پر حق آشکارا ہو جائے گا۔

یہ نتیجہ کس قدر عظیم ہے۔ مگر اس سے پہلے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے، تدبر اور حسن نیت۔ جب انسان قرآن سے ہدایت کا طالب ہوگا تو اس پر حق واضح ہو جائے گا۔ اس کی دلیل متعدد قرآنی آیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل : ٤٤)

''اور ہم نے آپ کی طرف ذکر اتارا تاکہ آپ بیان کر دیں لوگوں کے لیے جو ان کی طرف اتارا گیا۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص : ٢٩)

''اس کتاب کو ہم نے آپ کی طرف اتارا وہ بابرکت ہے، تاکہ وہ اس کی آیات میں غور وفکر کریں اور تاکہ نصیحت لیں عقل والے۔''

ایک اور جگہ ارشاد مبارک ہے:



﴿اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَاْتِ آبَائَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (المومنون : ٦٨)

''کیا انہوں نے اس کلام میں غور نہیں کیا یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آ گئی ہے جو ان کے پہلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی۔''

اور سورۃ القمر میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر: ٣٢)

''اور ہم نے قرآن کو آسان بنایا نصیحت کے لیے کیا ہے کوئی نصیحت لینے والے۔''

تدبر کے بارے میں اور بھی بہت سی آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ طلب ہدایت کے ارادے سے قرآن مجید میں تدبر و تعقل سے کام لینے والا اس نتیجہ پر ضرور پہنچتا ہے کہ اس پر راہ حق عیاں ہو جاتی ہے۔

مگر جس کا مقصد قرآن کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ ٹکرانا، اسے اپنی رائے کے حق میں استعمال کرنا اور غلط انداز سے جھگڑا کرنا ہو، جس طرح اہل بدعت اور اہل خرافات کیا کرتے ہیں تو ایسا شخص حق تک رسائی سے محروم رہتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ (ال عمران : ٧)

''وہ وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری، اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی اصل کتاب ہیں، اور دوسری متشابہات (غیر واضح حکم والی) ہیں، جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے لگتے ہیں محض فتنہ تلاش کرتے ہوئے اور اس کی حقیقت تلاش کرتے ہوئے، جبکہ اس کی حقیقت کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا مگر جو علم میں مضبوط ہیں۔''

اس جگہ (اما) کو مقدر مانا جائے گا۔ ﴿فَيَقُوْلُوْنَ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ ''تو وہ کہتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔'' اور آخر میں فرمایا: ﴿وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ال عمران : ٧) ''اور نہیں نصیحت لیتے مگر عقل والے ہی۔'' اور سورۃ فصلت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ٤٤)

''کہہ دیجئے! کہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ ان کے لیے اندھے پن کا موجب ہے، یہ لوگ (ایسے ہیں جیسے) انہیں دور سے آواز دی جا رہی ہو۔''



فصل:

سنت رسول اللہ ﷺ

شرح: ...... لغوی اعتبار سے سنت طریقہ کو کہتے ہیں، اسی سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ((لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ)) ❶ یعنی تم گزشتہ لوگوں کے طریقوں کی اتباع کرو گے۔

جبکہ سنت اصطلاحی اعتبار سے نبی کریم ﷺ کے قول وفعل اور تقریر کو کہا جاتا ہے، جو کہ واجب اور مستحب پر مشتمل ہے۔

سنت تشریع اسلامی کا دوسرا مصدر ہے، سنت کا مصدر ثانی ہونا عدد کے اعتبار سے ہے نہ کہ ترتیب کے اعتبار سے، اس لیے کہ صحیح طور پر ثابت ہونے کی صورت میں اس کا مرتبہ قرآن مجید کے برابر ہے۔

قرآن مجید میں غور وفکر کرنے والے کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہے حکم پر اس کی دلالت کا صحیح ہونا، جبکہ سنت میں غور وفکر کرنے والے کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

الاول: نبی کریم ﷺ کی طرف اس کا صحیح طور پر منسوب ہونا۔

الثانی: اس کی دلالت کا حکم پر صحیح ہونا، اس بنا پر سنت سے استدلال کرنے والے کو قرآن سے استدلال کرنے والے کے مقابلے میں زیادہ محنت درکار ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن کی سند سے بے نیاز کر دیا گیا ہے، قرآن کی سند متواتر ہے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بخلاف اس چیز کے جس کو آپ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

جب سنت نبی کریم ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہو جائے تو خبر کی تصدیق اور حکم پر عمل کے اعتبار سے اس کا مرتبہ قرآن مجید کے برابر ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (النساء: ۱۱۳) ”اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی۔“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میں تم میں سے کسی کو اس طرح شاہانہ تخت پر بیٹھا ہوا نہ پاؤں کہ اس کے پاس میرا کوئی حکم آئے اور وہ کہنے لگے: ہم نہیں جانتے، ہم تو جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں گے اس کا اتباع کریں گے، خبردار! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کی مثل اس کے ساتھ ہے۔“ ❷

اسی لیے صحیح قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے صحیح طور پر ثابت سنت سے قرآن مجید کو منسوخ کیا جا سکتا ہے، اگر چہ یہ عقلاً اور شرعاً دونوں طرح درست ہے، مگر اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ ❸

---

❶ صحیح بخاری: ۳۴۵۶۔ صحیح مسلم: ۲۶۶۹ عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنه۔

❷ اسے أحمد: ٤/ ١٣٢۔ أبوداود: ٤٦٠٥۔ ترمذی: ٢٦٦٣۔ ابن ماجه: ١٣ اور حاکم: ١/ ١٠٩ نے روایت کیا احمد شاکر نے الرسالہ: ٩۔ پر اپنی تعلیق میں اس کی تخریج اور تصحیح کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، ملاحظہ ہو: الحدیث حجة بنفسه فی العقائد والأحکام، از شیخ البانی۔

❸ یہ جمہور کا قول ہے، ملاحظہ ہو: إرشاد الفحول، از شوکانی: ١٩١۔



سنت قرآن کی تفسیر

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَالسُّنَّةُ تُفَسِّرُ الْقُرْآنَ وَتُبَيِّنُهُ وَتَدُلُّ عَلَيْهِ وَ تُعَبِّرُ عَنْهُ.))

''سنت قرآن کی تفسیر و تبیین کرتی، اس پر دلالت کرتی اور اس کی تعبیر کرتی ہے۔''

شرح: ......[تُفَسِّرُ الْقُرْآنَ]...... یعنی سنت قرآن کے مرادی معنی کی وضاحت کرتی ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ﴾ (یونس: ٢٦) ''محسنین کے لیے بھلائی ہے اور مزید کچھ اور بھی۔'' کی تفسیر میں فرمایا: ''اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرہ انور کی زیارت کرنا ہے۔''❶ اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: ٦٠) ''اور ان کے لیے جتنی بھی تم سے ہو سکے قوت تیار رکھو۔'' کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا:

''خبردار! قوت تیر اندازی ہے، خبردار! قوت تیر اندازی ہے۔''❷

[وَتُبَيِّنُهُ]...... یعنی سنت مجمل کی وضاحت کرتی ہے۔ قرآن مجید میں کئی آیات مجمل ہیں سنت ان کی تبیین و توضیح کرتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (البقرۃ: ٤٣) ''اور نماز قائم کرو۔'' میں اقامت صلاۃ کا حکم دیا ہے جبکہ سنت نے اس کی کیفیت کی وضاحت کی ہے۔

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ (الاسراء: ٧٨) ''نماز قائم کریں سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک۔''

﴿غَسَقِ الَّيْلِ﴾ رات کا شدید اندھیرا، اور یہ نصف شب کے وقت ہوا کرتا ہے۔

آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک وقت ہے، مگر سنت نے اس مجمل کی اس طرح تفصیل بیان کی ہے:

نماز ظہر کا وقت سورج ڈھلنے سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہونے تک ہے۔

نماز عصر کا اختیاری وقت ظہر کے آخری وقت سے سورج زرد ہونے تک ہے اور اسے بوقت ضرورت غروب آفتاب تک بڑھایا جا سکتا ہے۔

نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا اور سرخی غائب ہونے پر ختم ہوتا ہے۔

اور نماز عشاء کا وقت سرخی غائب ہونے سے نصف شب تک ہے۔

نماز عشاء کے لیے وقتِ ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی حائضہ عورت رات کے نصف آخر میں پاک ہوتی تو اس پر نہ تو عشاء کی نماز واجب ہے اور نہ مغرب کی، اس لیے کہ عشاء کی نماز کا وقت نصف شب کو ختم ہو جاتا ہے، سنت میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ نماز عشاء کا وقت طلوع فجر تک ہوتا ہے۔

---

❶ اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے: ٢٩٣.
❷ صحيح مسلم: ١٩١٧ـ عن عقبة بن عامر.



جبکہ نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک ہوتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں صلاۃ فجر کے وقت کا الگ سے ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ (الاسراء: ۷۸) اس لیے کہ نماز فجر کے وقت اور دوسری نمازوں کے اوقات میں قبل ازاں اور بعد ازاں فاصل ہے، اس سے قبل رات کا نصف ثانی جبکہ اس کے بعد دن کے اول کا نصف ہے۔

یہ ہے نمازوں کے اوقات کے حوالے سے سنت کی فراہم کردہ تفصیل۔ اسی طرح قرآن کا حکم ہے:

﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (البقرۃ: ۱٤۳) ''اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

جبکہ کون کون سے مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور کس قدر واجب ہے؟ اس کی تفصیل سنت فراہم کرتی ہے۔

[وَتَدُلُّ عَلَيْهِ]..... یہ لفظ تفسیر، تبیین اور تعبیر کے لیے عام ہے، سنت قرآن کی تفسیر بھی کرتی ہے اور اس کی تبیین بھی۔

[وَ تُعَبِّرُ عَنْهُ]..... یعنی سنت ایسے جدید معانی اور جدید احکام پیش کرتی ہے جو کہ قرآن مجید میں موجود نہیں ہوتے۔

سنت کے حکم ہونے پر مندرجہ ذیل اور اس قسم کی دیگر قرآنی آیات دلالت کرتی ہیں:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

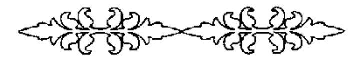
﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: ۷)

''تمہیں رسول جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔''

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (الاحزاب: ۳٦)

''اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ یقیناً دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

جہاں تک حکم معین کا تعلق ہے تو سنت نے قرآن سے الگ بہت سے احکام جاری فرمائے ہیں، مثلاً آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ: ''جب آخری رات کا ثلث باقی رہتا ہے اس وقت ہمارا رب آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔''[1] یہ چیز قرآن میں موجود نہیں ہے۔ الغرض سنت قرآن کے مشکل مقامات کی تفسیر کرتی، اس کی مجمل آیات کی تفصیل بیان کرتی، اس پر دلالت کرتی اور اس کی تعبیر کرتی ہے۔



احادیث صفات پر ایمان لانا واجب ہے

❑ اس کے بعد مؤلف رحمہ اللہ ایک اہم قاعدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((وَمَا وَصَفَ الرَّسُوْلُ بِهِ رَبَّهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الْاَحَادِيْثِ الصِّحَاحِ الَّتِيْ تَلَقَّاهَا اَهْلُ الْمَعْرِفَةِ بِالْقَبُوْلِ وَجَبَ الْاِيْمَانُ بِهَا كَذَالِكَ .))

---

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

''جس طرح قرآن کے محتویات پر ایمان لانا واجب ہے اسی طرح ان چیزوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کا ان صحیح احادیث میں وصف بیان کیا ہے، جنہیں اہل معرفت نے قبولیت کا درجہ دیا ہے۔''

شرح: ......[مَا]......شرطیہ ہے، ''وصف''فعل شرط اور ''وجب الایمان بھا'' جواب شرط ہے۔

نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے جو اوصاف بیان فرمائے اور جن ناموں سے موسوم کیا ان پر بھی ایمان لانا واجب ہے، آپ ﷺ نے رب تعالیٰ کو کچھ ایسے ناموں سے بھی موسوم کیا ہے جو کہ قرآن میں موجود نہیں، مثلاً (الشافی) آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: ((وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُ کَ .))''میرے اللہ! شفا عطا فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے، کوئی شفا نہیں ہے مگر تیری شفا۔'' ❶

[الــرّب]...... یہ لفظ قرآن مجید میں اضافت کے بغیر استعمال نہیں ہوا، مگر سنت میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''رہا رکوع تو اس میں رب تعالیٰ کی تعظیم بیان کرو۔'' ❷ اور آپ نے مسواک کے بارے میں فرمایا: ''وہ مومن کی صفائی اور رب تعالیٰ کی رضا مندی کے حصول کا ذریعہ ہے۔'' ❸

مؤلف رحمہ اللہ کے کلام سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبول احادیث کی دو شرطیں ہیں:

پہلی شرط: وہ احادیث صحیح ہوں۔

دوسری شرط: احادیث کی معرفت رکھنے والوں نے انہیں قبول کیا ہو، مگر اس سے یہ مراد نہیں ہے، شیخ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ احادیث صحیحہ کو اہل معرفت قبول کرتے ہیں، اس اعتبار سے یہ صفت، صفت کاشفہ ہے، نہ کہ صفت مقیدہ۔

[اَلَّتِیْ تَلَقَّاهَا]......یہ احادیث صحیحہ کی حالت کا بیان ہے یعنی اہل معرفت اس قسم کی احادیث کو قبول کرتے ہیں اس لیے کہ ان کی طرف سے صحیح احادیث کو قبول کرنے سے انکار کرنا امر مستحیل ہے، وہ انہیں رد نہیں کرتے بلکہ قبول کرتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ بعض احادیث بظاہر صحیح ہوتی ہیں مگر وہ کسی وجہ سے معلول ہوتی ہیں، اس قسم کی احادیث کا صحیح احادیث میں شمار نہیں ہوتا۔

[وَجَبَ الْاِیْمَانُ بِهَا]......اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (النساء: ۱۳۶)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔''

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (النساء: ۵۹)

---

❶ صحیح بخاری: ۵۷۴۲۔ صحیح مسلم: ۲۱۹۱۔ ❷ صحیح مسلم (۴۷۹) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

❸ اسے بخاری نے تعلیقاً (۴/۱۵۸) جبکہ أحمد (۶/۱۶۲)، نسائی (۱/۱۰) اور ابن حبان (۲/۲۸۷) نے موصولاً روایت کیا ہے، اور بغوی نے ''شرح السنة'' (۱/۳۴۹) میں اسے حسن کہا ہے۔

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو۔''

﴿وَ يَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ٥ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَ لُونَ٥﴾ (القصص : ٦٥ ـ ٦٦)

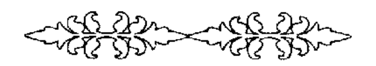
''اور جس دن وہ ان کو آواز دے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ تو اس دن ان پر خبریں اندھی پڑ جائیں گی، پھر وہ آپس میں بھی پوچھ نہ سکیں گے۔''

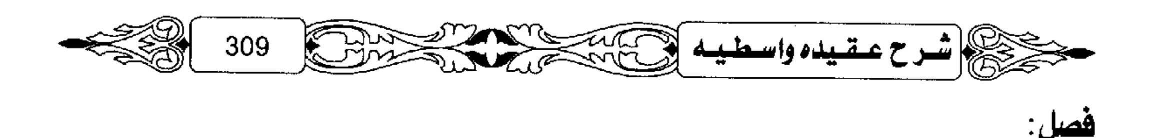
جان لیجیے کہ نفسانی خواہشات کے پجاریوں اور بدعت پرستوں کا موقف اپنی خواہشات کی مخالف احادیث کے بارے میں دو چیزوں پر مبنی ہے، تکذیب یا پھر تحریف۔

اگر ان کے لیے اس قسم کی حدیث کی تکذیب کرنا ممکن ہو تو اس میں تاخیر نہیں کریں گے، مثلاً انہوں نے یہ باطل قاعدہ تراش لیا ہے کہ عقیدہ کے بارے میں خبر واحد قابل قبول نہیں ہوتی۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''مختصر الصواعق'' کے آخر میں اس قاعدہ کا بہت سارے دلائل سے ابطال کیا ہے، اور اگر اس کی تکذیب ممکن نہ ہو تو پھر اس کی تحریف کر ڈالتے ہیں، جس طرح کہ انہوں نے قرآنی نصوص میں تحریف کر ڈالی۔

رہے اہل سنت تو وہ نبی کریم ﷺ کی ہر صحیح حدیث کو قبول کرتے ہیں، اس کا تعلق عملی امور سے ہو یا علمی امور سے، اس لیے کہ اسے قبول کرنے کی دلیل موجود ہے۔

کذلك . یعنی جس طرح تحریف وتعطیل اور تکییف وتمثیل کے بغیر قرآنی محتویات پر ایمان لانا واجب ہے اسی طرح احادیث صحیحہ پر ایمان لانا بھی واجب ہے۔





فصل:

احادیث صفات

□ پہلی حدیث آسمان دنیا پر نزول باری تعالیٰ کے اثبات کے بارے میں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((يَنْزِلُ رَبُّنَا إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا كُلَّ لَيْلَةٍ ، حِيْنَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ ، فَيَقُوْلُ: مَنْ يَدْعُوْنِي فَأَسْتَجِيْبَ لَهُ ، مَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهُ ، مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ .)) [1]

''ہمارا رب ہر رات کو جب اس کا آخری تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے آسمان دنیا پر اترتا ہے اور فرماتا ہے، مجھ سے کون دعا کرے گا، میں اس کی دعا قبول کروں، مجھ سے کون مانگتا ہے، میں اسے دوں، مجھ سے کون بخشش طلب کرتا ہے میں اسے معاف کر دوں۔''

شرح: ...... اس حدیث کو بعض علماء احادیث متواترہ میں شمار کرتے ہیں جبکہ اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اس کا شمار قبول عام حاصل کرنے والی احادیث مشہورہ میں ہوتا ہے۔

[يَنْزِلُ رَبُّنَا إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا] ..... نزول باری تعالیٰ سے مراد نزول حقیقی ہے، اس لیے کہ جس بھی چیز میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہو، تو وہ چیز حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

اس جگہ ہم پر واجب قرار پاتا ہے کہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہہ دیں کہ ہمارا رب آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے، آسمانوں کی تعداد سات ہے اور یہ آسمان زمین کے قریب ترین ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب ہونے کے لیے رات کے اس وقت آسمان دنیا پر اترتا ہے، جس طرح وہ عرفہ کی رات اپنے بندوں سے قریب ہوتا ہے اور وقوف عرفات کرنے والوں کی وجہ سے فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے۔ [2]

[حِيْنَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ] ..... اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ رات کا آغاز غروب آفتاب سے ہوتا ہے، مگر وہ ختم کب ہوتی ہے، اس بارے میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک اس کا اختتام طلوع فجر کے ساتھ ہوتا ہے، جبکہ بعض دوسروں کے نزدیک طلوع آفتاب کے ساتھ۔ ظاہر یہ ہے کہ شرعی رات کا اختتام طلوع فجر کے ساتھ اور فلکی رات کا طلوع آفتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

[فَيَقُوْلُ: مَنْ يَدْعُوْنِي] ..... ''مَنْ'' یہ شوق دلانے کے لیے حرف استفہام ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (الصف: ١٠)

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔
[2] ملاحظہ فرمائیں: صحیح مسلم: ١٣٤٨ عن عائشة رضي الله عنها.

''کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دلائے؟''

يَدْعُوْنِيْ ..... یعنی یا رب! یا رب! کہہ کر مجھے پکارے۔

[فَأَسْتَجِيْبَ] ..... نصب کے ساتھ، اس لیے کہ یہ جواب طلب ہے۔

[مَنْ يَسْأَلُنِيْ] ..... وہ مجھ سے جنت یا کسی اور چیز کا سوال کرے۔

[مَنْ يَسْتَغْفِرُنِيْ] ..... مثلاً وہ یوں کہے "اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ" یا اللہ! مجھے معاف فرما دے، یا أَسْتَغْفِرُكَ اللّٰهُمَّ. میرے اللہ! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔

[فَأَغْفِرَ لَهُ.] ..... مغفرت۔ گناہوں کی پردہ پوشی کرنا اور ان سے درگزر فرمانا۔

اس حدیث سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس جگہ نزول سے مراد اللہ تعالیٰ کا بنفس نفیس نزول فرمانا ہے۔ اس لیے کہ فعل اس کی طرف مضاف ہے، مگر بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ نزول فرماتا ہے، پھر بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا امر اترتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت اترتی ہے، جبکہ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کوئی فرشتہ اترتا ہے۔

مگر یہ سب کچھ باطل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہمیشہ اترتا رہتا ہے، اس کا نزول رات کے آخری ثلث کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ﴾ (السجدة: ٥)

''وہی تدبیر کرتا ہے امر کی آسمان سے زمین تک پھر وہ امر اس کی طرف چڑھے گا۔''

﴿وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ﴾ (هود: ١٢٣) ''اور سب کے سب کام اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

رہا ان کا یہ کہنا کہ اس وقت آسمان دنیا پر رحمت ایزدی کا نزول ہوتا ہے، تو کیا اس کا صرف اسی وقت ہی نزول ہوتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے:

﴿وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ (النحل: ٥٣)

''تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

سب نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ اس کی رحمت کے آثار ہیں جو کہ بروقت اترتی رہتی ہے، پھر یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ آسمان دنیا پر نزول رحمت کا ہمیں کیا فائدہ؟

جو شخص یہ کہتا ہے کہ آسمان دنیا پر کوئی فرشتہ اترتا ہے، تو اس سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ کیا کسی فرشتے کا یہ کہنا معقول ہے کہ: مجھے کون پکارے گا کہ میں اس کی پکار سنوں......؟

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ اقوال تحریف باطل کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کا ابطال یہ حدیث کرتی ہے۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ نہ تو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ علم رکھتے ہیں نہ ان سے بڑھ کر اللہ کے بندوں کے خیر خواہ ہیں اور نہ ہی ان سے زیادہ فصیح المقال۔

وہ ہم سے کہتے ہیں کہ تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے، اس حوالے سے تم سے ہمارا سوال یہ ہے کہ جب اللہ اترتا ہے، تو پھر علو کہاں گیا؟ اس کا عرش پر مستوی ہونا کہاں گیا؟ اگر وہ نزول فرماتا ہے تو نزول تو حرکت وانتقال کا متقاضی ہے، اگر وہ اترتا ہے تو اترنا حادث ہے اور حوادث حادث کی وجہ سے ہی قائم رہ سکتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ باطل کے ساتھ جھگڑا کرنا ہے، حقیقت نزول کا قول اختیار کرنے میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔ کیا تم اصحاب رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ان امور کا علم رکھتے ہو جن کا اللہ تعالیٰ استحقاق رکھتا ہے؟

انہوں نے تو اس طرح کے احتمالات کبھی پیدا نہیں کیے، وہ تو ہمیشہ یہی کہتے رہے، ہم نے سنا اور ہم ایمان لائے، ہم نے قبول کیا اور ہم نے تصدیق کی۔ اصحاب رسول کی مخالفت پر کمر بستہ لوگو! تم اب آئے اور باطل کے ساتھ جھگڑا کرنے لگے، اور یہ کس طرح؟ اور وہ کس طرح؟ کے راگ الاپنے شروع کر دیے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارا رب نزول فرماتا ہے، ہم اس کے استواء علی العرش کی بحث ہی نہیں کرتے، ہم یہ بات ہی نہیں کرتے کہ اس دوران عرش خالی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟

رہا علو، تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے مگر وہ اپنی مخلوق پر عالی بھی ہے، نزول کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ آسمان اسے اٹھائے ہوئے ہے اور دوسرے آسمان اس پر سایہ کیے ہوئے ہیں، اس لیے کہ اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی چیز اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

ہم کہتے ہیں: وہ حقیقتاً اترتا ہے اور حقیقتاً عالی بھی ہے اور اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

جہاں تک استواء علی العرش کا تعلق ہے تو یہ فعل ہے، اسے صفات ذات میں شمار نہیں کیا جاتا اور ہمیں یہ بحث کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ نزول کے دوران اس کا عرش اس سے خالی ہوتا ہے یا نہیں؟ ہمیں اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح سکوت اختیار کرنا چاہیے۔

عرش کے خالی ہونے پر علماء کے اقوال

علمائے اہل سنت کے اس بارے میں تین اقوال ہیں: ایک قول یہ کہ اس دوران عرش خالی ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ وہ خالی نہیں ہوتا اور تیسرا یہ کہ اس بارے توقف اختیار کیا جائے۔

شیخ الاسلام "الرسالة العرشية" میں فرماتے ہیں: عرش اللہ تعالیٰ سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے کہ استواء علی العرش کے دلائل محکم ہیں اور حدیث بھی محکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا استواء کی نصوص اور نزول کی نص کو ان کے احکام پر باقی رکھنا واجب ہے، ہم کہتے ہیں: وہ عرش پر مستوی ہے وہ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے، مگر اس کی کیفیت کے بارے میں اللہ بہتر جانتا ہے، ہماری عقلیں اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔

جب لوگ اس امر سے آشنا ہوئے کہ زمین گول ہے اور سورج اس کے اردگرد چکر لگاتا ہے، تو متاخرین نے یہ اشکال پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری ثلث میں کس طرح نزول فرماتا ہے، یہ وقت جب سعودی عرب سے منتقل ہوتا ہے تو



یورپ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں چلا جاتا ہے؟ کیا اس طرح وہ ہمیشہ نزول فرمائے رہتا ہے؟ اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ پہلے اس بات پر ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ اس معین وقت پر نزول فرماتا ہے۔

جب آپ اس بات پر ایمان لے آئیں گے، تو اس کے بعد آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں رہے گی، آپ کیوں؟ اور کس طرح؟ کی بحث چھوڑیں اور اس بات پر ایمان لائیں کہ جب یہ معین وقت سعودی عرب میں ہوتا ہے تو بھی اللہ نزول فرماتا ہے، پھر جب یہ وقت امریکہ میں ہوتا ہے تو بھی اللہ نزول فرماتا ہے اور جب فجر طلوع ہو جاتی ہے، تو ہر جگہ اس کے حساب سے نزول کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

دریں حالات ہمارا موقف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وساطت سے ہم تک جو چیز پہنچے ہم اس پر ایمان لائیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس وقت آسمان دنیا پر اترتا ہے جب رات کا آخری ثلث باقی رہتا ہے، تو وہ فرماتا ہے: مجھے کون پکارے گا میں اس کی پکار کو قبول کروں، مجھ سے کون سوال کرے گا میں اسے عطا کروں، مجھ سے کون بخشش طلب کرے گا میں اسے بخش دوں؟

فوائد حدیث

اس حدیث کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

اولاً: نبی کریم ﷺ کے ارشاد "يَنْزِلُ" سے اللہ تعالیٰ کے لیے علو کا اثبات ہوتا ہے۔

ثانیاً: آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے ارشاد: "ينزل ربنا حين يبقى ثلث الليل الآخر" سے افعال اختیاریہ کا اثبات ہوتا ہے جو کہ اصلاً صفات فعلیہ ہیں۔

ثالثاً: آپ ﷺ کے ارشاد: "من يدعوني...... من يسالني...... من يستغفرني" سے اللہ تعالیٰ کے لیے کرم کا اثبات ہوتا ہے۔

رابعاً: اور آپ ﷺ کے ارشاد: "يَقُوْلُ" سے اللہ تعالیٰ کے لیے قول کا اثبات ہوتا ہے۔

سلوکی فوائد

انسان کو چاہیے کہ وہ رات کے اس حصے کو غنیمت خیال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کرے، اسے پکارے اور اس سے طلب مغفرت کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ (هَل مَن) کہہ کر ان امور کا خود شوق دلایا ہے، لہٰذا ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اس لیے کہ آپ کی عمر وہی ہے، جسے آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بسر کریں گے۔ زندگی کے یہ دن بیت جائیں گے۔ جس دن آپ کو موت آئے گی گویا کہ اسی دن آپ کی پیدائش ہوگی، جو کچھ گزر گیا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

❑ دوسری حدیث اثباتِ فرح کے بارے میں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَلّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ مِنْ اَحَدِكُمْ بِرَاحِلَتِهٖ......)) (متفق عليه) [1]

---

[1] اسے بخاری: ۶۳۰۸۔ اور مسلم: ۲۷۴۷ نے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔



''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے توبہ کرنے پر اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جسے اپنی سواری مل جائے......''

شرح:...... [لَلّٰهُ] ...... یہ (لام) لام ابتداء ہے اور لفظ ((اللہ)) مبتدا۔

[اَشَدُّ] ...... خبر۔

[فَرَحًا] ...... تمیز ہے۔

اس حدیث کی تفصیل یہ ہے کہ کسی مسافر آدمی کے پاس اس کی سواری تھی، جس پر اس کا سامان خورد ونوش موجود تھا، مگر وہ گم ہوگئی، وہ اسے تلاش کرنے لیے نکلا مگر وہ اسے نہ مل سکی، آخر وہ زندگی سے مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ کر موت کا انتظار کرنے لگا، پھر اچانک کیا دیکھتا ہے، کہ اس کی اونٹنی کی لگام درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے...... اس آدمی کی خوشی کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو خود اس قسم کے حالات سے دوچار ہوا ہو...... اس نے اس کی لگام پکڑی اور کہنے لگا: میرے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں، اچانک اور بہت زیادہ خوشی ملنے پر اس سے غلطی ہوگئی اور صحیح انداز میں بات کرنے سے قاصر رہا۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتا ہے تو وہ اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے، جسے مایوسی کے عالم میں اپنی سواری مل جائے۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری توبہ کا محتاج نہیں ہے، یہ ہم ہی ہیں جو اپنے جملہ احوال میں اس کے محتاج ہیں، وہ اپنے لطف وکرم، جود وسخا اور فضل واحسان کی وجہ سے انسان کی توبہ سے اس طرح خوش ہوتا ہے کہ اس کی اور کہیں نظیر نہیں ملتی۔

اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کے لیے فرح وخوشی کا اثبات ہوتا ہے، جو کہ حقیقی ہے مگر وہ مخلوق کی فرح وخوشی جیسی نہیں ہے۔

انسان کی نسبت سے فرح ایک ایسی خوشی وشادمانی سے عبارت ہے جو وہ کسی خوش کن چیز کے حصول کے وقت اپنے جی میں محسوس کرتا ہے اور اسے یوں معلوم ہوتا ہے گویا کہ وہ ہوا میں اڑ رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی نسبت سے فرح کی یہ تفسیر نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ اس کی دیگر تمام صفات کی طرح اس کے شایان شان فرح ہے، جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ذات ہے مگر وہ ہماری ذات جیسی نہیں ہے، اس کی صفات ہیں مگر وہ ہماری صفات سے مماثل نہیں ہیں، اس لیے کہ صفات کے بارے میں بات کرنا ذات کے بارے میں بات کرنے کی فرع ہے۔

ہمارا اللہ تعالیٰ کی فرح پر ایمان ہے، جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا اثبات فرمایا ہے، جو کہ ساری مخلوق سے زیادہ اللہ کے بارے میں علم رکھتے ہیں، ساری مخلوق سے زیادہ مخلوق کے خیر خواہ اور سب سے زیادہ فصیح المقال ہے۔

جب ہم یہ کہیں گے کہ فرح سے مراد حقیقی نہیں بلکہ اس سے مراد ثواب ہے تو اپنے آپ کو خطرات سے دوچار کریں گے، یہ قول اہل تحریف کا ہے کہ اللہ خوش نہیں ہوتا، اس کی خوشی سے مراد توبہ کرنے والے کو ثواب سے نوازنا ہے، یا اس کے لیے ثواب کا ارادہ کرنا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس سے الگ مخلوق کا اثبات کرتے ہیں جو کہ ثواب ہے، وہ اس کے لیے ارادہ کا بھی اثبات کرتے ہیں اور فرح کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد ثواب یا ارادہ ثواب ہے۔

مگر ہمارے نزدیک فرح سے مراد حقیقی فرح ہے، مگر ہماری صفات اللہ کی صفات کے مماثل نہیں ہو سکتیں۔ اس حدیث

سے اللہ تعالیٰ کے لیے فرح کے اثبات کے ساتھ بندوں پر اس کی کمال رحمت وارفت کا بھی اثبات ہوتا ہے، اسے اس بات سے بڑی محبت ہے کہ اس سے دور بھاگنے والا عاصی اپنی معصیت سے باز آ جائے، اس کی طرف رجوع کرے اور اس کے حضور صدق دل سے توبہ کرے۔

اس حدیث کے سلوکی فوائد

سلوکی اعتبار سے یہ حدیث ہمیں یہ فائدہ دیتی ہے کہ ہم سے جب بھی کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے اس سے توبہ کریں۔

توبہ کی شرائط

اللہ تبارک وتعالیٰ متقین کے اوصاف گنواتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (آل عمران: ۱۳۵)

''اور وہ لوگ کہ جب وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کر لیتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے علاوہ گناہوں کو کون معاف کرتا ہے۔''

بے حیائی سے مراد زنا، لواطت اور ذوات المحارم سے نکاح کرنے جیسی برائیاں ہیں، فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا وَ سَآءَ سَبِيْلًاo﴾ (النساء: ۲۲)

''اور تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں، مگر جو کچھ پہلے ہو چکا، بیشک وہ بے حیائی اور ناراضی کا کام اور بہت ہی برا طریقہ ہے۔''

﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِيْلًاo﴾ (الاسراء: ۳۲)

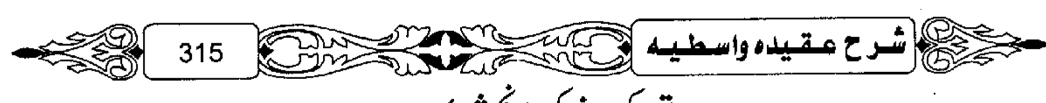
''اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ بیشک وہ بے حیائی کا کام ہے اور بہت ہی برا طریقہ ہے۔''

اور حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ﴾ (الاعراف: ۸۰) ''کیا تم بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو۔''

الغرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرنے یا اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عظمت ورفعت اور اس کی سزا کو یاد کرتے اور توبہ کرنے والوں کے اجر وثواب کو ذہن میں لاتے ہیں تو انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو اس سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی کے خواستگار ہوتے ہیں تو اللہ ان کی مغفرت فرما دیتا ہے کہ اس کے علاوہ گناہوں کو معاف کرنے والا بھی تو کوئی نہیں۔

جب آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی توبہ سے بڑا خوش ہوتا ہے تو یقیناً آپ توبہ کرنے پر بڑے حریص ہوں گے۔



توبہ کرنے کی پانچ شرائط ہیں

پہلی شرط: اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص ہونا، بایں طور کہ اس کے پیچھے دنیاوی مقاصد کارفرما نہ ہوں۔

دوسری شرط: معصیت پر ندامت۔

تیسری شرط: ارتکاب معصیت سے باز آجانا، اگر توبہ کا تعلق لوگوں کے حقوق سے ہو تو وہ حق متعلقہ لوگوں کو لوٹا دیا جائے۔

چوتھی شرط: مستقبل میں معصیت کے عدم ارتکاب کا عزم۔

پانچویں شرط: توبہ قبولیت کے وقت میں کی جائے، یعنی موت سے قبل توبہ کی جائے، مغرب کی طرف سے سورج طلوع ہونے کے بعد بھی توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ﴾ (النساء: ۱۸)

''اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو گناہ پر گناہ کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔''

نبی کریم ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ مغرب کی طرف سے سورج طلوع ہونے پر توبہ کا وقت ختم ہو جائے گا، اس وقت لوگ ایمان لائیں گے مگر اس کا وقت گزر چکا ہوگا۔

﴿لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا﴾ [1] (الانعام: ۱۵۸)

''نہیں فائدہ دے گا کسی شخص کو اس کا ایمان جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا یا ایمان کی حالت میں نیک اعمال نہ کیے تھے۔''

یہ پانچ شرائط ہیں جن کے متحقق ہونے پر ہی توبہ درست ہوگی۔

کیا توبہ صحیح ہونے کے لیے تمام گناہوں سے توبہ کرنا شرط ہے؟

اس بارے علماء کا اختلاف ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ شرط نہیں ہے، دوسرے گناہوں پر اصرار کے باوجود کسی ایک گناہ سے توبہ صحیح ہو جائے گی۔ [2] مگر یہ توبہ مطلق نہیں بلکہ مقید ہوگی۔

مثلاً اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا اور سودی لین دین کرتا ہے، اس نے شراب نوشی سے توبہ کر لی تو اس کی اس گناہ سے توبہ صحیح ہوگی جبکہ سود خوری کا گناہ اس کے ذمہ باقی رہے گا، مگر علی الاطلاق توبہ کرنے والوں کے مرتبہ کے حصول سے قاصر رہے گا، اس لیے کہ وہ بعض دوسرے گناہوں پر مصر ہے۔

ایک آدمی نے توبہ کی تمام شرائط مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب کر لیا، تو اس سے اس کی پہلی توبہ ٹوٹ نہیں

---

[1] ملاحظہ ہو، صحیح بخاری: ٤٦٣٦۔ صحیح مسلم: ١٥٧۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

[2] یہ دونوں روایتیں امام احمد کی ہیں، ملاحظہ فرمائیں کتاب مدارج السالکین، از امام ابن قیم: ١/ ٢٧٣۔

جائے گی، اس لیے کہ اس نے ایسا نہ کرنے کا عزم کیا تھا مگر وہ نفس کے فریب میں آ کر دوبارہ اس کا مرتکب ہوگیا، لہٰذا وہ اس سے ایک بار پھر توبہ کرے، پھر جب بھی اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا اس سے توبہ کرے...... اللہ تعالیٰ کا فضل بڑا وسیع ہے۔

❑ تیسری حدیث اثبات ضحک (ہنسنا) کے بارے میں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((یَضْحَكُ اللّٰهُ اِلٰی رَجُلَیْنِ ؛ یَقْتُلُ اَحَدُهُمَا الْآخَرَ ؛ كِلَاهُمَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ .)) [1]

''اللہ تعالیٰ ان دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنستا ہے جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دیتا ہے اور وہ دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

شرح: ...... بعض نسخوں میں ''یَدْخُلَانِ'' ہے اور یہ بھی صحیح ہے، اس لیے کہ (کلا) کی خبر میں۔ وہ اسم ہو یا فعل۔ لفظ اور معنی دونوں کی رعایت رکھنا جائز ہوتا ہے۔

حدیث میں نبی کریم ﷺ اس امر کی خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ دو ایسے آدمیوں کو دیکھ کر ہنستا ہے، جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دیتا ہے اور پھر وہ دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں، وہ یوں کہ ان میں سے ایک مسلمان تھا اور دوسرا کافر، کافر نے مسلمان کو قتل کر ڈالا، جس کی وجہ سے مسلمان شہید قرار پایا اور وہ جنت میں داخل ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے کافر پر احسان کیا اور وہ بھی مسلمان ہوگیا، پھر اسے شہید کر دیا گیا، یا طبعی موت مر گیا اور پھر وہ بھی جنت میں داخل ہوگیا اس طرح جب قاتل اور مقتول دونوں جنت میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ کر ہنس رہا۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہنسنے کا اثبات کیا گیا ہے، یہ ہنسنا حقیقی ہے مگر یہ مخلوق کے ہنسنے کے مماثل نہیں ہے، ایسی ہنسی ہے جو اس کے جلال و عظمت کے شایان شان ہے، ہمارے لیے اسے مخلوق کی ہنسی کے مماثل قرار دینا ممکن نہیں ہے، ہمارے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مونہہ ہے یا دانت ہیں یا اس جیسی کوئی اور بات۔ البتہ ہم اس کے لیے اس کے شایان شان ہنسی کا اثبات ضرور کریں گے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہنسی کے اثبات سے اس کا مخلوق کے ساتھ مماثل ہونا لازم آئے گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا، اس لیے کہ جس رسول ﷺ نے ''یضحك'' فرما کر اس کے لیے ہنسی کا اثبات فرمایا ہے انہیں پر اس آیت کا بھی نزول ہوا تھا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

دوسری بات یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس جیسے امور میں صرف وحی کی روشنی میں بات فرما سکتے ہیں اس لیے کہ اس کا تعلق غیبی امور سے ہے نہ کہ اجتہادی امور سے۔

---

[1] صحیح بخاری: ۲۸۲٦۔ صحیح مسلم: ۱۸۹۰۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ.

اگر کوئی یہ کہے کہ ہنسی سے مراد خوشنودی ہے، اس لیے کہ انسان جب کسی چیز سے راضی ہوتا ہے تو وہ خوشی سے ہنسنے لگتا ہے، اور خوشنودی ورضا سے مراد ثواب یا ارادہ ثواب ہے، جیسا کہ اہل تعطیل کا قول ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ تمہارا یہ کہنا محض تحریف ہے، تمہیں یہ کس طرح پتا چلا کہ رضیٰ سے مراد ثواب ہے؟ یہ کہہ کر تم نے دو طرح سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں لاعلمی پر مبنی بات کی۔

۱۔ تم نے بدون علم نص کو اس کے ظاہر سے پھرا۔

۲۔ تم نے بدون علم ظاہر کے خلاف نص سے اس کے معنی کا اثبات کیا۔

پھر ہم ان سے یہ بھی کہنا چاہیں گے کہ اگر تمہارے نزدیک اللہ کے لیے ارادہ ثابت ہے، تو اس سے بھی تمہارا وضع کردہ قائدہ ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے کہ انسان کے لیے بھی ارادہ ثابت ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ﴾ (آل عمران : ۱۵۲)

''تم میں سے کچھ دنیا کا ارادہ کرتے ہیں اور کچھ آخرت کا۔''

ارادہ انسان کے لیے بھی ثابت ہے، بلکہ دیوار کے لیے بھی ثابت ہے۔

﴿فَوَجَدَا فِيۡهَا جِدَارًا يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ﴾ (الکھف : ۷۷)

''انہوں نے اس بستی میں ایک دیوار پائی جو ٹوٹ کر گر جانا چاہتی تھی۔''

اب تم یا تو اللہ تعالیٰ سے بھی ارادہ کی نفی کرو جس طرح تم نے اس کی بعض صفات کی نفی کر دی ہے، یا پھر اس کے لیے وہ کچھ ثابت کرو جس کا اس نے اپنی ذات کے لیے اثبات کیا ہے۔

اس حدیث سے اخذ کردہ سلوکی فوائد

جب ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اللہ ہنس بھی لیا کرتا ہے تو ہم اس سے ہر خیر کی امید رکھیں گے، ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: کیا ہمارا رب ہنس بھی لیا کرتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' اس پر وہ کہنے لگا: ہنسنے والے رب سے ہم خیر کو معدوم نہیں پائیں گے۔ [1]

جب ہمیں اس کا علم ہوگا تو ہمارے لیے ہر خیر میں امید کے دروازے کھل جائیں گے، اس لیے کہ ترش رو اور ہنس مکھ انسان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے اور اکثر تبسم فرمایا کرتے۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیں، مسند احمد: ٤/ ١١، ١٢۔ سنن ابن ماجہ: ١٨١۔ الاسماء والصفات، از بیھقی: ٩٨٧۔ الشریعۃ از آجری: ٢٧٩۔ السنۃ، از ابن ابی عاصم: ١/ ٢٤٤۔ اس حدیث کو شیخ البانی نے السلسلۃ الصحیحۃ: ٢٨١٠ میں حسن کہا ہے۔



❑ چوتھی حدیث تعجب اور دوسری صفات کے اثبات میں:

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((عَجِبَ رَبُّنَا مِنْ قُنُوْطِ عِبَادِهِ وَقُرْبِ غِيَرِهِ ؛ يَنْظُرُ إِلَيْكُمْ أَزِلِيْنَ قَنِطِيْنَ ، فَيَظَلُّ يَضْحَكُ ؛ يَعْلَمُ أَنَّ فَرَجَكُمْ قَرِيْبٌ .)) (حديث حسن) [1]

''ہمارا پروردگار اپنے بندوں کی مایوسی اور اس کی تبدیلی کے قرب پر تعجب کرتا ہے، وہ تمہاری طرف اس حال میں دیکھتا ہے کہ تم سختی میں گرفتار مایوسی کا شکار ہوتے ہو تو وہ ہنسنے لگتا ہے، وہ جانتا ہے کہ تمہاری سختی کا ازالہ جلد ہونے کو ہے۔'' یہ حدیث حسن ہے۔

اسباب عجب

[عَجِبَ]..... کسی چیز پر حیرت کا اظہار کرنا، اس کے دو سبب ہوتے ہیں:

پہلا سبب: کسی چیز کے اسباب کا مخفی ہونا بایں طور کہ وہ توقع کے بغیر اچانک انسان کو لاحق ہو جائے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ سے تعجب اور حیرت کا صدور محال ہے، اس لیے کہ اسے ہر شے کا علم ہے، اور اس پر کوئی بھی چیز مخفی نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔

دوسرا سبب: اس کا اپنی نظائر سے خروج کرتے ہوئے اس طرح نہ ہو، جس طرح کہ اسے ہونا چاہیے، مگر اس میں تعجب کرنے والے کے قصور کا عمل دخل نہیں ہوتا بایں کہ وہ ایسا انوکھا کام کرے کہ اس کا وقوع اس جیسے سے مناسب نہ ہو۔ یہ تعجب اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے، اس لیے کہ یہ اس میں کسی نقص کی وجہ سے نہیں، بلکہ متعجب منہ کی حالت کی وجہ سے ہے۔

[عَجِبَ رَبُّنَا مِنْ قُنُوْطِ عِبَادِهِ]..... القنوط: شدید قسم کی مایوسی، رب کائنات بندوں کے دلوں میں شدید قسم کی مایوسی پیدا ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

[وَقُرْبِ غِيَرِهِ]...... واؤ معیت کے معنی ہے، یعنی مَعَ قُرْبِ غِيَرِهِ .

(ألغير) (غِيَرَة) کا اسم جمع، جس طرح کہ (طِيَر) طِيَرَة کا اسم جمع ہے، اور یہ تغییر کے معنی میں ہے، اس طرح اس عبارت کا معنی ہوگا: وَقُرْب تَغْيِيْرِهِ، اللہ تعالیٰ اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ ہم حالات سے کس طرح مایوس ہو رہے ہیں، جبکہ وہ انہیں تبدیل کرنے کے قریب ہے، وہ کلمہ (کُنْ) کے ساتھ ایک حالت کو دوسری حالت میں تبدیل کر دے گا۔

[يَنْظُرُ إِلَيْكُمْ] ..... یعنی اللہ عزوجل اپنی آنکھ سے ہماری طرف دیکھتا ہے۔

[أَزِلِيْنَ قَنِطِيْنَ]...... الازل: سختی میں مبتلاء قنطين . قانط کی جمع ہے، القانط: خوشحالی اور سختی کے ازالہ سے مایوس شخص۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیں، تفسیر ابن کثیر: ١/ ٢٥٢.



اس جگہ نبی کریم ﷺ نے انسان اور اس کے دل کی حالت کی عکاسی کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ مایوسی کا شکار ہے، جبکہ اس کا دل مایوس اور خوشحالی کو بعید خیال کیے بیٹھا ہے۔

[فَيَظَلُّ يَضْحَكُ] ...... یعنی اللہ تعالیٰ بندے کی اس عجیب وغریب حالت کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے کہ وہ اس ارحم الراحمین کی رحمت سے مایوس ہے جو ایک کلمہ (کن) سے سب کچھ تبدیل کر سکتا ہے۔

[يَعْلَمُ اَنَّ فَرَجَكُمْ قَرِيْبٌ.] ..... یعنی اسے معلوم ہے کہ تمہاری سختی کا زوال ہونے کو ہے۔

حدیث مذکورہ میں بیان کردہ صفات

اس حدیث میں کئی صفات کا ذکر ہے:

تعجب: جو اس ارشاد گرامی سے مستنبط ہے: "عجب ربنا من قنوط عباده" اس صفت پر قرآن کریم بھی دلالت کرتا ہے: ﴿بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ﴾ (الصافات : ١٢) (تاء کے ضمہ کی قراءت پر) "بلکہ میں نے تعجب کیا اور وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔"

قدرت: اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وقرب غيره" نیز یہ کہ وہ تام القدرت ہے۔

جب چاہتا ہے مختصر وقت میں ایک حالت کو دوسری حالت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

نظر: اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ينظر اليكم.

ضحك: (ہنسی) اس لیے کہ آپ نے فرمایا: فيظل يضحك.

علم، اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: يعلم ان فرجكم قريب.

رحمت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراخی بندوں کے ساتھ اس کی رحمت کی دلیل ہے۔

جن جملہ صفات پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے ہم پر اللہ تعالیٰ کے لیے ان کا ان کی حقیقت کے مطابق اثبات واجب ہے۔ ان میں تاویل کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

اس حدیث میں سلوکی فائدہ یہ ہے کہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس بات کا علم ہوگا، تو وہ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوگا، رحمت ایزدی سے مایوس ہونا کبیرہ گناہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ (الحجر : ١٥)

"ابراہیم نے کہا: گمراہوں کے علاوہ اپنے رب کی رحمت سے کون مایوس ہو سکتا ہے۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (يوسف : ٨٧)

"اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"



اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا اور اسے بعید خیال کرنا گناہ کبیرہ ہے، انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے رب کے بارے میں حسن ظن سے کام لے، اگر اس سے دعا کرے تو اس سے حسن ظن رکھے کہ وہ میری دعا کو قبول فرمائے گا، اگر شرعی تقاضوں کے مطابق اس کی عبادت کرے تو حسن ظن رکھے کہ اللہ اسے شرف قبولیت سے نوازے گا، اگر کوئی مشکل آن پڑے تو حسن ظن رکھے کہ رب تعالیٰ اسے دور فرمائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات جان لے کہ نصرت صبر کے ساتھ ہے، خوشحالی بدحالی کے ساتھ اور آسانی مشکل کے ساتھ ہے۔''[1] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ (انشراح: ٥-٦)

''یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہوتی ہے۔ یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہوتی ہے۔''

اور ایک مشکل دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آ سکتی۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ کے لیے رِجل یا قدم کا اثبات

☐ پانچویں حدیث رِجل یا قدم کے اثبات میں:

آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزَالُ جَهَنَّمُ يُلْقَى فِيهَا ، وَهِيَ تَقُولُ : هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ؛ حَتَّى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيهَا رِجْلَهُ (وَفِي رِوَايَةٍ : عَلَيْهَا قَدَمَهُ) فَيَنْزَوِي بَعْضُهَا إِلَى بَعْضٍ ، فَتَقُولُ: قَطْ قَطْ .))

متفق عليه [3]

''جہنم میں لوگوں کو مسلسل پھینکا جاتا رہے گا، اور وہ کہتی رہے گی: کیا کچھ اور بھی ہے، یہاں تک کہ اللہ رب العزت اس میں اپنا پاؤں رکھے گا (دوسری روایت میں ہے: اس پر اپنا قدم رکھے گا) اس پر وہ سکڑ جائے گی اور کہہ اٹھے گی: بس بس۔'' متفق علیہ

[لَا تَزَالُ جَهَنَّمُ يُلْقَى فِيهَا] ..... یہ قیامت کے دن ہوگا، یعنی اس میں لوگ اور پتھر پھینکے جائیں گے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (البقرة: ٢٤)

''بچو اس آتش جہنم سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے۔''

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صرف لوگوں کو پھینکا جائے گا اور پتھر اس میں پہلے سے موجود ہوں گے۔ والعلم عند اللہ

[1] مسند أحمد: ١/ ٣٠٧ اور جامع ترمذی: ٢٠١٨ میں مروی حدیث کا ٹکڑا، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا، ابو یعلیٰ: (٢٥٥٦) ابن عباس، ابن رجب جامع العلوم والحکم: ١/ ٤٦٠۔ میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں، یہ حدیث بہت سارے طرق سے مروی ہے، سب سے صحیح سند حنش صنعانی کی ہے، جسے ترمذی نے نکالا۔

[2] اس حدیث کے متعدد طرق ہیں جنہیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری: ٨/ ٧١٢۔ میں ذکر کیا ہے۔

[3] اسے بخاری: ٧٣٨٤۔ اور مسلم: ٢٨٤٨ نے روایت کیا۔

یُلْقٰی فِیْھَا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دوزخیوں کو جہنم میں دھکے دے کر پھینکا جائے گا، وہ اس میں عزت کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے۔

﴿كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ﴾ (الملك: ٨)

''جب کبھی ڈالی جائے گی اس میں ان کی کوئی جماعت تو اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟''

[وَهِيَ تَقُوْلُ : هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ] ..... (ھل) طلب کے لیے ہے، یعنی: اور لاؤ۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس جگہ یہ استفہام نفی کے لیے ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اس کا معنی ہوگا: اب مزید گنجائش نہیں ہے، مگر یہ معنی غلط ہے، اور اس تاویل کے بطلان کی دلیل آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

[حَتّٰى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيْهَا رِجْلَهُ (وَفِيْ رِوَايَةٍ: عَلَيْهَا قَدَمَهُ)] ..... یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مزید کا مطالبہ کرے گی، اگر یہ مطلب نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم مبارک نہ رکھتا، گویا کہ وہ بڑے شوق سے مزید لوگوں کے پھینکے جانے کا مطالبہ کرے گی۔

حَتّٰى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ ''رب العزت'' کی تعبیر اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عزت اور غلبہ وقدرت کا مقام ہے۔

اس جگہ (رَبٌّ) صاحب کے معنی میں ہے، خالق کے معنی میں نہیں ہے، اس لیے کہ عزت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور صفات باری تعالیٰ مخلوق نہیں ہے۔

[فِيْهَا رِجْلَهُ دوسری روایت میں ہے: ''عَلَيْهَا قَدَمَهُ'' اس جگہ (فِيْ) اور (عَلٰى) دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، بظاہر (فی) (علیٰ) کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری میں ہے: ﴿وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ﴾ (طٰہٰ: ٧١)

یعنی ''علی جذوع النخل'' ''میں تمہیں کھجوروں کے تنوں پر سولی دوں گا۔''

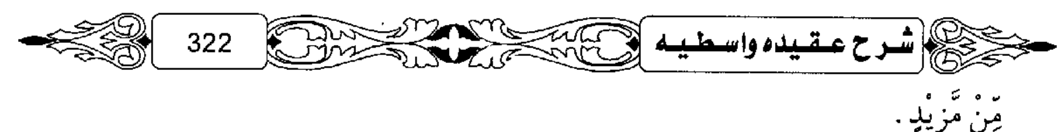
رجل اور قدم کا معنی ایک ہی ہے، انسان کے پاؤں کو قدم سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے چلتے وقت آگے کیا جاتا ہے اس لیے کہ جب تک کوئی اپنے پاؤں کو آگے نہیں بڑھائے گا، چل نہیں پائے گا۔

[فَيَنْزَوِيْ بَعْضُهَا إِلٰى بَعْضٍ] ..... یعنی باری تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے جہنم کا ایک حصہ دوسرے حصے کے ساتھ مل جائے گا اور وہ سکڑ جائے گی۔

[فَتَقُوْلُ: قَطْ قَطْ.] ..... یعنی: میرے لیے کافی ہے، میرے لیے کافی ہے۔ اب میں اور کسی کو نہیں چاہتی۔ اس حدیث میں مندرجہ ذیل صفات کا ذکر ہے۔

۱۔ جمادات کے بات کرنے کا اثبات اور یہ آپ ﷺ کے اس ارشاد کی بنیاد پر ہے: ''وَهِيَ تَقُوْلُ'' اسی طرح ''فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ'' یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہے جس نے ہر چیز کو قوت گویائی دی۔

۲۔ دوزخ سے خبردار کرنا۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے: لَا تَزَالُ جَهَنَّمُ يُلْقٰى فِيْهَا وَهِيَ تَقُوْلُ: هَلْ



مِنْ مَّزِیْدٍ .

۳۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کا اثبات، اللہ تعالیٰ نے جہنم سے اسے بھرنے کا وعدہ فرما رکھا ہے: ﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَo﴾ (ھود: ۱۱۹) ''میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھروں گا سب کے سب سے۔'' جب جہنمی جہنم میں داخل ہو جائیں گے اور اس میں ابھی مزید گنجائش باقی ہوگی تو وہ مزید کا مطالبہ کرے گی، اس پر اللہ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا اور وہ سکڑ جائے گی، اور اس طرح سکڑنے سے بھر جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا مظہر ہے، وگرنہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ کچھ نئے لوگ پیدا فرما کر اسے ان سے بھر دے، مگر وہ کسی کو بھی کسی گناہ کے بغیر عذاب نہیں دیتا، مگر جنت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، جب اس میں کچھ گنجائش باقی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کچھ نئے لوگ پیدا فرمائے گا، اور پھر انہیں اپنے فضل ورحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کا قدم حقیقی ہے جو کہ مخلوق کے پاؤں کے مماثل نہیں ہے، اہل سنت اس جیسی صفت کو صفت ذاتیہ خبریہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس لیے کہ اس کا علم صرف خبر کے ذریعہ سے ہوتا ہے، نیز اس لیے بھی کہ اس کا مسمی ہمارے اجزا اور بعض حصے ہیں، مگر ہم اللہ تعالیٰ کی نسبت سے انہیں ابعاض اور اجزا نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ یہ اللہ کے لیے ممتنع ہے۔

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کے مخالفین اور ان کا ردّ

اشاعرہ اور اہل تحریف اس بارے بھی اہل سنت سے مختلف رائے رکھتے ہیں، وہ ''یَضَعُ عَلَيْهَا رِجْلَهُ'' کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم پر اس کے مستحقین کی ایک جماعت رکھ دے گا، اس لیے کہ (رجل) جماعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے، جس طرح کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے: ''اَرْسَلَ اللّٰهُ اِلَيْهِ رِجْلُ جَرَادٍ مِّنْ ذَهَبٍ'' [1] یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سونے کی ٹڈیوں کی ایک جماعت بھیجی، اس جگہ (رجل) جماعت کے معنی میں ہے۔

مگر یہ باطل تحریف ہے، اس لیے کہ ''عَلَيْهَا'' اس سے مانع ہے۔

نیز، اللہ تعالیٰ کا اہل جہنم کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کی اضافت کا مطلب اس کی تکریم وتشریف ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح وہ ''قدم'' کو مقدم کے معنی میں لیتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ جہنم پر ایسے لوگوں کو رکھے گا، جنہیں وہ اس کی طرف آگے بڑھائے گا۔

مگر یہ معنی بھی باطل ہے، اس لیے کہ باری تعالیٰ اہل جہنم کو آگے نہیں کرے گا، بلکہ انہیں ﴿يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا﴾ (الطور: ۱۳) ''آتش جہنم کی طرف دھکا دیا جائے گا۔''

آپ نے دیکھا کہ یہ محرفین ایک چیز سے بھاگے اور اس سے کہیں بری چیز میں جا پڑے۔

---

[1] اسے بخاری نے: ۳۳۹۱، ۷۴۹۳۔ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

حاصل کلام یہ کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے قدم پر علی سبیل الحقیقت اور بدون مماثلت ایمان لانا واجب ہے ہم اس کے قدم یا پاؤں کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے۔ اور یہ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ خبر تو دی ہے کہ اللہ کا پاؤں یا قدم ہے مگر اس کی کیفیت سے آگاہ نہیں فرمایا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنے بارے میں لاعلمی پر مبنی بات کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

﴿وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف : ۳۳)

''اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ بات کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔''

حدیث سے ماخوذ سلوکی فوائد

اس حدیث سے ہمیں سلوکی فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ ہمیں دوزخیوں جیسے اعمال سے خبردار رہنا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بھی دوسروں کی طرح جہنم میں پھینک دیا جائے۔ والعیاذ باللّٰه

اللہ کے لیے کلام اور صوت کا اثبات

- چھٹی حدیث کلام اور صوت کے اثبات میں:

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: يَا آدَمُ! فَيَقُوْلُ: لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ ، فَيُنَادِيْ بِصَوْتٍ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكَ اَنْ تُخْرِجَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ بَعْثًا اِلَى النَّارِ......)) متفق عليه [1]

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم! وہ کہیں گے: لبیک وسعدیک، پھر اللہ آواز کے ساتھ پکارے گا: اللہ حکم دیتا ہے کہ اپنی اولاد سے جہنم کا لشکر نکال......''

شرح: ...... نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام رب تعالیٰ کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ وہ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم! آدم علیہ السلام جواب دیں گے: لبيك وسعديك .

[**لَبَّيْكَ**] ...... بمعنی: میں بار بار حاضر ہوں، یہ لفظاً مثنی ہے، جبکہ اس کا معنی جمع کا ہے، اسی لیے اسے ملحق بالمثنی کا اعراب دیا جاتا ہے۔

[**وَسَعْدَيْكَ**] ...... یعنی میں تیرے حکم پر لبیک کہتا ہوں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے سعادت مند بنا اور میری مدد فرما۔

[**فَيُنَادِيْ**] ......اس فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔

[**بِصَوْتٍ**] ......یہ تاکید کے باب سے ہے، اس لیے کہ ندا ہوتی ہی بلند آواز کے ساتھ ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (الانعام: ۳۸)

---

[1] صحیح بخاری: ۷٤۸۳۔ مسلم: ۲۲۲۔ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

''اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہوا اپنے دو پروں پر مگر وہ امتیں ہیں تمہاری طرح کی۔''

پرندہ اڑتا ہی دو پروں پر ہے، لہٰذا اس سے مقصود تاکید ہے۔

[إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تُخْرِجَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ بَعْثًا إِلَى النَّارِ......] ...... یہ نہیں فرمایا کہ ''إِنِّي أٰمُرُكَ'' ''میں تجھے حکم دیتا ہوں۔'' یہ عظمت و کبریائی کے باب سے ہے۔ جس طرح کہ بادشاہ اپنے لشکر سے کہتا ہے: بادشاہ تمہیں یہ یہ حکم دیتا ہے۔ اس سے فخر کرنا اور اپنی عظمت و بڑائی کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی متکبر اور عظیم ہے۔ یہ انداز قرآن میں بھی اختیار کیا گیا ہے، مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸)

''یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کو لوٹا دو۔''

بَعْثًا إِلَى النَّارِ لشکر جہنم کی طرف۔

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے دریافت کیا: ''میرے رب! دوزخ کے لشکر سے کیا مراد ہے؟ اللہ فرمائے گا، ہر ایک ہزار سے نو سو ننانوے۔''[1]

یہ بحث بھی کلام اور صوت کے متعلق ہے

- ساتویں حدیث بھی اثبات کلام میں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ ، وَلَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ .))[2]

''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کا رب کلام کرے گا، اس کے اور اس کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔''

شرح:...... [مَا] ...... نافیہ ہے۔

[مِنْ أَحَدٍ] ...... مبتدا اور اس پر (مِنْ) زائدہ تاکید کے لیے داخل ہے۔ یعنی: ما منکم من احد .

[إِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ] ...... یعنی جس حالت میں اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہوگا وہ یہ ہوگی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ اور ایسا قیامت کے دن ہوگا۔

ترجمان سے مراد ایسا شخص ہے، جو دو مختلف زبانیں بولنے والے دو آدمیوں کے درمیان واسطہ بن کر ایک کی بات دوسرے تک اس زبان میں منتقل کرنے کا فریضہ سرانجام دے جسے وہ سمجھتا ہو۔

مترجم میں چار شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے: امانت داری، جس زبان کا ترجمہ کر رہا ہے اس کا عالم ہو، جس زبان میں

---

[1] صحیح بخاری: ۶۵۳۰۔ صحیح مسلم: ۲۲۲۔ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ.

[2] صحیح بخاری: ۶۵۳۹۔ صحیح مسلم: ۱۰۱۶ عن عدي بن حاتم رضی اللہ عنہ.

کر رہا ہے اس کا عالم ہو، اور متعلقہ موضوع کا علم رکھتا ہو۔

اس حدیث سے اللہ کی صفت کلام کا اثبات ہوتا ہے اور یہ کہ وہ ایسی آواز میں ہوتی ہے جسے سنا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

دونوں احادیث سے ماخوذ سلوکی فوائد

پہلی حدیث میں سلوکی فوائد: جس انسان کو یہ معلوم ہوگا کہ ہزار میں سے نو سو ننانوے کا لشکر جہنم میں جائے گا تو وہ اس بات سے ڈرے گا کہ کہیں مجھے بھی اس لشکر میں شامل نہ کر لیا جائے۔

دوسری حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ جب انسان اس گفتگو کا تصور کرے گا جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہوگی تو وہ اس بات سے خائف ہوگا کہ میں اس موقع پر کہیں رسوا نہ ہو جاؤں، اس خوف کے پیش نظر وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے ارتکاب معاصی سے باز آ جائے گا۔

اللہ کے لیے صفت علو اور دیگر صفات کا اثبات

❑ آٹھویں حدیث علو اور دیگر صفات کے اثبات میں:

آپ ﷺ کا مریض کو دم کرنے کے بارے میں ارشاد ہے:

((رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ ! تَقَدَّسَ اسْمُكَ ، اَمْرُكَ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ؛ كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَاءِ ؛ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الْاَرْضِ ، اغْفِرْلَنَا حُوْبَنَا وَخَطَايَانَا ، اَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِيْنَ ، اَنْزِلْ رَحْمَةً مِنْ رَحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِنْ شِفَائِكَ عَلٰى هٰذَا الْوَجِعِ ؛ فَيَبْرَأَ .)) رواہ ابوداود وغیرہ [1]

''ہمارے پروردگار! جو آسمان میں ہے! تیرا نام بڑا مقدس ہے، تیرا حکم آسمان اور زمین میں نافذ ہے، جس طرح تیری رحمت آسمان میں ہے اسی طرح اپنی رحمت زمین میں بھی فرما دے، ہمارے کبیرہ وصغیرہ تمام گناہ معاف فرما دے، تو پاک لوگوں کا رب ہے، اس بیماری پر اپنی رحمت سے رحمت نازل فرما اور اپنی شفا سے شفا نازل فرما، تاکہ یہ تندرست ہو جائے۔'' یہ حدیث حسن ہے۔ اسے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا۔

شرح: ......[فِیْ رُقْيَةِ الْمَرِيْضِ] ...... یہ مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کے باب سے ہے، یعنی آپ ﷺ کا یہ ارشاد دم کے بارے میں ہے جب آپ مریض پر پڑھ کر اسے دم کرتے۔

[رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ] ......فی السماء ، پر گزشتہ سطور میں گفتگو ہو چکی ہے۔

---

[1] اسے ابوداود: ۳۸۹۲۔ احمد: ۶/ ۲۰۔ لالکائی: ۶۴۸۔ اور حاکم: ۱/ ۳۴۴ نے روایت کیا۔ ابن عدی نے اسے الکامل: ۳/ ۱۰۵۴۔ بیہقی نے ''الاسماء والصفات: ۸۹۲۔ ابن قدامہ نے العلو: ص۴۸ داری نے الرد علی الجھمیة: ۷۰ اور نسائی نے عمل الیوم واللیلة میں صحیح کہا، ملاحظہ ہو، تحفة الاشراف: ۸/ ۲۳۰.

[تَقَدَّسَ اسْمُكَ] ..... ''تیرا نام پاک ہے، اس جگہ اسم مفرد ہے، لیکن چونکہ مضاف ہے لہٰذا تمام اسماء کو شامل ہے۔ یعنی تیرے اسماء ہر نقص سے پاک ہیں۔

[اَمْرُكَ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ] ..... یعنی تیرا حکم آسمان اور زمین میں نافذ ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (السجدة : ٥) ''وہ آسمان سے زمین تک امر کی تدبیر کرتا ہے۔'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (الاعراف : ٥٤) ''خبردار کل مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا۔''

[كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَاءِ ؛ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الْاَرْضِ] ..... اس جگہ (کاف) تعلیل کے لیے ہے اور اس سے مراد توسل ہے کہ جس طرح تیری رحمت آسمان میں ہے اسی طرح زمین میں بھی اپنی رحمت فرما۔

سوال: کیا زمین میں اللہ کی رحمت نہیں ہے؟

جواب: یہ دعا مریض کے لیے کی جا رہی ہے اور مریض کو ایسی خاص رحمت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس کی بیماری کا خاتمہ ہو جائے۔

[اغْفِرْلَنَا حُوْبَنَا وَخَطَايَانَا] ..... اغفر، گناہوں کی پردہ پوشی کرنا اور ان سے درگزر فرمانا۔

الحوب . کبیرہ گناہ، الخطایا: صغیرہ گناہ، یہ اس صورت میں ہے جب یہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئیں۔ اور اگر الگ الگ آئیں گے تو دونوں ایک ہی معنی میں ہوں گے، یعنی ہمارے صغیرہ وکبیرہ تمام گناہوں کو معاف فرما، اس لیے کہ مغفرت کی وجہ سے دکھ درد کا خاتمہ ہوتا اور مطلوب کا حصول متحقق ہوتا ہے، نیز چونکہ گناہ انسان اور توفیق میں حائل ہو جایا کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی دعا قبول نہیں ہو پاتی۔

[اَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِيْنَ] ..... یہ ربوبیت خاصہ ہے، جہاں تک ربوبیت عامہ کا تعلق ہے، تو وہ ہر چیز کا رب ہے۔ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ ربوبیت خاصہ بھی ہوتی ہے اور ربوبیت عامہ بھی۔ ایمان لانے والے جادوگروں نے کہا تھا: ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَo رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَo﴾ (الاعراف : ١٢١ ـ ١٢٢) ''ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو کہ موسیٰ وہارون کا رب ہے۔'' انہوں نے پہلے ربوبیت عامہ کا ذکر کیا پھر ربوبیت خاصہ کا۔ اس ارشاد باری تعالیٰ پر توجہ فرمائیں:

﴿اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ﴾ (النحل : ٩١)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اس شہر (مکہ) کے رب کی جس نے اسے محترم بنایا ہے، اور ہر ہر چیز اسی کی ہے۔''

﴿رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ﴾ خاص ہے اور ﴿وَ لَهٗ كُلُّ شَيْءٍ﴾ عام۔

اور الطیبون سے مراد اہل ایمان ہیں، ہر بندہ مومن طیب وطاہر ہوتا ہے، یہ اس ربوبیت خاصہ سے توسل کے باب سے ہے، کہ اللہ اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے اس مریض کو شفا بخشے۔

[اَنْزِلْ رَحْمَةً مِنْ رَحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِنْ شِفَائِكَ عَلٰى هٰذَا الْوَجِعِ] ..... یہ دعا اور قبل ازیں کی



دعائیں توسل کے قبیل سے ہیں، "انزل رحمة من رحمتك" رحمت کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ رحمت جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، یہ نہ تو مخلوق ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے الگ، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ﴾ (الکهف : ٥٨) "اور تیرا رب معاف فرمانے والا اور رحمت والا ہے۔" اور اس کے نزول کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری رحمت مخلوق ہے، مگر اس کا شمار رحمت باری تعالیٰ کے آثار میں ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے اس پر رحمت کا اطلاق بھی کیا گیا ہے، اس کی مثال یہ حدیث قدسی ہے: ((اَنْتَ رَحْمَتِیْ اَرْحَمُ بِكَ مَنْ اَشَاءُ .)) ❶ اللہ تعالیٰ نے جنت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تو میری رحمت ہے، میں تیرے ساتھ جس پر چاہوں گا رحمت کروں گا۔"

شفا کا بھی یہی معاملہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ ہی شفا دینے والا ہے اور اسی سے شفا ملتی ہے، لہٰذا شفا اس کا وصف ہے جو کہ اس کا ایک فعل ہے، شفا اس معنی میں تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مگر اس اعتبار سے کہ شفاء مریض کو ملتی ہے اس کی مخلوق ہے، اس لیے کہ شفاء بیماری کے خاتمہ سے عبارت ہے۔

[فَيَبْرَأ] ..... ہمزہ کی زبر کے ساتھ، اس لیے کہ یہ جواب دعا ہے، یعنی: اس مریض پر رحمت نازل فرما تا کہ وہ تندرست ہو جائے۔ لیکن اگر اسے پیش کے ساتھ مرفوع پڑھا جائے تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا، اور حدیث کا تسلسل نہیں ہوگا، بلکہ "الوجع" پر وقف کیا جائے گا اور "یبـــرا" جملہ خبریہ اس بات کا فائدہ دے گا کہ یہ دم کرنے سے مریض شفایاب ہو جائے گا، مگر اسے منصوب پڑھنا زیادہ موزوں ہے۔

❑ نویں حدیث بھی علو کے بارے میں ہے:

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا تَاْمَنُوْنِیْ وَ اَنَا اَمِیْنُ مَنْ فِی السَّمَاءِ .)) ❷

"کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے جبکہ میں اس کا امین ہوں جو آسمان میں ہے۔"

شرح:...... [اَلَا تَاْمَنُوْنِیْ] ..... اس میں لغوی اشکال ہے اور وہ ہے بدون ناصب وجازم نون فعل کو حذف کرنا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب افعال خمسہ میں سے کسی فعل کے ساتھ نون وقایہ متصل ہو تو نون رفع کو حذف کرنا جائز ہوتا ہے۔ الا تامنونی کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے ہو۔

[وَاَنَـــا اَمِیْـنُ مَـنْ فِـی السَّمَـاءِ.] ..... اور آسمان میں اللہ ہے، آپ ﷺ اللہ کی وحی پر اس کے امین ہیں۔ آپ ﷺ سید الانبیاء ہیں اور آپ پر وحی لانے والے جبرئیل بھی امین ہیں۔

---

❶ صحیحین کی اس حدیث کی تخریج پہلے گزر چکی ہے، ص: ۲۲۲.

❷ اسے بخاری: ٤٣٥١۔ اور مسلم: ١٠٦٤ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍo ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍo مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍo﴾
(التکویر: ۱۹۔ ۲۱)

''بیشک یہ پیغام ہے فرشتے عالی مرتبت کا، جو صاحب قوت عرش والے کے پاس اونچے درجے والا ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہاں وہ امانت دار بھی ہے۔''

اس حدیث کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ارسال کردہ کچھ سونا چار آدمیوں میں تقسیم فرما دیا تو ایک آدمی کہنے لگا: ہم اس کے ان لوگوں سے زیادہ حقدار ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَ لَا تَاْمَنُوْنِيْ وَاَنَا اَمِيْنُ مَنْ فِي السَّمَاءِ .))

[اَ لَا] ..... عرض کے لیے ہے گویا آپ یہ فرمانا چاہتے تھے: مجھے امین سمجھو بیشک میں اس کا امین ہوں جو آسمان میں ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہو اور (لا) نافیہ

یہ ارشاد مبارک شاہد ہے: مَنْ فِي السَّمَاءِ . اس سے متعلقہ بحث گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔

اثباتِ علو کا بیان

☐ دسویں حدیث بھی اثبات علو کے بارے میں ہے:

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

((وَالْعَرْشُ فَوْقَ الْمَاءِ ، وَاللّٰهُ فَوْقَ الْعَرْشِ ، وَهُوَ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ .)) حديث حسن، رواه ابوداود وغيره . ❶

''عرش پانی پر ہے اور اللہ عرش پر اور وہ تمہاری حالت کو جانتا ہے۔'' یہ حدیث حسن ہے، اسے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا۔

شرح: ...... جب نبی کریم ﷺ نے آسمانوں کی درمیانی مسافت کا ذکر کیا تو فرمایا: ''والعرش فوق الماء'' اس کی شہادت اس ارشاد باری تعالیٰ سے ملتی ہے۔ ﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ (ھود: ۷) ''اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''

[وَاللّٰهُ فَوْقَ الْعَرْشِ، وَهُوَ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ.] ..... اللہ عرش کے اوپر ہے، مگر اس کے باوجود بھی ہمارے احوال و اعمال میں سے اس پر کوئی بھی چیز مخفی نہیں ہے، بلکہ اس نے تو یہاں تک فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ (ق: ۱۶)

---

❶ اسے ابن خزیمہ نے کتاب التوحید: ۱/ ۲۴۲۔ بیہقی نے الاسماء والصفات: ۸۵۱۔ ابوالشیخ نے کتاب العظمة: ۲۷۹۔ لالکائی نے شرح السنة: ۶۵۹ اور دارمی نے الرد علی الجهمية: ۸۱ میں روایت کیا ہے، ذہبی مختصر العلو: ۱۰۳۔ میں فرماتے ہیں، اس کی سند صحیح ہے، ہیثمی نے المجمع: ۱/ ۸۶ میں اسے التکبیر میں طبرانی کی طرف منسوب کیا اور اس کے راویوں کو صحیح کے راوی قرار دیا۔

''یقیناً ہم نے انسان کو پیدا فرمایا اور ہم اس کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات کو بھی جانتے ہیں۔''

آپ ﷺ کا ارشاد: وَهُوَ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ ..... اس امر کا فائدہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم نے ہمارے جملہ اقوال اور افعال واحوال کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اس حدیث سے ماخوذ سلوکی فائدہ

اس حدیث پر ایمان رکھنے کی صورت میں ہم اس سے یہ سلوکی فائدہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی جائے اسے علو میں تسلیم کیا جائے اور یہ کہ وہ ہمارے حالات وظروف سے بخوبی آگاہ ہے، لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت کرنی چاہیے، وہ ہمیں جس جگہ موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ اس جگہ ہمیں حاضر رہنا چاہیے۔

اللہ کی صفت علو کا بیان

- گیارہویں حدیث بھی اثبات علو کے بارے میں:

نبی کریم ﷺ نے ایک لونڈی سے دریافت فرمایا:

((أَيْنَ اللّٰهُ؟ قَالَتْ: فِي السَّمَاءِ . قَالَ: مَنْ أَنَا؟ قَالَتْ: أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ . قَالَ: أَعْتِقْهَا ؛ فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ .)) رواه مسلم . ❶

''اللہ کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''اللہ آسمان میں ہے۔'' آپ نے دریافت فرمایا: ''میں کون ہوں؟'' اس نے جواب دیا: ''آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' آپ ﷺ نے اس کے آقا سے فرمایا: ''اسے آزاد کردے، بیشک یہ تو مومنہ ہے۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... [أَيْنَ اللّٰهُ؟] ...... (این) کے ساتھ جگہ کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے۔

[قَالَتْ: فِي السَّمَاءِ.] ..... یعنی وہ آسمان پر ہے یا علو میں ہے، اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

[قَالَ: مَنْ أَنَا؟ قَالَتْ: أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ. قَالَ: أَعْتِقْهَا ؛ فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ.] ..... معطلہ کے نزدیک اگر اس نے اپنے قول: فِي السَّمَاءِ . سے یہ ارادہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ علو میں ہے، تو وہ کافر تھی، اس لیے کہ ان کے نزدیک اللہ کا کسی جہت میں اثبات کرنے والا کافر ہے، ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے جہات خالی ہیں۔

جبکہ نبی کریم ﷺ کا (این) کے ساتھ استفہام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کے لیے مکان ثابت ہے۔

لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جگہیں اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتیں، اس لیے کہ وہ ہر شے سے بڑا ہے، اور یہ کہ کون کے اوپر عدم ہے، وہاں صرف اللہ ہے اور وہ ہر چیز کے اوپر ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد: ((أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ)) اس بات کی دلیل ہے کہ کافر غلام کو آزاد کرنا غیر مشروع ہے، یہی

---

❶ اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

وجہ ہے کہ کفارات میں کافر کو آزاد کرنا کفایت نہیں کرتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غلامی کی حالت میں کافر کا آپ کے پاس موجود رہنا اسے اسلام کے قریب لانے کا سبب بن سکتا ہے، جب آپ اسے آزاد کر دیں گے تو اس سے اس کے بلاد کفر میں واپس چلے جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا، اور اگر ایسا ہوا تو وہ اہل ایمان کے خلاف کافروں کا معاون و مددگار بن جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت معیت کا بیان

❑ بارہویں حدیث اثبات معیت کے بارے میں:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

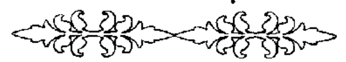
((اَفْضَلُ الْاِیْمَانِ اَنْ تَعْلَمَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَكَ حَیْثُمَا كُنْتَ .)) [1] حدیث حسن اخرجه الطبرانی، من حدیث عبادة بن الصامت .

''بہترین ایمان یہ ہے کہ تجھے اس بات کا علم ہو کہ اللہ تیرے ساتھ ہے تو جہاں بھی ہو۔'' یہ حدیث حسن ہے، اسے طبرانی نے عبادہ بن صامت کی حدیث سے نکالا۔

شرح: ...... یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی معیت کا فائدہ دیتی ہے، قبل ازیں متعدد آیات کے ضمن میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اس کے زمین پر ہونے کو مستلزم نہیں ہے، بلکہ اس کا زمین پر ہونا آخری حد تک ممتنع ہے۔ اس لیے کہ علو اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات میں سے ہے، جو اس کے لیے لازم ہے اور اس کا اس سے الگ ہونا کبھی بھی ممکن نہیں ہے۔ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ علو کی دو قسمیں ہیں۔

آپ ﷺ کا ارشاد: ((اَفْضَلُ الْاِیْمَانِ اَنْ تَعْلَمَ)) اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جب انسان کو علم ہوگا کہ وہ جہاں بھی ہوگا اللہ اس کے ساتھ ہوگا تو وہ اس سے ڈرتا رہے گا، اور اس کی تعظیم وتوقیر کرے گا۔

اگر آپ تن تنہا کسی تنگ وتاریک کمرے میں ہوں اور اس میں آپ کے علاوہ کوئی دوسرا موجود نہ ہو تو آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے، وہ کمرے میں نہیں مگر آپ کے ساتھ ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے علم وقدرت اور ربوبیت کے دیگر معانی کے ساتھ آپ کا احاطہ کر رکھا ہے۔



اس بات کا اثبات کہ اللہ تعالیٰ نمازی کے سامنے ہوتا ہے

❑ تیرہویں حدیث اس بات کے اثبات میں کہ اللہ تعالیٰ نمازی کے سامنے ہوتا ہے:

آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا قَامَ اَحَدُكُمْ اِلَی الصَّلَاةِ ، فَلَا یَبْصُقَنَّ قِبَلَ وَجْهِهِ ، وَلَا عَنْ یَمِیْنِهِ ؛ فَاِنَّ اللّٰهَ قِبَلَ

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔



وَجْهِهِ ، وَلٰكِنْ عَنْ يَّسَارِهِ ، اَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ .)) ❶ متفق عليه .

''تم میں سے جب کوئی آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتو وہ نہ تو اپنے سامنے تھوکے اور نہ اپنی دائیں طرف، اس لیے کہ اللہ اس کے سامنے ہوتا ہے وہ اپنی بائیں طرف تھوک لے یا پھر پاؤں کے نیچے۔''

شرح:......[قِبَلَ وَجْهِهِ] ..... یعنی اپنے سامنے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ١١٥) ''اور اللہ ہی کی ملکیت ہے مشرق ومغرب پس تم جدھر بھی مونہہ پھیرو، اللہ کا چہرہ اسی طرف ہے۔''

[يَمِيْنِهِ] ..... اس بارے میں ایک حدیث اس طرح وارد ہے: فَاِنَّ عَنْ يَّمِيْنِهِ مَلَكًا . ''اس لیے کہ اس کی دائیں طرف فرشتہ ہوتا ہے۔'' ❷

نیز اس لیے بھی کہ دائیں سمت سے بائیں سمت سے افضل ہوتی ہے، لہٰذا بائیں سمت تھوک وغیرہ کے لیے زیادہ مناسب ہے، اسی لیے آپ نے فرمایا: ((وَلٰكِنْ عَنْ يَّسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدِمِهٖ)) ''لیکن بائیں طرف تھوکے یا قدم کے نیچے۔''

اگر آدمی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو، تو علماء فرماتے ہیں کہ وہ کپڑے یا رومال وغیرہ میں تھوک کر اسے رگڑ دے یہاں تک کہ اس کی صورت زائل ہو جائے، اور اگر وہ مسجد میں دیوار کے قریب نماز پڑھ رہا ہو اور بائیں طرف کی دیوار چھوٹی ہو تو اس صورت میں وہ مسجد سے باہر اپنی بائیں طرف تھوک سکتا ہے، بشرطیکہ کسی گزرنے والے کو تکلیف نہ دے۔

اس بات میں تطبیق کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہوتے ہوئے نمازی کے سامنے کیسے ہوتا ہے؟

اس حدیث سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نمازی کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے، مگر ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس پیغمبر ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ: ''اللہ نمازی کے سامنے ہوتا ہے۔'' اسی نے ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ: ''وہ آسمان پر ہے۔'' آپ ﷺ کی ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے، اس لیے کہ ان میں تین طرح سے تطبیق دینا ممکن ہے۔

اولاً: شرع نے دونوں چیزوں کو جمع کیا ہے، جبکہ دو متناقض چیزوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔

ثانیاً: ممکن ہے کہ ایک چیز عالی بھی ہو اور وہ آپ کے سامنے بھی ہو، اگر آدمی دن کے آغاز میں سورج کی طرف منہ کرے تو سورج اس کے سامنے ہوگا حالانکہ وہ آسمان پر ہوتا ہے اور اگر وہ دن کے آخر میں اس کی طرف منہ کرے تو وہ پھر بھی اس کے سامنے ہوگا حالانکہ وہ آسمان میں ہوتا ہے، اگر یہ کچھ مخلوق میں ممکن ہے تو خالق کے لیے بلاشک اور بطریق اولیٰ ممکن ہے۔

ثالثاً: اگر اسے مخلوق میں ناممکن بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ خالق کے لیے ناممکن نہیں ہوگا، اس لیے کہ جملہ صفات میں اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

❶ صحیح بخاری: ٤٠٥۔ صحیح مسلم: ٥٤٧ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ۔ ❷ صحیح بخاری: ٤١٦۔ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔



اس حدیث سے ماخوذ سلوکی فوائد

یہ حدیث سلوکی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وجوب ادب کا فائدہ دیتی ہے، نیز اس سے یہ امر بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اگر نمازی کو یقین ہو کہ اللہ میرے سامنے ہے، تو یہ چیز اس میں خشوع اور اللہ کی ہیبت پیدا کرے گی۔

اللہ تعالیٰ کی صفت علو اور دیگر صفات

☐ چودھویں حدیث علو اور دیگر صفات کے اثبات میں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَالْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ! فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ! مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْآنِ! اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ دَابَّةٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِیَتِهَا . اَنْتَ الْاَوَّلُ ؛ فَلَیْسَ قَبْلَكَ شَیْءٌ ، وَاَنْتَ الْآخِرُ ، فَلَیْسَ بَعْدَكَ شَیْءٌ ، وَاَنْتَ الظَّاهِرُ ، فَلَیْسَ فَوْقَكَ شَیْءٌ ، وَاَنْتَ الْبَاطِنُ ، فَلَیْسَ دُوْنَكَ شَیْءٌ ، اقْضِ عَنِّی الدَّیْنَ ، وَاَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ .)) (رواہ مسلم) [1]

''یا اللہ سات آسمانوں اور زمین کے رب اور عرش عظیم کے رب! ہمارے اور ہر چیز کے رب! دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے! تورات، انجیل اور قرآن کو اتارنے والے! میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اپنے نفس کی شر سے اور ہر جانور کی شر سے جس کی پیشانی کو تو پکڑے ہوئے ہے، تو اول ہے، تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں، تو آخر ہے، تیرے بعد کوئی چیز نہیں، تو ظاہر ہے، تیرے اوپر کوئی چیز نہیں، اور تو باطن ہے، تیرے آگے کوئی کوئی چیز نہیں، میرا قرض ادا فرما دے اور مجھے فقر وفاقہ سے بے نیاز کر دے۔''

شرح: ...... یہ ایک عظیم حدیث ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی ربوبیت کا یہ کہہ کر وسیلہ پیش کیا ہے، ((اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَالْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ، رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ!)) (رب کل شی) تخصیص کے بعد تعمیم کے باب سے ہے، اور یہ اس لیے ہے تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ حکم اسی چیز کے ساتھ ہے، جس کے ساتھ اسے خاص کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَ لَهٗ كُلُّ شَیْءٍ﴾ (النمل: ۹۱) ''مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے رب کی عبادت کروں جس نے اسے محترم بنایا ہے، اور ہر چیز اسی کی ہے۔'' ﴿وَ لَهٗ كُلُّ شَیْءٍ﴾ اس لیے فرمایا تاکہ کسی کو یہ گمان نہ رہے کہ وہ صرف اس شہر کا رب ہے۔

[فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی !] ..... کھیتی کا اصل دانہ ہوتا ہے اور درختوں کا گٹھلی، رب کائنات دانے کو بھی پھاڑتا ہے

[1] اسے مسلم: ۲۷۱۳ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



اور گٹھلی کو بھی۔

وہ دانہ اور وہ خشک گٹھلی جس میں نہ نمو ہوتا ہے اور نہ اضافہ، اسے اللہ تعالیٰ اس طرح پھاڑتا ہے کہ اس سے درخت اور کھیتیاں پیدا ہو جاتی ہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نتیجہ ہے، یہ انسانوں میں سے کسی کے بھی بس کا روگ نہیں ہے، وہ جس قدر بھی طاقت حاصل کر لیں وہ نہ تو کسی دانے کو پھاڑ کر اس سے کھیتی اُگا سکتے ہیں اور نہ پتھر جیسی گٹھلی کو پھاڑ کر درخت، اسے صرف اللہ پھاڑ کر اُگا سکتا ہے۔

آپ ﷺ نے عظیم کونی آیت کا ذکر کرنے کے بعد آیات شرعیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: [مُنْـزِلَ التَّـوْرَاةِ وَالْإِنْـجِيْـلِ وَالْـقُـرْآنِ!] ...... یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ عظیم ترین کتابیں ہیں، جن کا آپ نے زمنی ترتیب سے ذکر فرمایا: تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتری، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور قرآن حضرت محمد ﷺ پر اتارا گیا۔ یہ حدیث اس بارے میں صریح نص ہے کہ تورات اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿إِنَّآ أَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ﴾ (المائدة: ٤٤)

''یقیناً ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔''

اور سورۂ آل عمران کے شروع میں فرمایا:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ أَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْإِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ أَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ (آل عمران: ٤-٣)

''اس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے، وہ ان کی تصدیق کرتی ہے، جو اس سے پہلے ہو گزری ہیں، اور اس نے اس سے قبل اتاری ہے، تورات اور انجیل، جو لوگوں کے لیے ہدایت تھی اور اس نے فرقان (قرآن) اتارا۔''

[أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ] ...... ''میں اپنے نفس کی شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے نفس میں شر موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَآ أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف: ٥٣)

''اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا یقیناً نفس برائی کا حکم دیتا ہے۔''

نفس کی اقسام

لیکن نفس دو قسم کا ہوتا ہے:

نفس مطمئنہ، جو کہ خیر کا حکم دیتا ہے۔

نفس شریرہ، جو کہ برائی کا حکم دیتا ہے۔

ایک نفس لوامہ بھی ہے، جسے بعض علماء نفس کی تیسری قسم بتاتے ہیں، جبکہ بعض کہتے ہیں کہ یہ نفس مطمئنہ اور نفس شریرہ کا وصف ہے، یعنی نفس مطمئنہ بھی آپ کو ملامت کرتا ہے، اور نفس شریرہ بھی، اس بنا پر ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ

اللَّوَّامَةِ﴾ (القیامة : ۲) ''میں قسم اٹھاتا ہوں نفس لوامہ کی۔'' ان دونوں کو شامل ہوگا۔ اگر آپ امر واجب کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو نفس مطمئنہ آپ کو ملامت کرے گا، اسی طرح وہ کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنے پر بھی آپ کو ملامت کرے گا۔

اس کے برعکس نفس شریرہ اچھے اعمال کی سرانجام وہی پر بھی آپ کو ملامت کرے گا، اور حکم برائی کے ارتکاب میں کوتاہی برتنے پر بھی آپ کو ملامت کرے گا۔

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسِیْ سے مراد برائی کا حکم دینے والا نفس ہے۔

[وَمِنْ شَرِّ كُلِّ دَابَّةٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا.] ..... الدابة ، زمین پر چلنے پھرنے والی ہر چیز، یہاں تک کہ اپنے پیٹ کے بل رینگنے والی چیزیں بھی اس حدیث میں داخل ہیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهِ﴾ (النور : ٤٥)

''اور اللہ ہی نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا فرمایا ہے، پھر ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں۔''

اسی طرح:﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود : ٦) ''اور زمین میں چلنے پھرنے والی ہر چیز کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔''

اگرچہ عرف میں اس لفظ کا اطلاق چوپایوں پر ہوتا ہے، اور عرف خاص میں صرف گدھوں پر، مگر اس حدیث میں اس سے مراد زمین پر چلنے پھرنے والا ہر جاندار ہے، ان میں سے بعض جانور اپنی ذات کے اعتبار سے محض شر ہوتے ہیں، جبکہ بعض جانوروں میں شر بھی ہوتی ہے، اور خیر بھی۔ یہاں تک کہ خیر کے حامل جانور بھی شر سے محفوظ نہیں ہوتے۔ ''اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا'' الناصية: سر کا اگلا حصہ، پیشانی، سر کے اگلے حصے کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی اونٹ اور اس جیسے دوسرے جانوروں کو چلایا جاتا ہے، اس کی تخصیص کی وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جس مخ میں تصور اور تلقی کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ سر کے اگلے حصے میں ہی موجود ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

[اَنْتَ الْاَوَّلُ ؛ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ] ..... الاول: اللہ کا نام ہے، جس کی تفسیر نبی کریم ﷺ نے اس طرح فرمائی ہے کہ: ''تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔''

ہم نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بتایا ہے کہ فلاسفہ اللہ تعالیٰ کو (القدیم) کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور ہم نے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کا شمار اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں نہیں ہوتا اور یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موسوم کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اس کے بارے میں خبر دینا جائز ہے، خبر کا باب تسمیہ کے باب سے زیادہ وسیع ہے، (القدیم) میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ کبھی کوئی چیز کسی نسبت سے بھی قدیم ہو سکتی ہے، کیا آپ نے یہ ارشاد باری ملاحظہ نہیں فرمایا:

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ (یٰس : ٣٩)

''اور ہم نے چاند کی کئی منزلیں مقرر کی ہیں، یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی قدیم شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔''

قدیم شاخ حادث ہے مگر وہ اپنے مابعد کی نسبت سے قدیم ہے۔

[وَاَنْتَ الظَّاهِرُ ، فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ] ..... ظاہر، ظہور سے ہے جو کہ علوّ سے عبارت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا﴾ (الكهف : ۹۷)

''پس وہ نہ تو اس پر چڑھنے کی طاقت رکھیں گے اور نہ نقب لگانے کی۔''

اس جگہ ﴿يَظْهَرُوْهُ﴾ يعلو کے معنی میں ہے۔

اس کی یہ تفسیر کرنا کہ ''وہ اپنی آیات قدرت کے ساتھ ظاہر ہے۔'' غلط ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کلام اللہ کی تفسیر کوئی نہیں جانتا، اور آپ ﷺ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ''تیرے اوپر کوئی چیز نہیں ہے۔'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر چیز سے اوپر ہے۔

[وَاَنْتَ الْبَاطِنُ ، فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ] ..... اس کا معنی ہے: اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے، اللہ کے علاوہ کوئی بھی تدبیر نہیں کرسکتا، اللہ کے علاوہ کوئی بھی کسی چیز کے ساتھ منفرد نہیں ہے، کوئی ایک بھی اللہ پر مخفی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ)) یعنی، تیرے سامنے کوئی بھی چیز حائل نہیں ہوسکتی، تیرے سامنے کوئی بھی مانع نہیں ہے اور کسی کی بے نیازی اسے تجھ سے فائدہ نہیں دے سکتی......

[اقْضِ عَنِّي الدَّيْنَ] ..... قرض، انسان کے ذمہ واجب الاداء، چیز، وہ مال ہو یا کوئی اور حق، میں نے آپ سے کوئی خدمت لی اور اس کا عوض نقد ادا نہ کیا، اسے بھی قرض سے موسوم کیا جاتا ہے، اگر چہ وہ غیر مؤجل ہی کیوں نہ ہو۔

[وَاَغْنِنِي مِنَ الْفَقْرِ .] ..... الفقر: خالی ہاتھ ہونا، فقر وفاقہ تکلیف دہ چیز ہے، اور قرض باعث ذلت ورسوائی، مقروض آدمی قرض دہندہ کے سامنے ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے، جبکہ فقیر بے بس ہوتا ہے، فقر انسان کو حرام کے ارتکاب پر بھی مجبور کرسکتا ہے۔

کیا آپ نے ان تین افراد کا واقعہ نہیں سنا جن پر غار کا راستہ بند ہوگیا تو ان میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے نیک عمل کا وسیلہ پکڑا، ان میں سے ایک آدمی اپنے چچا کی بیٹی پر فریفتہ تھا اور وہ اس کے ساتھ برا ارادہ رکھتا تھا مگر وہ اس سے مسلسل انکار کرتی رہی، آخر جب ایک سال وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تو اس سے مالی تعاون کا مطالبہ کیا مگر اس نے اس کے لیے اپنی جنسی تسکین کی شرط رکھ دی، لیکن چونکہ وہ ضرورت مند تھی لہٰذا اسے اس کی شرط تسلیم کرنا پڑی۔ پھر جب اس نے اس کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی تو وہ اس سے کہنے لگی: اللہ سے ڈر اور میری عزت وآبرو کو پامال نہ کر۔ چونکہ یہ بات اس عورت کے دل سے نکلی تھی لہٰذا اس کا اس آدمی پر گہرا اثر ہوا اور وہ اس سے الگ ہوگیا، وہ آدمی کہنے لگا: ''میرے اللہ! میں اس کے اوپر سے اٹھ گیا حالانکہ میں اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ [1]

آپ نے دیکھا کہ کس طرح فقر واحتیاج نے اس خاتون کو اپنی عزت وآبرو نیلام کرنے پر مجبور کر دیا۔

[1] اسے بخاری: ۳٤٦٥ اور مسلم: ۲۷٤۸ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

آپ ﷺ نے ((اَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ)) کہہ کر اپنے رب سے فقر سے بے نیاز کرنے کی درخواست کی اس لیے کہ اس کے ہولناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

وہ اسماء وصفات جن پر یہ حدیث مشتمل ہے

اس حدیث میں مندرجہ ذیل اسماء وصفات کا ذکر ہے:

اسماء: الاول، الاخر، الظاهر، الباطن.

صفات: اولیت، آخریت، علو، عموم ربوبیت، تمام قدرت اور کمال رحمت وحکمت۔

اور اس میں اسماء وصفات کے علاوہ مندرجہ ذیل امور ہیں: اللہ تعالیٰ کے حضور اللہ تعالیٰ کی صفات کا وسیلہ پیش کرنا، نفس کے شر سے خبردار رہنا، نبی کریم ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے قرض کی ادائیگی اور فقر وفاقہ سے بے نیازی کی دعا کرنا، اس حدیث سے اس حدیث کے ضعف کا بھی اثبات ہوتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھنا۔ [1]

اس حدیث میں موجود سلوکی فوائد

نفس کی شر سے خبردار رہنا، دین کی تعظیم کرنا، بقدر امکان قرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنا، مال کمانے اور اسے خرچ کرتے وقت میانہ روی سے کام لینا، اس سے انسان غالباً فقر واحتیاج اور قرض سے محفوظ رہتا ہے۔

اللہ کی صفت قرب کا اثبات

- پندرھویں حدیث اللہ تعالیٰ کے قرب کے بارے میں:

جب ذکر کرتے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آوازیں بلند ہو گئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَیُّهَا النَّاسُ! اِرْبَعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ ؛ فَاِنَّکُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا ، اِنَّمَا تَدْعُوْنَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ، اِنَّ الَّذِیْ تَدْعُوْنَهٗ اَقْرَبُ اِلٰی اَحَدِکُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ .)) متفق علیه . [2]

''لوگو! اپنے آپ پر ترس کھاؤ، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں سننے والے دیکھنے والے کو پکار رہے ہو۔ جسے تم پکارتے ہو وہ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے۔''

شرح: ...... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوران سفر نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، وہ جب اوپر چڑھتے تو اللہ اکبر کہتے اور جب

---

[1] ترمذی: ۲۳۵۲ نے حضرت انس اور ابن ماجہ: ۴۱۲۶ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے دعا کی: اَللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. شیخ البانی نے اسے الصحیحة: ۳۰۸ اور الارواء: ۸۵۳ میں صحیح کہا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کے الفاظ صحیح ہوں یا نہ ہوں متواضع مسکین لائق ستائش ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو، مجموع الفتاویٰ: ۱۸/ ۳۲۶ التلخیص الحبیر: ۲۷۵ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن جوزی نے حد سے تجاوز کرتے ہوئے اس حدیث کا (موضوعات) میں ذکر کیا ہے۔

[2] صحیح بخاری: ۶۶۱۰۔ صحیح مسلم: ۲۷۰۴۔ مسند احمد: ۴/ ۴۰۲۔ عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ.



نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے۔ ❶ اور یہ اس لیے کہ جب انسان بلند ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے، لہٰذا اس موقع پر مناسب سمجھا گیا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی بڑائی یاد دلانے کے لیے ''اللہ اکبر'' کہے، اسی طرح چونکہ نیچے اترنا نزول اور پستی کے ضمن میں آتا ہے، لہٰذا اس وقت ''سبحان اللہ'' پڑھ کر انسان اپنے آپ کو یاد دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پستی سے منزہ ہے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آوازیں بہت زیادہ بلند ہونے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[اِرْبَعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ] ..... یعنی اپنی جانوں پر نرمی کرو، ان پر ترس کھاؤ۔

[اِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَهٗ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ.] ..... سواری کی گردن سوار کے بہت قریب ہوتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے، مگر وہ اس کے باوجود آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے۔

مگر قرب اور علو میں منافات نہیں ہے، اس لیے کہ ایک چیز قریب بھی ہوسکتی ہے، اور بعید بھی، اگر مخلوق کے لیے ایسا ممکن ہے تو خالق کے لیے بطریق اولیٰ ممکن ہے، رب تعالیٰ اپنے علو کے باوجود قریب ہے، وہ میری سواری کی گردن سے بھی زیادہ میرے قریب ہے۔

فوائد مفیدہ

یہ حدیث مندرجہ ذیل فوائد پر مشتمل ہے:

- صفات سلبیہ میں سے: رب تعالیٰ کے بہرہ یا غائب ہونے کی نفی، جو کہ اس کے سمع وبصر اور علم وقرب کے کمال کی وجہ سے ہے۔

انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے وقت اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اس طرح وہ تھک جائے گا اور اکتا جائے گا، نیز اس سے اس کا جسم بھی متاثر ہوسکتا ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی طاقت کے مطابق عمل کیا کرو، اس لیے کہ اللہ نہیں اکتائے گا، یہاں تک کہ تم اکتا جاؤ گے۔'' ❷

لہٰذا عبادت کے لیے اپنے آپ کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہیے، اگر انسان اس کے لیے اپنے آپ میں نشاط اور آمادگی پائے تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصروف عمل رہے اور اگر واجبات کے علاوہ دیگر اعمال میں دون ہمتی محسوس کرے یا نفس کو کسی دوسری عبادت کی طرف مائل پائے تو اس کا رخ ادھر موڑ دے۔

حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نماز میں اونگھنے والے کو نماز ترک کر کے سو جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ایک اونگھنے کی حالت میں نماز پڑھے گا تو شاید وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے وقت اپنے آپ کو گالیاں دینے لگے۔'' ❸

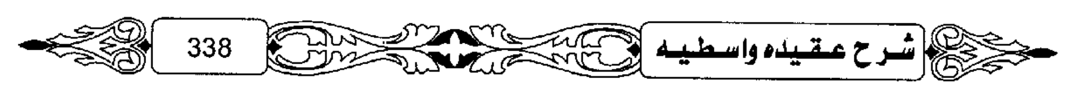
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تو مسلسل روزے رکھتے چلے جاتے یہاں تک کہ کہنے والا کہتا کہ آپ افطار نہیں کریں گے، پھر آپ افطار کرتے تو کہنے والا کہتا کہ اب آپ روزے نہیں رکھیں گے۔ ❹ آپ قیام اور نیند کے حوالے سے بھی

---

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ ❷ اسے بخاری: ۱۹۷۰۔ ۱۱۵۱ اور مسلم: ۷۸۲ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔

❸ صحیح بخاری: ۲۱۲۔ صحیح مسلم: ۷۸٦ عن عائشہ رضی اللہ عنہا.

❹ ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری: ۱۹۷۳، ۱۹۷۲۔ صحیح مسلم: ۱۱۵۷.



اعتدال پر مبنی یہی روش اختیار فرماتے۔

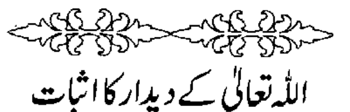
اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ قریب ہے، اس پر یہ ارشاد باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: ١٨٦) ''اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو بیشک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں وہ جب بھی مجھے پکارے۔''

سلوک کے حوالے سے مستفاد امور

عبادات کے لیے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں ہے، اس کے لیے افراط وتفریط سے ہٹ کر درمیانی روش اختیار کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی معصیت ومخالفت سے دور رہنا چاہیے، اس لیے کہ وہ قریب ہے، سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

وضاحت کے لیے غائب کو حاضر کے ساتھ تشبیہ دینا جائز ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ مفاہیم ومعانی کی وضاحت کے لیے اقرب الی الفہم امور کا انتخاب کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سفر کی حالت میں تھے اور اپنی سواریوں پر سوار تھے، اس وقت قریب کی اس مثال سے زیادہ کوئی دوسری مثال خوبصورت اور موثر نہیں ہوسکتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے بیان فرمائی۔



اللہ تعالیٰ کے دیدار کا اثبات

☐ سولہویں حدیث رؤیت باری تعالیٰ کے اثبات میں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ ، لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِ ؛ فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَا تُغْلَبُوْا عَلَى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَصَلَاةٍ قَبْلَ غُرُوْبِهَا؛ فَافْعَلُوْا .))

متفق عليه [1]

''یقیناً تم لوگ اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھا کرتے ہو، تمہیں اسے دیکھتے وقت بھیڑ بھاڑ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اگر تمہارے بس میں ہو کہ تم طلوع آفتاب سے قبل کی نماز (نماز فجر) اور غروب آفتاب سے قبل کی نماز (نماز عصر) کی ادائیگی سے کسی دوسرے کام میں الجھا نہ دیئے جاؤ تو ایسا ضرور کرنا۔''

شرح: ...... [إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ] ...... سین تحقیق اور فعل مضارع کو مستقبل کے معنی میں لے جانے کے لیے ہے، جبکہ قبل ازیں اس میں حال اور مستقبل دونوں معنوں کی گنجائش موجود تھی، اور یہ خطاب اہل ایمان سے ہو رہا ہے۔

[كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ] ...... رؤیت سے مراد رؤیت بصریہ ہے، اس لیے کہ ہم چاند کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں، چونکہ

---

[1] صحيح بخاری: ٥٥٤۔ صحيح مسلم: ٦٣٣۔ عن جرير بن عبدالله رضی اللہ عنہ.

اس جگہ رؤیت کو رؤیت کے ساتھ تشبیہ دی جا رہی ہے، لہٰذا اس سے مراد رؤیت بصریہ ہی ہوگی۔

كَمَا تَرَوْنَ یہ (ما) مصدریہ ہے، جس کے بعد آنے والا فعل مصدر میں تحویل ہو جاتا ہے، اس بنا پر تقدیری عبارت اس طرح ہوگی: كَرُؤْيَتِكُمُ الْقَمَرَ اس طرح یہ رؤیت کی رؤیت کے ساتھ تشبیہ ہے، مرئی (دیکھی گئی چیز) کی مرئی کے ساتھ نہیں، اس لیے کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کبھی کبھی حسی مثالوں کے ذکر کے ساتھ معانی کو لوگوں کے ذہنوں کے قریب فرمایا کرتے تھے، جس طرح کہ لقیط بن عامر کہنے لگا: اللہ کے رسول! کیا ہم سب کے سب قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟ اور اس کی مخلوق میں اس کی نشانی کیا ہے؟ تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم سب چاند کو اس کے ساتھ الگ ہو کر دیکھتے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: ''اللہ اس سے بھی زیادہ عظمت والا ہے۔'' [1]

اسی طرح صحیح مسلم [2] میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا ہے، جب بندہ کہتا ہے: الحمد للہ رب العالمین، تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری حمد کی۔''

یہ حدیث ہر نمازی کو شامل ہے، اور یہ سبھی کے علم میں ہے کہ تمام نمازی یہ آیت ایک ساتھ پڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایک ہی لمحہ میں ہر نمازی کے بارے میں فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی۔''

[كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ] ..... یعنی جس رات چاند صاف چمک رہا ہوتا ہے، یہ چودھویں اور پندرھویں کی رات ہوتی ہے اور تیرھویں کی بھی۔ درمیانی رات چودھویں کی ہوتی ہے۔

[لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ؛] ..... دوسری حدیث کے لفظ ہیں: لا تضامون ۔ اور ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

لَا تُضَامُّوْنَ میم کی تشدید اور تاء کی زبر اور پیش کے ساتھ، یعنی اسے دیکھتے وقت لوگ ایک دوسرے سے ملے جلے نہیں ہوں گے، جب کوئی چیز مخفی ہوتی ہے تو اسے دکھانے کے لیے ایک آدمی دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے، اسے رش سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

لا تضامون. تا کی پیش اور میم کی تخفیف کے ساتھ، یعنی تم پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی، مطلب یہ کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کو دیدار الٰہی سے روک کر اس پر ظلم و زیادتی نہیں کرے گا، ہر شخص اسے آسانی کے ساتھ دیکھ سکے گا۔

لا تضارون یا لا تضارّون ۔ یعنی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، ہر بندہ مومن بڑے اطمینان اور مکمل راحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہو سکے گا۔

---

[1] اسے امام أحمد: ٤/ ١١۔ أبو داود: ٤٧٣ اور حاکم: ٤/ ٥٨٠ نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان سے موافقت کی، اسے ابن خزیمہ نے التوحید: ٤٣٨ آجری نے الشریعة اور ابن ابی عاصم نے السنة: ١/ ٢٠٠ میں روایت کیا، ظلال الجنة میں البانی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ وکیع بن عدی (یا عدس) کے علاوہ اس کے راوی مسلم کے ہیں۔

[2] صحیح مسلم: ٣٩٥.



[فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلَى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَصَلَاةٍ قَبْلَ غُرُوْبِهَا؛ فَافْعَلُوْا.] .....

''طلوع آفتاب سے قبل کی نماز سے مراد نماز فجر اور اس کے غروب ہونے سے قبل کی نماز سے مراد نماز عصر ہے۔

نماز عصر، نماز فجر سے افضل ہے، اس لیے کہ وہ صلاۃ وسطیٰ (درمیانی نماز) ہے، جس کی نگہداشت کا اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر حکم دیا ہے، مگر دوسرے اعتبار سے نماز فجر نماز عصر سے افضل ہے، اس لیے کہ وہ صلاۃ مشہودہ ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (الاسراء: ۷۸)

''اور قرآن (پڑھنا نماز) فجر میں، یقیناً نماز فجر میں قرآن پڑھنا فرشتوں کی حاضری کا موجب ہے۔''

ایک صحیح حدیث میں آتا ہے: ''دو ٹھنڈی نمازیں پڑھنے والا جنت میں داخل ہوگا۔'' [1] ان دو نمازوں سے مراد، نماز فجر اور نماز عصر ہیں۔

اس حدیث سے مستفاد صفات

اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا اثبات ہوتا ہے۔

رؤیت باری تعالیٰ پر دلالت کرنے والی آیات کے ضمن میں اس صفت کی شرح گزر چکی ہے۔ جو کہ تعداد میں چار ہیں، جب کہ اس بارے میں مرفوع احادیث تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں، جن کا ثبوت بھی قطعی ہے اور دلالت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے کرام رؤیت باری تعالیٰ کے منکر کو کافر و مرتد قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر بندہ مومن پر اس کا اقرار کرنا واجب ہے، وہ اس کے منکر کو کافر قرار دینے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے دلائل قطعی الثبوت بھی ہیں اور قطعی الدلالت بھی، کسی شخص کے لیے بھی یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان: ((اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ .)) قطعی الدلالت نہیں ہے، اس لیے کہ اس ترکیب سے بڑھ کر کوئی بھی ترکیب قطعی الدلالت نہیں ہو سکتی۔

قبل ازیں ہم بتلا آئے ہیں کہ اہل تاویل ان احادیث کی تاویل کرتے ہوئے رؤیت کی تفسیر رؤیت علم کے ساتھ کرتے ہیں، وہیں ان کے اس قول کا بطلان بھی کیا جا چکا ہے۔

اِلٰی امثال هٰذهِ الحدیث یعنی ان احادیث کی امثال ملاحظہ فرمائیں جن میں نبی کریم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہے، ان میں سے جو احادیث ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے ان احادیث جیسی ہوں گی تو ان کا حکم بھی ان کے حکم جیسا ہوگا۔

الفرقة الناجية. نجات پانے والا گروہ، جو دنیا میں بدعات و خرافات سے نجات پائے گا اور آخرت میں آتش جہنم سے۔

اهل السنة والجماعة. یعنی جن کا سنت پر عمل ہے اور وہ اس پر اکٹھے ہیں۔

یومنون بذلك. یعنی وہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے امور پر ایمان رکھتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو: حادي الارواح، از ابن قیم، ص: ۲۴۲۔ انہوں نے امام احمد وغیرہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ کا منکر کافر ہے۔



كما يومنون بما اخبر الله به في كتابه. یعنی جس طرح ہم پر کتاب اللہ کے احکام وتعلیمات پر ایمان لانا واجب ہے اسی طرح ہم پر نبی کریم ﷺ کی طرف سے بتائی گئی باتوں پر ایمان لانا بھی واجب ہے، الا یہ کہ وہ ثبوت میں قرآن سے مختلف ہو، اس لیے کہ سنت کے حوالے سے ہمیں دو چیزوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے:

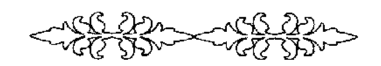
☆ اس کے ثبوت کے بارے میں۔

☆ اوراس کی دلالت کے بارے میں۔

مگر قرآن کے بارے میں صرف ایک ہی بات کا جائزہ لینا پڑتا ہے اور وہ ہے: دلالت قرآن۔

ہم قبل ازیں ان دلائل کا تذکرہ کر چکے ہیں، جو نبی کریم ﷺ کے بیان کردہ امور کو قبول کرنے کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔

من غير تحريف ولا تعطيل ومن غير تكييف ولا تمثيل . اس کی شرح گزر چکی ہے۔





فصل:

مختلف اسلامی فرقوں میں اہل السنۃ والجماعہ کا مقام و مرتبہ اور ان کا اعتدال کے ساتھ متصف ہونا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((بَلْ هُمُ الْوَسَطُ فِيْ فِرَقِ الْأُمَّةِ ، كَمَا اَنَّ الْاَمَّةَ هِيَ الْوَسَطُ فِي الْأُمَمِ.))

''امت کے مختلف فرقوں میں اہل السنہ والجماعۃ راہ اعتدال پر گامزن ہیں، جس طرح کہ یہ امت دوسروں امتوں میں معتدل امت ہے۔''

شرح: ...... [الْاَمَّةَ هِيَ الْوَسَطُ فِي الْأُمَمِ.] ..... یعنی یہ امت گزشتہ امتوں کے مقابلے میں راہ اعتدال پر گامزن ہے۔اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حق میں: یہودی اللہ تعالیٰ کو کئی نقائص سے متصف گردانتے ہوئے اسے مخلوق کے ساتھ ملاتے، جبکہ نصاریٰ ناقص مخلوق کو رب کامل کے ساتھ ملاتے ہیں، مگر یہ امت نہ تو رب تعالیٰ کو نقائص سے متصف قرار دیتی ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ اس کی مخلوق کو ملاتی ہے۔

انبیائے کرام کے حق میں: یہودیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی تکذیب کی اور ان کا انکار کر ڈالا، جبکہ نصاریٰ نے ان کے بارے میں غلو سے کام لیتے ہوئے انہیں مقام الوہیت پر فائز قرار دے دیا، مگر یہ امت ان پر غلو کے بغیر ایمان لاتی اور انہیں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول تسلیم کرتی ہے۔

عبادات میں: نصاریٰ، ایک پلید قوم ہے، وہ نجاستوں سے طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ پیشاب کرتے ہیں، پیشاب کپڑوں کو لگ جاتا ہے اور پھر کھڑے ہو کر عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں، ان کے برعکس اگر یہودیوں کے جسم یا لباس پر نجاست لگ جائے تو وہ اسے کپڑے سے کھرچ ڈالتے ہیں، ان کے نزدیک پانی سے طہارت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ وہ حائضہ عورت سے الگ تھلگ رہتے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے سے بھی گریز کرتے ہیں، جبکہ یہ امت راہ اعتدال پر گامزن ہے، اس امت کے لوگ نہ تو نجاست دور کرنے کے لیے کپڑے پھاڑتے ہیں اور نہ نجاست کی موجودگی میں نماز ادا کرتے ہیں، وہ نجاست کے ازالہ کے لیے پانی سے غسل کرتے اور پھر نماز ادا کرتے ہیں، وہ حائضہ عورت سے بھی قطع تعلق اختیار نہیں کرتے، وہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے اور میل ملاپ رکھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم نہیں کرتے۔



یہود ونصاریٰ اشیاء خورد ونوش کے حوالے سے بھی افراط وتفریط کا شکار ہیں، نصاریٰ خبائث اور جملہ محرمات کو حلال قرار دیتے جبکہ یہودی ناخن والے تمام جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾

(الانعام: ١٤٦)

''اور ہم نے یہودیوں پر ناخن والے تمام جانور حرام قرار دے دیئے تھے، اور گائے اور بکری میں سے ان پر ان کی چربی حرام کی تھی مگر جو ان کی پیٹھوں انتڑیوں سے لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہو، ہم نے ان کو یہ سزا ان کی شرارت کی وجہ سے دی تھی اور بیشک ہم سچے ہیں۔''

جبکہ یہ امت ایک معتدل امت ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں جبکہ خبیث چیزوں کو ان پر حرام کردیا گیا۔

قصاص میں: یہودیوں پر قصاص فرض ہے، جبکہ نصاریٰ پر اس سے درگزر کرنا فرض، جہاں تک اس امت کا تعلق ہے، تو انہیں قصاص لینے کا بھی اختیار ہے اور دیت قبول کرنے کا بھی، اور وہ بلا معاوضہ بھی معاف کرسکتے ہیں۔

الغرض امت اسلامیہ دیگر اقوام میں افراط وتفریط کے درمیان رہ کر راہ اعتدال پر گامزن ہے۔

اس کے بعد مؤلف رحمہ اللہ نے ان پانچوں اصولوں کا ذکر کیا ہے جن میں اہل سنت، امت اسلامیہ کے دیگر فرقوں میں درمیانی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔

الاصل الاول، باب الاسماء والصفات

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَهُمْ وَسَطٌ فِيْ بَابِ صِفَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بَيْنَ اَهْلِ التَّعْطِيْلِ الْجَهْمِيَّةِ وَاَهْلِ التَّمْثِيْلِ الْمُشَبِّهَةِ))

''اہل سنت صفات باری تعالیٰ کے باب میں اہل تعطیل جہمیہ اور اہل تمثیل مشبہ کے درمیان راہ اعتدال اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

شرح:...... جہمیہ اور مشبہ دونوں انتہا پسند گروہ ہیں۔

جہمیہ صفات باری تعالیٰ کے منکر ہیں، بلکہ ان میں سے غالی قسم کے لوگ تو اسماء کا بھی انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا نام ثابت کرنا جائز ہے اور نہ صفت، اس لیے کہ جب آپ اس کے لیے نام ثابت کریں گے تو اسے مسمّیات کے ساتھ تشبیہ دیں گے اور اگر صفت ثابت کریں گے تو اسے موصوفات کے ساتھ تشبیہ دینے کے مرتکب ہوں گے۔ لہٰذا ہم اس کے لیے نہ اسم ثابت کرتے ہیں اور نہ صفت، رہے وہ اسماء جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف مضاف کیا



ہے تو وہ از قبیل مجاز ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ ان اسماء کے ساتھ موسوم ہے۔

معتزلہ صفات کا انکار کرتے اور اسماء کا انکار کرتے ہیں۔

اشعریہ تمام اسماء اور سات صفات کا اثبات کرتے ہیں۔

ان سب لوگوں کا شمار اہل تعطیل کے ضمن میں کیا جاتا ہے، لیکن ان میں سے بعض کامل طور پر اسماء وصفات کو معطل کرتے ہیں جس طرح کہ جہمیہ اور بعض تعطیل نسبی کے مرتکب ہوتے ہیں، مثلاً معتزلہ اور اشاعرہ۔ رہے اہل تمثیل مشبہ، تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے صفات کا اثبات کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم پر اللہ تعالیٰ کے لیے صفات کا اثبات کرنا واجب ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے لیے خود ان کا اثبات کیا ہے، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صفات باری تعالیٰ مخلوق کی صفات جیسی ہیں۔

یہ لوگ اثبات صفات میں غلو کا شکار ہوئے اور اہل تعطیل تنزیہ میں۔

اہل تمثیل مشبہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے (الـــوجـــہ) چہرے کا اثبات واجب ہے اور یہ چہرہ اولاد آدم کے خوبصورت ترین شخص کے چہرے جیسا ہے اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس چیز کے ساتھ مخاطب کیا ہے، جسے ہم سمجھ سکتے ہیں، اللہ فرماتا ہے:

﴿وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ۲۷)

''اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو جاہ وجلال والا اور عزت والا ہے۔''

مگر ہم چہرے کا وہی معنی سمجھتے ہیں جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور سب سے خوبصورت چیز جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ انسان ہے۔

ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کا چہرہ، والعیاذ باللہ۔ انتہائی خوبصورت نوجوان کے چہرے جیسا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ یہی بات معقول ہے۔

مگر اہل سنت کہتے ہیں کہ ہم حق اپنائیں گے وہ جانبین میں سے جس کے پاس بھی ہوگا، ہم تنزیہ کے باب میں حق اپناتے ہوئے تمثیل کا انکار کریں گے اور اثبات کے باب میں حق اختیار کرتے ہوئے تعطیل کا انکار کریں گے۔ ہم اثبات بلا تمثیل اور تنزیہ بلا تعطیل کے قائل ہیں، ہم ادھر سے بھی دلائل لیں گے اور ادھر سے بھی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت صفات کے باب میں دونوں دو انتہا پسند گروہوں کے درمیان راہ اعتدال پر گامزن ہیں، ایک گروہ نے تنزیہ اور نفی میں غلو سے کام لیا جو کہ جہمیہ وغیرہم پر مشتمل ہے، جبکہ دوسرے گروہ نے اثبات میں غلو سے کام لیا، اور یہ ممثلہ کا گروہ ہے۔ اہل سنت نہ تو اثبات میں غلو کے قائل ہیں اور نہ نفی میں، وہ بدون تمثیل اثبات کے قائل ہیں، اس لیے کہ قرآن کا کہنا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''



دوسرا اصل، افعال باری تعالیٰ

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُمْ وَسَطٌ فِي بَابِ أَفْعَالِ اللّٰهِ بَيْنَ الْجَبْرِيَّةِ وَالْقَدْرِيَّةِ .))

''اہل سنت اللہ تعالیٰ کے افعال کے باب میں جبریہ اور قدریہ کے درمیان راہ اعتدال پر ہیں۔''

شرح:...... تقدیر کے باب میں لوگوں کے تین گروہ ہیں:

ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان رکھتا اور اس کے اثبات میں اس حد تک غلو سے کام لیتا ہے کہ انہوں نے انسان سے اس کی قدرت واختیار کو سلب کر لیا، ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے، بندے کو کوئی اختیار اور قدرت حاصل نہیں ہے، وہ اپنے افعال میں مجبور محض ہے، بلکہ ان میں سے کچھ کا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ بندے کا فعل اصل میں اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ یہ گروہ جبریہ کا ہے۔

دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے افعال میں آزاد ہے، ان میں تقدیر یا اللہ تعالیٰ کی مشیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ان میں سے بعض لوگوں نے غلو سے کام لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کے فعل کا اسی وقت علم ہوتا ہے جب وہ اسے کر گزرتا ہے، قبل ازیں اسے کسی چیز کا علم نہیں ہوتا، یہ اس امت کے مجوسی قدریہ ہیں، پہلے گروہ نے اللہ تعالیٰ کے افعال اور اس کی تقدیر میں غلو سے کام لیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے فعل پر مجبور کرتا ہے، اور انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

دوسرے گروہ نے انسان کی قدرت کے اثبات میں غلو سے کام لیا اور یہ موقف اپنایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ومشیت کا بندے کے فعل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، انسان مطلق الاختیار ہے، اور وہ اپنے فعل کا خود فاعل ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ اہل سنت کا ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کی مشیت سے واقع ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کسی چیز کا ہو پانا ہرگز ممکن نہیں ہے اور انسان صاحب اختیار بھی ہے اور صاحب ارادہ بھی، وہ اضطراری اور اختیاری فعل میں فرق کر سکتا ہے۔

پس بندوں کے افعال ان کے اختیار وارادہ سے سرانجام پاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور خلق سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

اشکال: جب وہ انسان کا فعل ہیں تو پھر اللہ کی مخلوق کیسے ہوئے؟

جواب: بندوں کے افعال ان کے ارادہ وقدرت سے صادر ہوتے ہیں، مگر اس ارادہ وقدرت کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آپ سے قدرت سلب کرے اور آپ کچھ بھی نہ کر سکیں۔

اگر فعل پر قادر کوئی شخص فعل کا ارادہ نہ کرے تو وہ فعل اس سے واقع نہیں ہوگا۔



فعل پر قادر جو بھی شخص کوئی فعل کرتا ہے وہ اس کے ارادے سے ہوتا ہے، بجز اس شخص کے جس پر زبردستی کی جائے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنی قدرت اور اختیار سے کرتے ہیں، اور جس نے ہم میں اختیار اور قدرت کو پیدا فرمایا وہ اللہ تعالیٰ ہے۔

تیسرا اصل، الوعید

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَفِی بَابِ وَعِیْدِ اللّٰهِ بَیْنَ الْمُرْجِئَةِ وَبَیْنَ الْوَعِیْدِیَّةِ مِنَ الْقَدَرِیَّةِ وَغَیْرِهِمْ .))

''اہل سنت اللہ تعالیٰ کی وعید کے باب میں مرجیہ اور وعیدیہ (قدریہ وغیرہم) کے درمیان راہ اعتدال پر ہیں۔''

شرح: ...... مرجیه: أرجأ سے اسم فاعل ہے، بمعنی: اس نے موخر کیا، اسی سے یہ ارشاد باری ہے: ﴿قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ﴾ (الاعراف: ۱۱۱) ''انہوں نے کہا: اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے۔'' اس میں دوسری قراءت ہے: ﴿اَرْجِئْهُ﴾ یعنی اسے اور اس کے معاملہ کو مؤخر کر۔

انہیں مرجیہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے۔ اگر یہ رجا بمعنی امید سے ماخوذ ہو۔ کہ وہ رجا و اُمید کے دلائل کو وعید کے دلائل پر ترجیح دیتے ہیں اور اگر یہ ارجاء بمعنی تاخیر سے ماخوذ ہو تو اس لیے کہ وہ اعمال کو حقیقت ایمان سے مؤخر بتلاتے ہیں، یعنی ان کے نزدیک عمل حقیقت ایمان سے خارج ہے۔

ان کا عقیدہ ہے کہ اعمال ایمان کا حصہ نہیں ہیں، ایمان محض اقرار بالقلب کا نام ہے، نتیجتاً ان کے نزدیک زانی، چور، شرابی، ڈاکو اور دیگر کبیرہ گناہوں کے مرتکب لوگ جہنم میں نہیں جائیں گے، نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور نہ وقتی طور پر، اس لیے کہ وہ کامل الایمان ہیں، ایمان کی موجودگی میں کوئی بھی گناہ ضرر رساں نہیں ہے وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، بشرطیکہ وہ کفر کی حد تک نہ پہنچے۔

وعیدیہ کا عقیدہ ان کے برعکس ہے، ان کے نزدیک کسی بھی گناہ کا مرتکب انسان اگر اس سے توبہ نہ کرے تو وہ اس کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ چور بھی ابدالاباد کے لیے جہنمی ہے اور شرابی بھی......

وعیدیہ کے ضمن میں معتزلہ بھی آتے ہیں اور خوارج بھی، اسی لیے مؤلف فرماتے ہیں: من القدرية وغيرهم .

یہ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا، اور وہ اس سے کبھی بھی باہر نہیں نکل سکے گا، ان کے نزدیک ایک بار شراب پینے والا، ایک ہزار سال تک بت پرستی کرنے والے کے برابر ہے، یہ دونوں ابدی جہنمی ہیں، مگر نام میں مختلف ہیں، جس کی تفصیل اگلے باب میں آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ

جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو خوارج اور معتزلہ کی طرح جانب وعید کو غلبہ دیتے ہیں اور نہ مرجیہ کی طرح جانب وعد کو، ان کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب عذاب کا مستحق ہے، اسے عذاب دیا جا سکتا ہے مگر وہ جہنم میں



ہمیشہ نہیں رہے گا۔

وعیدیہ اور مرجیہ کے درمیان اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ان میں سے ہر فریق نصوص کو ایک جانب سے دیکھتا اور ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہے، مرجیہ نے وعد ورجاء کی نصوص کو دیکھا تو انسان کو امید سے وابستہ کر دیا اور یہ کہا کہ ہم ان نصوص پر عمل کریں گے اور ان کے علاوہ دیگر کو ترک کر دیں گے، یہ لوگ وعید کی نصوص کو کفار پر محمول کرتے ہیں۔

وعیدیہ کا عقیدہ اس کے برعکس ہے، انہوں نے وعید کی نصوص کو دیکھا تو انہیں اپنا لیا، جبکہ وعدہ ورجاء کی نصوص کو فراموش کر دیا، اس طرح جب انہوں نے نصوص کو ایک جانب سے دیکھا تو ان کے توازن میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔

مگر اہل سنت نے یہ نصوص بھی اپنائیں اور وہ بھی، انہوں نے کہا کہ وعید کی نصوص محکم ہیں لہٰذا ہم ان پر عمل کریں گے اور چونکہ وعد کی نصوص بھی محکم ہیں، لہٰذا ہم ان پر بھی عمل کریں گے۔ لہٰذا ان کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دخول جہنم کا حقدار ہے۔ تاکہ وعید کی نصوص رائیگاں نہ جائیں، مگر وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ تاکہ نصوص وعد رائیگاں نہ جائیں۔

اہل السنہ والجماعہ نے دونوں آنکھوں سے دیکھا اور دونوں دلیلوں پر عمل کیا۔

چوتھا اصل، ایمان اور دین کے اسماء

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَفِی بَابِ اَسْمَاءِ الْاِیْمَانِ وَالدِّیْنِ بَیْنَ الْحَرُوْرِیَّةِ وَالْمُعْتَزِلَةِ ، وَبَیْنَ الْمُرْجِئَةِ الْجَهْمِیَّةِ .))

''اہل السنۃ والجماعہ ایمان اور دین کے اسماء کے باب میں دو جماعتوں کے درمیان ہیں، ان کے ایک طرف حروریہ اور معتزلہ ہیں اور دوسری طرف مرجیہ جہمیہ۔''

شرح: ...... یہ بحث ایمان اور دین کے اسماء کے باب میں ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم کبیرہ گناہ کے مرتکب کو مومن کے نام سے موسوم کریں گے یا کافر کے نام سے؟

اہل سنت دو جماعتوں کے درمیان ہیں، ان کے ایک طرف حروریہ ومعتزلہ ہیں تو دوسری طرف مرجیہ جہمیہ۔

حروریہ اور معتزلہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو ایمان سے خارج کرتے ہیں، لیکن حروریہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسا شخص کافر ہے اور اس کا خون اور مال حلال ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ائمہ کے خلاف خروج کیا اور لوگوں کو کافر قرار دیا۔

مرجیہ جہمیہ اس حوالے سے ان کے مخالف ہیں، ان کے نزدیک ایسا شخص مومن ہے اور کامل الایمان ہے، وہ چوری کرے یا زنا شراب نوشی کرے، ڈاکا زانی کرے یا کسی کو قتل کر ڈالے، وہ کسی بھی گناہ کا ارتکاب کرے ہم اسے کامل الایمان مومن کہیں گے، واجبات ومستحبات کی ادائیگی کرنے والا، محرمات سے اجتناب کرنے والا اور کبائر کا ارتکاب کرنے والا، ایمان میں یہ دونوں شخص برابر ہیں۔

یہ دونوں گروہ نام میں بھی ایک دوسرے کی ضد ہیں اور حکم میں بھی۔

رہے معتزلہ، تو ان کے نزدیک کبیرہ گناہ کرنے والا ایمان سے تو خارج ہوگیا مگر کفر میں بھی داخل نہیں ہوا، ایسا شخص دو منزلوں کے درمیان ایک تیسری منزل میں ہے، ہم نہ تو اسے کافر کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں اور نہ مومن کہنے کی، ان کا یہ کہنا تو مبنی برحقیقت ہے کہ یہ آدمی عبادت گزار مومن کے برابر نہیں ہوسکتا۔

مگر ان کا اسے ایمان سے خارج کرنا اور پھر اس کے لیے ایمان وکفر کے درمیان ایک تیسری منزل کو ایجاد کرنا ایسی بدعت ہے جس کا وجود نہ تو کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہی سنت رسول اللہ ﷺ میں۔

تمام نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دو منزلوں کے درمیان کسی تیسری منزل کا کوئی وجود نہیں ہے، مثلاً: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنَّآ اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی هُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝﴾ (سباء: ۲۴)

''اور یقیناً ہم یا خاص تم، ہدایت پر ہیں یا پھر کھلی گمراہی میں ہیں۔''

اور اس کا یہ ارشاد: ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ﴾ (یونس: ۳۲) ''اور حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور ہے بھی کیا؟'' نیز یہ ارشاد:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ (التغابن: ۲)

''وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو پھر تم میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن۔''

اور حدیث میں ہے: ''قرآن تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف۔''[1]

دو منزلوں کے درمیان تیسری منزل کا ذکر کہاں ہے؟

یہ لوگ وعید کے باب میں اس پر وعید نافذ کرتے ہیں اور اس طرح وہ اس بارے میں خوارج سے موافقت کرتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کرنے والا جہنم میں ہمیشہ رہے گا، مگر دنیا کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ اس پر اسلام کے احکام نافذ ہوں گے۔ اس لیے کہ اسلام اصل ہے، اس لیے وہ دنیا میں ان کے نزدیک فاسق وفاجر کے مرتبہ میں ہوگا۔

سبحان اللہ! اگر یہ بات ہے تو ہم اس کی نماز جنازہ کس طرح پڑھیں گے اور اس کے لیے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهٗ. ''یا اللہ اسے معاف کردے۔'' کیسے کہیں گے جبکہ اسے جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے؟

ان کے اس عقیدہ کی رو سے انہیں دنیا کے احکام کے حوالے سے یہ کہنا چاہیے کہ اس کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا۔

ہم نہ اسے مسلمان کہتے ہیں اور نہ کافر، اس پر احکام اسلام نافذ کرتے ہیں اور نہ احکام کفر، اس کے مرنے کے بعد ہم نہ تو اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے، نہ اسے کفن دیں گے، اور نہ غسل، اسے نہ مسلمانوں کے ساتھ دفن کیا جائے گا اور نہ کافروں

[1] صحیح مسلم: ۲۲۳۔ میں ابن مالک الاشعری سے مروی حدیث کا جز۔



کے ساتھ۔اس طرح ہم اس کے لیے دو قبرستانوں کے درمیان تیسرا قبرستان تلاش کریں گے۔

رہے اہل سنت تو وہ ان مختلف گروہوں میں راہ اعتدال اختیار کیے ہوئے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں: ہم کبیرہ گناہوں کے مرتکب مومن کو ناقص الایمان مومن کے نام سے موسوم کریں گے، یا یوں کہیں گے کہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے مومن اور کبیرہ گناہوں کی وجہ سے فاسق ہے، اور یہی عدل ہے، اسے نہ تو مطلق نام دیا جائے گا اور نہ اس سے مطلق نام سلب کیا جائے گا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ ہم فاسق شخص سے مطلقاً کراہت کریں یا اس سے مطلقاً محبت کریں، بلکہ ہم اس کے ایمان کی وجہ سے اس کے ساتھ محبت کریں گے اور اس کی معصیت کی وجہ سے اس سے کراہت کریں گے۔

پانچواں اصل، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَفِیْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ الرَّافِضَةِ وَالْخَوَارِجِ .))

''اہل سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں رافضہ اور خوارج کے درمیان راہ اعتدال پر ہیں۔''

شرح: ......[اَصْحَابِ] ......صاحب کی جمع ہے، اور صحب صاحب کی اسم جمع، اور الصاحب کا معنی ہے: کسی کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا۔

صحابی: اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے ایمان کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملاقات کی ہو۔ اور پھر حالت ایمان میں ہی فوت ہوا ہو۔

یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے کہ انسان آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہو سکتا ہے اگرچہ وہ لمحہ بھر کے لیے ہی آپ سے ملا ہو، مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو۔''[1]

اہل سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں رافضہ اور خوارج کے درمیان راہ اعتدال پر قائم ہیں۔

رافضہ: یہ لوگ آج کل اپنے آپ کو شیعہ کہلاتے ہیں۔ ان کے اس نام سے موسوم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت زید بن علی بن حسین بن علی بن ابو طالب کو چھوڑ دیا تھا، جن کی طرف اب زیدیہ فرقہ کے لوگ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں، ان لوگوں نے حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کیا رائے ہے؟ وہ چاہتے تھے کہ آپ انہیں گالی گلوچ کریں اور ان میں کیڑے نکالیں، مگر وہ کہنے لگے: یہ میرے نانا کے وزیر تھے اور بڑے اچھے وزیر تھے۔ جب جناب زید رحمہ اللہ نے ان کی تعریف وتوصیف کی تو وہ اس پر ناراض ہوئے اور انہیں چھوڑ کر چلے گئے اور بعد ازاں رافضہ کے نام سے موسوم ہو گئے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو: فتح الباری: ٤/ ٧.

[2] ان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں: منهاج السنة، از شیخ الاسلام: ١/ ٣٤.

رافضیوں کے کچھ مخصوص عقائد ہیں، ان کا بدترین عقیدہ یہ ہے کہ امام معصوم ہوتا ہے اور اس سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ مقام امامت مقام نبوت سے اعلیٰ وارفع ہوتا ہے، اور یہ اس لیے کہ امام اللہ تعالیٰ سے براہ راست اخذ کرتا ہے جبکہ نبی جبریئل امین کی وساطت سے، بلکہ غالی قسم کے شیعہ تو امام کے خالق ہونے تک کا دعویٰ کرتے ہیں جو کلمہ کن سے اشیاء کو وجود میں لاسکتا ہے۔

رافضی شیعہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافر تھے۔ والعیاذ باللہ۔ اور وہ تمام کے تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہوگئے تھے، یہاں تک حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی کافر تھے اور انہیں نفاق پر موت آئی۔ والعیاذ باللہ۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صرف اہل بیت اور چند ایسے لوگوں کو مستثنیٰ کرتے ہیں، جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ اہل بیت کے طرف دار تھے۔

کتاب "الفصل" کے مؤلف کہتے ہیں: ''غالی قسم کے شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی کافر کہتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے ظلم اور باطل کی تائید کرتے ہوئے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی بیعت کی جب کہ انہیں اس سے انکار کر دینا چاہیے تھا، جب انہوں نے حق وانصاف کا دامن نہ پکڑا اور ظلم کا ساتھ دیا تو ظالم وکافر قرار پائے۔'' جہاں تک خوارج کا تعلق ہے تو وہ رافضی شیعوں کے برعکس حضرت علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان کو کافر کہتے ہیں، ان کے نزدیک ہر وہ شخص کافر ہے جو ان (خوارج) کے طریقہ کو اختیار نہیں کرتا، خوارج مسلمانوں کے قتل کرنے کو مباح خیال کرتے ہیں، انہی لوگوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا: ''ان کا ایمان ان کے نرخروں سے آگے نہیں بڑھے گا وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔'' [1]

شیعہ اہل بیت کے بارے میں یہاں تک غلو اور مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں کہ ان میں سے بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہیں، جبکہ بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ نبوت کے حق دار تھے، جبکہ خوارج کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

رہے اہل السنہ والجماعہ، تو وہ ان دونوں گروہوں کی افراط وتفریط کے درمیان راہ اعتدال پر گامزن ہیں۔ ان کا کہنا ہے، ہم اہل بیت کو ان کے مقام ومرتبہ پر اتارتے ہیں، ہمارے نزدیک ان کے ہم پر دو حق ہیں، ایمان واسلام کا حق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت داری کا حق، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری کا ہم پر یقیناً حق ہے مگر ان کا ہم پر یہ بھی حق ہے کہ ہم انہیں ان کے مقام ومرتبہ پر اتاریں اور ان کے بارے میں غلو سے کام نہ لیں، اہل سنت کا دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہنا ہے کہ ہم پر ان کا یہ حق ہے کہ ہم ان کی تعظیم وتوقیر کریں اور ان سے راضی ہیں، اور یہ کہ ان کے بارے میں ہمارا رویہ اس ارشاد باری تعالیٰ کا عکاس ہو:

---

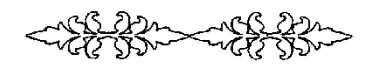
[1] اسے بخاری: ٦٩٣٠ اور مسلم: ١٠٦٦ نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



﴿رَبَّنَآ اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِىۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ۝﴾ (الحشر: ۱۰)

''ہمارے پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو معاف کر دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کینہ پیدا نہ کرنا جو ایمان لائے، ہمارے پروردگار! یقیناً تو بہت شفقت والا بڑا رحم والا ہے۔''

اور ہم ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی عداوت نہ رکھیں، نہ اہل بیت کے ساتھ اور نہ دوسروں کے ساتھ اور ہم ان میں سے ہر ایک ایک کا حق ادا کریں۔ اس طرح اہل سنت ان دو انتہا پسند گروہوں کے درمیان راہ اعتدال پر گامزن ہیں۔





فصل:

اللہ تعالیٰ کی معیت اس کے علو اور استواء علی العرش کے درمیان تطبیق کا بیان

شرح: ...... قبل ازیں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں اس کے اسماء وصفات پر ایمان لانا بھی داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے علو، استواء علی العرش اور اس کی معیت پر ایمان لانا بھی اسی ضمن میں آتا ہے، اس فصل میں مؤلف علو اور معیت میں تطبیق کا ذکر کریں گے۔

صفت علو پر دلائل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَدْ دَخَلَ فِيمَا ذَكَرْنَاهُ مِنَ الْإِيمَانِ بِاللّٰهِ : اَلْإِيمَانُ بِمَا أَخْبَرَ اللّٰهُ بِهِ فِي كِتَابِهِ ، وَتَوَاتَرَ عَنْ رَسُولِهِ ﷺ ، وَأَجْمَعَ عَلَيْهِ سَلَفُ الْأُمَّةِ ، مِنْ أَنَّهُ سُبْحَانَهُ فَوْقَ سَمَاوَاتِهِ عَلَى عَرْشِهِ عَلِيٌّ عَلَى خَلْقِهِ .))

اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے صفت علو (تمام مخلوقات سے بلند ہونا) کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے، اور ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ یہ عقل اور فطرت سے بھی ثابت ہے اور ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت علو کی دو قسمیں ہیں: علو صفات اور علو ذات، نیز یہ کہ علو کی یہ دونوں قسمیں کتاب وسنت، اجماع، عقل اور فطرت سے ثابت ہیں۔

کتاب اللہ اس کے دلائل سے بھری پڑی ہے، اس حوالے سے کبھی فوقیت کی صراحت کی گئی ہے، کبھی علو کی، کبھی اس کے آسمان پر ہونے کی، کبھی اس کی طرف سے اشیاء کے نزول کی اور کبھی اس کی طرف ان کے چڑھنے کی، سنت میں اس کی صراحت قول کے ساتھ بھی کی گئی ہے، فعل کے ساتھ بھی اور تقریر کے ساتھ بھی۔ اس کی تفصیل بھی پہلے گزر چکی ہے۔

رہا اجماع، تو اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے اور ان کے اجماع کے علم کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب وسنت میں جو کچھ وارد ہوا ہے، ان سے اس کے خلاف کچھ بھی منقول نہیں ہے، سلف قرآن مجید پڑھتے تھے، اخبار نقل کرتے تھے اور اس کے مفاہیم ومعانی کا علم رکھتے تھے، جب ان سے کتاب اللہ کے ظاہر کے خلاف کوئی چیز منقول نہیں ہے تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا اعتقاد اس سے ہٹ کر نہیں تھا، اور یہ کہ ان کا اس پر اجماع تھا، یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھیں، یہ بہت سے مقامات پر آپ کو فائدہ دے گا۔

جبکہ عقل اس پر دو طرح سے دلالت کرتی ہے:

ا۔ علو صفت کمال ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے تمام صفات کمال ثابت ہیں، لہٰذا اس کے لیے علو کا اثبات بھی واجب ہے۔

۲۔ اگر وہ عالی نہیں ہے تو پھر وہ نیچے ہوگا یا مساوی اور یہ صفت نقص ہے اس لیے کہ اس سے اشیاء کا اس کے اوپر یا اس کی مثل ہونا لازم آتا ہے جبکہ اس کے لیے علو کا ثبوت لازم ہے۔

دلالت فطرت بھی اللہ تعالیٰ کے علو یعنی تمام مخلوقات کے اوپر ہونے کی متقاضی ہے، کوئی بھی انسان جب اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو اس کا دل آسمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ نہ دائیں طرف پھرتا ہے اور نہ بائیں طرف اور یہ اس لیے کہ اللہ آسمان پر ہے۔

صفت معیت

□ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ سُبْحَانَهُ مَعَهُمْ أَيْنَمَا كَانُوْا ؛ يَعْلَمُ مَا هُمْ عَامِلُوْنَ .))

''وہ جہاں بھی ہوں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتا ہے، ان کے اعمال کا علم رکھتا ہے۔''

اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کی معیت مخلوق کے ساتھ ہے

شرح: ......ایمان باللہ کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت پر ایمان رکھا جائے۔

قبل ازیں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کی تین قسمیں ہیں: معیت عامہ، معیت خاصہ اور خاصۃ الخاصہ۔

معیت عامہ ہر شخص کو شامل ہے، وہ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (الحديد : ٤)

''تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

معیت خاصہ کی مثال یہ فرمان باری ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّ الَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ﴾ (النحل : ١٢٨)

''یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور محسنین کے ساتھ ہے۔''

اور خاصۃ الخاصہ (معیت اخص) کی مثال موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ (طٰهٰ : ٤٠)

''خوف نہیں کھانا، بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔''

نیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبة : ٤٠) ''یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ معیت حقیقی ہے اور یہ کہ معیت عامہ کا مقتضیٰ علم، سمع، بصر قدرت اور حکومت وغیرہا ہے، جبکہ معیت خاصہ کے مقتضیات میں سے نصرت و تائید ہے۔



❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((کَمَا جَمَعَ بَیْنَ ذٰلِکَ فِیْ قَوْلِہٖ: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (الحدید: ٤)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر جا ٹھہرا عرش پر وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں، اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔''

صفت علو اور معیت کے درمیان تطبیق

شرح: ...... [بَیْنَ ذٰلِکَ] ...... یعنی علو اور معیت کے درمیان۔ ارشاد باری: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ علو کی دلیل ہے۔ جبکہ فرمان ربانی: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ معیت کی دلیل ہے، اللہ رب تعالیٰ نے علو اور معیت کو ایک آیت میں جمع فرما دیا۔ ان میں کوئی منافات نہیں، علو، استواء علی العرش اور معیت میں تطبیق کی تین صورتیں ہیں۔

اولاً: اللہ رب تعالیٰ نے استواء علی العرش کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ جب خود اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لیے دو وصف اکٹھے کر دے تو ہمیں علم الیقین کی حد تک معلوم ہونا چاہیے، کہ وہ متناقض نہیں ہیں، اس لیے کہ اگر وہ متناقض ہوتیں تو ان کا اجتماع محال ہوتا، اس لیے کہ دو متناقض چیزیں نہ تو مجتمع ہو سکتی ہیں اور نہ مرتفع ان میں سے ایک کا وجود اور دوسری کا انتفاء ضروری ہوتا ہے، اگر آیت میں تناقض ہوتا تو اس سے یہ بات لازم آتی کہ اس کا پہلا حصہ اس کے آخری حصے کی یا دوسرا پہلے حصے کی تکذیب کرتا۔

ثانیاً: کبھی کبھی مخلوق میں بھی علو اور معیت اکٹھے ہو سکتے ہیں، جس طرح کہ مؤلف آگے چل کر لوگوں کے اس قول کا ذکر کریں گے: ہم چلتے رہے اور چاند ہمارے ساتھ رہا۔

ثالثاً: اگر مخلوق کی نسبت سے ان میں تعارض فرض کر بھی لیا جائے، تو یہ خالق کی نسبت سے لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلَيْسَ مَعْنٰى قَوْلِہٖ: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ اَنَّهُ مُخْتَلِطٌ بِالْخَلْقِ .))

''ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ اس کا مخلوق کے ساتھ اختلاط ہے۔''

شرح: ......اس لیے کہ اس معنی میں نقص ہے، ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ اگر اس کا یہ معنی ہوتا تو اس سے یا تو خالق کا تعدد لازم آتا یا اس کا تجزء (منقسم ہونا) علاوہ ازیں اس سے یہ بھی لازم آتا کہ اشیاء اس کے لیے محیط ہیں، حالانکہ اللہ سبحانہ و



تعالیٰ خود چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَإِنَّ هٰذَا لَا تُوْجِبُهُ اللُّغَةُ .)) ''اس لیے کہ لغت اس معنی کو واجب قرار نہیں دیتی۔''

شرح: ...... جب اسے لغت واجب قرار نہیں دیتی تو پھر یہ معنی متعین نہیں ہوتا، اس سے حلولیہ وغیرہم کے مذہب کا ابطال ہوتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ اختلاط کیے ہوئے ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا: ((لا تقتضیه اللغة)) کہ ''لغت اس کا تقاضا نہیں کرتی۔'' اس لیے کہ وہ کبھی بھی اس کا تقاضا کرتی بھی ہے، مثلاً اس طرح کہہ سکتے ہیں: مَاءٌ مَعَ لَبَنٍ مَخْلُوْطًا دودھ میں پانی ملا ہوا ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ خِلَافُ مَا اَجْمَعَ عَلَيْهِ سَلَفُ الْاُمَّةِ، وَخِلَافُ مَا فَطَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْخَلْقَ .))

''یہ امت کے سلف صالحین کے اجماع کے خلاف بھی ہے، اور مخلوق کی فطرت کے بھی۔''

شرح: ...... یہ اس لیے کہ یہ چیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ خالق مخلوق سے الگ ہے، جب بھی کوئی بندہ یا اللہ کہتا ہے تو اس کا اعتقاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے الگ ہے نہ کہ اس میں حلول کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ اختلاط کیے ہوئے ہے، نہ صرف یہ کہ شریعت کے خلاف ہے بلکہ عقل اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((بَلِ الْقَمَرُ آيَةٌ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ مِنْ اَصْغَرِ مَخْلُوْقَاتِهِ، وَهُوَ مَوْضُوْعٌ فِي السَّمَاءِ، وَهُوَ مَعَ الْمُسَافِرِ وَغَيْرِ الْمُسَافِرِ اَيْنَمَا كَانَ .))

''بلکہ چاند جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی اور اس کی چھوٹی سی مخلوق ہے، وہ آسمان پر بھی ہے اور ہر مسافر اور غیر مسافر کے ساتھ بھی وہ جہاں بھی ہو۔''

شرح: ......[بَلِ] ...... اضراب انتقالی کے لیے ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے یہ مثال معنی سمجھانے اور اس بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بیان کی ہے کہ ایک چیز انسان سے دور ہونے کے باوجود حقیقتاً اس کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے، چاند اللہ تعالیٰ کی چھوٹی سے مخلوق ہے جو آسمان پر بھی ہے اور مسافر وغیر مسافر ہر انسان کے ساتھ بھی وہ جس جگہ بھی ہو۔

جب ہم چاند جیسی چھوٹی سی مخلوق کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہے حالانکہ وہ آسمان پر ہے، اسے

نہ تو تناقض کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ اختلاط کا متقاضی ہوتا ہے، تو پھر آیات معیت کو ان کے ظاہر پر محمول کرنا صحیح کیوں نہیں ہے؟ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً ہمارے ساتھ ہے اگر چہ وہ آسمانوں پر ہر چیز کے اوپر ہے۔

جس طرح کہ ہم نے پہلے بھی کہا: اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ یہ مخلوق میں ممتنع ہے، تو خالق میں ممتنع نہیں ہے، رب کائنات آسمان میں بھی حقیقتاً ہے اور ہمارے ساتھ بھی حقیقتاً ہے اور اس میں کوئی تناقض نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر وہ علو میں دور ہے تو وہ اس علو کے باوجود قریب بھی ہے۔

معیت برحق اور حقیقتاً ہے، شیخ محمد بن ابراہیم کی تقریر

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اپنی کتابوں میں اسی معنی کی تائید وتوثیق کی ہے، آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس آیت کی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے ظاہری معنی میں ہے، ہمارا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں اپنے عرش پر ہے اور وہ حقیقتاً ہمارے ساتھ بھی ہے، جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ علو میں بھی ہے اور حقیقتاً آسمان دنیا پر بھی نزول فرماتا ہے، اہل سنت میں سے کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا، ان تمام کے نزدیک اللہ تعالیٰ حقیقتاً نزول فرماتا ہے اور وہ علو میں بھی ہے، اس لیے کہ خالق کی صفات مخلوق کی صفات جیسی نہیں ہیں۔

شیخ محمد بن ابراہیم بھی اسی معنی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معیت اپنی حقیقت پر مبنی ہے، اس سے اس کا اپنی مخلوق کے ساتھ اختلاط لازم نہیں آتا اور نہ اس کا زمین میں ہونا لازم آتا ہے، انہوں نے یہ بات بعض سلف کے اس قول کے جواب میں کہی کہ: ''اللہ تعالیٰ اپنے علم کی رو سے لوگوں کے ساتھ ہے۔''[1]

سوال: کیا یہ کہنا درست ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے؟

جواب: اس لفظ سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اس سے ایک ایسے غلط معنی کا تاثر پیدا ہوتا ہے جس کو حلول کے قائلین دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس لیے کہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس بھی چیز کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے وہی اس کی طرف منسوب ہوتی ہے، کیا ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ آتا ہے؟ اسی طرح آپ ﷺ کے ارشاد: ینزل ربنا الی السماء الدنیا .[2] کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ نزول فرماتا ہے؟ یقیناً ہمیں ایسا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ سُبْحَانَهُ فَوْقَ عَرْشِهِ ، رَقِيْبٌ عَلَى خَلْقِهِ ، مُهَيْمِنٌ عَلَيْمٌ ، مُطَّلِعٌ عَلَيْهِمْ .))

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے عرش پر ہے، اپنی مخلوق پر نگہبان ہے، ان پر حاکم ہے اور ان پر مطلع ہے۔''

شرح:......[وَهُوَ سُبْحَانَهُ فَوْقَ عَرْشِهِ]..... اگر چہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، مگر وہ مخلوق کے ساتھ بھی ہے۔

---

[1] فتاوی ورسائل الشیخ محمد بن ابراهیم آل الشیخ: ۱/ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ [2] صحیح بخاری: ۷٤۹٤۔ صحیح مسلم: ۷۵۷.

[رَقِيْبٌ عَلٰى خَلْقِهِ] ...... یعنی مخلوق کے اقوال وافعال اور حرکات وسکنات کا مراقب ونگہبان اور محافظ ہے۔

[مُهَيْمِنٌ عَلِيْمٌ] ...... یعنی اپنے بندوں پر حاکم ہے، اسی کا حکم چلتا ہے تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے: ہو جا! اور وہ ہو جاتی ہے۔

اس بات کی تاکید کہ وہ عرش پر ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَكُلُّ هٰذَا الْكَلَامِ الَّذِيْ ذَكَرَهُ اللّٰهُ مِنْ اَنَّهُ فَوْقَ الْعَرْشِ وَاَنَّهُ مَعَنَا ؛ حَقٌّ عَلٰى حَقِيْقَتِهِ ، لَا يَحْتَاجُ اِلٰى تَحْرِيْفٍ .))

''یہ سارا کلام جس میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے، تو یہ اپنی حقیقت پر ثابت ہے، اس میں تحریف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

شرح: ......یعنی ہمیں فوقیت کے معنی کو فوقیت قدر کے معنی کی طرف پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جس طرح کہ اہل تحریف وتعطیل کا دعویٰ ہے، بلکہ اس سے مراد ذات اور قدر دونوں کی فوقیت ہے، اسی طرح ہمیں معیت کے معنی کو اس کے ظاہر سے نکالنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے ظاہر پر ثابت ہے، جس نے معیت کی تفسیر اس کے حقیقی معنی سے ہٹ کر کی ہے وہ تحریف کا مرتکب ہوا ہے، لیکن اس کی جو تفسیر اس کے لازم اور مقتضی کے ساتھ وارد ہے تو بعض سلف سے مروی یہ تفسیر کسی ضرورت کے پیش نظر ہے، جو کہ حقیقت کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ حق کا لازم بھی حق ہی ہوا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ظنون سے پاک ہے

پہلی دلیل:

❑ پھر مؤلف رحمہ اللہ استدراک کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((ولكن يصان عن الظنون الكاذبة ، مِثْلَ اَنْ يُظَنَّ اَنَّ ظَاهِرَ قَوْلِهِ: ﴿فِي السَّمَآءِ﴾ (الملك: ١٧) اَنَّ السَّمَاءَ تُقِلُّهُ اَوْ تُظِلُّهُ ، وَهٰذَا بَاطِلٌ بِاِجْمَاعِ اَهْلِ الْعِلْمِ وَالْاِيْمَانِ .))

''مگر اسے ظنون کاذبہ سے بچانا چاہیے، مثلاً اس ظن سے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد (في السماء) کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ آسمان نے اسے اٹھا رکھا ہے یا وہ اس پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہ مفہوم علم وایمان والوں کے اجماع سے باطل ہے۔''

شرح: ......[الظنون الكاذبة] ...... ایسے اوہام جن کی کوئی صحیح اساس نہ ہو، ان اوہام باطلہ اور ظنون کاذبہ سے کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ کو بچانا از حد ضروری ہے۔

اس کی مثال یہ ظن ووہم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد (في السماء) کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ آسمان نے اسے اس طرح

اٹھا رکھا ہے جس طرح چھت اپنے اوپر موجود شخص کو اٹھاتی ہے یا اس نے اس پر سایہ کر رکھا ہے، یعنی آسمان اس طرح اللہ تعالیٰ کے اوپر ہے جس طرح انسان پر چھت ہوا کرتی ہے۔

جب کوئی انسان اس طرح کا گمان کرے تو یہ جھوٹا گمان ہے جس سے ان دلائل کو بچانا واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

سوال: مؤلف رحمہ اللہ کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا: ((ومثل ان یظن ان ظاهر قوله: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ (الحدید: ۱٤) انه مختلط بالخلق، لان هذا الظن كاذبا ايضا.))

جواب: مؤلف رحمہ اللہ یہ کچھ اپنے اس گزشتہ قول میں فرما چکے ہیں: "وليس معنى قوله: ﴿وهو معكم﴾ انه مختلط بالخلق"

دوسری بحث:

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾.....)) (البقرة: ٢٥٥)

"اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو گھیر رکھا ہے۔"

شرح: ......الكرسي. جس طرح کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کرسی دو قدموں کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔[1] [وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ] ..... یعنی اس کی کرسی نے سات آسمانوں اور سات زمینوں کو گھیر رکھا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر یہ گمان کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آسمان نے رب تعالیٰ پر سایہ کر رکھا ہے یا اس نے اسے اٹھا رکھا ہے؟ جب اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمینوں کو گھیر رکھا ہے تو پھر کسی کو بھی یہ ظن کاذب لاحق نہیں ہونا چاہیے کہ آسمان نے اسے اٹھا رکھا ہے یا وہ اس پر سایہ فگن ہے۔

تیسری بحث:

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ الَّذِيْ ﴿يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا﴾)) (فاطر: ٤١)

"اور وہ اللہ ہی ہے جو تھامے ہوئے ہے آسمانوں کو اور زمین کو کہ وہ ٹل نہ جائیں۔"

شرح: ......وہ انہیں تھامے ہوئے ہے کہ کہیں وہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں، اگر اللہ نے انہیں تھام نہ رکھا ہوتا تو ان

[1] اسے عبداللہ بن امام احمد نے کتاب السنة: ٥٨٦ اور ابن ابی شیبہ نے کتاب العرش: ٦١ ابن خزیمہ نے التوحید: ٢٤٧ اور حاکم نے المستدرك: ٢١٢٨٢ میں روایت کیا۔



میں اضطراب پیدا ہو جاتا اور وہ اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہو جاتے، یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس نے اپنی انہی قدرت اور طاقت سے انہیں اپنی جگہ چھوڑنے سے روک رکھا ہے، بلکہ اس نے تو یہاں تک فرما دیا:

﴿وَ لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ﴾ (فاطر: ٤١)

''اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد انہیں کوئی بھی تھام نہیں سکے گا۔''

اگر کوئی ستارہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو کسی میں اسے روکنے کی طاقت نہیں ہے، پھر اگر ساتوں آسمان اور زمین اپنی اپنی جگہ سے سرک جائیں تو انہیں کون تھام سکے گا؟ انہیں وہ اللہ ہی تھامے ہوئے ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے، جو ہر شے کو کلمہ (کن) سے معرض وجود میں لا سکتا ہے، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

چوتھی بحث:

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (الحج: ٦٥)

''اور وہ تھامے ہوئے ہے آسمان کو یہ کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر زمین پر گر نہ پڑے۔''

شرح: ......آسمان زمین کے اوپر ہے، واللہ العظیم، اگر اللہ نے اسے تھام نہ رکھا ہو تو وہ زمین پر گر پڑے، اس لیے کہ وہ بھاری بھرکم وجود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ (الانبیاء: ٣٢) ''اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔''

اور دوسری جگہ آتا ہے:

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ٥﴾ (الذاریات: ٤٧)

''اور آسمان کو ہم نے اپنی قوت سے بنایا اور یقیناً ہم ضرور وسعت دینے والے ہیں۔''

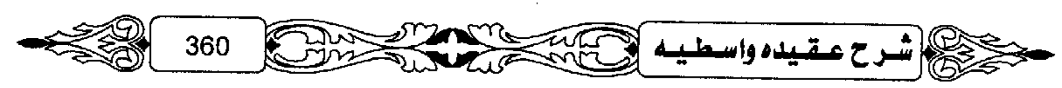
اگر اللہ اسے نہ تھامے تو یقیناً وہ زمین پر گر جائے اور اگر ایسا ہو تو وہ سب کچھ برباد کر کے رکھ دے۔

وہ عظیم ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو سرکنے سے روک رکھا ہے اور اپنی اجازت کے بغیر آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے، کیا اس کے بارے میں کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ آسمان اسے اٹھائے ہوئے ہے یا اس پر سایہ کیے ہوئے ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، اس کا کوئی بھی تصور نہیں کر سکتا۔

پانچویں بحث:

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ﴾ (الروم: ٢٥)

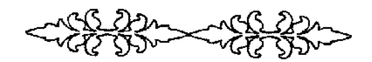


''اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔''

شرح: ......[وَ مِنْ اٰیٰتِہٖٓ] .... یعنی وہ علامات جو ہر اعتبار سے اس کے کمال پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ﴿اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ﴾ آسمان اور زمین اس کے کونی اور شرعی امر سے قائم ہیں، اس لیے کہ اس کا امر حکمت ورحمت اور عدل واحسان پر مبنی ہوتا ہے۔

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾ (المومنون : ۷۱) ''اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو ضرور سب آسمان اور زمین تباہ ہو جاتے، اور جو لوگ (وغیرہ) ان میں ہیں۔'' خواہشات آسمانوں اور زمین کی تباہی کا سبب ہیں اور وہ شرعی اوامر کی مخالفت پر کمر بستہ رہتی ہیں۔

زمین اور سب آسمان اللہ تعالیٰ کے امر کونی وشرعی سے قائم ہیں، اگر حق لوگوں کی خواہشات کا اتباع کرے تو آسمان، زمین اور ان میں موجود سب لوگ وغیرہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں، اسی لیے علماء قرآنی آیت: ﴿وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ (الاعراف : ۵۶) ''اور زمین میں اس کی درستگی کے بعد فساد نہیں کرو۔'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''زمین میں معاصی کے ساتھ فساد برپا نہیں کرو۔''





فصل:

اللہ تعالیٰ کے قرب واجابت کے بارے میں اور یہ کہ یہ چیز اس کے علو اور فوقیت کے منافی نہیں

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَدْ دَخَلَ فِيْ ذٰلِكَ الْاِيْمَانُ بِاَنَّهُ قَرِيْبٌ مِّنْ خَلْقِهِ مُجِيْبٌ .))

''اس میں اس بات پر ایمان لانا بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے قریب ہے، قبول کرنے والا ہے۔''

شرح:......[وَقَدْ دَخَلَ فِيْ ذٰلِكَ]......یعنی جس چیز کے ساتھ اس نے اپنے آپ کا وصف بیان کیا ہے اس میں۔

[اَلْاِيْمَانُ بِاَنَّهُ قَرِيْبٌ مِّنْ خَلْقِهِ مُجِيْبٌ.]...... اس بات پر ایمان لانا بھی داخل ہے کہ وہ فی نفسہ قریب ہے، اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے قریب ہونے پر دلائل

اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: ١٨٦)

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو بیشک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں وہ جب بھی مجھے پکارے۔''

اس آیہ کریمہ میں چھ ضمیریں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہیں اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل قرب تو اللہ عزوجل کا قرب ہے۔ مگر ہم قریب، کے بارے میں وہی کچھ کہیں گے جو ''معیت'' کے بارے میں کہہ آئے ہیں، کہ اس سے اس کا انسان کی جگہ میں ہونا لازم نہیں آتا۔

اگر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کہ ''وہ تم میں سے کسی ایک کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔''[1] سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ زمین میں اس کے اور اس کی سواری کی گردن کے درمیان ہے۔

اگر رسول علیہ الصلاۃ والسلام کے ارشاد گرامی:......''یقیناً اللہ تعالیٰ نمازی کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے۔''[2] سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر بندہ دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہو اللہ بندے اور دیوار کے درمیان ہے، اور اگر وہ زمین کی طرف دیکھ رہا ہو، تو وہ بندے اور زمین کے درمیان ہے، تو اسی طرح اس کے قریب ہونے سے اس کا زمین میں ہونا لازم نہیں آتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے، اور اس نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ [2] صحیح بخاری (٤٠٦)، صحیح مسلم (٥٤٧)



اللہ تعالیٰ کے قرب کی اقسام

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بعض علماء نے معیت کی طرح اللہ تعالیٰ کے قرب کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ:

جس قرب کا مقتضیٰ احاطہ ہے، وہ قرب عام ہے۔

اور جس کا مقتضیٰ اجابت واثابت ہے، وہ قرب خاص ہے۔

جب کہ بعض علماء کے نزدیک قرب صرف خاص ہوتا ہے، جو کہ پکارنے والے کی پکار کو قبول کرنے اور عبادت گزار کو اس کی عبادت کا ثواب دینے کا متقاضی ہوتا ہے، اور یہ غیر منقسم ہے: یہ لوگ اس قرآنی آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرہ: ۱۸۶)

نیز نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بھی: ''بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب کے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے۔'' ❶ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کافر و فاجر شخص کے قریب ہونا ممکن نہیں ہے۔

یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد ابن قیم رحمہ اللہ کا پسندیدہ مذہب ہے۔

مگر اس قول کے خلاف اس ارشاد ربانی کو پیش کیا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (ق: ۱۶)

''یقیناً ہم نے انسان کو پیدا فرمایا، اور ہم اس کے دل میں گزرنے والے خیالات کو جانتے ہیں، اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

اس جگہ انسان سے مراد ہر انسان ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لَقَدْ كُنْتَ فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَىَّ عَتِيْدٌ ۝ اَلْقِيَا فِىْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝﴾ (ق: ۲۲-۲۴)

''یقیناً تو اس دن سے غفلت میں پڑا تھا، پس ہم نے تجھ سے تیری آنکھ کا پردہ اٹھا دیا، پس تیری نظر آج بڑی تیز ہے، اور اس کے ساتھ والا (فرشتہ) کہے گا یہ ہے وہ اعمال نامہ جو میرے پاس تیار ہے۔ (پھر دونوں فرشتوں کو حکم ہوگا) ہر ناشکرے سرکش کو جہنم میں ڈال دو۔''

نیز اس ارشاد ربانی کو بھی:

﴿فَلَوْلَا اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (الواقعہ: ۸۳-۸۵)

---

❶ صحیح مسلم (۴۸۲) عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ .



''بھلا کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک آ پہنچتی ہے، اور تم اس وقت دیکھ بھی رہے ہوتے ہو، اور ہم اس شخص کے تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے ہو۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جن کی روحیں حلق تک آ پہنچتی ہیں جس میں کافر بھی شامل ہے۔

مگر اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (ق: ١٦) میں ہم سے مراد ہمارے فرشتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے: ﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ (ق: ١٧) اس لیے کہ ﴿اِذْ﴾ ظرف ﴿اَقْرَبُ﴾ سے متعلق ہے۔ یعنی ہم اس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں جب دو اخذ کرنے والے اخذ کرتے ہیں...... '' اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب سے مراد اس کے فرشتوں کا قرب ہے۔

اسی طرح قریب الموت شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ﴾ میں بھی قرب سے مراد فرشتوں کا قرب ہے، اسی لیے فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنْ لَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الواقعہ: ٨٥) ''مگر تم نہیں دیکھتے۔'' اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قریب ہمارے پاس موجود ہوتا ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، اس قریب سے اللہ ہرگز ہرگز مراد نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اللہ تو آسمان میں ہے۔

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

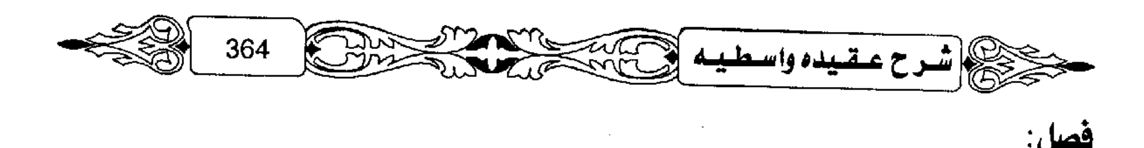
((كَمَا جَمَعَ بَيْنَ ذٰلِكَ فِيْ قَوْلِهِ: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: ١٨٦) وقوله ﷺ: ((اِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَهُ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ .))

شرح: ......جس طرح کہ اسے ارشاد باری: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: ١٨٦) اور ((اِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَهُ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ .)) میں جمع کر دیا گیا ہے۔ کما جمع بین ذلك . مشار الیہ قرب و اجابت ہیں۔

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَمَا ذُكِرَ فِي الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ مِنْ قُرْبِهِ وَمَعِيَّتِهِ لَا يُنَافِيْ مَا ذُكِرَ مِنْ عُلُوِّهِ وَفَوْقِيَّتِهِ ؛ فَإِنَّهُ سُبْحَانَهُ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ فِيْ جَمِيْعِ نُعُوْتِهِ ، وَهُوَ عَلِيٌّ فِيْ دُنُوِّهِ ، قَرِيْبٌ فِيْ عُلُوِّهِ .))

''کتاب و سنت میں اللہ تعالیٰ کے جس قرب اور معیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس کے علو اور فوقیت کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنے قرب کے باوجود تمام مخلوقات سے بلند اور علو کے باوجود قریب ہے۔''



فصل:

قرآن کے حقیقتاً کلام اللہ ہونے پر ایمان لانا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَصْلٌ: وَمِنَ الْاِیْمَانِ بِاللّٰهِ وَکُتُبِهٖ: اَلْاِیْمَانُ بِاَنَّ الْقُرْآنَ کَلَامُ اللّٰهِ، مُنَزَّلٌ، غَیْرُ مَخْلُوْقٍ مِنْهُ بَدَاَ، وَاِلَیْهِ یَعُوْدُ.))

''اللہ تعالیٰ اور اس کی کتابوں پر ایمان لانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے، منزل من اللہ ہے، غیر مخلوق ہے، اسی سے اس کا آغاز ہوا، اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔''

شرح:...... [اَلْاِیْمَانُ بِاَنَّ الْقُرْآنَ کَلَامُ اللّٰهِ] ...... اس طرح قرآنِ مجید پر ایمان لانے کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے، اور اللہ کا کلام اس کی ایک صفت ہے، نیز اس لیے بھی کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ اس کا کلام ہے، اور یہ کہ وہ منزل ہے۔ لہٰذا اس کی تصدیق کرنا اللہ پر ایمان لانے میں شامل ہے۔''

''**کلام اللہ**'' اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ٦)

''اگر مشرکوں میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دیں یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔''

''منزل'' یعنی قرآن منزل من اللہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر: ٩)

''یقیناً ہم نے ہی ذکر (قرآن) اتارا، اور بیشک ہم ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر: ١) ''بیشک ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل فرمایا۔''

[غَیْرُ مَخْلُوْقٍ] ...... یعنی قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (الاعراف: ٥٤) ''خبردار رہو کہ کل مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔''

قرآنِ مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کا امر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوریٰ: ٥٢)

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنا امر وحی کیا ہے۔''

نیز اس لیے بھی کہ کلام متکلم کی صفت ہوتی ہے، اور مخلوق خالق کا مفعول اور اس سے الگ، جس طرح کے مصنوع صانع سے الگ ہوتا ہے۔

[مِنْهُ بَدَاَ] ..... یعنی اس کے اتارنے کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی، نہ جبرئیل سے ہوئی اور نہ کسی اور سے۔ جبرئیل امین علیہ السلام اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے لے کر اترے، جب کہ ارشاد ہوا:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (الشعراء: ۱۹۲، ۱۹۳)

''یقیناً اس قرآن کا نزول ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ اسے جبرئیل امین لے کر اترے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ (الزمر: ۱)

''اس کتاب کی تنزیل اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے۔''

[وَ اِلَيْهِ يَعُوْدُ] ..... کلام اللہ کے بارے بحث کرتے وقت اس کے مفہوم و معنی اور اس کی دلیل کے بارے گفتگو ہو چکی ہے۔

قول مسألة اللفظ کی تفصیل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَنَّ اللّٰهَ تَكَلَّمَ بِهِ حَقِيْقَةً .)) ''بیشک اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ حقیقتاً کلام کیا۔''

یہ بات اس اصول پر مبنی ہے کہ تمام صفات باری تعالیٰ حقیقی ہیں، جب کلام اللہ حقیقت ہے، تو پھر اس کا مخلوق ہونا غیر ممکن اور غیر حقیقی ہے، اس لیے کہ وہ اس کی صفت ہے۔ خالق کی صفت غیر مخلوق ہے، جس طرح کہ مخلوق کی صفت بھی مخلوق ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس نے یہ کہا کہ قرآن کے ساتھ میرا لفظ مخلوق ہے تو وہ جہمی ہے اور جس نے یہ کہا کہ وہ مخلوق ہے، تو یہ شخص بدعتی ہے۔'' [1]

ہم کہتے ہیں کہ لفظ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: مصدر پر، جو کہ فاعل کا فعل ہوتا ہے، اور ملفوظ بہ پر۔ پہلے معنی کی رو سے جو کہ مصدر سے عبارت ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اور غیر قرآن کے ساتھ ہمارے الفاظ مخلوق ہیں۔

اس لیے کہ جب ہم یہ کہیں گے کہ لفظ سے مراد تلفظ ہے، تو منہ، زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے خارج ہونے والی یہ آواز مخلوق ہے۔

[1] اسے عبداللہ بن امام احمد نے کتاب السنة: ۱/۱٦٥ اور خلال نے بھی کتاب "السنہ" میں روایت کیا۔ ملاحظہ ہو: "درء تعارض العقل والنقل" از ابن تیمیۃ (۱/۲٦۱) .

جس لفظ سے مراد تلفظ ہوگا تو وہ مخلوق ہوگا، ملفوظ بہ قرآن ہو، حدیث ہو یا کوئی ایسا کلام جسے آپ نے اپنی طرف سے پیدا کیا۔

مگر جب لفظ سے مقصود ملفوظ بہ ہوگا، تو اس صورت میں بعض کلام مخلوق ہوتا ہے اور بعض غیر مخلوق۔

اس بنا پر اگر ملفوظ بہ قرآن ہو تو وہ مخلوق نہیں ہے۔

یہ ہے اس مسئلہ کی تفصیل۔

جہاں تک امام احمد رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا قول کا تعلق ہے، تو اس کے دو احتمال ہیں:

یا تو اس لیے کہ یہ قول جہمیہ کا شعار ہے، گویا کہ آپ رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب آپ کسی شخص کو یہ کہتے سنیں کہ قرآن کے ساتھ میرا لفظ مخلوق ہے، تو آپ جان لیں کہ یہ شخص جہمی ہے۔

یا ان کا یہ قول اس صورت میں ہے جب لفظ سے قائل کی مراد ملفوظ بہ بھی ہو، اور یہ زیادہ مناسب لگتا ہے اس لیے کہ خود امام احمد رحمہ اللہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جو شخص یہ کہے کہ قرآن کے ساتھ میرا لفظ مخلوق ہے اور اس سے مراد قرآن لے تو وہ جہمی ہے۔'' وہ صرف یہ کہتے تھے کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔

محمد ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن حقیقی کلام اللہ ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ الَّذِیْ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ هُوَ كَلَامُ اللّٰهِ حَقِیْقَةً ، لَا كَلَامَ غَیْرِهِ.))

''یقیناً یہ قرآن جو محمد ﷺ پر اتارا گیا، وہ حقیقتاً اللہ کا کلام ہے نہ کہ کسی غیر کی......''

شرح: ......اس بات کو دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ خلق قرآن کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے جس کی وجہ سے مسلمان علماء کو بڑے آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، بہت سے علماء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بیشمار کی پیٹھوں پر کوڑے برسائے گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور ان جیسے دوسرے علماء حق کی وجہ سے حق کو محفوظ رکھا، جن کے منہ سے ایک ہی بات نکلتی تھی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، یہ غیر مخلوق ہے۔

[لَا كَلَامَ غَیْرِهِ.] ...... یہ بات ان لوگوں کے خلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن جبرئیل امین علیہ السلام کا کلام ہے جس کے دل میں اللہ نے اس کا القاء کیا، یا یہ محمد ﷺ کا کلام ہے، یا اس طرح کی دیگر باتیں۔

سوال: مؤلف کا یہ قول ''لا کلام غیرہ'' اللہ تعالیٰ کے اس قول کے معارض ہے:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ﴾ (الحاقة: ٤٠۔٤١)

''یقیناً وہ قرآن پیغام ہے بڑے باعزت پیغام پہنچانے والے کا اور وہ شاعر کا کلام نہیں ہے تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔''

نیز اس ارشاد باری تعالیٰ کے بھی:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ٥ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ (التکویر: ١٩۔٢٠)

''یقیناً یہ قرآن پیغام ہے فرشتے عالی مرتبت کا، جو صاحب قوت عرش والے کے پاس اونچے درجے والا ہے۔''

پہلے رسول سے مراد محمد ﷺ ہیں، اور دوسرے سے جبرئیل امین۔

جواب: دونوں آیتوں کو اس بات پر محمول کرنا ممکن نہیں ہے کہ ان دونوں رسولوں نے قرآن کے ساتھ حقیقتاً کلام کیا۔ اور اس کا دونوں سے صدور ہوا، اس لیے کہ دو کلام کرنے والوں سے ایک کلام کا صدور ممکن نہیں ہوتا۔

قرآن اللہ کے کلام کی تفسیر و حکایت ہیں

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلَا يَجُوْزُ اِطْلَاقُ الْقَوْلِ بِاَنَّهٗ حِكَايَةٌ عَنْ كَلَامِ اللّٰهِ اَوْ عِبَارَةٌ .))

''یہ کہنا درست نہیں کہ یہ اللہ کے کلام کی حکایت یا تعبیر ہے۔''

شرح: ...... [وَلَا يَجُوْزُ اِطْلَاقُ الْقَوْلِ] ..... یعنی علی الاطلاق یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ قرآن کلام اللہ سے عبارت ہے، اور نہ ہی یہ کہنا جائز ہے کہ قرآن علی سبیل الاطلاق کلام اللہ کی حکایت ہے۔

کلابیہ قرآن مجید کو کلام اللہ کی حکایت کہتے ہیں، جبکہ اشعریہ کے نزدیک قرآن کلام اللہ سے عبارت ہے۔ ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مصحف میں موجود یہ قرآن کلام اللہ نہیں ہے، بلکہ یہ کلام اللہ کی حکایت ہے یا اس سے عبارت ہے اور دونوں میں فرق یہ ہے:

حکایت کا مطلب ہے کہ گویا یہ معنی جو ان کے نزدیک کلام ہے اسے صدائے بازگشت کی طرح آئینہ کے ساتھ نقل کیا گیا۔

عبارت کا معنی یہ ہے کہ متکلم نے اپنے کلام نفسی کو تخلیق کردہ حروف اور اصوات کے ساتھ تعبیر کیا۔

قرآنِ مجید کو مطلقاً حکایت یا عبارت کہنا جائز نہیں ہے، مگر تفصیل کے وقت کہا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید کو اس وقت پڑھنے والا کلام اللہ کی تعبیر کر رہا ہے یا اس کی حکایت، اس لیے کہ اس کی طرف سے قرآن کا تلفظ کلام اللہ نہیں ہے۔

اسی قید کے ساتھ قرآنِ مجید کو کلام اللہ کی حکایت یا اس کی تعبیر کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اس طرح علی سبیل الاطلاق کہنا جائز نہیں ہے۔ گویا مؤلف رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر بڑی باریک بینی سے کام لیا: ''لا یجوز اطلاق القول'' کیونکہ اس کے لیے تقیید و تعیین ضروری ہے۔

قرآن کو لکھنا اور یاد کرنا وغیرہ اسے کلام اللہ سے خارج نہیں کرتا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((بَلْ اِذَا قَرَاَهُ النَّاسُ اَوْ كَتَبُوْهُ فِي الْمَصَاحِفِ ؛ لَمْ يَخْرُجْ بِذٰلِكَ عَنْ اَنْ يَكُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ

تَعَالٰی حَقِیْقَةً ؛ فَإِنَّ الْکَلَامَ اِنَّمَا یُضَافُ حَقِیْقَةً اِلٰی مَنْ قَالَهُ مُبْتَدِئًا لا اِلٰی مَنْ قَالَهُ مُبَلِّغًا مُؤَدِّیًا .))

''لوگ قرآنِ مجید کو مصاحف میں لکھیں یا اس کی تلاوت کریں، وہ ''کلام اللہ'' ہونے سے خارج نہیں ہوجاتا، اس لیے کہ کلام حقیقتاً اس کی طرف منسوب ہوتا ہے جس نے اس کے ساتھ ابتدا میں تکلم کیا ہے، وہ اس کی طرف منسوب نہیں ہوتی جس نے اسے آگے پہنچانے کے لیے ایسا کیا ہو۔''

شرح: ......یعنی لوگ قرآنِ مجید کو اپنے سینوں میں محفوظ کریں، اس کی تلاوت کریں یا اسے مصاحف میں لکھیں، وہ اپنے کلام اللہ ہونے سے خارج نہیں ہوتا۔ پھر مؤلف اس کی علت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

((فان الکلام انما یضاف حقیقة إلی من قاله مبتدأ .))

یہ بڑی واضح دلیل ہے، حقیقتاً کلام کی اضافت اس کی طرف ہوتی ہے جو اسے ابتداءً کہے، اگر اسے اس کی طرف مضاف کیا جائے گا جو اسے آگے پہنچانا چاہتا ہو تو یہ علی سبیل التوسع ہوگا، نہ کہ علی سبیل الحقیقت۔

مثلاً اگر آپ اس وقت یہ شعر پڑھیں:

حُکْمُ الْمَحَبَّةِ ثَابِتُ الْاَرْکَان   مَا لِلصُّدُودِ بِفَسْخِ ذَاكَ یَدَان

تو یہ شعر حقیقتاً ابن قیم کی طرف منسوب ہوگا۔ ❶

اسی طرح اگر آپ یہ شعر پڑھیں گے:

کَلَامُنَا لَفْظٌ مُفِیْدٌ کَاسْتَقِمْ   وَاسْمٌ وَفِعْلٌ ثُمَّ حَرْفٌ الْکَلِمْ

تو یہ حقیقتاً ابن مالک کی طرف منسوب ہوگا۔ ❷

الغرض! کلام کو حقیقتاً پہلے قائل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

قرآن اس کا کلام ہے جس نے اوّلاً اس کے ساتھ تکلم کیا، اور وہ ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ، وہ دوسروں تک پہنچانے والے کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کے حروف ومعانی اللہ کی جانب سے ہیں

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ کَلَامُ اللّٰهِ ، حُرُوْفُهُ وَمَعَانِیْهِ .))

''قرآن کلام اللہ ہے، اس کے حروف بھی اور اس کے معانی بھی۔''

شرح: ......یہ اہل سنت کا مذہب ہے، ان کے نزدیک اللہ نے قرآنِ مجید کے حروف اور معانی سمیت اس کا تکلم فرمایا۔

---

❶ شرح قصیدہ الامام ابن القیم از ابن عیسیٰ (۱۱۳۷)۔

❷ ملاحظہ ہو: شرح ابن عقیل علی الالفیہ (۱/۱۳)۔



❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلَيْسَ كَلَامُ اللّٰهِ الْحُرُوْفَ دُوْنَ الْمَعَانِي .))

''معانی سے ہٹ کر محض حروف کلام اللہ نہیں ہیں۔''

شرح: ......معتزلہ اور جہمیہ کا مذہب یہ ہے کہ کلام کوئی ایسا معنی نہیں ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہو بلکہ وہ اس کی مخلوق ہے، جیسے کہ زمین، آسمان، اونٹنی، گھر اور اس طرح کی دیگر چیزیں، یہ کوئی ایسا معنی نہیں ہے جو فی نفسہ قائم ہو، کلام اللہ حروف سے عبارت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور اس کا نام کلام رکھ دیا جس طرح اس نے اونٹنی کو پیدا فرمایا اور اسے اللہ کی اونٹنی کا نام دے دیا۔ گھر پیدا کیا اور اسے اللہ کے گھر سے موسوم کر دیا۔

اسی لیے جہمیہ اور معتزلہ کے نزدیک کلام حروف اور اصوات سے عبارت ہے جنھیں اللہ نے پیدا فرمایا اور انھیں ازراہ تشریف و تعظیم اپنی طرف منسوب کر دیا۔

کلام اللہ حروف و معانی دونوں کا نام ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلَا الْمَعَانِيْ دُوْنَ الْحُرُوْفِ .))

''اور نہ ہی کلام اللہ حروف سے ہٹ کر معانی کا نام ہے۔''

شرح: ...... یہ کلابیہ اور اشعریہ کا مذہب ہے، ان کے نزدیک کلام اللہ فی نفسہ معنی ہے، پھر اللہ نے اصوات وحروف کو پیدا فرمایا جو عبارتاً یا حکایتاً اس معنی پر دلالت کرتے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا انکار کریں گے تو شریعت اور تقدیر کو باطل قرار دیں گے۔ شریعت کو تو اس لیے کہ تمام رسالتیں وحی کی وساطت سے آئیں، اور وحی مرسل الیہ تک پہنچایا گیا کلام ہے، کلام کے انکار سے وحی کا انکار لازم آئے گا، اور انتفاء وحی کا نتیجہ انتفاء شرع کی صورت میں سامنے آئے گا۔

جہاں تک تقدیر کا تعلق ہے تو اس کا ابطال اس طرح ہوگا کہ تخلیق اس کے حکم سے ہوتی ہے، وہ کن فرماتا ہے اور چیز معرض وجود میں آجاتی ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (یٰس: ۸۲)

''اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے: ہو جا! اور وہ ہو جاتی ہے۔''



فصل:

روزِ قیامت اہل ایمان کا
اللہ تعالیٰ کے دیدار کا بیان اور مقامات دیدار

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَدْ دَخَلَ اَیْضًا فِیْمَا ذَکَرْنَاہُ مِنَ الْاِیْمَانِ بِهِ وَبِکُتُبِهِ وَبِمَلَائِکَتِهِ وَبِرُسُلِهِ: الْاِیْمَانُ بِاَنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ یَرَوْنَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ.))

''اللہ تعالیٰ، اس کی کتابوں، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے میں اس بات پر ایمان لانا بھی داخل ہے کہ قیامت کے دن اہل ایمان اپنے رب کی زیارت سے مشرف ہوں گے۔''

شرح:......[اَلْاِیْمَانُ بِاَنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ یَرَوْنَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ.] ..... قیامت کے دن اہل ایمان کے دیدار الٰہی پر ایمان کے اللہ تعالیٰ پر ایمان میں داخل ہونے کی وجہ صاف ظاہر ہے، اس لیے کہ اس کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، جب ہم اس پر ایمان لائیں گے تو یہ اللہ پر ایمان لانے میں داخل ہوگا۔

اس کے کتب سماویہ پر ایمان لانے میں داخل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں نے ہی اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی خبر دی ہے۔ لہٰذا اس کی تصدیق آسمانی کتابوں کی تصدیق کے مترادف ہوگی۔ اس کے ملائکہ پر ایمان لانے میں داخل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وحی انہی کی وساطت سے آتی ہے، اللہ تعالیٰ سے وحی لے کر جبرئیل امین ہی اترتے رہے ہیں۔ اس طرح گویا کہ رؤیت باری تعالیٰ پر ایمان لانا، فرشتوں پر ایمان لانے کے زمرے میں آتا ہے۔

رب تعالیٰ کا دیدار بنا کسی تکلیف و رکاوٹ کے ہوگا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((عَیَانًا بِاَبْصَارِهِمْ کَمَا یَرَوْنَ الشَّمْسَ صَحْوًا لَیْسَ دُوْنَهَا سَحَابٌ وَکَمَا یَرَوْنَ الْقَمَرَ لَیْلَةَ الْبَدْرِ، لَا یُضَامُوْنَ فِیْ رُؤْیَتِهِ.))

''وہ اسے کھلے بندوں اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھیں گے جس طرح سورج کو دیکھتے ہیں جب اس کے سامنے بادل نہ ہو، اور جس طرح وہ چودھویں کی رات چاند کو دیکھتے ہیں جس کے دیکھنے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

شرح:......[عَیَانًا بِاَبْصَارِهِمْ] ..... (عیاناً) معاینہ کے معنی میں ہے جو کہ آنکھوں کے ساتھ دیکھنے سے عبارت ہے۔

[كَمَا يَرَوْنَ الشَّمْسَ صَحْوًا لَيْسَ دُوْنَهَا سَحَابٌ]..... اس کی دلیل آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''تم اللہ تعالیٰ کو اس طرح دیکھو گے جس طرح صاف سورج کو دیکھتے ہو جس کے سامنے بادل نہ ہو۔'' [1]

رؤیت سے مراد، رؤیت بالعین ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس رؤیت کو اس سورج کی رؤیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کے سامنے بادل نہ ہو۔

اہل ایمان کا قیامت کے میدان میں زیارت کرنا

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((يَرَوْنَهُ سُبْحَانَهُ وَهُمْ فِيْ عَرَصَاتِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَرَوْنَهُ بَعْدَ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ كَمَا يَشَاءُ اللّٰهُ تَعَالٰى .))

''اہل ایمان پہلے قیامت کے وسیع وعریض میدانوں میں رب تعالیٰ کی زیارت کریں گے اور پھر دخول جنت کے بعد اس سے مشرف ہوں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ چاہے گا۔''

شرح:......[عَرَصَاتِ] ..... عرصۃ کی جمع ہے، اور عرصہ ایسی وسیع وعریض جگہ کو کہتے ہیں جس میں کوئی عمارت نہ ہو، اور یہ اس لیے کہ قیامت کے دن زمین کو کھال کی طرح پھیلا دیا جائے گا۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ [2]

اہل ایمان قیامت کے دن کے میدانوں میں جنت میں داخل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے، جس طرح کہ اس نے اس دن کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (المطففين: ١٥)

''ہرگز نہیں اس دن یہ لوگ اپنے ربّ سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔''

یعنی وہ قیامت کے دن اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے۔

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (المطففين: ٦)

''جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

اسی طرح وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی دیدار الٰہی سے نوازے جائیں گے۔

قیامت کے میدانوں میں تین قسم کے لوگ ہوں گے:

ا۔ ظاہر وباطن کے اعتبار سے خالص مومن۔

[1] اسے صحیح بخاری (٧٤٣٩)، اور صحیح مسلم (١٨٣) نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] حاکم (٤/٥٧٥) عبداللہ بن عمرو سے موقوفاً روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''قیامت کے دن زمین کو چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا، اور مخلوقات کو اکٹھا کر دیا جائے گا'' اور جابر کی حدیث سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں (۴/۵۷۰) کہ ''زمین کو چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا۔ پھر انسان کو اس سے صرف دو قدموں کی جگہ ملے گی۔'' حافظ ابن حجرؒ فتح الباری (۱۱/۳۷۶) میں فرماتے ہیں: اس کے راوی ثقہ ہیں۔ شیخ البانی نے ''الصحیحہ'' (٤/٦٠٧) میں موقوف کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔



۲۔ ظاہر وباطن کے اعتبار سے خالص کافر۔

۳۔ ظاہر کے اعتبار سے مومن اور باطن کے اعتبار سے کافر یعنی منافقین۔

اہل ایمان عرصات قیامت میں بھی اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوں گے اور دخول جنت کے بعد بھی۔ جبکہ کفار رب تعالیٰ کو مطلقاً نہیں دیکھ سکیں گے۔ ایک قول کی رو سے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے مگر یہ دیکھنا قہر وغضب اور عقوبت کا دیکھنا ہوگا۔ مگر آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کفار اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکیں گے:

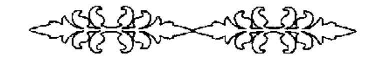
﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُوْنَ﴾ (المطففين: ١٥)

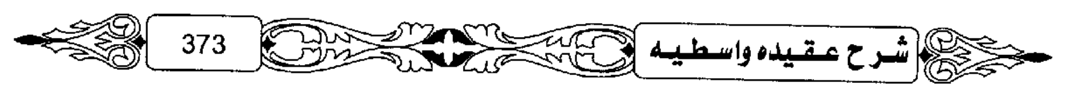
''ہرگز نہیں اس دن یہ لوگ اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔''

رہے منافقین، تو وہ عرصات قیامت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، مگر اس کے بعد اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔

[كَمَا يَشَاءُ] ..... یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت اس طرح کریں گے جس طرح اللہ چاہے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ رؤیت کی کیفیت سے ہم آگاہ نہیں ہیں، کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ اپنے رب کو کس طرح دیکھے گا۔ رؤیت کا معنی ہمارے علم میں ہے، مگر اس رؤیت کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

رؤیت باری تعالیٰ کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔





فصل:

قیامت کے دن پر ایمان لانے کے بارے میں

□ مؤلف رحمہ اللہ روز قیامت اور اس کے بارے میں اہل السنہ والجماعہ کے عقیدے پر گفتگو کرنے کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((وَمِنَ الْإِيْمَانِ بِالْيَوْمِ الْآخِرِ: الْإِيْمَانُ بِكُلِّ مَا أَخْبَرَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ مِمَّا يَكُوْنُ بَعْدَ الْمَوْتِ.))

''قیامت کے دن پر ایمان لانے میں ہر اس چیز پر ایمان لانا بھی داخل ہے۔ جس کے بعد از مرگ وقوع پذیر ہونے کی نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے۔''

شرح: ......روز قیامت پر ایمان لانے کا حکم فریضہ واجبہ ہے، اور دین میں اس کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ ایمان کے چھ ارکان میں سے ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اکثر مقامات پر اپنے اور روز قیامت پر ایمان کو ایک ساتھ بیان فرمایا ہے، اس لیے کہ جو شخص روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا ممکن نہیں ہے۔ جس شخص کا قیامت کے دن پر ایمان نہیں ہوگا وہ کبھی عمل نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ انسان قیامت کے دن عزت وکرامت کی امید اور عذاب وسزا کے خوف کی وجہ سے عمل کرتا ہے۔ اگر اس کا اس دن پر ایمان نہیں ہوگا تو وہ ان لوگوں جیسا ہوگا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثية: ٢٤)

''اور انہوں نے کہا نہیں ہے، مگر صرف ہماری دنیا کی زندگی ہم یہیں پر مرتے اور جیتے ہیں، اور نہیں ہلاک کرتا ہم کو مگر صرف زمانہ ہی۔''

انسان کے لیے پانچ مراحل اور ان پر دلائل

یوم آخرت کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس دن کے بعد کوئی دن نہیں ہوگا۔ وہ آخری مرحلہ ہے۔

انسان کے کل پانچ مراحل ہیں: عدم، حمل، دنیا، برزخ اور آخرت۔

مرحلہ عدم کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ (الدهر: ١)

''کیا زمانے میں انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر شی نہ تھا؟''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا أَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفَّى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ أَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ﴾ (الحج: ٥)

''اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے تو یقیناً ہم ہی نے پیدا کیا تم کو مٹی سے، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی متشکل اور غیر متشکل بوٹی سے تاکہ ہم واضح کردیں تمہارے لیے اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقرر مدت تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں، پھر نکالتے ہیں تم کو بچہ بنا کر تاکہ تم پہنچو اپنی جوانی کو، پھر تم میں سے کچھ وہ ہوتے ہیں جو فوت کردیئے جاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جنہیں بڑھاپے کی نکمّی عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ وہ علم کے بعد بالکل بے علم ہوجائے، اور آپ دیکھیں گے کہ زمین خشک پڑی ہے، پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اور پھولنے لگتی ہے اور ہر طرح کی بارونق چیزیں اُگاتی ہے۔''

مرحلہ حمل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (الزمر: ٦)

''وہ پیدا کرتا ہے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں، ایک طرح، پھر دوسری طرح تین اندھیروں میں۔''

اور دنیا کے مرحلہ کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَ اللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ أُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْأَبْصَارَ وَ الْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (النحل: ٧٨)

''اور اللہ نے ہی پیدا کیا تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔''

دنیا امتحان اور آزمائش کا گھر ہے اور اسی مرحلہ پر انسان کی سعادت اور شقاوت کا دار و مدار ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَّهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ﴾ (الملك: ٢)

''جس نے پیدا کیا زندگی اور موت کو تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے عمل میں اچھا کون ہے اور وہ بڑا زبردست اور بڑا بخشنے والا ہے۔''

مرحلہ برزخ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (المومنون: ١٠٠)

''اوران کے پیچھے برزخ ہے جس میں وہ اس دن تک رہیں گے جب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔''

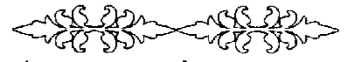
رہا مرحلہ آخرت، تو یہ آخری مرحلہ اور مسافر کی انتہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ o ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ﴾ (المومنون: ١٥، ١٦)

''پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن (قبروں سے) اٹھائے جاؤ گے۔''

[اَلْاِيْمَانُ بِكُلِّ مَا اَخْبَرَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ مِمَّا يَكُوْنُ بَعْدَ الْمَوْتِ.] ..... یہ سب چیزیں ایمان بالآخرت میں داخل ہیں، اور یہ اس لیے کہ انسان مرنے کے بعد یوم آخرت میں داخل ہو جاتا ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے: جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ لہٰذا موت کے بعد جو کچھ بھی ہو گا، وہ یوم آخرت کا حصہ ہو گا۔ یوم آخرت ہم سے کس قدر قریب ہے، ہمارے اور اس کے درمیان صرف موت حائل ہے، انسان مرتے ہی یوم آخرت میں داخل ہو جائے گا، جس میں صرف عمل کی جزا یا سزا ملے گی۔ لہٰذا ہمیں خبردار رہنا چاہیے۔

غافل انسان! اگر آپ غور وفکر سے کام لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ خطرے سے دوچار ہیں، اس لیے کہ موت کا کوئی وقت نہیں ہے، انسان گھر سے نکلتا ہے مگر گھر واپس نہیں آتا۔ دفتر میں کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے مگر اس سے اٹھ نہیں پاتا، کبھی وہ اپنے بستر پر ہوتا ہے مگر اسے یہاں سے اٹھا کر غسل دینے کے تختہ پر لٹا دیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اسی امر کی متقاضی ہے کہ ہم زندگی سے فائدہ اٹھائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور صدق دل سے توبہ کریں، ہمیں ہمیشہ رب تعالیٰ کے سامنے تائب ہونے کا احساس لے کر حاضر ہونا چاہیے تاکہ جب بھی موت آئے تو وہ ہماری بہترین حالت میں آئے۔



قبر کے عذاب اور نعمتوں پر ایمان رکھنا

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَيُؤْمِنُوْنَ بِفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَبِعَذَابِ الْقَبْرِ وَنَعِيْمِهِ.))

''اہل سنت فتنہ قبر، عذاب قبر اور قبر کی نعمتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔''

شرح: ..... اس جگہ فتنہ، اختبار کے معنی میں ہے، اور فتنہ قبر سے مراد ہے: میت کو دفن کرنے کے بعد اس سے اس کے رب، اس کے دین اور اس کے نبی کے بارے میں سوال کیا جانا۔

[يُؤْمِنُوْنَ] ..... کی ضمیر اہل سنت کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اہل السنہ والجماعہ فتنہ قبر پر ایمان رکھتے ہیں، اور یہ اس لیے کہ اس پر کتاب اللہ بھی دلالت کرتی ہے اور سنت رسول اللہ بھی۔

فتنہ قبر کی کتاب اللہ میں یہ دلیل ہے:

﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (ابراهيم: ٢٧)

''اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو پکی بات سے ثابت قدم رکھتا ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔''

یہ آیت فتنہ قبر کے بارے میں ہے، جس طرح کے صحیح بخاری و مسلم ❶ اور دیگر کتب حدیث میں حضرات براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے ثابت ہے۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اس میں بکثرت بتایا گیا ہے کہ انسان کو اس کی قبر میں فتنہ سے دوچار کیا جاتا ہے اور یہی وہ فتنہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تم اپنی قبروں میں فتنہ دجال کی مثل یا اس کے قریب آزمائے جاؤ گے۔'' ❷

فتنہ دجال آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر روز قیامت تک کی انسانی تاریخ کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدم کی پیدائش سے لے کر قیامت قائم ہونے تک دجال سے بڑا کوئی معاملہ نہیں ہے۔'' ❸

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ضرور ارشاد فرمایا: ''اگر دجال میری موجودگی میں نکلا تو میں اس سے خود جھگڑوں گا اور اگر وہ میری عدم موجودگی میں نکلا تو ہر شخص اپنا دفاع خود کرے گا، اور اللہ میرا خلیفہ ہے ہر مسلمان پر۔'' ❹

مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس امر سے آگاہ فرمایا کہ ہم نے اس کے ساتھ کس طرح جھگڑنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کے اوصاف اور علامات سے اس طرح مطلع فرمایا گویا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں، ہم ان اوصاف اور علامات کو دیکھ کر اس سے جھگڑا کر سکتے ہیں۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ دجال کا فتنہ بڑا سنگین ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''تم فتنہ دجال کی مثل یا اس کے قریب آزمائے جاؤ گے۔'' فتنہ قبر بھی بڑا سنگین معاملہ ہے، قبر میں انسان سے اس قسم کے سوال کیے جائیں گے کہ جن کا جواب عقیدہ اور عمل صالح کی ٹھوس اساس کے بغیر دینا ممکن نہیں ہوگا۔



فتنۂ قبر کی تفصیل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَاَمَّا الْفِتْنَةُ ؛ فَاِنَّ النَّاسَ يُفْتَنُوْنَ فِيْ قُبُوْرِهِمْ .))

''رہا فتنہ، تو لوگوں کا ان کی قبروں میں امتحان لیا جائے گا۔''

یہاں سے فتنہ قبر کی کیفیت کے بیان کا آغاز ہو رہا ہے۔

لفظ (النـاس) عام ہے ان کے کلام سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ قبروں میں تمام لوگوں کا امتحان ہوتا ہے۔ یہاں

---

❶ اسے صحیح بخاری (٤٦٩٩) اور صحیح مسلم (٢٨٧١) نے روایت کیا۔

❷ اسے صحیح بخاری (١٨٤) اور صحیح مسلم (٩٠٥) نے اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔

❸ اسے صحیح مسلم (٢٩٤٦) نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

❹ اسے صحیح مسلم (٢٩٧٣) نے نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

تک کہ انبیاء، صدیقین، شہداء، مرابطون، غیر مکلف چھوٹے بچے اور دیوانے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چونکہ مسئلہ تفصیل طلب ہے لہٰذا ہم یہ کہنا چاہیں گے۔

اولاً: اس سے انبیائے کرام مستثنیٰ ہیں، اور یہ دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ:...... انبیائے کرام، شہداء سے افضل ہیں، اور شہید کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ اسے فتنہ قبر سے محفوظ رکھا جاتا ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''فتنہ قبر کے لیے اس کے سر پر تلوار کی چمک ہی کافی ہے۔'' [1]

دوسری وجہ:...... قبر میں میت سے یہ سوال کیا جائے گا: من نبیك؟ کہ تیرا نبی کون ہے؟ اس حوالے سے انبیائے کرام سے سوال نہیں ہوتا بلکہ ان کے بارے میں سوال ہوتا ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تم اپنی قبروں میں آزمائے جاؤ گے۔'' [2] یہ خطاب امت سے ہو رہا ہے، جس میں رسول داخل نہیں ہیں۔

ثانیاً: جہاں تک صدیقین کا تعلق ہے تو ان سے بھی قبر میں سوالات نہیں کیے جاتے، اور یہ اس لیے کہ ان کا مرتبہ شہداء کے مرتبہ سے بلند ہے، جب شہداء فتنہ قبر سے مستثنیٰ ہیں تو صدیقین بطریق اولیٰ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ چونکہ صدیق، صادق بھی ہوتا ہے اور مصدق بھی، لہٰذا اس وصف کی بناء پر اس کے صدق کا علم ہوتا ہے لہٰذا اس کے اختبار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے امتحان اس شخص کا ہوتا ہے جس کے صادق یا کاذب ہونے میں شک ہو، مگر جب وہ صادق ہو تو اس کے امتحان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض علماء عمومی دلائل کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ان سے بھی سوال ہوگا۔ واللہ اعلم

ثالثاً: فی سبیل اللہ جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے شہداء بھی فتنۂ قبر سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ ان کی شہادت کی وجہ سے ان کے ایمان کی سچائی واضح ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ﴾ (التوبة: ۱۱۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اس کے عوض کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، پس وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (آلِ عمران: ۱۶۹)

''اور تم ان لوگوں کو مردے مت خیال کرو جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیے گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کے سر پر تلواروں کی چمک ہی فتنہ قبر کے لیے کافی ہے۔ [3]

---

[1] اس حدیث کو نسائی (۴/۹۹) نے روایت کیا۔ ملاحظہ ہو: "احکام الجنائز" (۳۶) از البانی، انہوں نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔
[2] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔ [3] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

اگر اسلامی حدود کی حفاظت کرنے والا مرنے کے بعد فتنہ قبر سے محفوظ رہتا ہے، تو میدان جنگ میں شہید ہونے والا بطریق اولیٰ اس سے محفوظ رہے گا، اس لیے کہ اس نے اعلائے کلمۃ اللہ اور اس کے دین کی نصرت وحمایت کے لیے اپنی گردن کو دشمن کے سامنے پیش کر دیا اور آخر کار اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا اور یہ اس کے صادق الایمان ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

رابعاً: مرابطون (دشمن کے مقابلہ میں مورچہ نشین) بھی فتنہ قبر سے محفوظ رہیں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ایک دن اور ایک رات کا پہرہ مہینہ بھر کے صیام وقیام سے بہتر ہے، اور اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کا وہ عمل مسلسل جاری رہے گا جو وہ کیا کرتا تھا، اس کے لیے اس کا رزق جاری کر دیا جائے گا، اور وہ فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ [1]

خامساً: کیا قبر میں بچوں اور دیوانوں کا بھی امتحان ہوگا؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ ان کا بھی امتحان ہوگا، اس لیے کہ وہ عموم میں داخل ہیں۔ نیز اس لیے بھی زندگی کی حالت میں ان سے تکلیف ساقط ہوگئی تھی، اور موت کی حالت زندگی کی حالت سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بعض علماء کے نزدیک ان کا امتحان نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ غیر مکلّف ہیں۔ اور جب وہ غیر مکلف ہیں تو ان کا کوئی حساب نہیں، حساب تو صرف مکلّف کا ہوتا ہے اور اسے ہی اس کے گناہوں کی سزا ملتی ہے، انہیں سزا دی جائے گی، ہاں اگر وہ نیک اعمال کرتے رہے ہوں گے تو انہیں ان کا ثواب ضرور دیا جائے گا۔

دریں حالات مؤلف رحمہ اللہ کے قول "فان الناس" سے پانچ قسم کے لوگ خارج ہوگئے: انبیائے کرام، صدیقین، شہداء، مرابطون اور دیوانوں اور بچوں جیسے عقل سے محروم لوگ۔

تنبیہ: لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

خالص مومن اور منافقین، ان دونوں قسموں کے لوگوں کو فتنہ قبر سے دوچار کیا جائے گا، جبکہ تیسری قسم خالص کفار کی ہے جن کے فتنہ قبر میں اختلاف ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے کتاب ''الروح'' میں انہیں فتنہ قبر سے دوچار کیے جانے کو ترجیح دی ہے۔

کیا سابقہ امتوں کے لیے بھی یہی حکم ہے؟

بعض علماء کے نزدیک ان کا بھی یہی حکم ہے۔ صحیح قول یہی ہے، اس لیے کہ جب اشرف الامم، امت اسلامیہ سے قبر میں سوالات کیے جا سکتے ہیں تو دوسروں کے ساتھ بطریق اولیٰ یہ سلوک کیا جانا چاہیے۔

[فِيْ قُبُوْرِهِمْ.] ..... ''قبور'' قبر کی جمع ہے۔ مردوں کا مدفن۔ جبکہ مراد اس سے عام ہے، قبر عالم برزخ کو شامل ہے جو کہ انسان کی موت سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک کے عرصہ پر مشتمل ہے۔ میت کو دفن کیا جائے، اسے میدانوں میں درندے کھا جائیں، سمندر میں مچھلیاں لقمہ بنا لیں، یا اسے آندھیاں تلف کر ڈالیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ظاہر یہ ہے کہ قبر میں ابتلاء وآزمائش کا یہ مرحلہ دنیوی احوال کے اختتام پر شروع ہوتا ہے، اگر میت کی تدفین ایک دو دن یا اس سے زیادہ مؤخر ہو جائے تو اس سے سوالات کا سلسلہ دفن ہونے کے بعد ہی شروع ہوگا۔

[1] اسے صحیح مسلم (۱۹۱۳) نے سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



کیا پہلی قوموں کو بھی قبر میں سوال ہوگا؟

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَيُقَالَ لِلرَّجُلِ ، مَنْ رَبُّكَ ، مَا دِيْنُكَ ، مَنْ نَّبِيُّكَ .))

''قبر میں آدمی سے سوال ہوگا: تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کون سا ہے اور تیرا نبی کون ہے؟''

یہ سوال وہ دو فرشتے کریں گے جو قبر میں انسان کے پاس آ کر اسے بٹھالیں گے اور پھر اس سے سوال کریں گے، جب وہ اس سے سوال کر رہے ہوتے ہیں، اس وقت وہ واپس لوٹنے والوں کی جوتیوں کی آہٹ بھی سن رہا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ میت کو دفنانے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے: ''اپنے بھائی کے لیے مغفرت طلب کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کا سوال کرو، اس لیے کہ اب اس سے سوالات ہوں گے۔'' [1]

قبر میں سوال کرنے والے فرشتوں کے نام

بعض آثار میں وارد ہے کہ ان کے نام منکر اور نکیر ہیں۔ [2]

مگر بعض علماء ان ناموں کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جن فرشتوں کے اللہ تعالیٰ نے خود اچھے اوصاف گنوائے ہوں وہ خود انہیں ان ناموں سے کس طرح موسوم کر سکتا ہے، وہ اس بارے میں وارد حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

جبکہ دوسرے علماء کے نزدیک یہ حدیث حجت ہے، ان کے نزدیک انہیں اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے منکر و نکیر ہیں بلکہ اس کی وجہ ان کا میت کے نزدیک غیر معروف ہونا ہے جن کے بارے میں اس کے پاس پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مہمان فرشتوں سے فرمایا تھا:

﴿سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ (الذاريات : ٢٥) ''اجنبی لوگوں کو سلام۔''

یہ اس لیے کہ آپ انہیں پہچانتے نہیں تھے، چونکہ یہ فرشتے میت کے نزدیک غیر معروف ہوتے ہیں لہٰذا انہیں ان دو ناموں سے موسوم کر دیا گیا۔

کیا یہ دو فرشتے کوئی نئے فرشتے ہیں جنہیں اصحاب قبور پر متعین کیا جاتا ہے؟ یا یہ وہی دو فرشتے ہیں جو انسان کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں؟

بعض علماء کے نزدیک یہ وہی دو فرشتے ہیں جو انسان کے اعمال لکھنے کے لیے ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور پھر وہی قبر میں آ کر اس سے یہ تین سوالات کرتے ہیں۔

---

[1] اسے ابوداؤد (٣٢٢١) اور بیھقی (٤١٥٦) نے روایت کیا، اور حاکم نے اسے صحیح کہا (١٣٧٠) اور ذہبی نے ان سے موافقت کی۔ امام نووی نے ''المجموع'' (٥١٢٩٢) میں اس کی سند کو عمدہ بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو: احکام الجنائز از البانی (١٥٦)

[2] ترمذی (١٠٨٣)، ابن ابی عاصم ''السنۃ'' (٨٦٤) اور آجری ''الشریعۃ'' (٣٦٥) میں ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''جب میت کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو اس کے پاس دو سیاہ نیلے فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے......'' اس حدیث کو شیخ البانی نے ''الصحیحۃ'' (١٣٩١) میں صحیح کہا ہے۔



جبکہ بعض دوسرے علماء کے نزدیک یہ دو الگ فرشتے ہیں، اور اللہ فرماتا ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾ (المدثر: ۳۱)

''اور تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی (اللہ) جانتا ہے۔''

فرشتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''آسمان چرچراتا ہے اور اسے چرچرانا ہی چاہیے، آسمان میں ایک بالشت (یا فرمایا چار انگلیوں) کے برابر بھی جگہ نہیں ہے، مگر اس میں کوئی نہ کوئی فرشتہ اللہ تعالیٰ کے لیے قیام کر رہا ہے یا رکوع کر رہا ہے یا سجدہ کر رہا ہے۔ [1] جبکہ آسمان کی وسعت کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ (الذاریات: ٤٧)

''اور ہم نے آسمان کو اپنی قوت سے بنایا، اور یقیناً ہم ضرور وسعت دینے والے ہیں۔''

اس بات میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مدفون شخص کے لیے دو نئے فرشتوں کو معرض وجود میں لا کر انہیں اس کے پاس بھیج دے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

[مَنْ رَّبُّكَ] ..... یعنی تیرا رب کون ہے جس نے تجھے پیدا فرمایا اور تو صرف اسی کی عبادت کیا کرتا تھا؟ ہم نے یہ معنی اس لیے کیا تاکہ یہ کلمہ اپنے اندر توحید ربوبیت اور توحید الوہیت کو سمو سکے۔

[مَا دِيْنُكَ] ..... یعنی تو کس قسم کے اعمال کے ساتھ اپنے رب کی فرمانبرداری کیا کرتا اور کس کا قرب حاصل کیا کرتا تھا؟

[مَنْ نَّبِيُّكَ] ..... یعنی تو کس نبی پر ایمان رکھتا اور اس کی اتباع کیا کرتا تھا؟

مومنین کی دُنیا و آخرت میں ثابت قدمی

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فـ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾

(ابراھیم: ۲۷)

''اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو پکی بات کی وجہ سے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے۔''

یعنی انہیں اس طرح ثابت قدم رکھتا ہے کہ وہ کسی تردد اور توقف کے بغیر سوالات کا جواب دے دیتے ہیں۔ قول ثابت سے مراد توحید ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾

(ابراھیم: ٢٤)

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ کس طرح بیان کی اللہ نے مثال پاکیزہ بات کی کہ جیسے ایک پاکیزہ درخت ہو، جس

[1] اسے احمد (۵/۱۷۳) ترمذی (۲۳۱۲)، ابن ماجہ (۴۱۹۰) اور حاکم نے ''مستدرک'' (۲۱۵۱۰) میں ابوذر سے روایت کیا۔ اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے ''الصحیحۃ'' میں اسے حسن کہا۔ (۱۷۲۲)



کی جڑ مضبوط ہو اور شاخ آسمان میں ہو۔"

[فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ] ..... حرف جار (یثبت) سے بھی متعلق ہو سکتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے اور (الثابت) سے بھی، یعنی یہ قول دنیا میں بھی ثابت ہے اور آخرت میں بھی۔

لیکن پہلا معنی زیادہ خوبصورت بھی ہے اور زیادہ مناسب بھی، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا﴾ (الانفال: ٤٥)

"اے ایمان والو! جب تمہارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الانفال: ١٢)

"جب تمہارا رب فرشتوں کی طرف پیغام بھیج رہا تھا کہ بلا شک میں تمہارے ساتھ ہوں، اس لیے تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو۔"

اہل ایمان کو دنیا میں بھی قول ثابت کے ساتھ ثابت قدم رکھا جاتا ہے اور آخرت میں بھی۔

قبر مومن کے جواب

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَيَقُوْلُ الْمُؤْمِنُ: رَبِّيَ اللّٰهُ ، وَالْاِسْلَامُ دِيْنِيْ ، وَمُحَمَّدٌ نَبِيِّيْ ، وَاَمَّا الْمُرْتَابُ ؛ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ! لَا اَدْرِيْ؛ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ.))

"مومن جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ اسلام میرا دین اور محمد میرے نبی ہیں، رہا شک کرنے والا، تو وہ کہتا ہے: ہاہ ہاہ! میں کچھ نہیں جانتا، میں نے لوگوں سے سنا کہ وہ کوئی بات کہتے ہیں، وہ بات میں نے بھی کہہ دی۔"

شرح: ..... جب بندہ مومن سے پوچھا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے، اور جب پوچھا جاتا ہے کہ تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے: میرا دین اسلام ہے، اور جب اس سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تیرے نبی کون ہیں؟ تو وہ کہتا ہے: میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

چونکہ یہ جواب درست ہوتا ہے، لہٰذا آسمان سے اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے، میرے بندے نے سچ کہا۔ لہٰذا اس کے لیے جنت کا بستر بچھا دو، اسے جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔

قبر میں منافق، فاسق وغیرہ کے جواب

[الْمُرْتَابُ] ..... شک کرنے والا، منافق، اور ان جیسا کوئی دوسرا آدمی۔

[فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ! لَا اَدْرِيْ؛ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ.] ..... یعنی جس شخص کے دل میں



ایمان داخل نہ ہوا، اور وہ وہی کچھ کہتا رہا جو لوگ کہا کرتے تھے۔

میت کا قول: ''ہاہ! ہاہ'' قابل غور ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی چیز اس سے کھو گئی ہو اور وہ اسے یاد کرنا چاہتا ہو، جس سے اس کی شدید حسرت وندامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے جواب سے آگاہ ہے مگر اسے اس کی توفیق نہیں دی جا رہی جس پر وہ ہاہ! ہاہ! کہہ اٹھتا ہے۔ چونکہ وہ دنیا میں شکوک وشبہات میں پڑا رہا اور کبھی یقین کی دولت سے مالا مال نہ ہوسکا۔ لہٰذا وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب کہہ سکا، نہ دین اسلام کو اپنا دین بتا سکا اور نہ یہ کہہ سکا کہ میرے نبی محمد ﷺ ہیں۔ حالانکہ قبر میں اسے صحیح جواب کی شدید ضرورت تھی اور یہ اس لیے کہ اس کا ایمان دلی نہیں بلکہ صرف زبانی کلامی تھا۔

ہتھوڑے کا عذاب اور انسان کا چیخنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فیضرب بمرزبة من حدید فیصیح صیحة یسمعها کل شیء الا الانسان.))

''اس پر اسے لوہے کے ہتھوڑے سے مارا جاتا ہے جس سے وہ اس زور سے چیختا ہے کہ اسے انسان کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے۔''

شرح: ......[یَضرب] ...... یعنی جواب نہ دینے والے کو مارا جاتا ہے، وہ کافر ہو یا منافق، اور اسے مارنے والے وہی دو فرشتے ہوتے ہیں جو قبر میں آ کر اس سے سوال کرتے ہیں۔

[**بمرزبة**] ...... لوہے کا ہتھوڑا، بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اگر منیٰ والے مل کر اسے اٹھانا چاہیں تو اٹھا نہ سکیں۔ پھر جب اسے مارا جاتا ہے تو وہ ایسی چیخ مارتا ہے جسے انسان کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے۔

[**فیضرب فیصیح**] ...... یعنی وہ اس ضرب پر ایسی چیخ مارتا ہے جسے اس کے آس پاس کی ہر چیز سنتی ہے، اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ اسے دنیا بھر کی ہر چیز سنتی ہے۔ پھر کبھی کبھی اسے سننے والی چیزیں اس سے متاثر بھی ہوتی ہیں۔ حدیث [1] میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی سواری پر سوار ہو کر مشرکین کی قبروں کے قریب سے گزرے تو آپ کی اونٹنی بدک گئی، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ آپ کو گرا دیتی اور یہ اس لیے کہ اس نے انہیں عذاب دیئے جانے کے دوران ان کی آوازیں سن لی تھیں۔

[**الا الانسان**] ...... یعنی اس چیز کو انسان نہیں سن پاتا جس کی چند حکمتیں ہیں، مثلاً:

اوّلاً: اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم اپنے مردوں کو قبروں میں دفن نہیں کرو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ وہ تمہیں عذاب قبر سنا دے۔'' [2]

ثانیاً: اسے مخفی رکھنے میں میت کی پردہ پوشی ہے۔

ثالثاً: اس سے اس کے اہل خانہ پریشانی سے محفوظ رہتے ہیں، اس لیے کہ اگر وہ اس کی چیخ و پکار کو سن لیں تو انہیں کبھی

---

[1] اسے امام مسلم نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا (۲۸۶۷)۔

[2] گزشتہ حدیث کا جزء۔



چین وقرار نصیب نہ ہوگے۔

رابعاً: تاکہ اس کے گھر والے شرمسار نہ ہوں، اسے اگر لوگ سن لیں تو وہ انہیں طعنہ دیتے ہوئے کہا کریں: یہ تمہارا باپ ہے، یہ تمہارا بھائی ہے، یہ تیرا بیٹا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

خامساً: اسے سن کر ہم خود بھی ہلاک ہو جائیں، اس لیے کہ وہ چیخ کوئی معمولی قسم کی نہیں ہے، اگر لوگ اسے سن لیں تو ان کے دل باہر کو آ ئیں، جس سے وہ مر جائیں یا پھر بیہوش ہو جائیں۔

سادساً: اگر ان لوگوں کی چیخیں لوگ سن لیں تو عذاب قبر پر ایمان لانا، ایمان بالغیب کے زمرے سے نکل کر ایمان بالشہادہ کے زمرے میں آ جائے گا اور اس طرح امتحان کی مصلحت ختم ہو جائے گی، اور لوگ جس چیز کا مشاہدہ کر لیں گے اس پر یقیناً ایمان لے آئیں گے، لیکن اگر وہ ان سے غائب رہے گی اور انہیں اس کا علم صرف خبر کی وساطت سے ہوگا تو اس کا شمار ایمان بالغیب میں ہوگا۔

تنبیہ: ......مؤلف رحمہ اللہ کا قول: ((فيصيح صحيحةً يسمعها كل شيء اِلّا الانسان ولو سمعها الانسان تصعق .)) میت کے قول کے بارے میں وارد ہوا ہے، جب لوگ اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر قبرستان کی طرف جا رہے ہوتے ہیں، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ نیک ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھے آگے لے چلو، اور اگر وہ نیک نہیں ہوتا تو کہتا ہے کہ ہائے خرابی مجھے کہاں لیے جاتے ہو، اس کی آواز کو انسان کے علاوہ ہر شے سنتی ہے، اگر وہ سن لے تو بے ہوش ہو جائے۔''[1]

جہاں تک قبر میں چیخ مارنے کا تعلق ہے، تو اس بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''وہ ایسی چیخ مارتا ہے جسے جنوں اور انسانوں کے علاوہ اس کے آس پاس کی ہر شے سنتی ہے۔''[2]



انعامات اور عذاب کا اثبات

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثم بعد هذه الفتنة اما نعيم وإما عذاب .))

شرح: ......''اس ابتلاء کے بعد نعمتیں ہیں یا پھر عذاب'' ''ثم'' یہ ''ثُمَّ'' تراخی کے لیے نہیں بلکہ مطلق ترتیب کے لیے ہے، اس لیے کہ سوال و جواب کے بعد انسان کو فوراً عذاب دیا جاتا ہے، یا اسے نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، جس طرح کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ جب یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، تو اسے لوہے کے ہتھوڑے سے مارا جاتا ہے، جبکہ صحیح جواب دینے والے کے لیے جنت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور اس کی قبر میں توسیع کر دی جاتی ہے۔

ان نعمتوں اور عذاب کا تعلق بدن کے ساتھ ہوتا ہے یا روح کے ساتھ؟ یا ان دونوں کے ساتھ؟

---

[1] اسے امام بخاری نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا (۱۳۸۰_۱۳۱۶)

[2] صحیح بخاری: ۱۳۷٤۔



اہل سنت کے نزدیک معروف یہ ہے کہ ان کا اصل تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ بدن اس کے تابع ہوتا ہے۔ جس طرح کہ دنیا میں عذاب بدن کو ہوتا ہے اور روح اس کے تابع ہوتی ہے، اور جس طرح کہ دنیا میں شرعی احکام ظاہر پر نافذ ہوتے ہیں اور آخرت میں اس کے برعکس باطن پر۔ قبر میں عذاب یا نعمتوں کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے مگر جسم اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا مستقلاً جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا، کبھی عذاب جسم کو ہوتا ہے اور روح اس کے تابع ہوا کرتی ہے، مگر اس کا وقوع انتہائی نادر ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عذاب روح کو ہوتا ہے اور بدن اس کے تابع ہوتا ہے، نعمتیں روح سے متعلق ہوتی ہیں اور جسم اس کے تابع ہوتا ہے۔ "إمـا نعيم و إما عذاب" اس میں قبر میں نعمتوں اور عذاب کا اثبات ہے، جس پر کتاب اللہ بھی دلالت کرتی ہے اور سنت رسول اللہ ﷺ بھی، بلکہ اجماع امت بھی۔

انعام وعذاب سے متعلق کتاب اللہ سے دلائل

جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے، تو اس کے لیے سورۂ واقعہ کی یہ آخری آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ o وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ o وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ o فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ o تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ o فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ o فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ o وَأَمَّا إِن كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ o فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ o وَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ o فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ o وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ o﴾ (الواقعہ: ۸۳-۹۴)

''بھلا کیوں نہیں جب روح گلے تک پہنچتی ہے، اور تم اس وقت دیکھ بھی رہے ہوتے ہو، جبکہ ہم تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے ہو، پھر کیوں نہیں اگر تم غیر محکوم ہو تو واپس کر لیتے اس کو اگر تم سچے ہو تو، پھر اگر وہ اللہ کے مقربین میں سے ہو، تو اس کے لیے آرام وراحت اور نعمتوں والا باغ ہے، اور اگر وہ دائیں طرف والوں میں سے ہے تو کہا جائے گا سلام ہو تجھ پر دائیں طرف والوں سے، اور اگر ہو وہ جھٹلانے والوں گمراہوں سے تو اس کی مہمان نوازی ہوگی بہت کھولتے پانی سے اور جہنم میں داخلے سے۔''

اسی طرح آل فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا﴾ ''انہیں صبح وشام آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' جو کہ قیامت آنے سے پہلے کی بات ہے، اور اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ o﴾ (غافر: ۴۶) ''آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کرو۔''

نیز ارشاد ربانی:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ﴾ (الانعام: ۹۳)

''اور اگر تو اس وقت دیکھے جب ظالم لوگ موت کی بے ہوشی میں ہوتے ہیں اور فرشتے ان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائے یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ اپنی جانیں باہر نکالو۔''

یہ اس لیے کہ وہ جانوں کے بارے میں بڑے بخیل ہیں وہ انہیں نکالنا نہیں چاہتے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں عذاب اور سزا کی بشارت دی گئی ہے، لہٰذا وہ نکلنے سے انکار کرتی ہیں۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ (الانعام: ۹۳) ''اپنی جانیں خود باہر نکالو، آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔'' ''الیوم'' میں الف لام عہد حضوری کے لیے ہے، جس طرح کہ دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ (المائدہ: ۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔'' یعنی آج کے موجود دن میں۔

یعنی جس دن فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اور یہ اس امر کا متقاضی ہے کہ انہیں ان کی روحیں نکالے جانے کے ساتھ ہی عذاب دینا شروع کر دیا جاتا ہے۔ اور یہی عذاب قبر ہے۔

عذاب قبر کی ایک اور قرآنی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ (النحل: ۳۲)

''وہ لوگ کہ جب انہیں فرشتے فوت کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ پاک صاف ہوتے ہیں تو فرشتے ان سے کہتے ہیں کہ سلام ہو تم پر۔''

انعام و عذاب سے متعلق احادیث نبویہ سے دلائل

یہ وفات کے وقت کی بات ہے، اسی لیے ایک صحیح حدیث میں آتا ہے: ''مومن کی روح سے کہا جاتا ہے: اے پاکیزہ روح! اللہ کی مغفرت اور اس کی رضامندی کی طرف نکل ❶ '' اس بشارت پر وہ خوش ہو جاتی ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ جسم سے باہر آ جاتی ہے۔ اس دوران اگرچہ بدن کو تکلیف ہو سکتی ہے مگر روح شاداں و فرحاں رہتی ہے۔

رہی سنت تو وہ عذاب قبر اور اس کی نعمتوں کے بارے میں تواتر کے ساتھ وارد ہے، مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری و مسلم کی یہ حدیث کہ نبی کریم ﷺ کا گزر دو قبروں پر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''انہیں عذاب دیا جا رہا ہے۔ اور انہیں کسی بڑی بات کے بارے میں عذاب نہیں دیا جا رہا......'' الحدیث ❷

انعام و عذاب سے متعلق اجماع کی رُو سے دلائل

جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو تمام مسلمان یہ دعا کرتے ہیں: ((اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ......)) میں جہنم اور قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں......'' اگر عذاب قبر ثابت نہ ہوتا تو لوگوں کا اس سے اللہ کی پناہ مانگنا صحیح نہ ہوتا، اس لیے کہ غیر موجود چیز سے پناہ مانگنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اہل اسلام کا یہ دعا مانگنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عذاب قبر پر ایمان رکھتے ہیں۔

---

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ ❷ اسے بخاری (۱۳۷۸)، اور مسلم (۱۹۸۰) نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

سوال: کیا عذاب قبر یا اس کی نعمتیں دائمی ہیں یا ان میں انقطاع آ جائے گا؟

جواب: کفار کے لیے عذاب قبر دائمی ہوگا، ان سے عذاب قبر کا ٹل جانا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اس کے مستحق ہیں، نیز اس لیے بھی کہ ان سے عذاب کا ٹل جانا ان کے لیے باعث راحت ہوگا اور وہ راحت کے اہل نہیں ہیں۔ مدت جس قدر بھی دراز ہو وہ قیامت تک عذاب سے دوچار رہیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی جس قوم کو غرقاب کر دیا گیا تھا انہیں ابھی تک اس آگ میں عذاب دیا جا رہا ہے جس میں انہیں داخل کیا گیا تھا، اور وہ قیامت تک مسلسل جاری رہے گا، اسی طرح آل فرعون کو صبح وشام آگ پر پیش کیا جاتا رہے گا۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ نفخہ اولیٰ اور نفخہ ثانیہ کے درمیان کفار سے عذاب قبر میں تخفیف کر دی جائے گی جس کے لیے وہ اس ارشاد باری سے استدلال کرتے ہیں:

﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا﴾ (یٰس: ۵۲)

''یہ کہتے ہوئے کہ ہائے ہائے کس نے جگا دیا ہم کو ہماری خواب گاہ سے۔''

مگر یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی قبریں ان کی خواب گاہیں ہی ہوں گی، اگرچہ انہیں ان میں عذاب ہی دیا جاتا رہا ہوگا۔

رہے وہ گناہ گار اہل ایمان جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ عذاب قبر کا فیصلہ کرے گا، تو ان کا عذاب دائمی بھی ہو سکتا ہے اور عارضی بھی، طویل بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی، اور یہ سب کچھ ان کے گناہوں کے مطابق ہوگا، یا رب تعالیٰ کے عفو وکرم کے مطابق۔

عذاب قبر، روز قیامت کے دن کے عذاب سے ہلکا ہوگا، اس لیے کہ عذاب قبر میں ذلت و رسوائی نہیں ہے جبکہ آخرت کے عذاب میں رسوائی بھی ہوگی اور عار بھی، اس لیے کہ اس وقت گواہ موجود ہوں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ (غافر: ۵۱)

''یقیناً ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی، اور ان کی جو ایمان لاتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور جس دن کھڑے ہوں گے گواہ۔''

سوال: اگر آدمی کا جوڑ جوڑ اکھڑ جائے، اسے درندے کھا جائیں اور آندھیاں اڑا لے جائیں تو اس سے سوال کس طرح ہوگا اور اسے عذاب کس طرح ہوگا؟

جواب: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، یہ ایک غیبی امر ہے، اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب میں ان چیزوں کو جمع کرنے پر قادر ہے اگرچہ ہم دنیا میں ان چیزوں کو الگ الگ اور دور دور دیکھتے ہیں مگر عالم الغیب میں اللہ انہیں جمع فرما دے گا۔

آپ فرشتوں کو دیکھیں کہ وہ آدمی کی روح کو قبض کرنے کے لیے آتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الواقعہ: ۸۵)

''ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں مگر تم دیکھتے نہیں ہو۔''



مگر اس کے باوجود ہم انہیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔

عالم غیب کو، عالم شہادت پر قیاس کرنا ہرگز ممکن نہیں ہے، تو تو اپنے اندر موجود نفس کے بارے میں نہیں جانتا کہ تیرے بدن کے ساتھ اس کے تعلق کی کیا کیفیت ہے؟ اسے پورے جسم میں کس طرح پھیلا دیا گیا ہے؟ اور وہ سوتے وقت تجھ سے کس طرح نکل جاتا ہے؟ کیا نیند سے بیدار ہوتے وقت تجھے اس کی واپسی کا احساس ہوتا ہے؟ اور کیا تو جانتا ہے کہ وہ تیرے جسم میں کہاں سے داخل ہوتا ہے؟

عالم الغیب کو صرف تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے، اس میں قیاس کا چلنا ہرگز ممکن نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ٹوٹے پھوٹے جسم سے ان متفرق اعضاء کو جمع کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے جنہیں آندھی نے ادھر ادھر بکھیر دیا ہو۔ انہیں جمع کرنے کے بعد سوال و جواب بھی ہوگا، پھر اسے عذاب دیا جائے گا یا نعمتوں سے نوازا جائے گا، اس لیے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سوال: میت کو تنگ قبر میں دفن کیا جاتا ہے، اس میں حد نگاہ تک وسعت کس طرح ہو سکتی ہے؟

جواب: جس طرح کہ ہم نے ابھی عرض کیا عالم غیب کو عالم شہادت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ فرض کریں کسی شخص نے حد نگاہ تک زمین میں گڑھا کھودا، اور اس میں میت کو دفن کر کے اس پر مٹی ڈال دی۔ اب جس شخص کو اس گڑھے کا علم نہیں ہے وہ اسے دیکھ سکے گا یا نہیں؟ وہ یقیناً اسے نہیں دیکھ سکے گا اگرچہ وہ عالم محسوسات میں ہے۔ مگر اس کے باوصف وہ اس وسعت کو نہیں دیکھ سکتا، اسے وہی جانتا ہوگا جس نے اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔

سوال: کافر میت کے بارے میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر دو یا تین دن بعد بھی اس کی قبر کھولی جائے تو قبر کی تنگی کی وجہ سے اس کی پسلیاں نہ تو ٹیڑھی ہوتی ہیں اور نہ ایک دوسری میں پیوست۔

جواب: جس طرح کہ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں اس بات کا تعلق عالم غیب کے ساتھ ہے، عین ممکن ہے کہ ایسا ہو چکا ہو مگر جب قبر کھولی گئی تو اللہ تعالیٰ نے بندوں کا امتحان لینے کی غرض سے اپنی قدرت کاملہ سے ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر واپس لوٹا دیا ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ اس وقت بھی مختلف حالت میں موجود ہوتیں تو اس پر ایمان لانا، ایمان بالشہادۃ ہوتا نہ کہ ایمان بالغیب۔

اگر کوئی شخص فلاسفہ کی طرح یہ اشکال پیش کرے کہ: ہم مردے پر پارہ رکھ دیتے ہیں جو کہ سب چیزوں سے زیادہ حرکت کرتا اور پھیلتا ہے۔ مگر جب ہم ایک روز بعد آئیں گے تو وہ اسی حالت میں موجود ہوگا، جبکہ تم کہتے ہو کہ فرشتے اسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں، بیٹھنے والے پر پارہ کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟

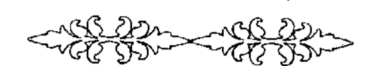
ہم اس کے جواب میں بھی وہی کچھ کہیں گے جو قبل ازیں کہہ چکے ہیں کہ اس بات کا تعلق عالم غیب کے ساتھ ہے جس پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا ہم پر واجب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ پارے کو اس کی جگہ میں واپس لوٹا دے جبکہ وہ قبل ازیں میت کے بیٹھنے کی وجہ سے ادھر ادھر ہو گیا ہو۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان نیند کی حالت میں ایسی ایسی چیزیں دیکھتا ہے کہ اگر وہ واقعی خواب کے مطابق ہوں تو وہ



اپنے بستر پر پڑا سو نہ سکے۔کبھی کبھی وہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچا بھی ثابت ہو جاتا ہے اور آدمی جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے وہی کچھ بیداری میں بھی دیکھ لیتا ہے، مگر اس کے باوجود ہمارا اس پر ایمان ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں کوئی غیر پسندیدہ چیز دیکھے تو جاگنے پر پریشانی کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں، اسی طرح خوشگوار خواب دیکھنے پر انسان خوش خوش نظر آتا ہے۔ یہ سب باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روح سے متعلقہ امور کا شمار قابل مشاہدہ امور میں نہیں ہوتا، اور نہ غیبی امور کو مشاہد امور پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ہم نصوص صحیحہ کو اس بنیاد پر ردّ نہیں کر سکتے کہ امر مشاہدہ کے حساب سے جس پر وہ دلالت کرتی ہیں اسے ہم بعید خیال کرتے ہیں۔





فصل:

قیامت کبریٰ کے بارے میں

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

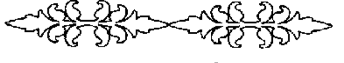
((اِلٰی اَنْ تَقُوْمَ الْقِیَامَةُ الْکُبْرٰی .)) ''یہاں تک کہ قیامت کبریٰ قائم ہو جائے گی۔''

شــرح: ......قیامت کبریٰ وہ قیامت ہے جس میں لوگ رب العالمین کے سامنے حاضر ہونے کے لیے اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

مؤلف رحمہ اللہ کے قول: "القیامۃ الکبری" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک "قیامت صغریٰ" بھی ہے، جو کہ ہر انسان کی اپنی قیامت ہے، جو شخص مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔

مؤلف رحمہ اللہ نے اشراط قیامت سے خاموشی اختیار کی ہے، اس لیے کہ وہ یوم آخرت کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں، جبکہ اشراط قیامت محض علامات قیامت ہیں، جن سے مقصود قرب قیامت سے خبر دار کرنا ہے تا کہ اس کے لیے تیاری کرنے والے تیاری کر لیں۔

جن بعض اہل علم نے عقائد کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے انہوں نے اس جگہ اشراط قیامت کا بھی ذکر کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایمان بالآخرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اگر چہ ان کا شمار بھی ان غیبی اُمور میں ہوتا ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اشارہ کیا ہے، اور جن کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت میں تفصیل فراہم کی ہے۔



ارواح کا جسموں میں لوٹایا جانا

❏ قیامت کے دن سب سے پہلے جو کچھ ہوگا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَتُعَادُ الْاَرْوَاحُ اِلَی الْاَجْسَادِ .))

''روحیں جسموں میں لوٹائی جائیں گی۔''

شــرح: ......یہ پہلا کام نفخہ ثانیہ کے بعد ہوگا، جو روحیں مرتے وقت جسموں سے الگ ہو گئی تھیں انہیں جسموں میں لوٹا دیا جائے گا، اور یہ اس اعادہ کے علاوہ ہے جو عالم برزخ میں اس وقت ہوتا ہے جب میت سے اس کے رب، اس کے دین اور اس کے نبی کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسرافیل کو حکم دے گا تو اس میں دوبارہ پھونک مارا جائے گا جس سے روحیں صور سے اڑ کر اپنے اپنے جسموں میں داخل ہو جائیں گی۔

مؤلف رحمہ اللہ کے قول: "الـی الاجسـاد" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صور سے روحیں اس وقت نکلیں گی

جب جسم تخلیق ہو کر مکمل ہو چکے ہوں گے، ان کی خلقت مکمل ہونے کے بعد صور میں پھونکا جائے گا اور روحیں جسموں میں لوٹا دی جائیں گی۔

مؤلف رحمہ اللہ کے قول: ((فَتُعَادُ الْاَرْوَاحُ اِلَى الْاَجْسَادِ .)) میں اس امر کی دلیل ہے کہ بعث اعادہ ہے تجدید نہیں۔ وہ زائل شدہ اور تبدیل شدہ اشیاء کا اعادہ ہے، اس لیے کہ جسم مٹی میں تبدیل ہو چکا ہوگا، ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان متفرقات کو جمع کرے گا یہاں تک کہ جسم معرض وجود میں آ جائے گا اور پھر روحوں کو ان کے جسموں میں لوٹا دیا جائے گا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جسموں کو نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا تو ان کا یہ دعویٰ باطل ہے جس کی کتاب و سنت اور انسانی عقل تردید کرتی ہے۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ (الروم : ۲۷)

''اور وہ وہی ہے جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہ اسے دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔''

یعنی اس مخلوق کا اعادہ کرے گا جسے اس نے ابتدا میں پیدا فرمایا۔

اور حدیث قدسی میں ہے: ''میرے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا اس کے اعادہ سے آسان نہیں ہے۔'' [1]

یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے سب کچھ آسان ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ (الانبیاء : ۱۰٤)

''جس طرح ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کرنا شروع کیا تھا ہم اسے پھر دہرائیں گے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ٥ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ٥﴾ (المؤمنون : ۱٦ـ۱۵)

''پھر اس کے بعد تم مرو گے پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ٥ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ٥﴾ (یٰس : ۷۹ـ۷۸)

''کہتا ہے کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ بہت بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟ کہہ دو کہ انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کر لیا تھا اور وہ ہر قسم کی پیدائش کو خوب جانتا ہے۔''

رہی سنت، تو وہ اس بارے میں بڑی کثرت کے ساتھ وارد ہے، نبی کریم ﷺ نے اس امر کی وضاحت فرما دی ہے کہ: ''لوگ ننگے پاؤں، ننگے جسم اور غیر مختون اکٹھے کیے جائیں گے۔'' [2]

---

[1] اسے بخاری (٤٩٧٤) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] صحیح بخاری (۳٤٤۹، ۳٤٤۷) اور صحیح مسلم (۲۸٦۰) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پاؤں! ننگے جسم غیر مختون اکٹھے کیے جاؤ گے......''

المهم: بعث سابقہ جسموں کے اعادہ سے عبارت ہے۔

سوال: کبھی انسان کو درندے کھا جاتے ہیں، اور اس کا جسم ان خونخوار درندوں کی غذا بن کر ان کے خون، گوشت اور ہڈیوں کے ساتھ مل جاتا ہے، اور پھر اس کے پیشاب اور فضلے کے ساتھ خارج ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اعادہ جسم کس طرح ممکن ہے؟

جواب: یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے لیے بڑا آسان ہے، وہ اشیاء کو کلمہ کن سے معرض وجود میں لا سکتا ہے، انسانی جسم درندوں کی جن جن چیزوں کے ساتھ مل گیا ہوگا، اسے ان چیزوں سے الگ کر کے دوبارہ وجود دے دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت ہمارے تصور سے بھی بڑھ کر ہے۔ اللہ عزوجل ہر چیز پر قادر ہے۔

قیامت قائم ہونے کا اثبات قرآن وحدیث سے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَتَقُوْمُ الْقِيَامَةُ الَّتِيْ اَخْبَرَ اللّٰهُ بِهَا فِيْ كِتَابِهِ وَعَلَى لِسَانِ رَسُوْلِهِ وَاَجْمَعَ عَلَيْهَا الْمُسْلِمُوْنَ .))

''وہ قیامت قائم ہوگی جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دی ہے اور اپنے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے دی ہے اور جس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔''

شرح: ......قیامت برپا ہونے کے تین قسم کے دلائل ہیں، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع امت، جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں قیامت کا بڑی تاکید اور تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس کے ایسے ایسے اوصاف گنوائے ہیں جن سے انسان لرز کر رہ جاتا اور اس کے لیے تیاری کرنے لگ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ○ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ○﴾ (الحج: ۱، ۲)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو، یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑا حادثہ ہے، جس روز تم اسے دیکھو گے تو یہ حال ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی، اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور لوگ تجھے نشہ میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔''

دوسری جگہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْحَآقَّةُ ○ مَا الْحَآقَّةُ ○ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحَآقَّةُ ○ ﴾ (الحاقة: ۱۔۳)



’’سچ مچ ہونے والی چیز، کیا ہے وہ سچ مچ ہونے والی چیز، اور آپ کو کیا معلوم کہ کیسی کچھ ہے وہ سچ مچ ہونے والی چیز؟‘‘

اور سورۃ القارعہ میں فرمایا گیا:

﴿ اَلْقَارِعَةُ o مَا الْقَارِعَةُ o وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ o يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ o وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ o ﴾ (القارعة: ۱-۵)

’’کھڑکھڑانے والی چیز کیا ہے کھڑکھڑانے والی چیز، اور آپ کو کیا معلوم کہ کیا ہے کھڑکھڑانے والی چیز؟، جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گی، اور پہاڑ دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہو جائیں گے۔‘‘

قرآن مجید میں قیامت کے بہت سارے اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو کہ بڑے خوفناک اور پریشان کن ہیں، اور یہ اس لیے کہ قیامت بڑا عظیم واقعہ ہے۔ اگر ہمارا قیامت پر ایمان نہیں ہوگا تو ہم اس کے لیے نیک اعمال نہیں کریں گے، جب تک انسان روز قیامت پر ایمان نہیں لائے گا اور اسے اس کے ان اوصاف سے آگاہ نہیں کیا جائے گا جن سے اسے اس دن کی تیاری کے لیے آمادہ عمل کیا جا سکتا ہو تو وہ ہرگز اس کے لیے عملی زندگی نہیں اپنائے گا۔

رہی سنت رسول ﷺ تو قیامت کے ذکر پر مشتمل بہت ساری ایسی احادیث وارد ہیں جن میں رسول علیہ السلام نے اس دن وقوع پزیر ہونے والے حالات و واقعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ جس طرح کہ حوض، پل صراط اور نامہ اعمال وغیرہ کے ضمن میں آگے چل کر آئے گا۔

جہاں تک اجماع کا تعلق ہے، مسلمانوں کا ایمان بالآخرت پر قطعی اجماع ہے، تمام اہل اسلام کے نزدیک قیامت کا منکر کافر ہے۔ اِلّا یہ کہ وہ جاہل اور اسلام سے اجنبی ہو، ایسے شخص کو اسلام کے اس بنیادی عقیدہ سے آگاہ کیا جائے گا، اگر وہ پھر بھی انکار قیامت پر مصر ہو تو وہ کافر ہے۔

علاوہ ازیں دلائل کی ایک چوتھی قسم بھی ہے، اور وہ ہیں آسمانی کتب، بایں طور کہ ان کا روز آخرت کے اثبات پر اتفاق ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر یہود و نصاریٰ کا ہمیشہ سے ایمان رہا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے فوت شدگان کو مرحوم یا اس جیسے دیگر الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا اب بھی روز قیامت پر ایمان ہے۔

دلائل روز قیامت کی پانچویں قسم عقل ہے۔ اور اس طرح کہ اگر یہ دن نہ آنا ہوتا تو وجود کائنات عبث اور لایعنی قرار پاتا، جبکہ اللہ تعالیٰ عبث سے منزہ ہے۔ آخر ان لوگوں کے ساتھ کون سی حکمت وابستہ ہے جنھیں پیدا کرنے کے بعد انہیں کچھ کام کرنے کا پابند بنایا جائے اور کچھ کام کرنے سے روک دیا جائے، بعض امور کو ان کے لیے لازم قرار دیا جائے اور بعض کو مندوب و مستحسن۔ پھر وہ مر جائیں، اور نہ ان کا کوئی حساب و کتاب ہو اور نہ جزا و سزا؟

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَo فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo﴾ (المؤمنون: ۱۱۶-۱۱۵)



''کیا تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ پس بلند ہے اللہ سچا بادشاہ، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو بڑی عزت والے عرش کا مالک ہے۔''

مزید ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ إِلٰى مَعَادٍ﴾ (القصص: ٨٥)

''یقیناً جس نے آپ پر قرآن کو فرض کیا ہے وہ آپ کو آپ کے وطن لوٹا کر رہے گا۔''

یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ قرآن بھی فرض ہو اور اس کے احکام پر عمل کرنا بھی فرض ہو، مگر کسی ایسی جگہ پلٹ کر نہ جانا ہو جہاں یہ پتا چلایا جاسکے کہ ہم نے احکام قرآن کا کس حد تک نفاذ کیا؟

قبروں سے لوگوں کا اُٹھایا جانا

❑ قیامت کے دن جو دوسرا کام ہوگا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَيَقُوْمُ النَّاسُ مِنْ قُبُوْرِهِمْ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا .))

''لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مختون حالت میں رب العالمین کے سامنے حاضر ہوں گے۔''

شرح: ......[مِنْ قُبُوْرِهِمْ] ..... لوگوں کا قبروں سے اٹھنا علی سبیل الاغلب ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگ غیر مدفون بھی ہوتے ہیں۔

[لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ] ......اور یہ اس لیے کہ انہیں اللہ رب العالمین بلائے گا۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ٥ يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ٥﴾ (ق: ٤١-٤٢)

''اور سنیں جس دن آواز دے گا آواز دینے والا قریب کی جگہ سے، اس دن وہ یقینی چیخ سن لیں گے، وہ قبروں سے نکل پڑنے کا دن ہے لوگ اس عظیم نداء کو سن کر اپنی قبروں سے اپنی رب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ٥ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ٥ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ٥﴾

(المطففين: ٤-٦)

''کیا انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ انہیں یقیناً دوبارہ زندہ اٹھایا جائے گا، ایک بڑے سخت دن میں، جس دن سب لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے۔''

[**حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا.**] ..... "حفاۃً" ننگے پاؤں، انہوں نے نہ جوتے پہن رکھے ہوں گے اور نہ موزے۔

عراۃً بدن سے ننگے۔

غرلًا غرل، اُغرل کی جمع ہے۔ غیر مختون آدمی۔ یعنی ان کی پیدائش سے کوئی چیز بھی کم نہ ہوگی، یہاں تک کہ ختنہ کرتے وقت جو حصہ کاٹ دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن وہ بھی واپس آ جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے:

﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ (الانبیاء: ۱۰۴)

''جس طرح ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کرنا شروع کیا تھا ہم اسے پھر دہرادیں گے۔''

پورے کے پورے انسان کا اعادہ کیا جائے گا اور اس کے جسم سے کوئی چیز کم نہیں کی جائے گی۔ اور اس سلسلے میں مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز روانہ رکھا جائے گا۔

جب نبی کریم ﷺ نے یہ بات فرمائی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: یارسول اللہ! پھر تو مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''معاملہ اس خیال سے بھی سنگین ہوگا۔'' ❶

دوسری روایت میں ہے۔ ''معاملہ اس بات سے بہت سنگین ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں۔'' ہر انسان کی اپنی حالت اسے دوسروں سے بے نیاز کردے گی۔

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ٥ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ٥ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ٥ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ٥﴾ (عبس: ۳۴-۳۷)

''اس دن دور بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے، اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے، اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے، اس دن ہر شخص کے لیے ایک حالت ہوگی جو اس کے لیے کافی ہوگی۔''

نہ کوئی آدمی کسی عورت کی طرف دیکھے گا اور نہ کوئی عورت کسی آدمی کی طرف، یہاں تک کہ اس کا باپ یا اس کا بیٹا بھی اس خوف کے پیش نظر اس سے دور بھاگے گا کہ کہیں وہ اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کردے۔ جب صورت حال یہ ہوگی تو ایسے میں مردوں کا عورتوں کی طرف یا عورتوں کا مردوں کی طرف دیکھنا ممکن نہ ہوگا۔ بعدازاں انہیں لباس پہنا دیا جائے گا، اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ ❷

قیامت کے دن سورج ایک میل کے فاصلہ پر ہوگا

❑ قیامت کے دن تیسرے کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَتَدْنُوْ مِنْهُمُ الشَّمْسُ.)) ''اور سورج ان کے قریب آ جائے گا۔''

---

❶ اسے بخاری نے روایت کیا (۶۵۲۷)، جبکہ دوسری روایت صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ (۲۸۵۹)

❷ اسے صحیح بخاری (۳۳۴۹) اور مسلم (۲۸۶۰) نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

شرح: ...... یہ سورج ان سے ایک میل کی مسافت پر ہوگا۔میل سے مراد مسافت معلوم کرنے کا نشان راہ ہو یا سرمہ کی سلائی۔سورج بہر حال قریب ہوگا۔ جب دنیا میں زمین سے اس قدر دوری کے باوصف اس کی حرارت کا یہ عالم ہے تو جب وہ ایک میل کی مقدار میں سروں پر کھڑا ہوگا ❶ تو اس کی تپش کا پھر کیا حال ہوگا؟

سوال: معروف یہ ہے کہ اگر سورج اپنے خط استواء سے بال برابر بھی زمین کے قریب ہو جائے تو اسے بھسم کر ڈالے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس دن اس قدر قریب ہونے کے باوجود مخلوق کو نہ جلائے؟

جواب: لوگ قیامت کے دن اپنی موجودہ قوت کے حامل نہیں ہوں گے بلکہ اس دن ان کی قوت برداشت اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

لوگوں کے لیے اس وقت پچاس دنوں تک کچھ کھائے پیئے بغیر دھوپ میں کھڑا رہنا ممکن نہیں ہے۔مگر وہ قیامت کے دن پچاس ہزار سال تک بغیر خوراک اور پانی کے اور بغیر سائے کے کھڑے رہیں گے، اس دوران وہ بڑے بڑے ہولناک مناظر کا مشاہدہ کریں گے اور انہیں برداشت بھی کریں گے۔

دوزخیوں کے بارے میں تصور کیجئے کہ وہ اس عظیم آفت کو کس طرح برداشت کریں گے:

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا﴾ (النساء: ٥٦)

''جب کبھی ان کی جلدیں گل جائیں گی تو ہم انہیں دوسری جلدیں بدل دیں گے۔''

اسی طرح جنتی آدمی جس طرح اپنی بادشاہت کے قریب ترین حصے کو دیکھے گا اسی طرح ایک ہزار سال کی مسافت پر اس کے آخری حصے کو بھی دیکھ لے گا۔جس طرح کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔ ❷

سوال: کیا قیامت کے دن کوئی شخص سورج کی حرارت سے محفوظ بھی رہے گا؟

جواب: جی ہاں، کتنے ہی ایسے خوش نصیب لوگ ہوں گے۔جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں اس دن جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے مطلع کرتے ہوئے فرمایا: ''عادل حکمران، وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری میں نشو ونما پائی۔ وہ آدمی جس کا دل مساجد کے ساتھ معلق ہے۔ وہ دو آدمی جنہوں نے اللہ کے لیے محبت کی، وہ اسی پر اکٹھے ہوئے اور اسی پر جدا ہوئے، وہ آدمی جس نے اس قدر چھپا کر صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس نے دائیں ہاتھ سے کیا خرچ کیا ہے، اور ایک وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔'' ❸

ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے لوگ ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

---

❶ ملاحظہ ہو: صحیح مسلم (٢٨٦٤) من حديث المقداد بن أسود رضی الله عنه ۔

❷ اسے احمد (٢/٦٤) ترمذی (٢٥٥٣)، حاکم (٢/٥٠٩) نے روایت کیا، البانی نے "الضعيفة" میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔(١٩٨٥)

❸ اسے صحیح بخاری (٦٦٠) اور صحیح مسلم (١٠٤١) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّہ] ...... یعنی مگر وہ سایہ جسے اللہ تعالیٰ تخلیق کرے گا۔ اس کا وہ معنی نہیں ہے جس طرح بعض لوگوں کو وہم ہوا کہ اس سے مراد ذات باری تعالیٰ کا سایہ ہے۔ اس لیے کہ یہ معنی باطل ہے۔ اور باطل اس لیے کہ یہ اس امر کو مستلزم ہے کہ اس وقت سورج اللہ تعالیٰ کے اوپر ہوگا۔

ہم دنیا میں اپنے سائے کا خود آپ بندوبست کر لیتے ہیں، مگر قیامت کے دن صرف وہی سایہ ہوگا جسے اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا، تاکہ اس کے بندوں سے جسے وہ چاہے وہ اس سائے میں جگہ حاصل کر سکے۔

روزِ قیامت اعمال کے مطابق لوگ پسینے میں شرابور ہوں گے

❑ قیامت کے دن وقوع پذیر ہونے والا چوتھا کام، جس کا مؤلف رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر کیا ہے:

شرح:......[وَيُلْجِمُهُمُ الْعَرَقُ.]...... یعنی پسینہ ان کی اس جگہ تک پہنچ جائے گا جس جگہ گھوڑے کو لگام دی جاتی ہے۔ اور وہ جگہ منہ ہے مگر یہ وہ انتہائی مقام ہے جہاں تک پسینہ پہنچے گا، اس لیے کہ کسی کا پسینہ ٹخنوں تک، کسی کا گھٹنوں تک، کسی کا کمر تک اور کسی کا منہ تک پہنچے گا۔ لوگ پسینہ کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔ اور یہ پسینہ گرمی کی شدت کی وجہ سے آئے گا، اس لیے کہ رش بہت زیادہ ہوگا، سختی کا عالم ہوگا اور سورج انتہائی قریب ہوگا، جس کی وجہ سے لوگوں کو پسینہ آئے گا مگر وہ ان کے اعمال کے مطابق آئے گا۔

سوال: یہ کس طرح ہو سکتا ہے جبکہ لوگ ایک ہی جگہ میں موجود ہوں گے؟

جواب: ہم نے ایک اصولی قاعدہ وضع کر دیا ہے جس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ غیبی امور میں کیوں؟ اور کس طرح؟ کی بحث چھیڑے بغیر ان پر ایمان لانا، اور ان کی تصدیق کرنا واجب ہوا کرتا ہے، اس لیے کہ یہ ہماری عقلوں سے ماوراء ہیں، ہمارے لیے ان کا ادراک کرنا بھی ناممکن ہے اور ان کا احاطہ کرنا بھی۔ اگر ایسے دو آدمیوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا جائے جن میں سے ایک مومن ہو اور دوسرا کافر، تو مومن کو اس کے استحقاق کے مطابق نعمتوں سے نوازا جائے گا اور کافر کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دیا جائے گا۔ حالانکہ وہ ایک ہی قبر میں مدفون ہیں۔ ہم قیامت کے دن کے پسینے کے بارے میں بھی یہی کچھ کہیں گے۔

سوال: کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پسینے کی اونچائی کے اعتبار سے مختلف لوگوں کو الگ الگ جگہوں میں جمع کر دے گا، مثلاً جنہیں منہ تک پسینہ آئے گا انہیں ایک جگہ میں جنہیں ٹخنوں تک آئے گا انہیں دوسری جگہ اور جنہیں گھٹنوں تک آئے گا انہیں تیسری جگہ میں......؟

جواب: ہم یہ بات بالجزم تو نہیں کہہ سکتے، واللہ اعلم، البتہ اس کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا اور اس کی نظیر اہل ایمان کو عطا کردہ نور ہے جو ان کے آگے آگے اور دائیں طرف دوڑ رہا ہوگا، جبکہ کفار اندھیرے میں پڑے ہوں گے۔



ہمارے لیے قیامت کے دن پر ایمان لانا ضروری ہے، اس دن وقوع پزیر ہونے والے امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مگر کیوں؟ اور کیسے؟ کی بحث کا ہمارے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔

میزان کے قیام کا اثبات

❑ قیامت کے دن ہونے والا پانچواں کام، اس کے بارے میں مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَتُنْصَبُ الْمَوَازِيْنُ فَتُوْزَنُ بِهَا اَعْمَالُ الْعِبَادِ .))

''ترازو نصب کر دیئے جائیں گے اور ان کے ساتھ بندوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔''

شرح:..... ترازو کی تنصیب اللہ تعالیٰ کرے گا، تاکہ ان کے ساتھ بندوں کے اعمال کا وزن کیا جائے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے ''الموازین'' جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ نصوص شرعیہ میں جمع کا صیغہ بھی استعمال ہوا ہے اور مفرد کا بھی۔ جمع کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (الانبياء : ٤٧)

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ (الاعراف : ٩-٨)

''اور اس دن اعمال کا وزن ہونا حق ہے پس جس شخص کے وزن بھاری ہو گئے تو یہی لوگ ہیں کامیاب ہونے والے، اور جس شخص کے وزن ہلکے ہو گئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نقصان میں ڈالا اپنے آپ کو۔''

اور اس کے افراد کی مثال نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

((کلمتان حبیبتان الی الرحمن ، خفیفتان علی اللّسان ، ثقیلتان فی المیزان ، سبحان الله وبحمده ، سبحان الله العظیم .))

''دو کلمے ایسے ہیں جو رب رحمان کو بڑے پسند ہیں، زبان پر ہلکے اور میزان میں بھاری ہیں، اور وہ ہیں: سبحان الله و بحمده سبحان الله العظیم۔''[1]

اس جگہ آپ ﷺ نے مفرد کے طور پر ''فی المیزان'' فرمایا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنی آیات اور اس حدیث میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے موزون کے اعتبار سے جمع لایا گیا ہے، اس لیے کہ وہ متعدد ہے، اور اس اعتبار سے مفرد

[1] اسے صحیح بخاری (٦٤٠٦)، اور صحیح مسلم (٢٦٩٤) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

لایا گیا ہے کہ میزان ایک ہوگا، یا اسے ہر امت کے میزان کے اعتبار سے مفرد لایا گیا ہے یا نبی کریم ﷺ کے ارشاد: "ثقیلتان فی المیزان" سے مراد: "ثقیلتان فی الوزن" ہے۔

مگر ظاہر یہ ہے۔ واللّٰہ اعلم کہ قیامت کے دن میزان ایک ہوگا، اور جمع اسے موزون کے اعتبار سے لایا گیا ہے۔ اور اس کی دلیل ہے:

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (الاعراف: ٨) "پس جس شخص کے وزن بھاری ہو گئے۔"

[فَتُنْصَبُ الْمَوَازِيْنُ] ..... اس عبارت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن رکھے گئے ترازو بہت حسّی ہوں گے اور یہ کہ وزن راجح اور مرجوح کے معہود کے مطابق ہوگا، اور یہ اس لیے کہ کتاب وسنت میں وارد کلمات میں اصل یہ ہے کہ انہیں معہود معروف پر محمول کیا جائے اِلا یہ کہ کوئی دلیل اسے اس مفہوم سے خارج کر دے۔ نزول قرآن حکیم سے آج تک مخاطبین کے نزدیک معہود معروف یہ ہے کہ میزان حسّی ہوتا ہے اور راجح ومرجوح بھی۔

مگر ایک جماعت کو اس سے اختلاف ہے۔

معتزلہ کے نزدیک قیامت کے دن حسی میزان کا کوئی وجود نہیں ہوگا، اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے اعمال کا علم ہے اور اس نے انہیں شمار کر رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میزان سے مراد معنوی میزان ہے، جو کہ عدل سے عبارت ہے۔

مگر معتزلہ کا یہ قول باطل ہے، اس لیے کہ یہ ظاہر لفظ اور اجماع سلف کے مخالف ہے، نیز اس لیے بھی کہ اگر ہم میزان سے عدل مراد لیں تو پھر اسے میزان سے تعبیر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اسے عدل سے تعبیر کرنا چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ دل کو کلمہ (میزان) سے زیادہ بھاتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ﴾ (النحل: ٩٠) "یقیناً اللہ تعالیٰ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے۔"

روزِ قیامت بندوں کے اعمال کو تولا جائے گا

[فَتُوْزَنُ بِهَا اَعْمَالُ الْعِبَادِ.] ..... مؤلف رحمہ اللہ کا یہ قول اس امر میں صریح ہے کہ جو چیز تولی جائے گی وہ انسان کے اعمال ہوں گے۔ اس جگہ دو بحثیں کی جا سکتی ہیں:

پہلی بحث: عمل کا وزن کس طرح کیا جا سکتا ہے، وہ جسم تو نہیں ہے کہ اس کا وزن کیا جا سکے، عمل تو عامل کے ساتھ قائم ایک وصف کا نام ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی اعمال کو اجسام میں تبدیل کر دے گا جو کہ اس کی قدرت کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں ہے، اور اس کی نظیر موت ہے، اسے قیامت کے دن مینڈھے کی شکل دے کر جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔[1] حالانکہ موت ایک معنوی چیز ہے، وہ جسم نہیں ہے، ذبح ملک الموت کو نہیں کیا جائے گا، بلکہ نفس موت کو کیا جائے

[1] جس طرح کہ صحیح بخاری: ٤٧٣٠ اور صحیح مسلم: ٢٨٤٩ میں ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔



گا۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اسے ایسا جسم بنادے گا جس کا مشاہدہ کیا جائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اعمال کو بھی جسم عطا کردے گا جن کا حسی ترازو کے ساتھ وزن کیا جائے گا۔

مؤلف رحمہ اللہ کا کلام اس امر میں صریح ہے کہ جس چیز کا وزن کیا جائے گا وہ انسان کے اعمال ہوں گے، وہ اچھے ہوں یا بُرے۔ اور قرآن کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ٥ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ٥ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ٥﴾ (الزلزال: ۶۔۸)

''اس دن لوگ گروہ در گروہ نکلیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں، پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

اس آیہ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اس دن انسان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا، وہ اعمال اچھے ہوں یا برے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''کلمتان حبیبتان......'' [1] بھی اسی امر میں واضح اور بالکل صریح ہے کہ جس چیز کا وزن کیا جائے گا وہ انسان کے اعمال ہوں گے۔ اس بارے میں بہت سی نصوص وارد ہیں:

ان میں سے ایک نص پرزے والے شخص کے واقعہ پر مشتمل ہے، یہ وہ آدمی ہوگا جسے قیامت کے دن لوگوں کے سامنے لایا جائے گا اور ننانوے رجسٹروں میں مندرجہ اس کے اعمال اس کے سامنے رکھے جائیں گے، جن میں سے ہر رجسٹر حد نگاہ تک پہنچتا ہوگا، اور وہ ان کا اعتراف کرے گا، اس سے پوچھا جائے گا: کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے یا تو نے کوئی نیکی کی تھی؟ وہ جواب دے گا: نہیں میرے پروردگار! اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری ایک نیکی ہمارے پاس موجود ہے اس پر ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ لایا جائے گا، جس میں لکھا ہوگا: أشهد ان لا اِلٰه الا اللّٰه وان محمدًا رسول الله. وہ کہے گا: میرے رب! ان رجسٹروں کے سامنے اس پرزے کی کیا اہمیت ہے؟ اس پر اس سے کہا جائے گا: یقیناً تجھ پر ظلم نہیں ہوگا۔ فرمایا: اس کے بعد وہ رجسٹر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے۔ اور پرزہ دوسرے پلڑے میں، وزن کرنے پر رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور پرزہ بھاری ہو جائے گا...... الحدیث۔'' [2]

اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ وزن اعمال کے رجسٹروں کا ہوگا۔

کچھ دیگر نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عامل کا وزن کیا جائے گا۔ مثلاً ارشاد باری ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ٥﴾ (الكهف: ۱۰۵)

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

[2] اسے احمد (۲/۲۱۳) اور ترمذی (۲۶۳۹) نے روایت کیا اور اسے حسن کہا، اسے ابن ماجہ (۴۳۰۰) اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا (۱/۵۲۹) اور فرمایا: اس کی سند مسلم کی شرط پر صحیح ہے، اور ذہبی نے ان سے موافقت کی، اور البانی نے ''الصحیحة'' (۱۳۵) میں اسے صحیح کہا۔



''یہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور اس کی ملاقات کا، پس ضائع ہوگئے ان کے اعمال، پس ہم قیامت کے دن ان کے لیے وزن قائم نہیں کریں گے۔''

مگر اس آیت سے یہ استدلال کرنا متنازع ہے، کہا جا سکتا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ کا معنی یہ ہے کہ ان کے اعمال کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں ہوگی۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آتا ہے کہ وہ پیلو کے درخت پر مسواک بنانے کے لیے چڑھے ان کی پنڈلیاں بہت پتلی تھیں، وہ تیز ہوا کی وجہ سے لرزنے لگے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ منظر دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کس چیز سے ہنستے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پنڈلیوں کے پتلے پن کی وجہ سے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ میزان میں اُحد پہاڑ سے بھی وزنی ہوں گی۔'' ❶

اس طرح وزن کے حوالے سے تین چیزیں سامنے آ گئیں: عمل، عامل اور صحائف۔

بعض علماء کے نزدیک ان میں تطبیق کی یہ صورت ہے کہ بعض لوگوں کے اعمال کا وزن ہوگا، بعض کا اپنا اور بعض ایسے بھی ہوں گے جن کے اعمال کے صحائف کا وزن کیا جائے گا۔

جبکہ بعض دوسرے علماء ان میں اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ اعمال کا وزن کرنے سے مراد ان کا صحائف میں اندراج کی صورت میں وزن کرنا ہے، البتہ بعض ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کا اپنا وزن کیا جائے گا۔

لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وزن اعمال کا ہوگا، جبکہ بعض مخصوص لوگوں کے اعمال کے صحائف کا وزن کیا جائے گا یا خود ان کا۔

مگر جو کچھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اور پرزے والے شخص کے واقعہ میں وارد ہوا ہے تو یہ ایسا معاملہ ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے خاص کر دے۔

نیکیوں کا گناہوں سے بڑھنا انسان کی کامیابی کا ذریعہ ہوگا

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (المؤمنون: ١٠٢)

''پس جس کے ترازو بھاری ہوگئے تو یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پائیں گے۔''

---

❶ اسے احمد نے روایت کیا (۱/۴۲۱)، ہیثمی "مجمع الزوائد" (۹/۲۸۹) میں فرماتے ہیں: ''اسے احمد، ابویعلی، بزار اور طبرانی نے کئی سندوں سے روایت کیا، اور اس کی بہترین سند وہ ہے جس میں عاصم بن ابی نجود راوی ہے، جو کہ ضعیف ہونے کے باوصف حسن الحدیث ہے۔ احمد اور ابویعلی کے دوسرے راوی صحیح کے راوی ہیں۔



شرح:.....[فَمَنْ] ..... (من) شرطیہ ہے۔
اور جواب شرط ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ جملہ ہے۔
جملہ جزائیہ کو حصر کے انداز میں، جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا، جو کہ ثبوت اور استمرار کا فائدہ دیتا ہے۔
اور بعد پر دلالت کرنے والا اسم اِشارہ ﴿فَاُولٰٓئِكَ﴾ ان کے علو مرتبت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
﴿هُمُ﴾ ضمیر فصل ہے جو کہ حصر اور تو کید کا فائدہ دیتی ہے، نیز خبر اور صفت کے درمیان فصل کا فائدہ دیتی ہے۔
مفلح وہ آدمی ہوتا ہے جو مطلوب کے حصول میں کامیاب ہو جائے اور مرہوب (جس سے ڈرا جائے) سے نجات پا جائے۔ اس طرح اس کی پسندیدہ چیز اسے حاصل ہو جائے اور غیر پسندیدہ چیز سے محفوظ رہے۔
ترازو بھاری ہونے سے مراد نیکیوں کا برائیوں سے بڑھ جاتا ہے۔
قرآنی آیت: ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں عربی گرائمر کی رو سے ایک اشکال ہے، اور وہ یہ کہ ﴿مَوَازِيْنُهٗ﴾ میں ضمیر مفرد ہے جبکہ ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں جمع۔
اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿مَنْ﴾ شرطیہ، جمع و افراد دونوں کے لیے مستعمل ہے، لفظ کے اعتبار سے اس کی طرف مفرد ضمیر لوٹتی ہے اور معنی کے اعتبار سے جمع۔ جس جگہ بھی ﴿مَــنْ﴾ استعمال ہوگا، اس کی طرف ضمیر کا بالافراد لوٹنا بھی جائز ہے۔'' اور بالجمع بھی۔ قرآن مجید میں اس طرح کا استعمال کثرت کے ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:
﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًاo﴾
''اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے، یقیناً اللہ نے اسے اچھا رزق دیا ہے۔''
اس آیہ کریمہ میں پہلے لفظ کا خیال رکھا گیا، پھر معنی کا اور پھر لفظ کا۔

گناہوں کی زیادتی کے سبب انسان کی تباہی

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَo﴾ (المؤمنون: ۱۰۳)
''اور جس شخص کے ترازو ہلکے ہو گئے تو یہی ہیں وہ لوگ جنھوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔''
اس جگہ اشارہ بعد کے لیے ہے، اور یہ ان کی تحقیر کے لیے ہے نہ کہ تعظیم کے لیے۔
﴿خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ کافر اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، اپنے اہل وعیال کو بھی اور اپنے مال کو بھی۔

﴿قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (الزمر: ١٥)

''کہہ دیجئے کہ یقیناً حقیقی نقصان والے تو وہ ہیں جنہوں نے نقصان میں ڈالا اپنے آپ کو بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی قیامت کے دن۔''

جبکہ نیک اعمال کرنے والا بندہ مومن اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے، اپنے گھر والوں کو بھی اور اپنے مال کو بھی۔

کفار نے اپنے آپ کو تو اس طرح نقصان میں رکھا کہ انہوں نے دنیا میں اپنے وجود سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ انہوں نے دنیا میں رہ کر نقصان وزیاں کے علاوہ کچھ بھی نہ کمایا، اور اپنے مال کو اس طرح نقصان میں رکھا کہ اس سے منفعت لینے سے محروم رہے، یہاں تک کہ انہوں نے اسے لوگوں میں بھی تقسیم نہ کیا تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ آخر یہ مال ان کے کس کام کا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ﴾ (التوبة: ٥٤)

''اور نہیں مانع ہوئی ان سے کوئی چیز کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے خرچ کردہ مال مگر صرف یہ بات کہ انہوں نے کفر کیا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ۔'' اور گھر والوں کو اس طرح نقصان میں رکھا کہ وہ جہنم کا ایندھن بن گئے۔

موازین کے ہلکا ہونے سے مراد گناہوں کا نیکیوں پر غلبہ یا نیکیوں کا کلیتاً فقدان ہے، مگر یہ بعض علماء کے اس قول کے پیش نظر ہے کہ کفار کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا، اس آیہ کریمہ اور اس جیسی دیگر قرآنی آیات کا ظاہری مفہوم یہی ہے۔

جبکہ علماء کا دوسرا قول یہ ہے کہ کفار کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝﴾ (الکهف: ١٠٣۔ ١٠٥)

''کہہ دیجیے! کیا ہم تمہیں ان لوگوں کی خبر دیں جو اعمال کے اعتبار سے بدترین خسارے میں ہیں؟ وہ لوگ کہ ضائع ہوگئی ان کی کوشش دنیا کی زندگی میں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سب کام اچھے کر رہے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور اس کی ملاقات کا، پس ضائع ہوگئے ان کے اعمال، لہٰذا ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔'' واللہ اعلم

اعمال کے دفاتر کا کھولا جانا

- قیامت کے دن ہونے والا چھٹا کام، جس کا مؤلف رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر کیا ہے:

((وَتُنْشَرُ الدَّوَاوِيْنُ وَهِيَ صَحَائِفُ الْأَعْمَالِ فَآخِذٌ كِتَابَهُ بِيَمِيْنِهِ وَآخِذٌ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ أَوْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهِ .))



''اعمال کے دفاتر کھول دیئے جائیں گے، کوئی اپنا نامہ اعمال اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑے گا اور کوئی بائیں ہاتھ سے یا اپنی پیٹھ کے پیچھے سے۔''

شرح: ......[تُنْشَرُ] ...... یعنی پھیلا دیئے جائیں گے، اپنے پڑھنے والوں کے لیے کھول دیئے جائیں گے۔

[الدَّوَاوِیْنُ] ...... دیوان کی جمع ہے۔ وہ رجسٹر جس میں اعمال لکھے جاتے ہیں، دواوین بیت المال، وغیرہ اسی سے ہے۔

[وَهِيَ صَحَائِفُ الْاَعْمَالِ] ...... یعنی وہ نامہ ہائے اعمال جنہیں اولاد آدم کے اعمال پر مامور فرشتے لکھا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ o وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ o كِرَامًا كَاتِبِيْنَ o يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَo﴾ (الانفطار: ۹-۱۲)

''ہرگز نہیں، بلکہ تم قیامت کے دن کو جھٹلاتے ہو۔ اور یقیناً تم پر نگہبان مقرر ہیں، عزت والے لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔''

انسان کے اعمال مسلسل لکھے جا رہے ہیں، اور قیامت کے دن اس کے اعمال کا رجسٹر اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًاo اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ (الاسراء: ۱۳، ۱۴)

''اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کی گردن میں لگا دیا ہے، اور ہم قیامت کے دن اس کے سامنے وہ کتاب نکال پیش کریں گے جو اسے کھلی ہوئی ملے گی، اپنی کتاب خود پڑھ لے، تو آج کے دن اپنے اوپر خود ہی حساب لینے والا کافی ہے۔''

علمائے سلف میں سے بعض کا قول ہے۔ اس نے تجھ سے انصاف کیا جس نے تجھے ہی تجھ پر محاسب مقرر کر دیا۔ اعمال کے صحیفوں میں نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں اور برائیاں بھی۔

جو نیکیاں لکھی جاتی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں: نیک اعمال، جن نیک اعمال کی انسان نے نیت کی، اور جن کا اس نے قصد و ارادہ کیا۔ انسان نے جو نیک اعمال کیے، ظاہر ہے وہ لکھے جائیں گے۔

جن نیک اعمال کی اس نے نیت کی، وہ بھی لکھے جائیں گے، مگر اس کے لیے صرف نیت کا اجر لکھا جائے گا۔ جس طرح کہ ایک صحیح حدیث میں اس مالدار آدمی کا قصہ درج ہے جو اپنا مال بھلائی کے کاموں میں خرچ کرتا تھا، اسے دیکھ کر ایک فقیر آدمی کہنے لگا: اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسے فلاں شخص کی طرح خرچ کرتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''وہ اپنی نیت کے ساتھ ہے، ان دونوں کا اجر برابر ہے۔'' [1]

---

[1] ایک حدیث کا جزء جسے احمد (۴/۲۳۰)، ترمذی (۲۳۲۵) اور ابن ماجہ (۴۲۲۸) نے ابو کبشہ انماری سے روایت کیا۔ ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ شیخ البانی نے اسے ''صحیح الجامع'' میں صحیح قرار دیا ہے۔ (۳۰۲۴)

وہ دونوں نیت کے اعتبار سے اجر میں برابر ہیں، عمل کے اعتبار سے نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ فقراء مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے، یا رسول اللہ! مالدار لوگ ہم سے سبقت لے گئے۔ اس پر نبی مکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس دفعہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر'' پڑھ لیا کرو۔ جب اس بات کا علم مالدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہوا، تو انہوں نے بھی ایسا ہی عمل شروع کر دیا۔ اس پر فقراء مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بات کی شکایت کرنے لگے، جس پر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''یہ اللہ کا فضل ہے اللہ اسے دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔'' [1]
اس وقت آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنی نیت کی وجہ سے ان کے عمل کو پا لو گے۔

نیز عدل کا تقاضا بھی یہی ہے، جس آدمی نے عمل نہیں کیا وہ عمل کرنے والے جیسا نہیں ہوسکتا۔ البتہ وہ نیت کے اجر میں اس جیسا ضرور ہوگا۔

جہاں تک ارادہ کا تعلق ہے تو اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: انسان کسی کام کا ارادہ کرے اور پھر اپنی طاقت کے مطابق جو کر سکتا ہو وہ بھی کر گزرے۔ مگر بعد ازاں وہ کسی وجہ سے اسے مکمل کرنے سے قاصر رہے، تو اس شخص کے لیے پورا پورا اجر لکھا جائے گا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (النساء: ۱۰۰)

''اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف مہاجر بن کر نکلے، پھر اسے موت پالے تو اس کا اجر اللہ پر ثابت ہو چکا۔''

یہ طالب علموں کے لیے خوشخبری ہے، جب انسان یہ ارادہ کرے کہ وہ اپنے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے گا۔ سنت رسول ﷺ کا دفاع کرے گا اور زمین میں اللہ کے دین کی نشر و اشاعت کرے گا، پھر یہ کچھ اس کے مقدر میں نہ ہو سکے، مثلاً علم حاصل کرتے کرتے اسے موت آ جائے، تو اس کے لیے اس کی نیت اور اسے عملی شکل دینے کی کوشش کا اجر لکھا جائے گا۔

بلکہ اگر کوئی عمل انسان کی عادت بن چکا تھا پھر وہ کسی سبب سے اس سے محروم رہا تو اس کے لیے اس کا اجر بھی لکھ دیا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ بیمار پڑ جائے یا سفر پر روانہ ہو جائے تو اس کے لیے ایسا ہی عمل لکھا جاتا ہے جیسا وہ مقیم ہونے اور تندرستی کی حالت میں کیا کرتا تھا۔'' [2]

دوسری قسم: انسان کسی چیز کا ارادہ کرے اور پھر اس پر قدرت حاصل ہونے کے باوجود اسے ترک کر دے، تو اس شخص کے لیے اس کی نیت کی پوری نیکی لکھی جائے گی۔

---

[1] اسے صحیح بخاری (۸۴۳)، اور صحیح مسلم (۵۹۵) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔

[2] اسے صحیح بخاری (۲۹۹۶) نے ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



جہاں تک برائیوں کا تعلق ہے، تو انسان کے ذمے اس کا کردہ گناہ بھی لکھا جاتا ہے، اور وہ گناہ بھی جس کا اس نے ارادہ کیا اور پھر اس کے لیے کوشش بھی کی، مگر اس کے کرنے سے قاصر رہا۔ اس شخص کے ذمے وہ گناہ لکھ لیا جائے گا جس کی اس نے نیت اور تمنا کی تھی۔

ارتکاب کردہ گناہ کا لکھ لیا جانا تو واضح ہی ہے، مگر جس گناہ کا اس نے ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشاں بھی رہا مگر کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کر سکا تو اس کا پورا گناہ اس کے ذمہ لکھ لیا جاتا ہے، اس لیے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: ''جب دو مسلمان تلواریں پکڑ کر ایک دوسرے کے مدمقابل آ جاتے ہیں تو پھر قاتل بھی جہنم میں جائے گا اور مقتول بھی، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! قاتل تو جہنم میں جائے گا ہی، مگر مقتول کس لیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس لیے کہ وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔'' [1] اسی طرح جس آدمی نے شراب نوشی کا ارادہ کیا مگر کوئی رکاوٹ آڑے آ گئی تو اس کے ذمہ پورا پورا گناہ لکھا جائے گا، اس لیے کہ اس نے تو پوری کوشش کی تھی۔

رہا وہ گناہ جس کی اس نے نیت اور تمنا کی، تو یہ گناہ اس کے ذمہ اس کی نیت کی وجہ سے لکھا جائے گا۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے آدمی کے بارے میں بتایا جسے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا تھا اور وہ اس میں غلط روش اختیار کیے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر ایک فقیر آدمی کہنے لگا: اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی فلاں جیسے کام کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اپنی نیت کے ساتھ ہے، دونوں کا گناہ برابر ہے۔'' [2]

اور اگر اس نے کسی برائی کا ارادہ کیا مگر پھر اسے چھوڑ دیا، تو اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ اگر اس نے اسے بے بس ہو کر ترک کیا جبکہ اس کے لیے کوشاں رہا، تو وہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے جیسا ہی ہے۔

۲۔ اگر اس نے اسے اللہ کے لیے ترک کر دیا تو وہ عند اللہ ماجور ہوگا۔

۳۔ اور اگر اس نے اسے بے رغبتی کی وجہ سے ترک کر دیا یا اس کا خیال ہی نہ رہا تو ایسے شخص پر نہ تو گناہ لازم آئے گا اور نہ ہی وہ اجر و ثواب حاصل کر پائے گا۔

اللہ عزوجل نیکیوں کا بدلہ عمل سے کہیں زیادہ دیتا ہے جبکہ برائیوں کا بدلہ عمل کے مطابق ہی دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (الانعام: ۱۶۰)

''جو شخص ایک نیکی لے کر آیا اس کے لیے اس سے دس گنا ہوگا، اور جو شخص ایک برائی کے ساتھ آیا اسے نہ سزا دی جائے گی مگر اس کے برابر ہی۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کی وجہ سے ہے، نیز اس وجہ سے کہ اس کی رحمت اس کے قہر و غضب پر سبقت لے گئی ہے۔

[1] اسے بخاری (۳۱) اور مسلم (۲۸۸۸) نے ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔
[2] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

[فَاٰخِذٌ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ] ..... "اٰخذٌ" مبتدا ہے، اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیری عبارت ہے: فمنهم أخذٌ اگر چہ یہ نکرہ ہے مگر اس کے ساتھ ابتدا جائز ہے، اس لیے کہ مقام تفصیل میں واقع ہے یعنی اس دن لوگ منقسم ہوں گے۔ ان میں سے کچھ اپنا اعمال نامہ اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑیں گے۔ اور وہ مومن ہوں گے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دایاں ہاتھ باعزت ہے۔ اسی لیے مومن تو اپنا اعمال نامہ دائیں ہاتھ سے پکڑے گا جبکہ کافر اسے بائیں ہاتھ سے پکڑے گا یا پھر پیٹھ کے پیچھے سے۔

[اَوْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهِ.] ..... "أو" شک کے لیے نہیں بلکہ تنویع کے لیے ہے۔

کلام مؤلف رحمہ اللہ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ لوگ اپنے اعمال نامے تین طرح سے پکڑیں گے: دائیں ہاتھ کے ساتھ، بائیں ہاتھ کے ساتھ اور پیٹھ کے پیچھے سے۔

مگر دراصل یہ اختلاف، صفات کا اختلاف ہے، جو شخص اپنا اعمال نامہ اپنی پیٹھ کے پیچھے سے پکڑے گا وہی اسے اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑے گا اور اسے پیچھے سے بڑھا کر پکڑے گا اس کا اپنے نامہ اعمال کو بائیں ہاتھ سے پکڑنا اس لیے ہے کہ اس کا اپنا شمار بائیں ہاتھ والوں میں ہوتا ہے، اور اسے پیٹھ کے پیچھے سے پکڑنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے دنیا میں کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا تو انصاف کا تقاضا یہی ٹھہرا کہ قیامت کے دن اس کے نامہ اعمال کو اس کی پیٹھ کے پیچھے کر دیا جائے۔ واللہ اعلم.

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا٥ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا٥﴾ (الاسراء: ١٤-١٣)

''اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے، اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن اس کا نامہ اعمال نکال کر سامنے کر دیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا، اپنا نامہ اعمال پڑھ لے آج تو خود ہی اپنے آپ پر حساب کرنے والا کافی ہے۔''

شرح:.....﴿طٰٓئِرَهٗ﴾ طائر کے معنی پرندے کے ہیں اور اس سے مراد انسان کے اختیاری اعمال ہیں وہ اچھے ہوں یا برے۔

﴿فِيْ عُنُقِهٖ﴾ یعنی اس کی گردن میں، گردن میں معلق چیز کا انسان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے، ایسی چیز اس کی ہلاکت پر ہی اس سے الگ ہوتی ہے۔

جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نامہ اعمال کو کھول کر ہر انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، اسے اپنا نامہ اعمال پڑھتے وقت کسی مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اس سے کہا جائے گا: (اقرء کتابك) اپنا نامہ اعمال خود آپ پڑھ لے، اور اس میں تیرے خلاف جو کچھ لکھا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

﴿كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ اس سے بڑھ کر عدل و انصاف اور کیا ہوگا کہ انسان کا حساب و کتاب خود اس کے ہی سپرد کر دیا جائے۔

عاقل انسان کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ اس کے اس نامہ اعمال میں کیا لکھا ہے جسے وہ قیامت کے دن اپنے سامنے کھلا پائے گا، ہمارے سامنے ایک ایسا دروازہ کھلا موجود ہے جو تمام برائیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اور وہ دروازہ توبہ کا ہے جو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہے، تو اس کا گناہ جس قدر بھی سنگین ہو اللہ اس سے اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے، حتیٰ کہ اگر بندہ سے بار بار گناہ سرزد ہو اور وہ بار بار اس سے توبہ کرے تو اللہ پھر بھی اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ اس وقت جب کہ معاملہ ہمارے اپنے اختیار میں ہے تو ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے نامہ اعمال میں اعمال صالحہ کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ مخلوق کا محاسبہ فرمائے گا

- قیامت کے دن وقوع پذیر ہونے والا ساتواں کام، جس کا مؤلف رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر کیا ہے:

((وَيُحَاسِبُ اللّٰهُ الْخَلَائِقَ وَيَخْلُوا بِعَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوْبِهِ كَمَا وُصِفَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ.))

''اور اللہ تعالیٰ مخلوقات کا محاسبہ کرے گا، اور اپنے مومن بندے کے ساتھ انتہائی اختیار کر کے اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کروائے گا جس طرح کہ یہ کتاب وسنت میں بتایا گیا ہے۔''

شرح:......[المحاسبة] ......قیامت کے دن بندوں کو ان کے اعمال پر مطلع کرنا۔

اس پر کتاب اللہ بھی دلالت کرتی ہے اور سنت رسول اللہ بھی، یہ اجماع سے بھی ثابت ہے اور عقل سے بھی۔

کتاب اللہ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝﴾ (الانشقاق: ٨۔٧)

''جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا، تو اس کا جلد ہی آسان سا حساب ہوگا۔''

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝﴾

(الانشقاق: ١٠ تا ١٢)

''اور جسے اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا گیا تو وہ جلد ہی موت کو پکارے گا اور جہنم کی دہکتی آگ میں داخل ہوگا۔''

سنت رسول اللہ ﷺ: متعدد احادیث میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ اللہ عزوجل مخلوقات کا محاسبہ کرے گا۔

اجماع امت: امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کا محاسبہ کرے گا۔

عقل: محاسبہ پر دلیل عقل بالکل واضح ہے، اس لیے کہ ہمیں فعل، ترک اور تصدیق کے اعتبار سے کئی اعمال کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے، اور عقل وحکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کو کسی عمل کے لیے مکلّف ٹھہرایا جائے تو اس کے لیے اس کا محاسبہ ہونا چاہیے۔

[الْخَلَائِقُ] ...... یہ خلیقۃ کی جمع ہے جو کہ ہر مخلوق کو شامل ہے۔ مگر اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو جنت میں بغیر حساب اور بغیر عذاب کے داخل ہوں گے، جس طرح کہ ''صحیحین'' میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے ایسے ستر ہزار لوگوں کو دیکھا جو جنت میں بغیر حساب اور عذاب کے داخل ہوں گے، اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ جھاڑ پھونک لیتے تھے، نہ آگ سے داغ لگواتے تھے نہ براشگون لیتے تھے، اور اپنے رب پر توکل رکھتے تھے۔ [1]

امام احمد جید سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار لوگ ہوں گے۔ [2]

امت اسلامیہ میں سے اس قدر کثیر تعداد میں لوگ بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ وللّٰہ الحمد.

مؤلف کا قول: ''الخلائق'' جنات کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ وہ بھی مکلّف ہیں، نص اور اجماع کی رو سے کافر جن جہنم میں جائیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ ادْخُلُوا فِيٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ﴾ (الاعراف: ۳۷)

''اللہ فرمائے گا، شامل ہو جاؤ دوزخ میں جنات اور انسانوں کے ان گروہوں کے ساتھ جو تم سے قبل گزر چکے ہیں۔''

جبکہ جمہور کے قول کے مطابق مومن جنات جنت میں جائیں گے۔ اور یہی مذہب صحیح ہے۔

اس کی دلیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (الرحمن: ۵۶۔۴۶) اور کیا چوپایہ جانوروں کا بھی محاسبہ ہوگا؟

جہاں تک قصاص کا تعلق ہے، تو وہ چوپایہ جانوروں کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سینگ والی بکری سے بے سینگ کی بکری کے لیے قصاص لیا جائے گا۔'' [3] یہ صرف قصاص کی حد تک ہے، ورنہ وہ نہ تو مکلّف ہیں، اور نہ ہی ان کے لیے جزا وسزا ہے۔

[وَيَخْلُوا بِعَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوبِهِ] ...... یہ بندہ مومن سے حساب لینے کا ایک انداز ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ساتھ علیحدگی اختیار کرے گا، جبکہ کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا، یعنی اس سے پوچھے گا: تو نے یہ کام کیا، تو نے یہ کام کیا...... یہاں تک کہ وہ ہر گناہ کا اعتراف و اقرار کرے گا۔ پھر اللہ فرمائے گا: ''میں نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی اور آج تیری مغفرت فرماتا ہوں۔'' [4]

---

[1] اسے بخاری (۶۵۴۱)، اور مسلم (۲۲۰) نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

[2] اسے امام احمد (۱/۵، ۴۱۱) نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن سے روایت کیا۔ مجمع الزوائد (۱۰/۴۱۰۔۴۱۱)

[3] اسے مسلم (۲۵۸۲) نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔

[4] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔



اللہ تعالیٰ اس کی اس طرح پردہ پوشی فرمائے گا کہ اسے نہ کوئی دیکھ سکے گا اور نہ سن سکے گا، اور یہ اللہ رب العزت کا بندہ مومن پر عظیم احسان ہے، اس لیے کہ اگر کوئی انسان لوگوں کے سامنے تجھ سے تیرے گناہوں کا اعتراف کرائے تو اگر چہ بعد میں تجھ سے درگزر سے ہی کام لے مگر اس سے تیری رسوائی تو ضرور ہوگی، لیکن اگر یہ سب کچھ تنہائی میں ہو، تو یہ اس کی طرف سے تیری پردہ پوشی ہے۔

کفار کا محاسبہ مومنوں سے مختلف ہوگا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَمَّا الْكُفَّارُ ؛ فَلا يُحَاسَبُوْنَ مُحَاسَبَةَ مَنْ تَوَزَّنُ حَسَنَاتُهُ وَسَيِّئَاتُهُ ؛ فَإِنَّهُمْ لا حَسَنَاتَ لَهُمْ ، وَلٰكِنْ تُعَدُّ اَعْمَالُهُمْ فَتُحْصىٰ فَيُوقَفُوْنَ عَلَيْهَا وَيُقَرَّرُوْنَ بِهَا وَيُخْزَوْنَ بِهَا .))

''جہاں تک کفار کا تعلق ہے، تو ان کا محاسبہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوگا جن کی حسنات وسیئات کا وزن کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ نیکیوں سے خالی ہاتھ ہیں، ان کے گناہوں کو شمار کیا جائے گا، جن کا وہ اعتراف کر لیں گے اور ان کی وجہ سے انہیں رسوا کیا جائے گا۔''

شرح:......حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کا حساب لینے، اس کے ساتھ علیحدگی اختیار کرنے اور اس سے اس کے گناہوں کا اعتراف کروانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''رہے کفار اور منافقین، تو ان کے بارے میں لوگوں کے سامنے اعلان کیا جائے گا:

''ان لوگوں نے اپنے رب کے بارے میں کذب بیانی سے کام لیا، خبردار! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔''[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ منافق آدمی سے ملاقات کر کے اس سے فرمائے گا: اے فلاں! کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی، کیا میں نے تجھے سردار نہیں بنایا تھا، کیا میں نے تیری شادی نہیں کروائی تھی، اور کیا میں نے گھوڑوں اور اونٹوں کو تیرے تابع نہیں کیا تھا، اور میں نے تجھے اس حال میں نہیں چھوڑا کہ تو سرداری کرتا رہا اور خوشحالی کی زندگی گزارتا رہا؟ وہ کہے گا! یہ سب کچھ درست ہے۔ اللہ فرمائے گا: کیا تجھے مجھ سے ملاقات کرنے کا یقین تھا؟ وہ جواب دے گا: نہیں، اس پر اللہ فرمائے گا: جس طرح تو نے مجھے بھلائے رکھا آج میں تجھے بھول جاؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ دوسرے شخص سے ملاقات کرے گا اور اس سوال کرے گا۔ تو وہ بھی پہلے کی طرح ہی جواب دے گا۔ اس سے بھی اللہ یہی فرمائے گا کہ: جس طرح تو نے مجھے بھلائے رکھا آج میں تجھے بھول جاؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ تیسرے شخص سے ملاقات کر کے اس سے بھی یہی سوال کرے گا، تو وہ جواب دے گا، میرے پروردگار! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا، نمازیں پڑھتا رہا، روزے رکھتا رہا، اور صدقہ وخیرات کرتا رہا، اس سے جہاں تک ہو سکے گا اپنی

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

اچھائیاں بیان کرتا رہے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا: اب ہم تیرے خلاف اپنا گواہ کھڑا کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ اپنے دل میں سوچے گا کہ میرے خلاف کون گواہی دے گا؟ پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ران، گوشت اور ہڈیوں سے کہا جائے گا: اب تم بولو۔ وہ اس کے عمل کے بارے میں بول کر بتا دیں گے۔

''ایسا اس کا عذر دور کرنے کے لیے کیا جائے گا۔ اور یہ منافق ہوگا، اور یہ وہ ہوگا جس پر اللہ ناراض ہوگا۔''[1]

تنبیہ: ......مؤلف رحمہ اللہ کے قول [مُحَاسَبَةَ مَنْ تَوَزَّنُ حَسَنَاتُهُ وَسَيِّئَاتُهُ] ..... ''میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس محاسبہ کی کفار سے نفی کی گئی ہے وہ نیکیوں اور برائیوں کے درمیان موازنہ کرنے کا محاسبہ ہے۔ رہا اس سے اقرار کروانے اور ڈانٹ ڈپٹ کا محاسبہ، تو وہ ثابت ہے۔ جس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔

فائدہ: ......بندے کا سب سے پہلے نماز پر محاسبہ ہوگا، اور لوگوں میں سب سے پہلے خونوں کا فیصلہ کیا جائے گا، اور یہ اس لیے کہ بدنی عبادات میں سے سب سے افضل عبادت نماز ہے۔ جبکہ حقوق العباد میں خون کی حرمت کو پامال کرنا سنگین ترین جرم ہے۔

حوضِ کوثر کا اثبات

☐ قیامت کے دن کی آٹھویں چیز کے بارے میں مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَفِيْ عَرَصَاتِ الْقِيَامَةِ الْحَوْضُ الْمَوْرُوْدُ لِلنَّبِيِّ ﷺ .))

''قیامت کے میدان میں نبی کریم ﷺ کا حوض ہوگا۔''

شرح: ......[الْعَرَصَاتِ] ..... یہ عرصة کی جمع ہے: عمارتوں کے درمیان کھلی جگہ، اس جگہ سے مراد روز قیامت کھڑے ہونے کی جگہیں ہیں۔

حوض: اصل میں پانی کے کھڑا ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ مگر اس جگہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کا حوض ہے۔ اس حوض کے بارے میں متعدد وجوہ سے گفتگو ہو سکتی ہے:

اولاً: یہ حوض اس وقت بھی موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم، میں اس وقت اپنے حوض کی طرف دیکھ رہا ہوں۔''[2]

آپ ﷺ ہی کا ارشاد مبارک ہے: ''اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔''[3]

آپ ﷺ کا یہ ارشاد اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ آپ کا حوض اس جگہ موجود ہو، لیکن چونکہ وہ ایک غیبی چیز ہے لہٰذا

---

[1] صحیح مسلم (۲۹۶۸)

[2] اسے بخاری (۶۵۹۰)، اور مسلم (۲۲۹۶) نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[3] اسے بخاری (۶۵۸۹) اور مسلم (۱۳۹۱) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

ہم اس کا مشاہدہ کرنے سے قاصر ہیں، آپ ﷺ کا یہ ارشاد اس امر کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ اس منبر کو قیامت کے دن آپ کے حوض پر رکھا جائے گا۔

ثانیاً: نبی کریم ﷺ کے اس حوض میں نہر کوثر سے دو پرنالے گرائے جائیں گے [1] کوثر ایک بہت بڑی نہر ہے جو نبی کریم ﷺ کو جنت میں عطا کی جائے گی، جس سے دو پرنالے آپ ﷺ کے حوض میں اتارے جائیں گے۔

ثالثاً: حوض کا وقت پل صراط عبور کرنے سے قبل ہوگا، اس لیے کہ وقت اس کا متقاضی ہوگا، لوگوں کو پل صراط عبور کرنے کے مرحلہ سے قبل پانی کی ضرورت ہوگی۔ [2]

رابعاً: حوض کوثر پر وہ لوگ آئیں گے جن کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان ہوگا، اور شریعت کی اتباع کرنے والے ہوں گے۔ جبکہ اتباع شریعت سے جی چرانے اور تکبر کرنے والوں کو اس سے دھتکار دیا جائے گا۔ [3]

خامساً: اس کے پانی کی کیفیت کے بارے میں مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ماء ہ أشدّ بیاضاً من ابتن وأحلی من العسل" ''اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے میٹھا ہوگا۔''

اس کی مہک کستوری کی مہک سے بھی عمدہ ہوگی۔ جس طرح کہ یہ نبی کریم ﷺ سے مروی حدیث سے ثابت ہے۔ [4]

سادساً: اس کے برتنوں کے بارے میں مؤلف فرماتے ہیں: "أنیتہ عدد نجوم السماء" ''اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔'' ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: "أنیتہ کنجوم السماء" ''اس کے برتن آسمان کے ستاروں جیسے ہوں گے۔'' یعنی اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی طرح بہت زیادہ اور چمک دار ہوں گے۔

سابعاً: اس کے اثرات کے بارے میں مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "من یشرب منہ شربۃ لا یظمأ بعدھا أبداً" ''جو کوئی اس سے ایک گھونٹ پانی پی لے گا اس کے بعد کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔'' حتی کہ پل صراط پر بھی نہیں ہوگا، اور نہ اس کے بعد ہوگا۔ ایسا اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت ہے، اس لیے کہ دنیا میں شریعت کے گھاٹ سے پیاس بجھانے والا کبھی خسارے میں نہیں رہتا۔

ثامناً: اس کی مساحت کے بارے میں مؤلف فرماتے ہیں: "طولہ شھر وعرضہ شھر" ''اس کا طول وعرض ایک ایک ماہ کی مسافت کے برابر ہوگا۔''

مؤلف رحمہ اللہ کا یہ قول اس کے مدوّر ہونے کا متقاضی ہے، اس لیے کہ اس کا ہر جانب سے اس مسافت کے برابر ہونا اس کے مدور ہونے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ یہ مسافت نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اونٹوں کی عام رفتار کے اعتبار سے ہے۔

---

[1] اسے مسلم (۲۳۰۱۔ ۲۳۰۰) نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] اسے عبداللہ بن امام احمد نے مسند (۴/۱۳) پر اپنی زیادات میں روایت کیا، فتح الباری (۱۱/۴۶۷) میں حافظ فرماتے ہیں: یہ اس امر میں صریح ہے کہ حوض صراط سے قبل ہوگا۔

[3] ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری (۶۵۷۶)، صحیح مسلم (۲۲۹۷) عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ.

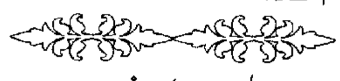
[4] اسے بخاری (۶۵۷۹)، اور مسلم (۲۲۹۲) نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



تاسعاً: کیا قیامت کے دن دوسرے انبیائے کرام کے بھی حوض ہوں گے؟

یقیناً اس کا جواب ہاں میں ہے۔ اس لیے کہ ایک حدیث میں آتا ہے۔ کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کا حوض ہے۔'' ❶ اگرچہ اس میں مقال ہے مگر معناً اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور عدل کے تحت اپنے نبی محمد ﷺ کو حوض عطا فرمایا: جس پر آپ کی امت کے اہل ایمان وارد ہوں گے اسی طرح وہ ہر نبی کو حوض عطا فرمائے گا تاکہ انبیاء سابقین پر ایمان لانے والے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

لیکن سب سے باعظمت حوض نبی کریم ﷺ کا ہوگا۔



پل صراط کا اثبات

❑ قیامت کے دن کی نویں چیز کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَالصِّرَاطُ مَنْصُوْبٌ عَلٰی مَتْنِ جَهَنَّمَ ، وَهُوَ الْجِسْرُ الَّذِیْ بَیْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ .))

''صراط کو جہنم پر نصب کیا جائے گا صراط وہ پل ہے جو جنت اور جہنم کے درمیان واقع ہے۔''

شرح: ......بعض علماء کے نزدیک وہ ایک کھلا راستہ ہے جس سے لوگ اپنے اعمال کے تناسب سے گزریں گے، اس لیے کہ لفظ صراط کا لغوی مدلول یہی ہے، نیز اس لیے بھی کہ نبی کریم ﷺ نے مطلع فرمایا ہے کہ وہ راستہ پھسلن والا اور کیچڑ ہے۔ ❷ یہ دونوں چیزیں صرف کھلے راستے میں ہوتی ہیں، تنگ راستے ایسے نہیں ہوا کرتے۔

جبکہ بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ راستہ انتہائی باریک ہے، جس طرح کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ❸

اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ جب وہ راستہ اس قدر باریک اور تیز ہے تو پھر اسے عبور کرنا کیسے ممکن ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اخروی امور کو دنیوی امور پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ اس راستے کو کس طرح عبور کریں گے، کیا سب لوگ اس پر اکٹھے ہو جائیں گے یا یکے بعد دیگرے گزریں گے؟

اس مسئلہ میں کسی ایک قول کے بارے میں بالجزم کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ ہر قول کی ٹھوس توجیہ ممکن ہے۔

[مَنْصُوْبٌ عَلٰی مَتْنِ جَهَنَّمَ] ..... یعنی وہ پل جہنم پر نصب ہے۔

---

❶ اسے ترمذی (۲۴۴۳)، اور ابن ابی عاصم نے ''السنہ'' (۷۳۴) میں روایت کیا۔ اس حدیث کو ہیثمی نے ''المجمع'' (۱۰/۳۶۳) میں دوسرے لفظوں سے روایت کیا ہے۔ اور فرمایا ہے: اس کی سند میں ایک راوی مروان بن جعفر سمیری ہے جس کی ابن ابی حاتم نے توثیق کی ہے، ازدی کہتے ہیں: یہ متکلم فیہ ہے اور اس کے دوسرے راوی ثقہ ہیں۔ ''الصحیحہ'' (۱۵۸۹) میں البانی فرماتے ہیں: یہ حدیث اپنی تمام سندوں کے ساتھ حسن یا صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو: فتح الباری (۱۱/۴۶۷)

❷ صحیح بخاری (۷۴۳۹)، صحیح مسلم (۱۸۳)

❸ اسے مسلم (۱۸۳) نے موصولاً روایت کیا۔ اس میں آتا ہے کہ ابوسعید نے فرمایا: مجھے خبر دی ہے کہ پل صراط بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔



پل صراط کی کیفیت

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((یمر علیه الناس علی قدر أعمالهم، فمنهم من یمر کلمح البصر، ومنهم من یمر کالبرق، ومنهم من یمر کالصریح، ومنهم من یمر کالفرس الجواد و منهم من یمر کرکاب الإبل، ومنهم من یعد و عدوا، ومنهم من یمشی مشیاً ومنهم من یزحف زحفاً ومنهم من یخطف خطفاً ویلقی فی جهنم، فإن الجسر علیه کلالیب تخطف الناس بأعمالهم.)) ❶

"لوگ اپنے اعمال کے تناسب سے پل صراط پر سے گزریں گے، کوئی آنکھ جھپکنے کی طرح گزر جائے گا۔ کوئی بجلی کی طرح، کوئی تیز ہوا کی طرح، کوئی تیز رفتار عمدہ گھوڑے کی طرح اور کوئی اونٹ کی طرح گزرے، ان میں سے کوئی تیز دوڑ کر، کوئی عام چال چل کر اور کوئی گھسٹ کر گزرے گا۔ کسی کو اوپر سے اچک لیا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا، اس لیے کہ پل صراط پر تیز نوک والے کنڈے ہوں گے جو لوگوں کو ان کے اعمال کے حساب سے اچک لیں گے۔"

شرح:......[یمر الناس]...... اس جگہ "الناس" سے مراد اہل ایمان ہیں، اس لیے کہ کفار کو جہنم میں لے جایا جا چکا ہوگا۔ لوگ پل صراط سے اپنے اپنے اعمال کے حساب سے گزریں گے، کچھ لوگ آنکھ جھپکنے کی طرح آناً فاناً گزر جائیں گے۔ جبکہ بعض بجلی کی طرح گزر جائیں گے۔ جبکہ بعض ہوا کی طرح، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوا تیز رفتار ہوا کرتی ہے، جو کہ کبھی ایک سو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی چلا کرتی ہے۔ کچھ اہل ایمان تیز رفتار گھوڑے کی طرح گزر جائیں گے تو کچھ اونٹ کی طرح۔ یاد رہے کہ اونٹ تیز رفتار گھوڑے سے بہت کم رفتار سے دوڑ سکتا ہے، کچھ اہل ایمان تیز گھوڑے کی طرح گزر جائیں گے تو کچھ اونٹ کی طرح۔ یاد رہے کہ اونٹ تیز رفتار گھوڑے سے بہت کم رفتار سے دوڑ سکتا ہے، کچھ تیز دوڑ کر پل صراط عبور کریں گے اور کچھ عام چال سے چل کر اور کچھ زمین پر گھسٹ کر اسے عبور کریں گے۔ ان میں سے ہر شخص پل صراط کو عبور کرنا چاہے گا۔ مگر اس میں اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اگر کسی کا کوئی اختیار حاصل ہوتا تو وہ اسے تیز رفتاری کے ساتھ عبور کر جاتا۔ اس کی یہ رفتار دنیا میں قبول شریعت کی رفتار کے تناسب سے ہوگی، جو شخص دنیا میں انبیاء و رسل کی تعلیمات کو قبول کرنے میں جس قدر تیز رفتار ہوگا وہ اسی قدر تیزی کے ساتھ پل صراط کو عبور کر لے گا، اور جو شخص اس حوالے سے دنیا میں تاخیر کرنے کا عادی ہوگا وہ پل صراط کو بھی اتنی ہی تاخیر سے عبور کر پائے گا۔ یہ پورا پورا بدلہ ہے۔ جزاء جنس عمل سے ہوا کرتی ہے۔

[ومنهم من یخطف] ...... یعنی ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہیں تیزی کے ساتھ اچک لیا جائے گا، اور ایسا

---

❶ اسے بخاری (۱۸۳۹) نے موصولاً اور مسلم (۱۸۳) نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



نوکدار بڑے بڑے کانٹوں کے ساتھ ہوگا جو پل صراط پر معلق ہوں گے اور لوگوں کو ان کے اعمال کے حساب سے اُچک لیں گے۔

[ویلقی فی جهنم] ...... اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جس آگ میں نافرمانوں کو پھینکا جائے گا اسی آگ میں ہی کفار کو بھی پھینکا جائے گا لیکن وہ انہیں کفار کے عذاب جیسا عذاب نہیں دے سکے گی، بلکہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ ان کے لیے اس طرح ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہوگئی تھی۔ مگر بظاہر ایسا نہیں لگتا۔ آتش جہنم گرم بھی ہوگی اور اذیت رساں بھی، البتہ اس کی حرارت ان کے لیے اس طرح نہیں ہوگی جس طرح کفار کے لیے ہوگی۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ آگ بندہ مومن کے اعضاء سجود کو مس نہیں کر سکے گی۔ جیسا کہ یہ صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے،[1] اور اعضاء سجود یہ ہیں: پیشانی، ناک، ہتھیلیاں گھٹنے اور پیروں کے اطراف۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فمن مر على الصراط دخل الجنة .))

''جو شخص پل صراط سے گزر گیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔''

شرح: ......اس لیے کہ اسے نجات مل گئی۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فاذا عبروا عليه وقفوا على قنطرة بين الجنة والنار .))

''جب لوگ پل صراط عبور کر جائیں گے انہیں جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر ٹھہرا دیا جائے گا۔''

شرح: ......''القنطرة'' چھوٹا پل۔ علماء کا اس پل کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ کوئی مستقل پل ہے یا جہنم کی پیٹھ پر نصب پل کا حصہ ہے۔

اس بارے میں ہمارے لیے (اللہ اعلم) کہنا ہی صائب ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں دلچسپی صرف اس بات سے ہے کہ لوگوں کو اس پر کھڑا کیا جائے گا۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فيقتص لبعضهم من بعض .))

''بعض لوگوں کے لیے بعض سے قصاص لیا جائے گا۔''

شرح: ......یہ قصاص اس پہلے قصاص کے علاوہ ہے جو قیامت کے میدان میں ہوگا، اس لیے کہ یہ خاص قصاص ہے۔

---

[1] اسے بخاری (۷٤۳۷)، اور مسلم (۱۸۲) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



جو لوگوں کے دلوں سے کینہ ونفرت کو ختم کرنے کے لیے ہوگا جو کہ تنقیہ وتطہیر کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ دلوں کی نفرتیں اور کدورتیں مجرد قصاص سے دور نہیں ہوسکتیں۔

الغرض! جنت اور جہنم کے درمیان کا یہ پل دلوں کی کدورتیں اور دیگر آلائشیں دور کرنے کے لیے ہوگا تا کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں تو ان کے دلوں میں کینہ ونفرت نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ (الحجر: ٤٧)

''اور جو کچھ ان کے دلوں میں کینہ ہوگا ہم اسے دور کر دیں گے، سب بھائیوں کی طرح رہیں گے آمنے سامنے تختوں پر۔''

تہذیب کے بعد جنت میں داخلہ

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَإِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا ؛ أُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ .))

''جب ان کی تہذیب کر دی جائے گی تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔''

شرح: ......اسے بخاری نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ❶

جب اہل ایمان کے دلوں سے عداوت ونفرت کو ختم کر دیا جائے گا اور وہ اس سے پاک ہو جائیں گے تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی، مگر جب وہ جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو وہ کھلا نہیں ہوگا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے شفاعت کریں گے کہ ان کے لیے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ اقسام شفاعت میں آئے گی۔

سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جنت کے دروازے کھلنے کا اثبات

❑ قیامت کے دن دسواں کام جنت میں داخلہ ہوگا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وأول من يستفتح باب الجنة محمد ﷺ .))

''سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولنے کا مطالبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔''

شرح: ......اس کی دلیل صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں جنت میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا۔''

دوسری حدیث کے لفظ ہیں: ''سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں کھٹکھٹاؤں گا۔'' ❷

---

❶ صحیح بخاری: ٧٤٣٩ ❷ اسے مسلم (١٩٦) نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں: ''میں قیامت کے دن جنت کے دروازہ پر آؤں گا اور اسے کھولنے کا مطالبہ کروں گا، اس پر خازن دریافت کرے گا: آپ کون ہیں؟ میں کہوں گا: میں محمد ﷺ ہوں۔ وہ کہے گا: مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں آپ سے پہلے جنت کا دروازہ کسی کے لیے نہ کھولوں۔''❶

نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ میدان محشر میں غم واندوہ کے ازالہ کے لیے پہلی شفاعت بھی آپ کریں گے۔ اور پھر انبساط وسرور کے حصول کے لیے دوسری شفاعت کا اعزاز بھی آپ ﷺ ہی کو حاصل ہوگا۔ الغرض آپ ﷺ اذیت رساں چیزوں کے ازالہ کے لیے بھی شفاعت کریں گے اور نفع بخش چیزوں کے حصول کے لیے بھی۔

اہل ایمان کا جنت میں داخلہ محمد ﷺ کی شفاعت کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا: اور جس طرح کہ بتایا جا چکا ہے یہ سنت سے بھی ثابت ہے، اور خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ (الزمر: ۷۳)

''یہاں تک جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے اور کھولے جائیں گے اس کے دروازے۔''

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: حتی اذا جاء وها ؛ فتحت . اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کے دروازے کھلوانے سے قبل کوئی واقعہ ہوا تھا اور وہ شفاعت ہے۔ جبکہ دوزخیوں کے بارے میں فرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ (الزمر: ۷۱)

''یہاں تک کہ جب وہ جہنم کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔''

یہ اس لیے کہ وہ جہنم کے پاس تیار حالت میں آئیں گے اور وہ اچانک ان کے سامنے آن کھڑے ہوگی۔ نعوذباللہ منھا .

سب سے پہلے اُمت محمدیہ کا جنت میں جانے کا اثبات

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((واول من يدخل الجنة من الأمم أمته .))

''سب امتوں سے پہلے آپ ﷺ کی امت جنت میں جائے گی۔''

شرح: ...... یہ ثابت شدہ حقیقت ہے، اس کی دلیل صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''ہم آخر میں آئے قیامت کے دن سب سے اول ہوں گے۔ اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔''❷ آپ ﷺ نے ہی فرمایا: ''ہم آخر میں آئے قیامت کے دن سب سے سبقت لے جائیں گے۔''❸ آپ ﷺ کا یہ ارشاد تمام مواقف قیامت کو شامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: ''حاوی الارواح'' لابن القیم رحمہ اللہ . ''

❶ اسے مسلم (۱۹۷) نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا۔ ❷ اسے مسلم (۸۵۵) نے روایت کیا۔

❸ اسے بخاری (٦٦٢٤)، اور مسلم (۸۵۵) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



تتمہ: مؤلف رحمہ اللہ نے جنت کے دروازوں کا ذکر نہیں کیا، جن کی تعداد آٹھ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتّٰى إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ (الزمر: ٧٣)

''یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آئیں گے اور اس کے دروازے کھول دے جائیں گے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل وضو کر کے توحید و رسالت کی گواہی دینے والے شخص کے بارے میں فرمایا: ''اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔'' ❶

جنت کے آٹھ دروازے اعمال کے حساب سے ہیں، اس لیے کہ ہر دروازے کے لیے ایک خاص عمل ہے، نمازی حضرات کو باب الصلاۃ، صدقہ و خیرات کرنے والوں کو باب الصدقہ، مجاہدین کو باب الجہاد اور روزے داروں کو باب الرّیان سے آواز دی جائے گی۔ جن بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ مختلف قسم کے نیک اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے انہیں تمام دروازوں سے آواز دی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں کسی چیز کا جوڑا خرچ کرنے والے کو جنت کے سب دروازوں سے آواز دی جائے گی: اللہ کے بندے! یہ بہت بہتر ہے......'' ❷ اسی حدیث میں آتا ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ پر میرے والدین قربان ہوں...... کیا کسی کو ان سب دروازوں سے بھی آواز دی جائے گی؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، اور مجھے امید کہ آپ انہی میں سے ہوں گے۔''

سوال: اگر جنت کے دروازے اعمال کے حساب سے ہوں گے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اس شخص کو ان سب دروازوں سے آواز دی جائے جو ان کے اعمال کرتا رہا ہو؟

جواب: کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص کسی دروازے کے لیے مخصوص اعمال کثرت سے کرتا رہا اسے اس دروازے سے بلایا جائے گا۔

مثلاً: اگر کوئی شخص نمازیں کثرت سے پڑھتا ہے تو اسے باب الصلاۃ اور زیادہ روزے رکھنے والے کو باب الریان سے آواز دی جائے گی۔ ہر شخص کو ہر نیک عمل میں کثرت حاصل نہیں ہوا کرتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض اعمال کثرت سے کرتا ہے اور ان میں اس کا جی بھی زیادہ لگتا ہے۔ مگر بعض لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوتا ہے اور وہ جملہ اعمال کو بڑی خوشی اور انبساط سے ادا کیا کرتے ہیں۔ جس طرح کہ اوپر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے بتایا گیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتیں

☐ قیامت کے دن کا گیارہواں کام، جس کا مؤلف رحمہ اللہ اس طرح ذکر کرتے ہیں:

((وله في القيامة ثلاث شفاعات .))

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن تین شفاعتیں فرمائیں گے۔''

---

❶ اسے مسلم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ ❷ اسے بخاری (٣٦٦٦) اور مسلم (١٠٢٧) نے روایت کیا۔



شرح: ......[لہ]......ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

[**شفاعات**] ...... شفاعۃ کی جمع ہے جس کا لغوی معنی ہے: کسی چیز کو دوہرا کرنا، جفت بنانا۔ جبکہ اس کا اصطلاحی معنی ہے: جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے دوسرے کا واسطہ بننا، اصطلاحی معنی کی اشتقاق کے ساتھ مناسبت بالکل واضح ہے اس لیے کہ جب آپ کسی کا واسطہ بنیں گے تو اس کا جفت بن کر ہی اس کی سفارش کریں گے۔

شفاعت کی دو قسمیں ہیں: شفاعت باطلہ اور شفاعت صحیحہ۔

شفاعت باطلہ: اس کے ساتھ مشرکین کا اپنے بتوں کے حوالے سے تعلق ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ مشرکین ان کی پرستش کرتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾

(یونس: ۳)

''اور وہ اللہ کے علاوہ اس کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان دے سکتا ہے اور نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے اللہ کے ہاں سفارشی ہوں گے۔''

مشرکین کا کہنا تھا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر: ۳)

''ہم ان کی صرف اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں مرتبہ میں اللہ کے قریب کر دیں گے۔''

مگر یہ شفاعت باطل ہے جو کسی کے لیے نفع بخش نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ۝﴾ (المدثر: ۴۸)

''انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہیں دے گی۔''

صحیح شفاعت میں تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

پہلی شرط: اللہ تعالیٰ شفاعت کرنے والے سے راضی ہو۔

دوسری شرط: جس کے لیے شفاعت کی گئی ہو اس سے راضی ہو۔

تیسری شرط: اللہ تعالیٰ شفاعت کرنے کی اجازت دے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت شافع اور مشفوع لہ پر راضی ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى۝﴾ (النجم: ۲۶)

''اور کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں کہ ان کی سفارش کچھ بھی کام نہیں آئے گی مگر اس کے بعد کہ اللہ جس کے لیے اجازت دے اور پسند کرے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا﴾ (طه: ۱۰۹)

''اور اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر جسے رب رحمان اجازت دے اور اس کی بات کو پسند کرے۔''

اور سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ﴾ (الانبیاء: ۲۸)

''اور وہ نہیں سفارش کر سکتے مگر صرف اسی کی جس کے لیے اللہ پسند کرے۔''

پہلی آیت ان تینوں شروط کو متضمن ہے، دوسری دو کو اور تیسری ایک شرط کو متضمن ہے۔

قیامت کے دن نبی کریم ﷺ تین شفاعتیں فرمائیں گے۔

۱۔ شفاعت عظمیٰ: جو تمام اولاد آدم کے لیے ہوگی۔

۲۔ جنتی لوگوں کے لیے شفاعت، تاکہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں۔

۳۔ جہنم کے مستحقین کے لیے اس بات کی شفاعت، کہ وہ جہنم میں داخل نہ ہوں، اور جو اس میں داخل ہو چکے ہیں انہیں اس سے نکال لیا جائے۔

پہلی شفاعت

❑ پھر مؤلف رحمہ اللہ ان کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((أما الشفاعة الاولىٰ؛ فيشفع في اهل الموقف، حتى يقضى بينهم بعد ان يتراجع الانبياء، آدم و نوح و ابراهيم و موسىٰ و عيسىٰ ابن مريم عن الشفاعة حتى تنتحصى إليه.))

''آپ ﷺ پہلی شفاعت اہل موقف کے بارے میں فرمائیں گے تاکہ ان کا فیصلہ کر دیا جائے، اور یہ شفاعت اس وقت ہوگی جب آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام شفاعت کرنے سے انکار کر دیں گے اور پھر اس کا معاملہ آپ ﷺ کی ذات اقدس تک آن پہنچے گا۔''

شرح:......[حتى يقضّى بيهنم] ......(حتّٰی) غائت کے لیے نہیں بلکہ تعلیل کے لیے ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ شفاعت لوگوں کا فیصلہ کیے جانے سے قبل ہوگی۔ پھر جب آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے تو اللہ عزوجل لوگوں کا فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائے گا اور پھر فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ اس کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا﴾ (المنافقون: ۷)



''وہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ تم ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے پاس ہیں تاکہ وہ خود ہی غائب ہو جائیں۔''

اس جگہ (حتی) تعلیل کے لیے ہے نہ کہ غایت کے لیے۔ یعنی اس لیے کہ وہ غائب ہو جائیں۔ کیونکہ غایت صورت میں معنی بگڑ جاتا ہے۔

[بعد ان یتراجع الانبیاء: آدم و نوح و ابراھیم و موسی و عیسی ابن مریم عن الشفاعة]...... یعنی تمام انبیاء کرام لوگوں کے مطالبہ کو رد کر دیں گے۔

اس جملہ کی شرح صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں وارد ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں قیامت کے دن لوگوں کا سردار ہوں گا، کیا تم جانتے ہو کہ یہ کس طرح ہوگا؟ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کر دے گا، وہ میدان ایسا ہموار ہوگا کہ بلانے والا انہیں اپنی آواز سنا سکے گا اور دیکھنے والا دیکھ سکے گا، سورج ان کے قریب آ جائے گا، اور لوگ ناقابل برداشت حد تک غم واندوہ اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں گے۔ آخر وہ ایک دوسرے سے کہیں گے: تم پر بڑا کٹھن وقت آ گیا ہے۔ کسی ایسے آدمی کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کے پاس تمہاری شفاعت کرے، وہ ایک دوسرے سے کہیں گے: چلو حضرت آدم کے پاس چلتے ہیں۔ وہ ان کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے: آپ سب لوگوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دست مبارک سے بنایا، آپ میں اپنی روح پھونکی، اور اس کے حکم سے فرشتوں نے آپ کو سجدہ کیا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم کس اذیت سے دوچار ہیں، ہمارے لیے اپنے پروردگار کے حضور شفاعت کریں۔ وہ جواب دیں گے: میرا رب آج اس قدر غصے میں ہے کہ وہ نہ تو اس سے پہلے اس قدر غصے میں آیا اور نہ پھر کبھی آئے گا، اس نے مجھے ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا تھا، مگر مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے تو اپنی فکر پڑی ہے۔ تم نوح کے پاس جاؤ۔ ان کے مشورہ پر وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور ان سے کہیں گے: آپ پہلے رسول ہیں جنہیں زمین والوں کے پاس بھیجا گیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو شکر گزار بندہ فرمایا ہے آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کریں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے بارے میں وہی کچھ فرمائیں گے جو کچھ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک دعاء کرنے کا حق دیا تھا جو میں نے اپنی قوم کے خلاف کر ڈالی، تم ایسا کرو کہ ابراہیم کے پاس جاؤ، اس پر وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور ان سے عرض پرداز ہوں گے: آپ اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کے خلیل ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم کیسے ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہیں، اپنے رب سے ہماری سفارش کریں۔ اس پر وہ بھی اللہ تعالیٰ کے غضب کے بارے میں حضرت آدم والی بات دہرا دیں گے اور کہیں گے کہ میں نے تین جھوٹ بولے تھے۔ تم لوگ موسیٰ کے پاس جاؤ، وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، اور کہیں گے: آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور کلام کے ساتھ لوگوں پر آپ کو فضیلت عطا فرمائی، اپنے رب سے ہماری سفارش کریں، آپ ہمارے حالات کی سنگینی سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے بارے میں



حضرت آدم علیہ السلام والی بات کہہ دیں گے اور پھر فرمائیں گے: میں نے ایک ایسی جان کو قتل کر ڈالا تھا جسے قتل کرتے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تم لوگ عیسیٰ کے پاس جاؤ، اس پر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور ان سے کہیں گے: آپ اللہ کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے مریم میں القاء کیا اور اس کی روح ہیں۔ آپ نے بچپن میں لوگوں سے کلام کیا۔ اپنے رب کے سامنے ہماری شفاعت کریں، آپ نہیں دیکھ رہے کہ ہم کس مشکل سے دو چار ہیں؟ حضرت عیسیٰ بھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں حضرت آدم والی بات دہرادیں۔ مگر وہ اپنے کسی گناہ کا ذکر نہیں کریں گے، وہ فرمائیں گے: تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔ اس پر وہ حضرت محمد ﷺ کے پاس جائیں گے، اور عرض کریں گے: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول، اور خاتم النبیین ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ہماری شفاعت کریں: اس وقت ہم بڑی مشکل میں گرفتار ہیں۔ اس پر میں چل دوں گا اور عرش رحمٰن کے نیچے جا کر اپنے رب کے لیے سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی حمد وثناء کی ایسی ایسی چیزیں مجھ پر کھولے گا جو اس نے مجھ سے قبل کسی پر بھی نہیں کھولیں۔ پھر کہا جائے گا: محمد! اپنا سر اٹھائیں، سوال کریں، آپ کو دیا جائے گا، اور شفاعت کریں آپ کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا.....'' الحدیث۔ ❶

ابراہیم علیہ السلام نے جن تین جھوٹوں کا ذکر کیا ان کی تفسیر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری کی حدیث میں اس طرح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین جھوٹ بولے، ان میں سے دو ذات باری تعالیٰ کے بارے میں تھے، ایک ان کا یہ فرمانا کہ: (انی سقیم) ''بیشک میں بیمار ہوں'' اور دوسرا ان کا یہ قول: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيرُهُمْ هٰذَا﴾ (الانبياء: ٦٣) ''بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہوگا۔''

اور ان کا اپنی بیوی سارہ کے بارے میں یہ کہنا کہ: ''یہ میری بہن ہے۔''

''صحیح مسلم'' میں شفاعت کی گزشتہ حدیث میں وارد ہے کہ ان کا تیسرا جھوٹ ان کا ستارے کے بارے میں یہ فرمانا تھا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ ''یہ میرا رب ہے'' اس میں سارہ کا واقعہ نہیں ہے لیکن ابن حجر ''فتح الباری'' ❷ میں فرماتے ہیں: بظاہر یہ کسی راوی کا وہم لگتا ہے، اور انہوں نے اس کی یہ علت بیان کی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے از راہ تواضع ان باتوں کو جھوٹ سے تعبیر کیا، اس لیے کہ یہ ان کے ارادے کے مطابق مبنی پر صداقت اور واقع کے عین مطابق ہیں۔ ان کا یہ فرمانا توریہ کے باب سے ہے۔

[حتى تنتهي إليه]...... یعنی رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا۔ وہ حدیث میں گزر چکا ہے۔

اس شفاعت عظمیٰ کا حق صرف نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل ہوگا۔ اور یہ سب سے بڑی شفاعت ہوگی، اس لیے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو اس دن کے کرب ودرد اور غم واندوہ سے راحت حاصل ہوگی۔

حدیث شفاعت میں جن رسولوں کا ذکر آیا ہے، ان سب کا شمار اولوا العزم رسولوں میں ہوتا ہے، جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دو جگہ ذکر فرمایا ہے: سورۂ احزاب میں اور پھر سورۂ شوریٰ میں۔

---

❶ اسے بخاری (٤٧١٢) اور مسلم (١٩٤) نے روایت کیا۔ ❷ فتح الباری (٦/٣٩٠)



سورۂ احزاب میں ان کا ذکر اس ارشاد باری میں کیا گیا ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ﴾ (الاحزاب: ۷)

''اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا میثاق لیا، اور تم سے اور نوح سے، ابراہیم سے، موسیٰ سے اور عیسیٰ ابن مریم سے۔''

جبکہ سورۂ شوریٰ میں ان کا ذکر اس ارشاد ربانی میں موجود ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰۤى﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

''اس نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا جس کا حکم اس نے نوح کو دیا، اور جس کو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا، اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا۔''

تنبیہ:......مؤلف رحمہ اللہ کا قول: **الانبیاء: آدم و نوح و ابراهیم و موسی و عیسی ابن مریم عن الشفاعة** اس امر کا قطعی فیصلہ ہے کہ حضرت آدم اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اور حقیقت بھی یہی ہے، اس لیے کہ اللہ رب کائنات نے اپنے اوامر و نواہی کو ان کی طرف وحی کیا تھا۔ ابن حبان اپنی ''صحیح'' ❶ میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کیا حضرت آدم نبی تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''

آدم علیہ السلام پہلے نبی تھے جن کی طرف وحی بھیجی گئی تھی، جبکہ پہلے رسول نوح علیہ السلام ہیں جس طرح کہ حدیث شفاعت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور قرآن میں اس ارشاد باری سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے:

﴿اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ (النساء: ۱۶۳)

''یقیناً وحی کی ہم نے آپ کی طرف جس طرح وحی کی ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف۔''

نیز اس ارشاد سے بھی:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ﴾ (الحدید: ۲۶)

''اور یقیناً ہم نے بھیجا تھا نوح اور ابراہیم کو، اور ہم نے ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری رکھا۔''

دوسری شفاعت

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وأما الشفاعة الثانیة؛ فیشفع فی اهل الجنة ان یدخلوا الجنة .))

''رہی دوسری شفاعت؛ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل جنت کی شفاعت کریں گے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں۔''

❶ صحیح ابن حبان (۲/۷۷)، مسند احمد (۵/۱۷۸) هیثمی ''المجمع'' میں فرماتے ہیں: اسے احمد، بزار اور طبرانی نے ''الأوسط'' میں اسی طرح روایت کیا۔



شرح: ......جب جنتی لوگ پل صراط عبور کر لیں گے تو انہیں ایک چھوٹی پل پر کھڑا کر دیا جائے گا تا کہ وہ ایک دوسرے سے قصاص لے لیں، اور یہ میدان محشر میں لئے گئے قصاص کے علاوہ ہوگا، اب دلوں کو پاک کیا جائے گا، اور ان میں پائے جانے والے بغض و نفرت اور کینہ کا خاتمہ کر دیا جائے گا، اور پھر جب ایسا ہو جائے گا تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔

مگر جب وہ جنت کے قریب پہنچیں گے تو اس کے دروازوں کو بند پائیں گے، اور انہیں اس وقت کھولا جائے گا جب نبی کریم ﷺ انہیں جنت میں داخل کیے جانے کی شفاعت کریں گے۔ آپ کی شفاعت کو شرف قبولیت سے نوازا جائے گا، اور ہر انسان اپنے اس عمل کے دروازے سے جنت میں داخل ہو جائے گا جس کے لیے وہ زیادہ کوشاں رہتا تھا، کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوں گے جنہیں جنت کے تمام دروازوں سے آواز دی جائے گی۔

اس شفاعت کی طرف قرآن مجید میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے بارے میں فرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ (الزمر: ٧٣)

''یہاں تک کہ جب وہ جنت کے قریب پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔''

یہ اسلوب بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے جنت کے قریب پہنچنے اور اس کے دروازے کھلنے کے درمیان کوئی واقعہ ہوا تھا۔

اس واقعہ کو صحیح مسلم [1] کی اس حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تبارک و تعالیٰ لوگوں کو اکٹھا فرمائے گا، مومن کھڑے ہو جائیں گے یہاں تک کہ جنت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا، وہ آدم کے پاس جائیں گے اور کہیں گے: ابا جان! ہمارے لیے جنت کے دروازے کھلوانے کی سفارش کریں......'' الحدیث۔ اس حدیث میں آتا ہے: ''وہ محمد ﷺ کے پاس جائیں گے، آپ کھڑے ہوں گے۔ پھر آپ کو اجازت دے دی جائے گی۔ الحدیث''

مخصوص شفاعت کا حق

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وھاتان الشفاعتان خاصتان له.))

''وہ دونوں شفاعتیں آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔''

شرح: ......یعنی اہل موقف کے بارے میں یہ سفارش کہ ان کا فیصلہ کر دیا جائے اور جنت میں جانے والوں کی یہ شفاعت کہ انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔

[خاصتان له]......یعنی یہ دونوں شفاعتیں اللہ کے نبی محمد ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، اسی لیے حضرت آدم اور دیگر

[1] صحیح مسلم (١٩٥)



اولوالعزم رسول علیہم السلام ان سے معذرت کر دیں گے۔

ایک تیسری شفاعت بھی ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے، اور یہ وہ شفاعت ہے جو آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے لیے فرمائیں گے۔

ابو طالب جس طرح کہ صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں وارد ہے۔ کفر پر فوت ہوئے تھے۔ ❶

رسول اللہ ﷺ کے دس چچا تھے، جن میں سے چار نے اسلام کا زمانہ پایا، ان میں سے دو تو کافر ہی رہے جبکہ دو مشرف با اسلام ہوئے۔ جو دو لوگ کفر کی حالت میں مرے، وہ ہیں:

ابو لھب: یہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ بہت زیادہ بدسلوکی کیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اور ایندھن اٹھانے والی اس کی بیوی کے بارے میں مکمل سورت نازل فرمائی جس میں ان دونوں کی شدید مذمت کی گئی اور انہیں سخت وعید سنائی گئی ہے۔

ابو طالب: نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کا حسن سلوک کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، ان کا کفر پر باقی رہنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت تھا، اس لیے کہ اگر وہ اس حالت مین نہ ہوتے تو نبی کریم ﷺ کا اس طرح دفاع نہ کر سکتے۔ بلکہ انہیں بھی آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح شدید ایذائیں پہنچائی جاتیں۔ مگر چونکہ وہ قریش مکہ کے دین پر قائم رہے اور وہ انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جس کی وجہ سے وہ نبی کریم ﷺ کی نصرت وحمایت کرنے کی پوزیشن میں رہے۔

آپ ﷺ کے جو دو چچا دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے، ان میں سے ایک حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں، ثانی الذکر، اول الذکر سے افضل ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسد اللہ کا لقب عطا فرمایا، انہوں نے جنگ احد کے موقعہ پر جام شہادت نوش کیا رضی اللہ عنہ و أرضاہ.

نبی ﷺ نے انہیں سید الشہداء کے لقب سے ملقب فرمایا۔ ❷

اگر چہ ابو طالب کفر کی حالت میں فوت ہوئے مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو ان کی شفاعت کرنے کی اجازت دے گا۔ مگر آپ ﷺ کی شفاعت انہیں جہنم سے باہر نہیں نکال سکے گی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا: ''آگ ان کے ٹخنوں تک پہنچی ہوگی جس سے ان کا دماغ ابل رہا ہوگا اور اگر میں سفارش نہ کرتا تو وہ اس کی تہہ میں ہوتے۔'' ❸

یہ ابو طالب کی شخصیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کی طرف سے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع کی وجہ سے ہے۔

---

❶ ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری (٤٧٧٢)۔ صحیح مسلم (٢٤)

❷ اسے حاکم نے "مستدرك" (٣/١٩٥) میں جابر سے روایت کیا۔ اور ہیثمی نے "المجمع" (٩/٣٦٨) میں اسے "الاوسط" میں طبرانی کی طرف منسوب کیا۔ اس حدیث کو البانی "السلسلة الصحيحه" میں لائے ہیں۔ (٣٧٤)

❸ اسے بخاری (٣٨٨٣)، اور مسلم (٢٠٩) نے عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وأما الشفاعة الثالثه؛ فيشفع فيمن استحق النار ، وهذه الشفاعة له ولسائر النبيين والصديقين وغيرهم ، فيشفع فيمن استحق النار ان لا يدخلها ، ويشفع فيمن دخلها ان يخرج منها .))

''رہی تیسری شفاعت ؛ تو وہ آپ جہنم کے مستحقین کے لیے کریں گے، یہ شفاعت آپ بھی کریں گے، اور تمام انبیاء کرام اور صدیقین وغیرہم بھی، آپ ﷺ جہنم کا استحقاق رکھنے والوں کے لیے شفاعت کریں گے کہ وہ اس میں داخل نہ ہوں اور جو اس میں داخل ہو چکے ہیں انہیں اس سے نکال لیا جائے۔''

شرح:...... [استحق النار]...... یعنی نافرمان اہل ایمان میں سے جو جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔

اس کی دو صورتیں ہیں؛ جو لوگ جہنم کے حق دار قرار دیے جائیں گے آپ ان کے لیے تو سفارش کریں گے کہ وہ اس میں داخل نہ ہوں، اور جو اس میں داخل ہو گئے ہیں انہیں اس سے نکال لیا جائے۔

نافرمان اہل ایمان کو جہنم سے نکالے جانے کی شفاعت پر مبنی احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے بلکہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ رہی اس کے مستحقین کو اس میں داخل نہ کرنے کی شفاعت ؛ تو آپ کی اہل ایمان کے جنازوں میں ان کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعاؤں سے مستفاد ہے۔ جن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ انہیں اس میں داخل نہ فرمائے۔ جس طرح کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا اللہ! ابو سلمہ کو معاف فرمادے، اور اس کا درجہ ہدایت یافتہ لوگوں میں بلند فرمادے۔''[1]

مگر یہ شفاعت دنیا سے تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جس مسلمان کا جنازہ ایسے چالیس آدمی پڑھیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں، تو اللہ اس کے بارے میں ان کی شفاعت کو قبول فرمالیتا ہے۔''[2]

اس شفاعت کا معتزلہ اور خوارج انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کے بارے میں ان کا مذہب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے۔ ان کے نزدیک زانی شخص مشرک آدمی جیسا ہے، جسے شفاعت کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی اور نہ ہی اللہ کسی کو اس کی شفاعت کرنے کی اجازت دے گا۔

مگر اس بارے میں متواتر احادیث کی وجہ سے ان کا یہ قول مردود ہے۔

[وهذه الشفاعة له ولسائر النبيين والصديقين وغيرهم]...... آپ ﷺ کے علاوہ بھی جملہ انبیاء کرام، صدیقین اور دوسرے لوگ جہنم کے مستحقین کے لیے شفاعت کریں گے کہ وہ اس میں داخل نہ ہوں اور جو داخل ہو چکے ہیں انہیں اس سے نکال لیا جائے۔ یعنی یہ شفاعت نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کا حق دیگر انبیاء کرام کو بھی حاصل ہے، وہ بھی اپنی اپنی قوموں کے گناہ گاروں کے لیے شفاعت کر سکیں گے۔ اس طرح صدیقین اپنے

---

[1] اسے مسلم (۹۲۰) نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔

[2] اسے مسلم (۹۴۸) نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔



قرابت داروں اور دیگر اہل ایمان کے لیے سفارش کریں گے۔ ان کے علاوہ عام نیکو کار لوگ بھی شفاعت کر سکیں گے، حتی کہ آدمی اپنے گھر والوں، پڑوسیوں اور دیگر لوگوں کی بھی شفاعت کر سکے گا۔

اللہ کا اپنے رحم و فضل سے لوگوں کو جہنم سے نکالنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویخرج الله من النار أقواماً بغیر شفاعة، بل بفضله ورحمته .))

''اللہ تعالیٰ کئی لوگوں کو بغیر کسی کی شفاعت کے محض اپنے فضل اور رحمت سے جہنم سے نکال لے گا۔''

شرح: ......یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ گناہ گار اہل ایمان میں سے جسے چاہے گا اسے بدون شفاعت جہنم سے باہر نکال لے گا۔ اور یہ اس کے فضل و کرم اور رحمت سے ہوگا، اس لیے کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ جب انبیاء ورسل نیک لوگ اور فرشتے شفاعت کر چکے ہوں گے، یہاں تک کہ صرف ارحم الراحمین باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا بدون شفاعت جہنم سے نکال لے گا۔ حتی کہ جہنم میں صرف اصحاب جہنم ہی باقی رہ جائیں گے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: فرشتے شفاعت کر چکے، انبیاء بھی کر چکے اور اہل ایمان بھی۔ اور سوائے ارحم الراحمین کے کوئی بھی باقی نہیں رہا، پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک مٹھی بھرے گا اور اس سے کچھ ایسے لوگوں کو باہر نکال لے گا جنہوں نے کبھی کوئی اچھا کام نہیں کیا ہوگا۔ یہ لوگ جہنم میں کوئلے بن چکے ہوں گے۔''[1]

❑ قیامت کے دن وقوع پذیر ہونے والے بارہویں کام کا مؤلف رحمہ اللہ یوں ذکر کرتے ہیں:

((وَيَبْقَى فِي الْجَنَّةِ فَضْلٌ عَمَّنْ دَخَلَهَا مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا .))

''جنت میں ان لوگوں سے کچھ جگہ بچ جائے گی جو اہل دنیا میں سے اس میں داخل ہوں گے۔''

شرح: ......جس جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اس میں تمام جنتی داخل ہو جائیں گے، مگر وہ پھر بھی بھر نہیں سکے گی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم دونوں کو بھرنے کا خود ذمہ اٹھا رکھا ہے۔

جہنم میں لوگوں کو ڈالا جاتا رہے گا، مگر وہ هل من مزید؟ هل من مزید؟ پکارتی رہے گی مگر اس کے باوصف بھی بھر نہیں سکے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا قدم مبارک رکھے گا جس سے وہ آپس میں سکڑ جائے گی اور بس بس کر اٹھے گی۔[2]

رہی جنت تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے نئے لوگوں کو پیدا فرمائے گا جو محض اللہ کے فضل و احسان اور رحمت سے اس میں داخل ہوں گے۔ یہ صحیحین میں [3] نبی کریم ﷺ سے مروی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے اور ارشاد

[1] اسے بخاری (۷۴۳۹)، اور مسلم (۱۸۳) نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ [3] اسے بخاری (۴۸۵۰)، اور مسلم (۴۹۲۹) نے روایت کیا۔

باری تعالیٰ: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ٥٤) ''تمہارے رب نے اپنی ذات پر رحمت لکھ دی ہے۔'' کا مقتضی بھی یہی ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنے رب سے اس کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں: ''بیشک میری رحمت میری ناراضی پر سبقت لے گئی ہے۔'' [1]

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فينشي الله لها أقواماً: فيد خلهم الجنة .))

''اللہ تعالیٰ جنت کے لیے کچھ نئے لوگوں کو پیدا فرما کر انہیں اس میں داخل فرما دے گا۔''

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وأضاف ما تضمنته الدار ألاخرة من الحساب والثواب والعقاب و الجنة والنار .))

''روز آخرت ان امور پر مشتمل ہوگا: حساب و کتاب، ثواب سزا، جنت اور جہنم۔''

شرح:..... ''**الاضاف**'' انواع واقسام۔

''**ألحساب**'' اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

''**الثواب**'' نیکیوں کا بدلہ، ہر نیکی کا بدلہ دس گنا سے سات سوگنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ ملے گا۔

''**العقاب**'' برائیوں کا بدلہ، ایک برائی کا بدلہ اس کے برابر ہی ملے گا، اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔

''**ألجنّة**'' وہ گھر جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ جس میں ہر وہ چیز موجود ہے جسے دل چاہے اور جس سے آنکھوں کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ایسی ایسی چیزیں ہیں جنہیں نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا۔

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (السجدة: ١٧)

''ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک سے جو کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔''

جنت اس وقت موجود ہے اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ١٣٣) ''اسے پرہیز گاروں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔''

اس معنی میں احادیث تواتر کے ساتھ وارد ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ۝﴾ (هود: ١٠٨)

[1] اسے بخاری (٧٥٥٤)، مسلم (٢٧٥١) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



''مگر وہ لوگ جو خوش بخت ہوں گے تو وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین رہیں گے مگر جو چاہے رب تیرا، یہ بخشش ہے نہ ختم ہونے والی۔''

ارشاد باری: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ متعدد آیات میں وارد ہوا ہے۔ رہی ''النار'' دوزخ تو وہ بھی اس وقت موجود ہے۔ اس لیے کہ ارشاد باری ہے:

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۱) ''اسے کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔''

اس معنی میں احادیث بڑی کثرت سے وارد ہیں اور بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ اہل جہنم اس میں ابدالآباد کے لیے پڑے رہیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا o خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (الاحزاب: ٦٤-٦٥)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی ہے، اور ان کے لیے بھڑکنے والی آگ تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کی تین آیات میں اہل جہنم کے لیے اس میں ہمیشہ رہنے کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک آیت تو یہ ہے۔ دوسری سورۂ نساء کے آخر میں اور تیسری سورۂ جن میں ہے۔

جو اس بات کی دلیل ہیں کہ جہنم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہے گی۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وتفاصيل ذلك مذكورة في الكتب المنزلة من السماء.))

''اور اس کی تفصیل آسمانی کتب میں مذکور ہے۔''

شرح: ......مثلاً تورات، انجیل، ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے اور دیگر آسمانی کتابیں۔ جن میں لوگوں کی حاجت بلکہ ضرورت کے پیش نظر اس کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ ایمان بالآخرت کے بغیر دین پر استقامت ممکن ہی نہیں ہے، جس دن ہر شخص کو اس کے اچھے یا برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والأثار من العلم الماثور عن الانبياء.))

''اور انبیاء سے ماثور علمی آثار میں بھی۔''

شرح: ......یاد رہے کہ انبیاء کرام سے ماثور علم کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ علم کی ایک وہ قسم ہے جو وحی سے ثابت ہے، یہ قرآن اور سنت صحیحہ میں مذکور ہے، اس قسم کے علم کو قبول کرنے اور اس

کے مدلول پر اعتقاد رکھنے میں کوئی شک نہیں ہے۔

۲۔ جب کہ دوسری قسم وہ ہے جو وحی کے علاوہ نقل کے انداز میں ہم تک پہنچی ہے۔ علم کی یہ وہ قسم ہے جس میں کذب و تحریف اور تغیر و تبدل کا عمل دخل ہو گیا۔ لہٰذا انبیاء سابقین سے جو علم اس انداز سے منقول ہو کر ہم تک پہنچا، اس کے بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب اہل کتاب تم سے کوئی چیز بیان کریں تو اس کی تصدیق کرو نہ تکذیب اور یوں کہا کرو: ہم اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو تمہاری طرف اتاری گئی۔'' [1] اس لیے کہ اگر تم نے اس کی تصدیق کر دی تو یہ باطل کی تصدیق ہوئی اور اگر اس کی تکذیب کر دی تو یہ حق کی تکذیب ہوئی۔ لہٰذا اس کی تصدیق یا تکذیب کرنے سے گریز کریں اور یہ کہہ دیں کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو یقیناً میرا اس پر ایمان ہے۔

گزشتہ لوگوں سے ماثورات کی علماء نے تین قسمیں بنائی ہیں:

پہلی قسم: جس کے صدق کی ہماری شریعت گواہی دے دے۔

دوسری قسم: جس کے کذب کی ہماری شریعت گواہی دے دے۔

تیسری قسم: ہماری شریعت اس کی نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب۔ اس کے بارے میں توقف اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس کی نہ تو تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وفي العلم الموروث عن محمد ﷺ مایشفي ویکفي .))

''ہم جس علم کے محمد ﷺ کی طرف سے وارث بنے ہیں وہ کتاب اللہ میں ہو یا سنت رسول اللہ ﷺ میں اس میں شفا بھی ہے اور کفایت بھی۔''

شرح: ......ہمیں کتاب و سنت سے ہٹ کر کسی بھی جگہ سے دلوں کو نرم کرنے والے مواعظ کی ضرورت نہیں ہے، ہم اس قسم کے تمام مواعظ سے بے نیاز ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے جو علمی ورثہ چھوڑا وہ علم اور ایمان کے تمام ابواب میں شفا بخش اور کفایت کنندہ ہے۔ ترغیب و ترہیب کے مقصد کے پیش نظر وعظ و نصیحت اور فضائل کے باب میں نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب امور تین قسم کے ہوتے ہیں: صحیح مقبول، ضعیف اور موضوع، ہمیں ضعیف اور موضوع کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

موضوع کے بارے میں علماء رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ اس کا لوگوں میں ذکر کرنا اور پھیلانا جائز نہیں ہے۔ نہ فضائل کے ابواب میں، نہ ترغیب و ترہیب کے بارے میں اور نہ ہی کسی اور باب میں۔ بجز اس صورت کے کہ اس کی حالت بیان کرنے

[1] اسے بخاری (٤٤٨٥) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور امام احمد (٤/١٣٥) نے ابو نملہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



کے لیے اسے ذکر کیا جائے۔

جبکہ ضعیف کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ جو علماء اس کے ذکر اور اشاعت کے قائل ہیں، وہ اس کے لیے تین شرائط عائد کرتے ہیں:

پہلی شرط: ضعف شدید نہ ہو۔

دوسری شرط: جس عمل پر ثواب یا عقاب ثابت ہوتا ہو، اس کا اصل صحیح دلیل سے ثابت ہو۔

تیسری شرط: وہ یہ اعتقاد نہ رکھے کہ یہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بلکہ وہ اس بارے میں متردد رہے۔

البتہ وہ ترغیب کے باب میں امید رکھے اور ترہیب کے باب میں ڈرتا رہے۔ رہے اسے پیش کرنے کے الفاظ، تو وہ یہ نہ کہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا، بلکہ یوں کہے: رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، یا آپ ﷺ سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس طرح کے دوسرے الفاظ۔ اگر آپ ایسے عوام میں ہوں جو ذکر، قیل وقال جیسے الفاظ میں فرق نہیں کر سکتے تو ان کے سامنے ایسی بات کا ہرگز ذکر نہ کریں۔ اس لیے کہ عامی شخص یہی سمجھے گا کہ یہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ اس کے نزدیک محراب میں کی گئی ہر بات صواب ہوتی ہے۔

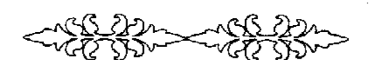
تنبیہ: ...... یوم آخرت اور علامات قیامت کے باب میں بہت ساری احادیث مذکور ہیں، ان میں سے کچھ ضعیف ہیں اور کچھ موضوع۔ اور ان میں سے زیادہ تر دل نرم کرنے والی اور مواعظ پر مشتمل کتابوں میں ملتی ہیں۔ لہٰذا ان سے خود بھی محتاط رہنا ضروری ہے۔ اور ان عوام الناس کو خبردار کرنا بھی ضروری ہے جن کے پاس اس قسم کی کتابیں موجود ہوں۔

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فمن ابتغاه وجده.))

''اس کی جستجو کرنے والا اسے حاصل کرے گا۔''

یہ بات بالکل درست ہے۔ ہمارے پاس قرآن مجید بھی ہے اور کتب احادیث بھی۔ البتہ احادیث کی تنقیح کرنے اور ان میں سے صحیح اور ضعیف کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ لوگ اس باب میں جس چیز کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ اس کی عمارت مضبوط اور محفوظ اساس پر کھڑی کر سکیں۔



فصل:

تقدیر پر ایمان

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وتؤمن الفرقة الناجية، اهل السنة والجماعة بالقدر خيره و شره.))

''فرقہ ناجیہ اہل السنہ والجماعہ اچھی اور بری تقدیر پر ایمان رکھتا ہے۔''

شرح: ...... [الفرقة الناجية، اهل السنة والجماعة] ......اس فرقہ کی تعریف اور اس سے متعلقہ گفتگو کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے۔

[بالقدر خيره و شره.] ......لغت میں قدر، تقدیر کے معنی میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (القمر: ۴۹)

''بیشک ہم نے ہر چیز کو ایک مقررہ اندازے پر پیدا کیا ہے۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ﴾ (المرسلات: ۲۳)

''پھر ہم نے اندازہ مقرر کیا تو ہم کیسا اچھا اندازہ کرنے والے ہیں۔''

جبکہ لغت میں القضاء حکم کے معنی میں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں: قضاء وقدر اگر اکٹھے آئیں تو ان کے معنی الگ الگ ہوتے ہیں، اور اگر الگ الگ آئیں تو مترادف ہوتے ہیں۔

جب یہ کہا جائے کہ یہ اللہ کی تقدیر ہے تو یہ قضاء کو بھی شامل ہوتی ہے، مگر جب انہیں ایک ساتھ ذکر کیا جائے تو ہر ایک کا اپنا معنی ہوتا ہے۔

تقدیر

وہ چیز ہے جس کے اپنی مخلوق میں وقوع پذیر ہونے کا اللہ تعالیٰ نے ازل میں فیصلہ کر دیا ہو۔

رہی قضاء؛ تو یہ وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں ایجاد، اعدام یا تبدیلی کے حوالے سے فیصلہ کر دے۔ اس اعتبار سے تقدیر، خلق پر مقدم ہے۔

سوال: تمہارا یہ قول اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے معارض ہے:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا﴾ (الفرقان: ۲)

''اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کا ٹھیک اندازہ ٹھہرایا۔''



اس لیے کہ اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ تقدیر، تخلیق سے موخر ہے۔

جواب: یہ ترتیب ذکری کے اعتبار سے ہے نہ کہ معنوی اعتبار سے؛ اس جگہ خلق کو تقدیر پر مقدم کرنے کی وجہ آیات کے آخر میں تناسب برقرار رکھنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اگر چہ ہارون علیہ السلام سے افضل ہیں، مگر اسی مقصد کے پیش نظر اس آیہ کریمہ میں انہیں موسیٰ علیہ السلام پر مقدم کیا گیا:

﴿فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى﴾ (طه: ۸۰)

''تو گرا دیئے گئے جادوگر سجدے میں، کہنے لگے، ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ پر۔''

یہ اسلوب بیان اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ لفظوں میں متاخر رتبہ میں بھی متاخر ہے۔

اس کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس جگہ تقدیر برابر کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی اسے مناسب انداز میں پیدا فرمایا۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى﴾ (الاعلیٰ: ۲) ''جس نے پیدا فرمایا اور برابر برابر پیدا فرمایا۔''

یہ معنی پہلے معنی سے زیادہ قریب ہے اس لیے کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى﴾ کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس طرح کوئی اشکال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

تقدیر پر ایمان رکھنا واجب ہے کیونکہ یہ ایمان کے چھ بنیادی ارکان میں سے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور قیامت کے دن پر ایمان رکھے، اور تقدیر پر ایمان رکھے، وہ اچھی ہو یا بری۔''[1]

تقدیر پر ایمان کے فوائد

تقدیر پر ایمان رکھنے کے کئی فوائد ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

اولاً: تقدیر پر ایمان لانے سے ایمان مکمل ہوتا ہے۔

ثانیاً: تقدیر پر ایمان لانے سے ربوبیت پر ایمان مکمل ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اللہ کی تقدیر اس کے افعال میں سے ہے۔

ثالثاً: انسان اپنے جملہ امور کو اپنے رب کے سپرد کر دیتا ہے؛ اس لیے کہ جب اسے یہ علم ہوگا کہ ہر شے رب تعالیٰ کے قضاء و قدر سے ہوتی ہے تو وہ ضرر رساں چیزوں کے ازالہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا اور خوش کن امور کو اس کی طرف منسوب کرے گا، اور وہ اس بات سے آگاہ ہوگا کہ یہ اس پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی وجہ سے ہے۔

رابعاً: انسان کے لیے مصائب و آلام کو برداشت کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو اس سے ان کی شدت میں نرمی کا احساس پیدا ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ (التغابن: ۱۱) ''اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت پر رکھتا ہے۔''

[1] اسے مسلم (۸) نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



حضرت علقمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس سے مراد وہ آدمی ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو چونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اس کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔''❶

سادساً: انسان نعمتوں کو ان کے عطاء کرنے والے کی طرف منسوب کرتا ہے، مگر جب آپ کا تقدیر پر ایمان نہیں ہوگا تو آپ انہیں براہ راست عطاء کرنے والے کی طرف منسوب کریں گے، اور منعم حقیقی کو بھول جائیں گے۔ بادشاہوں، امراء اور وزراء کے مقربین کے بارے میں اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جب وہ ان سے اپنی مطلوبہ اشیاء حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنے اوپر انہیں کا احسان سمجھتے ہیں، اور رب تعالیٰ کے فضل و کرم کو بھلا دیتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسان پر لوگوں کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے محسن کو اس کے احسان کا بدلہ دیا کرو۔''❷ مگر یہ معلوم رہے کہ اصل میں احسان اللہ تعالیٰ کا ہے جسے اس نے اس آدمی کے ہاتھ سے کروایا۔

سابعاً: تقدیر پر ایمان رکھنے کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی حکمت سے آگاہ ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جب وہ اس کائنات اور اس میں نت نئی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرے گا تو اس سے وہ حکمت ایزدی سے آشنا ہوگا، جبکہ قضاء وقدر کو طاق نسیاں پر رکھنے والا یہ استفادہ نہیں کر سکتا۔

بُری اور اچھی تقدیر پر ایمان

[خیرہ و شرہ]...... بری تقدیر وہ ہوتی ہے جو انسان کی طبیعت کے ساتھ ملائمت نہ رکھتی ہو۔ بایں طور کہ اسے اس کی وجہ سے اذیت پہنچے یا وہ اس کے لیے ضرر رساں ہو۔ جبکہ اچھی تقدیر وہ ہوتی ہے جو اس کی طبیعت کے ساتھ ملائمت رکھتی ہو اور وہ اس طرح کہ اس کی وجہ سے اسے کوئی اچھائی مل جائے یا اس کی وجہ سے اسے خوشی و انبساط میسر آئے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں برائی کس طرح ہو سکتی ہے؟ جبکہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ''برائی اس کی طرف منسوب نہیں ہے۔''

جواب: تقدیر میں برائی مقدور لہ کے اعتبار سے ہے، اللہ کے فاعل ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے۔ پس تقدیر اس اعتبار سے کہ وہ اس کے لیے اللہ کی تقدیر ہے اس میں کوئی برائی نہیں ہے بلکہ وہ محض خیر ہے، حتی کہ اگر وہ انسان کے ساتھ ملائمت بھی نہ رکھتی ہو، اور اس کے لیے تکلیف دہ اور ضرر رساں بھی ہو، پھر بھی وہ خیر و بھلائی ہے، تقدیر اگر بری ہے تو وہ

---

❶ اسے طبری (۲۸/۸۰) نے روایت کیا، اور سیوطی نے اسے عبد بن حمید اور ابن منذر کی طرف منسوب کیا۔ نیز بیہقی نے اسے "شعب الایمان" (۶/۲۲۷) میں روایت کیا۔ اسی طرح ابن کثیر نے اسے ابن ابی حاتم (۸/۱۶۳) کی طرف منسوب کیا۔ ملاحظہ ہو: "نسخة وكيع عن الاعمش" (۵)

❷ اسے أحمد (۲۱۶۸)، ابو داؤد (۱۶۷۲)، ابن حبان (۸/۱۹۹)، نسائی (۵/۸۲) اور حاکم (۱/۴۱۲) نے روایت کیا۔ حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیحین کی شرط پر صحیح ہے۔ اور ذہبی نے ان سے موافقت کی۔ اور شیخ البانی نے "الصحیحة" (۲۵۴) اور "الارواء" (۱۶۱۷) میں اسے صحیح کہا۔

مقدور اور انجام کار کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا تقدیر کا اچھا یا برا ہونا، مقدور کے اچھا یا برا ہونے کے اعتبار سے ہے۔

اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا﴾ (الروم: ٤١)

''خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے فساد پھیل گیا تا کہ اللہ ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھا دے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دنیا میں پیدا ہونے والے فساد، اس کے سبب اور اس کے انجام سے آگاہ فرمایا ہے۔ فساد شر ہے، اس کا سبب انسان کی بدعملی ہے، جبکہ اس کا انجام ہے: ﴿لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ خشکی اور تری میں فساد کا پھیل جانا بڑی حکمت کے تحت ہے، جس کی وجہ سے اس کی تقدیر خیر ہے، اور وہ حکمت ہے: لوگوں کا گناہوں سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنا۔

اسی طرح کفر اور معاصی شر ہیں اور یہ اللہ کی تقدیر سے ہیں، مگر یہ عظیم حکمت کے تحت ہیں، اگر وہ نہ ہوتیں تو شرائع باطل ہو جاتے اور لوگوں کی تخلیق عبث اور لایعنی قرار پاتی۔

مقدور کی اقسام

اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانا، ہر مقدور پر ایمان لانے کو متضمن نہیں ہے۔ مقدور کی دو قسمیں ہیں: مقدور کونی اور مقدور شرعی۔

مقدور کونی: جب اللہ تعالیٰ کسی ناپسندیدہ چیز کو تیرے مقدر میں کر دے، تو ایسا بہر صورت ہو کر رہے گا تو اسے پسند کرے یا اس سے انکار کر دے۔

مقدور شرعی: انسان اس پر کبھی عمل کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا، لیکن اسے پسند کرنے کے اعتبار سے یہ قضیہ تفصیل طلب ہے؛ اگر تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مبنی ہے تو اسے پسند کرنا واجب ہے اگر وہ اس کی معصیت پر مبنی ہے تو پھر اسے ناپسند کرنا اور اس کے خلاف جانا ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران: ١٠٤)

''تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دیتی رہے، نیکی کا حکم کرتی رہے اور گناہ سے روکتی رہے۔''

اس بناء پر ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کردہ تمام امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کا فیصلہ ہے مگر اس حیثیت سے کہ ان کا فیصلہ کیا گیا ہے؛ اسے پسند بھی کر سکتے ہیں اور ناپسند بھی۔ اگر کسی شخص سے کفر وقوع پذیر ہوا ہو تو ہم اس سے کفر کے وقوع پذیر ہونے کو تو ناپسند کریں گے مگر اس حیثیت سے اسے پسند بھی کریں گے کہ اسے اللہ نے واقع کیا ہے۔



فصل:

تقدیر پر ایمان کے درجات کے بارے میں

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَالْإِیْمَانُ بِالْقَدَرِ عَلٰی دَرَجَتَیْنِ ، کُلُّ دَرَجَةٍ تَتَضَمَّنُ شَیْئَیْنِ .))

''تقدیر پر ایمان لانے کے دو درجے ہیں، اور ہر درجہ دو چیزوں کو متضمن ہے۔''

شرح: ......مؤلف رحمہ اللہ کو یہ تقسیم اختلاف کی وجہ سے کرنی پڑی ہے، اس لیے کہ تقدیر میں اختلاف اس کے تمام مراتب کو شامل نہیں ہے۔ انسان کے لیے تقدیر کا باب علم اور دین کے مشکل ترین ابواب میں سے ایک ہے۔ اور اس میں نزاع عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن متلاشی حق کے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے علم قدیم سے موصوف ہے

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فالدرجة الاولیٰ الایمان بأن اللّٰه علم ما الخلق عاملون بعلمه القدیم الذی موصوف به ازلاً وابدا .))

''تقدیر پر ایمان کے درجات میں سے پہلا درجہ؛ اس بات پر ایمان رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم قدیم سے جس کے ساتھ وہ ازل ابد سے موصوف ہے، جانتا ہے کہ مخلوق آئندہ چل کر کیا عمل کرنے والی ہے۔''

شرح: ......[فالدرجة الاولیٰ الایمان بأن اللّٰه علم ما الخلق عاملون] ......مؤلف رحمہ اللہ نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اللہ کو اس کا علم ہے جو مخلوق کر رہی ہے؛ اس لیے کہ یہ مسئلہ اختلافی نہیں ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے جس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ اس چیز کو جانتا ہے جو اس کے مخلوق آئندہ کے لیے کرنے والی ہے یا اس کے کرنے کے بعد ہی اسے اس کا علم ہوتا ہے؟ علماء سلف اور ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا پہلے سے علم ہے۔

[بعلمه القدیم] ...... علماء کی اصطلاح میں القدیم وہ ہے جس کی ابتدا کا اوّل نہ ہو۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ان گزشتہ زمانوں سے جن کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ ان باتوں کو جانتا ہے جو مخلوق کرنے والی ہے۔ القدیم کا یہ مفہوم لغت میں اس کے مفہوم سے مختلف ہے۔ جس کی رو سے اس سے نسبتاً قدیم بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝﴾ (یس: ۳۹) ''یہاں تک کہ وہ کھجور کی قدیم شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔''

یہ سبھی کے علم میں ہے کہ کھجور کی شاخ ازلی قدیم نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے مابعد کے اعتبار سے قدیم ہے۔



اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے قدیم ازلی علم کے ساتھ اس بات سے متصف ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ مخلوق کیا عمل کرنے والی ہے؛ ایسے قدیم ازلی علم کے ساتھ کہ جس کے اول کی کوئی نہایت نہیں ہے، وہ اپنے قدیم علم سے اس بات کا علم رکھتا کہ یہ انسان فلاں دن، فلاں جگہ فلاں کام کرے گا۔ اس بات پر ایمان رکھنا ہم پر واجب ہے۔

اس کی دلیل کتاب اللہ میں بھی ہے، سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی، اور عقل انسانی میں بھی۔

قرآنی دلائل : اکثر آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم کا عموم وارد ہے۔ مثلاً:

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○﴾ (البقرہ: ۲۸۲) ''اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔''

﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ○﴾ (النساء: ۳۲) ''یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

﴿رَبَّنَآ وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (غافر: ۷)

''ہمارے رب! تو ہر چیز کا اپنی رحمت اور علم سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ○﴾ (الطلاق: ۲)

''تاکہ تم جان لو کہ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اور یقیناً اللہ نے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔''

ان کے علاوہ کتنی ہی ایسی قرآنی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم کے عموم پر دلالت کرتی ہیں۔

دلائل سنت رسول اللہ ﷺ: نبی کریم ﷺ نے امت کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیر لکھ دی تھیں۔ نیز یہ کہ انسان کو جو تکلیف پہنچی ہے وہ کبھی خطا کرنے والی نہیں تھی، اور جو نہیں پہنچی وہ کبھی پہنچنے والی نہیں تھی۔ اور یہ کہ قلمیں خشک ہو گئیں، اور دفتر لپیٹ دیئے گئے...... اس بارے میں احادیث بڑی کثرت سے وارد ہیں۔

عقلی دلائل: جہاں تک عقل کا تعلق ہے۔ تو وہ بھی یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی مخلوق ہے۔ لہٰذا از روئے عقل ضروری ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم ہو، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○﴾ (الملك: ۱٤)

''کیا وہ اسے نہیں جانتا جسے اس نے خود پیدا فرمایا ہے۔ اور وہ باریک بین خبر رکھنے والا ہے۔''

الغرض! کتاب وسنت اور عقل سبھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ازلی علم کے ساتھ اس بات کا بخوبی علم ہے کہ اس کی مخلوق کیا کچھ کرنے والی ہے۔

[**الذی موصوف بہ ازلاً وابداً.**] ..... اللہ تعالیٰ کے اس کے ساتھ ازل سے موصوف ہونے میں جہل کی نفی ہے جبکہ اس کے ساتھ اَبد سے موصوف ہونے میں نسیان کی نفی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ کا علم جہالت کے ساتھ غیر مسبوق اور نسیان کے ساتھ غیر ملحوق ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون



سے کہا تھا:

﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى۝﴾ (طٰه : ٥٢)

''اس نے کہا: اس کا علم میرے رب کے پاس ہے کتاب میں، میرا رب نہ چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔''

بخلاف مخلوق کے علم کے، جو کہ جہل سے مسبوق اور نسیان سے ملحوق ہوتا ہے۔

لہٰذا ہمارا اس بات پر ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اس سابق علم کے ساتھ اس بات کا علم ہے کہ مخلوق کیا عمل کرنے والی ہے جس کے ساتھ وہ ازل و ابد سے موصوف ہے۔

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((عَلِمَ جَمِيْعَ اَحْوَالِهِمْ مِنَ الطَّاعَاتِ وَالْمَعَاصِيْ وَالْاَرْزَاقِ وَالْآجَالِ .))

''اسے ان کے جمیع احوال کا علم ہے، ان کی اطاعت گزاریوں کا بھی، اور معاصی کا بھی، ان کے رزق کا بھی اور اوقات مقررہ کا بھی۔''

شرح: ......اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''تم میں سے ایک کی خلقت کو اس کی ماں کے پیٹ میں جمع کیا جاتا ہے......'' اس دوران آپ ﷺ نے جنین پر گزرنے والے مختلف حالات کا ذکر فرمایا۔ اسی حدیث میں آپ نے فرمایا: ''پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے، اور اسے چار باتوں کا حکم دیتے ہوئے فرمایا جاتا ہے: ''اس کا عمل، رزق، وقت مقررہ اور اس کا بد نصیب یا خوش نصیب ہونا لکھ دے......'' ❶ انسان کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں کا علم ہوتا ہے۔

اسے ہماری اطاعت گزاریوں کا بھی علم ہے اور ہماری معصیتوں کا بھی۔ ہمارا رزق بھی اس کے علم میں ہے اور ہمارا وقت مقررہ بھی، اس پر کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، انسان کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اور کہاں مرے گا، کس وجہ سے مرے گا اور کس حال میں مرے گا؟ جبکہ اللہ کو یہ سب کچھ معلوم ہے۔ یہ درجہ اولیٰ کی پہلی چیز ہے۔

لوحِ محفوظ میں مخلوق کی تقدیر

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثُمَّ كَتَبَ اللّٰهُ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ مَقَادِيْرَ الْخَلْقِ .))

''پھر اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں مخلوق کی تقدیریں لکھیں۔''

شرح: ......یہ درجہ اولیٰ کی دوسری چیز ہے۔ ہم لوح محفوظ کی ماہیت سے آگاہ نہیں ہیں؛ وہ لکڑی کی ہے یا لوہے کی، سونے کی ہے یا چاندی کی؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ہمارا تو اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ

---

❶ اسے بخاری (٣٢٨)، اور مسلم (٢٦٤٣) نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔

میں ہر چیز کی تقدیر لکھ دی ہے۔ ہمیں اس بارے میں مزید کچھ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ہاں اگر کتاب وسنت کسی چیز پر دلالت کریں تو ہم پر اس کا اعتقاد رکھنا واجب ہوگا۔

اسے محفوظیت سے موصوف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مخلوق کے ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ کسی کے لیے اس میں کسی چیز کا اضافہ کرنا یا اس میں کوئی تبدیلی کرنا ممکن نہیں ہے حتی کہ اللہ تعالیٰ بھی اس میں موجود کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم سے لکھا ہے۔ جس طرح کہ مؤلف اس کا ذکر کریں گے۔

- اسی لیے شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ان المکتوب فی اللوح المحفوظ لا یتغیّر أبدا.))

''لوح محفوظ میں لکھی گئی چیز کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔''

تبدیلی فرشتوں کے پاس موجود کتابوں میں ہوتی ہے۔

شرح:......[مَقَادِيرَ الْخَلْقِ]......یعنی تمام مخلوقات کی تقدیریں۔ نصوص کا ظاہر انسانوں اور حیوانوں کے افعال کو شامل ہے، لیکن کیا یہ کتابت اِجمالی ہے یا تفصیلی؟

ہمارے لیے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کتابت اِجمالی ہے یا تفصیلی۔

مثلاً: کیا قرآن مجید لوح محفوظ میں ان آیات اور حروف کے ساتھ لکھا ہوا ہے یا اس کا ذکر لکھا ہوا ہے اور یہ کہ اسے محمد ﷺ پر اتارا جائے گا اور یہ کہ وہ لوگوں کے لیے ہدایت اور نور ہوگا، اور اس طرح کے دوسرے امور؟

اگر ہم ظاہر نصوص کی طرف دیکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ سارے کا سارا قرآن اِجمالا اور تفصیلاً لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اور اگر ہم اس بات کی طرف دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن اتارتے وقت اس کے ساتھ تکلم فرماتا تھا تو پھر کہہ سکتے ہیں کہ لوح محفوظ میں قرآن کا ذکر لکھا ہوا ہے۔ مگر لوح محفوظ میں اس کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس میں لکھا ہوا بھی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں فرمایا:

﴿وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ۝﴾ (الشعراء: ۱۹۶) ''اور یقیناً وہ پہلی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔''

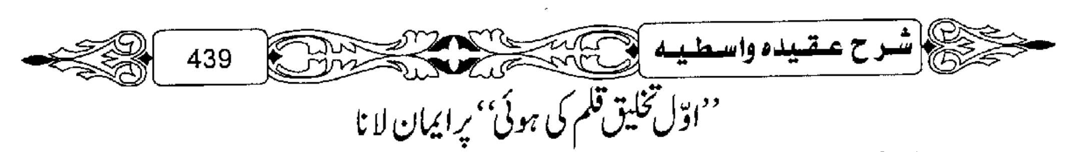
حالانکہ یہ سبھی کے علم میں ہے کہ کتب سابقہ میں اس کی نص نہیں بلکہ اس کا ذکر موجود ہے۔ قرآنی آیت:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۝﴾ (البروج: ۲۲-۲۱)

''بلکہ وہ قرآن ہے بڑی شان والا لوح محفوظ میں۔''

کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لوح محفوظ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

الـمـهـم ہمارا ایمان ہے کہ مخلوقات کی تقدیریں لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور یہ کہ اس میں لکھی ہوئی کسی چیز میں تبدیلی ممکن نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس میں قیامت تک ہونے والے واقعات اللہ کے حکم سے ہی لکھے گئے ہیں۔



’’اوّل تخلیق قلم کی ہوئی‘‘ پر ایمان لانا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿(فأول ما خلق الله القلم ؛ قال له: اکتب !قال: ما أکتب ؟ قال : اکتب ماھو کائن الی یوم القیامۃ .)) ❶

’’اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ اس سے فرمایا: لکھ! اس نے کہا: کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا: وہ سب کچھ لکھ دے جو قیامت تک ہونے والا ہے۔‘‘

شرح:......[فاول ما خلق الله القلم ؛ قال له: اکتب]......’’اللہ تعالیٰ نے قلم کو لکھنے کا حکم دیا‘‘ حالانکہ قلم جامد ہے۔

سوال: پیدا ہوتا ہے کہ جمادات سے کس طرح خطاب کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جامد اشیاء اللہ تعالیٰ کی نسبت سے عاقل ہیں، جن سے مخاطب ہونا درست ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ (فصلت: ۱۱)

’’پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، اور وہ دھواں ہی دھواں تھا، تو فرمایا اس سے اور زمین سے کہ تم دونوں آؤ خوشی یا ناخوشی۔ انہوں نے کہا: ہم آتے ہیں خوشی خوشی۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو مخاطب کیا اور ان کے جواب کا بھی ذکر کیا۔ اور ان کا جواب جمع عقلاء (طائعین) کے ساتھ دیا، نہ کہ طائف کے ساتھ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آگ سے فرمایا:

﴿يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ (الانبیاء: ۶۹)

’’اے آگ! ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔‘‘

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح قرآن میں آتا ہے:

﴿يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ﴾ (سبا: ۱۰)

’’اے پہاڑو! تسبیح دہراؤ اس کے ساتھ اور پرندو تم بھی۔‘‘

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پہاڑ ان کے ساتھ مل کر تسبیح دہرایا کرتے تھے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو لکھنے کا حکم دیا تو اس نے اس حکم کی تعمیل کر دی، مگر اسے یہ اشکال لاحق ہوا کہ وہ کیا لکھے؛ اس لیے کہ حکم مجمل تھا۔ لہٰذا اس نے وضاحت چاہی کہ: ’’کیا لکھوں؟‘‘

[قال]...... یعنی اللہ نے فرمایا۔

[اکتب ماھو کائن إلی یوم القیامۃ] ...... وہ سب کچھ لکھ دے جو قیامت تک ہونے والا ہے۔ چنانچہ قلم نے

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔



اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ لکھ ڈالا۔ اس لیے کہ اللہ کے حکم کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

مؤلف رحمہ اللہ کا قول: "ماهو كائن الى يوم القيامة" اللہ عزوجل کے فعل کو بھی شامل ہے اور مخلوقات کے افعال کو بھی۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَمَا اَصَابَ الْاِنْسَانَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَهُ ، وَمَا اَخْطَاَهُ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَهُ .))

''انسان کو جو کچھ میسر آ جائے وہ اس سے رک نہیں سکتا تھا، اور جو کچھ میسر نہ آئے وہ اسے مل نہیں سکتا تھا۔''

اگر آپ کا اس جملہ پر ایمان ہو تو آپ ہر طرح سے مطمئن رہیں گے۔

شرح: ......[مَا اَصَابَ] ...... کا ایک معنی تو یہ ہے کہ جس چیز کا میسر آنا اس کے مقدر میں کر دیا گیا ہے، وہ اسے میسر آتی رہے گی اور اس سے ہرگز نہیں چوک سکے گی۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ جو کچھ بالفعل اسے میسر آ گیا ہے اس کا اس سے چوک جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ ان میں سے ہر معنی اپنی جگہ پر درست ہے، اور اُن میں باہم کوئی منافات نہیں ہے۔ اور جو کچھ اس سے چوک گیا وہ اسے میسر نہیں آ سکتا تھا، یعنی جس چیز کا چوک جانا اس کے مقدر میں کر دیا گیا ہے وہ اسے میسر نہیں آ سکتا۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ جو کچھ بالفعل اس سے چوک گیا وہ اسے میسر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ دونوں معنی بھی صحیح ہیں اور ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

قلم کا خشک اور رجسٹروں کا بند ہونا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((جَفَّتِ الْاَقْلَامُ وَطُوِیَتِ الصُّحُفُ .)) ''قلمیں خشک ہو گئیں اور رجسٹر لپیٹ دیے گئے۔''

شرح: ......[اَلْاَقْلَامُ] ...... سے مراد تقدیر کی قلمیں ہیں جن کے ساتھ اللہ نے مخلوق کی تقدیر لکھی۔ یعنی وہ خشک ہو گئیں۔

[اَلصُّحُفُ.] ...... رجسٹر لپیٹ لیے گئے۔ یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ معاملہ ختم ہو چکا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سراقہ بن مالک بن جعشم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! ہمارے لیے ہمارے دین کی اس طرح وضاحت فرما دیں گویا کہ ہم ابھی پیدا ہوئے ہوں: ہمارے آج کے عمل کی کیا حیثیت ہے، کیا یہ وہ عمل ہے جس کے ساتھ قلمیں خشک ہو گئیں اور تقدیریں جاری ہو گئیں؟ یا اس کا تعلق مستقبل کے ساتھ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ یہ وہ عمل ہے جس کے ساتھ قلم خشک ہو گئے اور تقدیریں جاری ہو گئیں۔'' سراقہ کہنے لگا: پھر عمل کی کیا حیثیت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم عمل کرتے رہو، ہر ایک عمل آسان کر دیا جائے گا۔''[1]

[1] اسے مسلم نے روایت کیا (۲۶۴۸)



❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (الحج : ۷۰)

''کیا آپ نہیں جانتے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ بیشک یہ کتاب میں ہے۔ بیشک یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔''

شرح:......[كَمَا]......اس جیسی تعبیر میں کاف تفصیل کے لیے ہوتا ہے۔

[اَلَمْ تَعْلَمْ]...... یعنی اے مخاطب۔

[اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ]..... یہ عام ہے یعنی وہ آسمان اور زمین میں موجود تمام اعیان و اوصاف اور اعمال واحوال کو جانتا ہے۔

[اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ]..... کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

[اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ]..... یعنی لکھنا اللہ تعالیٰ کے لیے آسان سی بات ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (الحديد : ۲۲)

''نہیں پہنچتی کوئی بھی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں، مگر وہ کتاب میں لکھی ہوتی ہے اس سے قبل کہ ہم اسے پیدا کریں، یقیناً یہ (لکھنا) اللہ پر بہت آسان ہے۔''

شرح:......[فِي الْاَرْضِ]......مثلاً خشک سالی، زلزلے، اور سیلاب وغیرہا۔

[وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ]......مثلاً بیماریاں اور تباہ کن وبائیں وغیرہا۔

[اِلَّا فِيْ كِتَابٍ]......کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

[نَّبْرَاَهَا]......یعنی انہیں پیدا کرنے سے قبل۔ اور ''نبر أها'' میں ضمیر کا مرجع مصیبت بھی ہو سکتا ہے اور انفس بھی، یہ ضمیر الارض کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور یہ سب کچھ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ نے مصیبت کو اسے پیدا کرنے سے پہلے، مصیبت زدہ شخص کو پیدا کرنے سے پہلے اور زمین کو پیدا کرنے سے پہلے لکھ دیا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ نے مخلوقات کی تقدیروں کو آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے



لکھ دیا تھا، اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔'' [1]

تقدیر اللہ کے علم کے تابع ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهٰذَا التَّقْدِيْرُ التَّابِعُ لِعِلْمِهِ سُبْحَانَهُ يَكُوْنُ فِيْ مَوَاضِعَ جُمْلَةً وَ تَفْصِيْلًا .))

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کے تابع یہ تقدیر اجمالا اور تفصیلاً کچھ دیگر مقامات میں بھی ہوتی ہے۔''

شرح: ......[فِيْ مَوَاضِعَ] ...... یعنی لوح محفوظ کے علاوہ کچھ دیگر مقامات میں بھی ہوتی ہے۔''

پھر وہ ان مقامات کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

((فَقَدْ كَتَبَ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ مَا شَاءَ . "وَإِذَا خَلَقَ جَسَدَ الْجَنِيْنِ قَبْلَ نَفْخِ الرُّوْحِ فِيْهِ ؛ بَعَثَ إِلَيْهِ مَلَكًا ، فَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ ، فَيُقَالُ لَهُ: اكْتُبْ رِزْقَهُ وَأَجَلَهُ وَعَمَلَهُ وَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيْدٌ وَنَحْوَ ذٰلِكَ .))

''اس نے جو کچھ چاہا لوح محفوظ میں لکھا'' جنین کا جسم پیدا کرنے کے بعد اور اس میں روح پھونکنے سے قبل اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے اور اسے چار چیزوں کا حکم دیا جاتا ہے، پس اس سے کہا جاتا ہے: اس کا رزق، اس کا وقت مقرر، اس کا عمل اور اس کا بدنصیب ہونا یا خوش نصیب ہونا لکھ دے، اور اس طرح کی دوسری تقدیر۔''

اور وہ دو جگہیں ہیں:

پہلی جگہ: لوح محفوظ، اس کی دلیل اور تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

دوسری جگہ: کتابۃ عمر یہ جو کہ ماں کے پیٹ میں جنین کی لکھی جاتی ہے۔

تیسری جگہ کی طرف انہوں نے ''ونحو ذلك'' کہہ کر اشارہ کیا ہے، اور یہ ہے سالانہ تقدیر، جو شب قدر میں لکھی جاتی ہے؛ اس رات میں اس سال ہونے والی اہم چیزیں لکھی جاتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ○ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ○﴾ (الدخان: ٥-٤)

''اس رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر پر از حکمت کام کا، یعنی حکم دیا ہے ہماری طرف سے یقیناً ہم ہی بھیجنے والے ہیں۔''

غالی قدریہ کا تقدیر سے انکار

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فهذا التقدير قد كان ينكره غلاة القدرية قديماً وينكروه اليوم قليل .))

[1] صحيح مسلم: ٢٦٥٣.



''اس تقدیر کا پہلے غالی قدریہ انکار کرتے تھے، جبکہ آج کل اس کے منکرین کی تعداد بہت کم ہے۔''

شرح: ......[فھذا التقدیر] ......یعنی علم اور تقدیر کا پہلے غالی قدریہ انکار کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا ان کے معرض وجود میں آ جانے کے بعد علم ہوتا ہے، اور یہ کہ وہ لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ وہ کہتے تھے کہ معاملات نئے سرے سے وجود میں آتے ہیں، مگر ان کے متاخرین علم اور کتابت کا تو اقرار کرتے جبکہ مشیت اور خلق کا انکار کرتے ہیں، یہ بندوں کے افعال کی نسبت سے ہے۔ مگر خود اللہ تعالیٰ کے افعال کی نسبت سے کوئی بھی اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے وقوع سے قبل ان کا علم ہوتا ہے۔ جو لوگ بندوں کے اَفعال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم کا انکار کرتے ہیں، شرع ان پر کفر کا حکم لگاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک:

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (البقرہ: ۲۸۲) ''اور اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔''

اور اس جیسی دیگر بہت سی آیات کا انکار کرتے اور معلوم ضروریات دین کی مخالفت کرتے ہیں۔

ایمان بالقدر کا دوسرا درجہ

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَمَّا الدَّرَجَةُ الثَّانِيَةُ فَهِيَ مَشِيْئَةُ اللّٰهِ النَّافِذَةُ ، وَقُدْرَتُهُ الشَّامِلَةُ ، وَهُوَ الْاِيْمَانُ بِاَنَّ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ ، وَمَا لَمْ يَشَاْ لَمْ يَكُنْ ، وَاَنَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ حَرَكَةٍ وَلَا سُكُوْنٍ اِلَّا بِمَشِيْئَةِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ .))

''ایمان بالقدر کے درجات میں سے دوسرا درجہ اللہ تعالیٰ کی مشیت نافذہ اور قدرت کاملہ کا ہے۔ یعنی اس بات پر ایمان رکھنا کہ جو کچھ اللہ چاہے گا ہوگا اور جو وہ نہیں چاہے گا نہیں ہوگا، اور یہ کہ آسمانوں اور زمین میں ہر حرکت و سکون اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔''

شرح: ......یعنی تو اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہر چیز میں نافذ ہے، وہ چیز اس کے اپنے فعل سے تعلق رکھتی ہو یا مخلوق کے افعال سے، اور یہ کہ اس کی قدرت ہمہ گیر ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهُ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا﴾ (فاطر: ۴۴)

''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ اسے عاجز کر سکتی ہو کوئی بھی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں، یقیناً وہ خوب علم والا، خوب قدرت والا ہے۔''

ایمان بالقدر کا یہ درجہ دو چیزوں کو متضمن ہے؛ مشیت اور خلق۔

جہاں تک مشیت کا تعلق ہے تو ہمارے لیے یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہر چیز میں نافذ ہے اور اس کی قدرت اس کے افعال اور مخلوق کے افعال میں سے ہر شے کو شامل ہے۔



مشیت کا اس کے اپنے افعال کو شامل ہونے کا معاملہ تو ظاہر ہے۔
جب کہ اس کا اس کی مخلوق کے افعال کو شامل ہونا اس لیے ہے کہ ساری مخلوق اللہ کا ملک ہے اور اس کے ملک میں وہی کچھ ہوسکتا ہے جسے وہ چاہے۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿فَلَوْشَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۴۹) ''اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔''

اس کی دوسری دلیل ہے:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (ھود: ۱۱۸)
''اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا۔''

اور تیسری دلیل ہے:

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ (البقرہ: ۲۵۳)
''اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان کے بعد تھے اس کے بعد کہ آ چکے تھے ان کے پاس واضح دلائل، لیکن انہوں نے اختلاف کیا، پھر ان میں سے کچھ تو وہ تھے جو ایمان لائے، اور کچھ وہ تھے جنہوں نے کفر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ مرتے۔''

یہ آیات کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت سے تعلق رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الدھر: ۳۰) ''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''
یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندے کی مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لَا يَكُوْنُ فِيْ مُلْكِهِ مَا لَا يُرِيْدُ .)) ''اس کے ملک میں وہی کچھ ہوسکتا ہے جو وہ چاہے۔''

شرح: ......مؤلف رحمہ اللہ کی یہ عبارت تفصیل طلب ہے: اس کے ملک میں ارادہ کونیہ کے ساتھ تو وہی کچھ ہوسکتا ہے جو وہ چاہے۔مگر ارادہ دو قسموں میں منقسم ہے: ارادۂ کونیہ اور ارادہ شرعیہ۔

ارادہ کونیہ مشیت کے معنی میں ہوتا ہے، اس کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے یہ ارشاد ہے:

﴿وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾ (ھود: ۳۴)
''اور تمہیں میری نصیحت نفع نہ دے گی اگر میں ارادہ بھی کروں تمہیں نصیحت کرنے کا اگر اللہ ارادہ کرے تمہیں گمراہ کرنے کا۔''

اور ارادہ شرعیہ میں محبت کا معنی پایا جاتا ہے۔اس کی مثال یہ ارشاد باری ہے:



﴿وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ﴾ (النساء : ٢٧) ''اور اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

یہ دونوں ارادے اپنے اپنے موجب اور متعلق میں مختلف ہوتے ہیں۔

متعلق میں ارادہ کونیہ کا تعلق واقع ہونے والی چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ انہیں پسند کرے یا ناپسند۔ جبکہ ارادہ شرعیہ کا تعلق اس کی پسندیدہ چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے، وہ واقع ہوں یا نہ ہوں۔

اور **موجب** کے حوالے سے ارادہ کونیہ میں مراد کا وقوع متعین ہوتا ہے جبکہ ارادہ شرعیہ میں وقوع مراد متعین نہیں ہوتا۔

اس بنا پر مؤلف کے قول: "ولا یکون فی ملکه مالا یرید" سے مراد ارادہ کونیہ ہے۔

سوال: کیا معاصی اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں؟

جواب: معاصی ارادہ شرعیہ کے ساتھ اللہ کی مراد نہیں ہیں؛ اس لیے کہ وہ انہیں پسند نہیں کرتا، البتہ ارادہ کونیہ کے ساتھ ایسا ضرور ہے؛ اس لیے کہ وہ اس کی مشیت سے واقع ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَنَّهُ سُبْحَانَهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ مِنَ الْمَوْجُوْدَاتِ وَالْمَعْدُوْمَاتِ .))

''اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ موجودات اور معدومات میں سے ہر شے پر قادر ہے۔''

اللہ تعالیٰ موجودات میں سے ہر شے پر قادر ہے؛ اسے معدوم کر دے یا اسے تبدیل کر دے، اسی طرح وہ معدومات میں سے ہر چیز پر قادر ہے، اگر چاہے تو اسے عدم سے وجود میں لا سکتا ہے۔

قدرت ایزدی کا موجود کے ساتھ تعلق اس کے ایجاد، اعدام اور تبدیل کر دینے کے حوالے سے ہے۔ اور معدوم کے ساتھ اس کے اعدام یا ایجاد کے حوالے سے۔

مثلاً: اللہ تعالیٰ ہر موجود کو معدوم کرنے پر قادر ہے اور اسے تبدیل کرنے پر قادر ہے، وہ اسے ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کسی بھی معدوم چیز کو ایجاد کرنے پر قادر ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرہ : ٢٠) ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

بعض علماء نے اس سے ذات باری تعالیٰ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اپنی ذات پر قادر نہیں ہے، ان کے خیال میں اس پر عقل دلالت کرتی ہے۔

مگر ہم ان سے یہ دریافت کرنا چاہیں گے کہ آپ کی اس سے کیا مراد کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر قادر نہیں ہے؟

اگر تو اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو معدوم کرنے یا اس میں نقص پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے تو اس حوالے سے ہمیں آپ کے ساتھ اتفاق ہے۔ مگر ہمیں آپ کے ساتھ اس حوالے سے موافقت نہیں ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جس کے



ساتھ قدرت کا تعلق ہے؛ اس لیے کہ قدرت ممکن چیز کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ رہا امر واجب یا مستحیل، تو اس کے ساتھ قدرت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ واجب چیز مستحیل العدم ہوتی ہے اور مستحیل، مستحیل الوجود۔

اگر آپ کی اس سے یہ مراد ہو کہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ جو چاہے کر گزرے پس وہ آسمان پر آنے یا اس جیسی کسی اور چیز پر قادر نہیں ہے۔ تو یہ غلط ہے بلکہ اللہ اس پر قادر ہے اور وہ یہ کچھ کر سکتا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ اس قسم کے افعال پر قادر نہیں ہے؛ تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ممتنع بہت بڑا نقص ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قدرت باری تعالیٰ کے عموم سے یہ استدراک ہر اعتبار سے غیر محل میں ہے۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں رب تعالیٰ کی قدرت کے ہمہ گیر ہونے کے دلائل ان کے اس قول کی تردید کرتے ہیں۔

خالق کل اللہ کی ذات ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَمَا مِنْ مَخْلُوْقٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ اِلَّا اللّٰهُ خَالِقُهُ سُبْحَانَهُ ، لَا خَالِقَ غَيْرُهُ ، وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.))

''آسمان اور زمین میں موجود ہر مخلوق کا خالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے اس کے علاوہ کوئی خالق نہیں اور اس کے سوا کوئی رب نہیں۔''

شرح: ...... یہ بات درست اور یقیناً درست ہے۔ اس کے اثری دلائل بھی ہیں اور نظری بھی۔ جہاں تک اثری دلائل کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الزمر: ٦٢) ''اللہ ہر شے کا خالق ہے۔''

اور دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ (الطور: ٣٥-٣٦)

''کیا وہ پیدا کیے گئے ہیں بغیر کسی کے (پیدا کرنے کے) یا وہ خود (اپنے آپ کے) خالق ہیں، کیا انہوں نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔''

آسمانوں اور زمینوں میں جو چیز بھی موجود ہے، اس کا خالق صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کو بڑے زوردار انداز میں چیلنج کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ (الحج: ٧٣)

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو، یقیناً جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، خواہ وہ اس کام کے لیے سب کے سب جمع ہو جائیں۔''

یہ تو سبھی کے علم میں ہے کہ وہ لوگ جنہیں اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے وہ ان کے نزدیک بڑے بلند پایہ تھے، اس لیے کہ انہوں نے انہیں رب بنا رکھا تھا۔ جب چوٹی کہ یہ لوگ ایک مکھی پیدا کرنے سے بے بس ہو گئے حالانکہ وہ بڑی معمولی اور کمزور سی چیز ہے تو وہ اس سے بڑی چیز کو پیدا کرنے سے بطریق اولیٰ بے بس رہیں گے۔ بلکہ اللہ نے تو یہاں تک فرمایا:

﴿وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ (الحج: ٧٣)

''اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔''

یعنی وہ اس حد تک عاجز و بے بس ہیں کہ مکھی سے بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتے اور اس سے بھی اپنا حق وصول کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

سوال: بتوں سے مکھی کس طرح کوئی چیز چھین سکتی ہے؟

جواب: بعض علماء فرماتے ہیں: ایسا علی سبیل الفرض کہا گیا ہے۔ یعنی فرض کریں اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ جبکہ بعض علماء کے نزدیک یہ امر واقع کے طور پر ہے مکھی بتوں پر بیٹھ کر ان کی خوشبو وغیرہ چوس لیتی ہے، مگر وہ اسے اس سے نکلوانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے خلق کے عموم پر ایمان لانا واجب ہے، وہ ہر چیز کا خالق ہے یہاں تک کہ بندوں کے افعال کا بھی خالق ہے۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ﴾ (الرعد: ١٦) ''اللہ ہر شے کا خالق ہے۔'' اور انسان کا عمل بھی ایک شے ہے۔ اور اللہ فرماتا ہے: ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا﴾ (الفرقان: ٢) ''اور اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کا ٹھیک ٹھیک انداز ٹھہرایا۔'' اس بارے میں بہت سی آیات وارد ہیں۔ اور ایک آیت تو اس موضوع کے ساتھ خاص ہے، اور وہ موضوع ہے: بندوں کے افعال کا پیدا کرنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات: ٩٦) ''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔''

اس جگہ ﴿مَا﴾ مصدریہ ہے۔ اور تقدیری عبارت یہ ہے: واللہ خلقکم و عملکم . اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ انسان کا عمل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔

سوال: کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ ﴿مَا﴾ اسم موصول ہو۔ اور آیت کا معنی یہ ہو: اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور اسے بھی جو تم عمل کرتے ہو؟

اس احتمال کی موجودگی میں یہ کہنا کس طرح ممکن ہے کہ ﴿مَا﴾ موصولہ ہونے کی تقدیر پر یہ آیت بندوں کے افعال کے خلق کی دلیل ہے؟

جواب: جب معمول اللہ کی مخلوق ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ انسان کا عمل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اس لیے کہ



معمول انسان کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، انسان ہی معمول میں براہ راست کردار ادا کرتا ہے۔ پھر جب معمول اللہ کی مخلوق ہے جو کہ بندے کا فعل ہے تو اس سے بندے کے فعل کا مخلوق ہونا لازم آئے گا۔ لہٰذا ان دونوں احتمالوں پر قرآنی آیت بندوں کے افعال کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے۔

رہی بندوں کے افعال کے اللہ کی مخلوق ہونے کی نظری دلیل، تو اس بارے میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ بندے کا فعل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے، اور وہ دو چیزیں ہیں: عزم صادق اور قدرت تامہ۔

مثلاً: جب میں کوئی بھی عمل کرنا چاہوں تو اس سے پہلے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

پہلی چیز: جو کچھ کرنا ہو اس کا عزم صادق اس لیے کہ اگر آپ عزم نہیں کریں گے تو وہ کام نہیں کر پائیں گے۔

دوسری چیز: قدرت تامہ، اس لیے کہ اگر آپ وہ کام کرنے پر قادر نہیں ہوں گے تو اسے نہیں کر سکیں گے۔

پھر اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ کو قدرت دی اور اسی نے آپ میں عزم ودیعت کیا اور جو سبب کا خالق ہے وہی مسبب کا بھی خالق ہے۔

دوسری نظری دلیل یہ ہے کہ فعل، فاعل کا وصف ہوا کرتا ہے، اور وصف موصوف کے تابع ہوتا ہے۔ پس جس طرح انسان خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس کے افعال بھی اس کی مخلوق ہیں، اس لیے کہ صفت موصوف کے تابع ہوا کرتی ہے۔

اس دلیل سے واضح ہوا کہ انسان کا عمل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔

[لَا خَالِقَ غَيْرُهُ] ..... اگر کوئی شخص یہ سوال اٹھائے کہ اس حصر کی تردید اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی خالق کا وجود موجود ہے۔ مصور اپنے آپ کو خالق شمار کرتا ہے۔ حتی کہ ایک حدیث میں بھی اسے خالق کہا گیا ہے۔ ارشاد پیغمبر ﷺ ہے: ''تصویریں بنانے والوں کو عذاب دیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا: جسے تم نے پیدا کیا انہیں زندہ کرو۔'' [1] اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ (المومنون: ١٤)

''بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالق تو اور بھی ہیں مگر اللہ سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے، آپ مؤلف رحمہ اللہ کے قول کا کیا جواب دیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس خلق کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ ایجاد اور اعیان کو ایک عین سے دوسرے عین میں تبدیل کرنے سے عبارت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ تو کوئی کسی چیز کو وجود میں لا سکتا ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی ایک عین کو دوسرے عین میں تبدیل کر سکتا ہے۔

اس پر مخلوق کی نسبت سے خلق کا جو اعتراض کیا گیا ہے وہ کسی چیز کو اس کی ایک صفت سے دوسری صفت میں تحویل سے

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی صحیحین کی اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے۔



عبارت ہے۔ مثلاً لکڑی کو درخت سے کاٹ کر دروازے میں تبدیل کرنا خلق کہلاتا ہے مگر یہ ایسا خلق نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہو، اور وہ ہے: کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا، یا خلق کے ساتھ ایک عین کو دوسرے عین میں تبدیل کرنا۔

[لَا رَبَّ سِوَاهُ] ..... یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اکیلا ہی رب ہے جو تمام امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔ اور یہ حقیقی حصر ہے۔

مگر اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ احادیث میں غیر اللہ کے لیے ربوبیت کا اثبات کیا گیا ہے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے گم شدہ اونٹ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''اسے چھوڑ دیں، اس کا مشکیزہ اور اس کا جوتا اس کے ساتھ ہے۔ وہ پانی پر وارد ہوتا رہے گا اور درختوں سے خوراک حاصل کرتا رہے گا، یہاں تک کہ اس کا رب اسے حاصل کرے گا۔'' ❶ اس کے رب سے مراد اس کا مالک ہے۔

اور حدیث جبرئیل کے الفاظ ہیں: ''جب لونڈی اپنے رب کو جنم دے گی۔'' ❷

آپ اس میں اور مؤلف کے قول: ''لا رب سواہ'' میں کس طرح تطبیق دیں گے؟

اس حوالے سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عام اور کامل ہے۔ ہر چیز کا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے ساتھ جو کچھ بھی کرے وہ اس کے لیے کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا ہر فعل رحمت اور حکمت پر مبنی ہوا کرتا ہے، اللہ رب کائنات قحط سالی، بیماری، موت اور اس طرح کی دیگر چیزیں انسانوں کے مقدر میں بھی کرتا ہے اور حیوانات کے مقدر میں بھی۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس کی حکمت کے تحت ہے۔

جہاں تک مخلوق کی مخلوق کے لیے ربوبیت کا تعلق ہے تو یہ ربوبیت ناقص بھی ہے اور قاصر بھی، وہ نہ تو اپنے محل سے تجاوز کر سکتی ہے اور نہ ہی اس میں انسان مکمل طور پر تصرف کر سکتا ہے۔

بلکہ اس کا تصرف یا تو شریعت کے ساتھ مقید ہے یا پھر عرف کے ساتھ۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ومع ذلك، فقد أمر العباد بطاعته وطاعة رسله ونهاهم عن معصيته.))

''مگر اس کے باوجود اس نے اپنے بندوں کو اپنی اور اپنے رسولوں کی اطاعت کا حکم دیا اور انہیں اپنی معصیت سے منع فرمایا۔''

شرح: ..... یعنی اس نے اپنے خلق اور ربوبیت کے عموم کے باوجود بندوں کو بے مقصد نہیں چھوڑا، اور نہ ان سے اختیار سلب کیا، بلکہ انہیں اپنی اور اپنے رسولوں کی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی معصیت سے منع فرمایا۔

اس کا اپنے بندوں کو حکم دینا امر ممکن ہے اس لیے کہ جسے اس کا حکم دیا گیا ہے وہ بھی اس کی مخلوق ہے اور اس کا فعل بھی

❶ اسے بخاری (۲۴۲۹)، اور مسلم (۱۷۲۲) نے زید بن خالد رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔

❷ اسے بخاری (۵۰) اور مسلم (۹) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔



اس کی مخلوق ہے۔ لہٰذا اسے حکم بھی دیا جاسکتا ہے اور منع بھی کیا جاسکتا ہے۔

اگر انسان اپنے عمل کے لیے مجبور ہوتا تو پھر اس کا حکم غیر ممکن چیز کے لیے ہوتا، جبکہ اللہ فرماتا ہے:

﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق ہی۔''

اور دوسری آیت میں آتا ہے:

﴿لَا یُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (الانعام: ۱۵۲) ''وہ نہیں مکلّف ٹھہراتا مگر اس کی تکلیف کے مطابق ہی۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بندے اطاعت کرنے اور معصیت سے بچنے پر قدرت رکھتے ہیں، اور یہ کہ وہ اس کے لیے مجبور نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُوَ سُبْحَانَهٗ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ وَالْمُحْسِنِیْنَ وَالْمُقْسِطِیْنَ .))

''اللہ تعالیٰ متقین، محسنین اور مقسطین سے محبت کرتا ہے۔'' ارشاد ہوتا ہے:

شرح:.....﴿وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (البقرہ: ۱۹۵)

''اور اچھے کام کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

﴿فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ﴾ (التوبہ: ۷)

''جب تک وہ قائم رہیں تمہارے لیے تو تم بھی قائم رہو ان کے لیے، یقیناً اللہ تعالیٰ متقین (پرہیزگاروں) سے محبت کرتا ہے۔''

﴿وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ﴾ (الحجرات: ۹)

''اور انصاف کرو یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے، اور یہ اس امر کے باوجود ہے کہ اسی نے اپنے پسندیدہ عمل کو ان کے مقدر میں کیا ہے۔ پس ان کا فعل اللہ کا محبوب فعل اور شرعی وکونی امر کے اعتبار سے اس کی مراد ہے۔ محسن واجب اور مستحب کی ادائیگی کرتا ہے، متقی واجب کی اور مقسط معاملات میں ظلم وزیادتی سے مکمل اجتناب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو پسند اور کافروں کو ناپسند کرتا ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَیَرْضٰی عَنِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا یُحِبُّ الْكَافِرِیْنَ .))



''وہ ایمان والوں اور نیک اعمال کرنے والوں سے راضی ہوتا ہے، اور کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''

شرح:......[وَیَرْضٰی عَنِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ] ...... اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبه: ۱۰۰)

''اور سبقت لے جانے والے پہلے پہل مہاجرین اور انصار میں سے اور جنہوں نے نیکی کرنے میں ان کی اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ (البینه: ۶۔۷)

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے بہتر مخلوق ہیں، ان کا بدلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں، راضی ہوگیا اللہ ان سے اور وہ راضی ہوگئے ان سے۔''

[وَلَا یُحِبُّ الْكَافِرِیْنَ.] ...... اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ۝﴾ (آل عمران: ۳۲)

''پھر اگر وہ پھر جائیں تو یقیناً اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔''

اگر چہ کفر اس کی مشیت سے واقع ہوتا ہے مگر اس سے اس کا پسندیدہ ہونا لازم نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ فاسق انسان اور فسادی کو پسند نہیں کرتا

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ولا یرضی عن القوم الفاسقین ولا یأمر بالفحشاء ولا یرضی لعباده الکفر ولا یحب الفساد.))

''اور اللہ فاسق قوم سے خوش نہیں ہوگا، اور وہ بے حیائی کا حکم نہیں کرتا اور نہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

شرح:......فاسقین سے خوش نہ ہونے کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۝﴾ (التوبه: ۹۶)

''(بفرض محال) اگر آپ ان سے خوش ہو بھی جائیں تو یقیناً اللہ فاسق قوم سے خوش نہیں ہوگا۔''

(فاسق) اللہ کی اطاعت سے خروج کرنے والا۔ سے مراد کبھی کافر بھی ہوتا ہے اور کبھی عاصی و نافرمان بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ:

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ ○ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ○﴾

(السجدہ: ۲۰۔۱۸)

''کیا مومن فاسق جیسا ہوسکتا ہے؟ وہ برابر نہیں ہو سکتے، جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے رہنے کے باغات ہیں، یہ مہمانی ہے اس کی جو وہ عمل کرتے رہے، مگر جو لوگ فاسق ہوئے تو ان کا ٹھکانا آگ ہے وہ جب بھی اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے اس میں واپس لوٹا دیئے جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا کہ آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلا رہے تھے۔''

مندرجہ بالا آیت میں فاسق سے مراد کافر ہے۔ جبکہ مندرجہ ذیل میں فاسق سے مراد عاصی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ (الحجرات: ۶)

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔''

اللہ تعالیٰ فاسقوں کو پسند نہیں کرتا، نہ ان کو اور نہ ان کو، لیکن فاسقین بمعنی کافرین کو تو مطلقاً پسند نہیں کرتا، جبکہ نافرمانوں کے معنی میں فاسقین کی نافرمانیوں کو تو پسند نہیں کرتا جبکہ ان کی اطاعت گزاریوں کو پسند کرتا ہے۔ ﴿لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ اس کی دلیل یہ ارساد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (الاعراف: ۲۸) ''کہہ دیجیے کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔''

اس لیے کہ وہ بے حیائی کے ارتکاب پر کہا کرتے تھے: ﴿وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا﴾ ''اس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا۔''

انہوں نے اس پر دو چیزوں سے حجت لی، جس کے جواب میں اللہ نے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، جب کہ اس نے ان کے اس قول: ﴿وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا﴾ کہ ''ہم نے اس پر اپنے آباء واجداد کو پایا۔'' سے سکوت اختیار فرمایا؛ اس لیے کہ ان کی یہ بات درست تھی، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ اللہ نے ان کے اس قول کی تکذیب فرما دی کہ: ﴿وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا﴾ اس لیے کہ یہ ان کی کذب بیانی تھی۔ اور اپنے نبی ﷺ کو یہ فرما دینے کا حکم دے دیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ ''کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیا کرتا۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ انہوں نے اپنے بڑوں کو اس پر نہیں پایا۔ اس لیے کہ ان کے بڑے یہ کچھ کیا کرتے تھے۔

﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے:

﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ (الزمر: ۷)

''اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے بے نیاز ہے۔اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔''

اگر چہ کفر کو ان کے مقدر میں اسی نے کیا ہے۔لیکن اس سے اس کا کفر پر راضی ہونا لازم نہیں آتا۔ وہ اسے ان کے مقدر میں بھی کرتا ہے اور اسے ناپسند بھی کرتا ہے۔

﴿لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ اس کی دلیل یہ قرآنی آیت ہے:

﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾

(البقرہ: ۲۰۵)

''اور جب وہ زمین میں پھرتا ہے تو کوشش کرتا ہے تاکہ زمین میں فساد پھیلائے اور تاکہ تباہ کرڈالے کھیتی اور نسل کو۔جبکہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

مؤلف رحمہ اللہ کی طرف سے اس قسم کی عبارات کو دہرانے کی وجہ اس امر کو واضح کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے ارادہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اسے پسند بھی کرتا ہے، اور نہ ہی اس کی طرف سے کسی چیز کو ناپسند کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ ارادہ کونیہ کے ساتھ اس کی مراد نہیں ہوتی، بلکہ رب تعالیٰ ایک چیز کو ناپسند بھی کرتا ہے اور وہ ارادہ کونیہ کے ساتھ اس کا ارادہ بھی کرتا ہے۔ وہ ایک چیز کو واقع بھی کرتا ہے اور اسے ناپسند بھی کرتا ہے، اور ارادہ شرعیہ کے ساتھ اس کا ارادہ بھی نہیں کرتا، اور اسے پسند بھی نہیں کرتا۔

سوال: اللہ تعالیٰ جس چیز کو ناپسند کرتا ہے اسے واقع کس طرح کرتا ہے؟ اور کیا کوئی اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسی چیز واقع کرے جسے وہ پسند نہیں کرتا؟

جواب: اس بات پر اسے کوئی بھی مجبور نہیں کرتا کہ وہ ایسا کام کرے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو، ایسا کام اسے ایک وجہ سے ناپسند ہوتا ہے اور دوسری وجہ سے پسندیدہ ومحبوب؛ اور یہ اس لیے کہ اس پر مصالح عظیمہ مرتب ہوتی ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کو ایمان محبوب ہے اور کفر مکروہ، مگر وہ بڑی بڑی مصلحتوں کے پیش نظر کفر کو اس کی ناپسندیدگی کے باوجود واقع کرتا ہے؛ اس لیے کہ اگر کفر کا وجود نہ ہوتا تو ایمان کی معرفت حاصل نہ ہوسکتی، اگر کفر کا وجود نہ ہوتا تو انسان ایمان کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت سے آشنا نہ ہوتا، اگر کفر کا وجود نہ ہوتا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قیام نہ ہوسکتا۔ اگر کفر نہ ہوتا تو جہاد قائم نہ ہوتا، اور اگر کفر نہ ہوتا تو سب لوگ ایک ہی امت ہوتے، وہ نہ اچھائی سے آگاہ ہوتے اور نہ برائی سے آشنا ہوتے۔ اور اس طرح انسانی معاشرہ تباہی سے دوچار ہو جاتا، اور اگر کفر کا وجود نہ ہوتا تو ہم اللہ کی ولایت سے ناآشنا رہتے؛ اس لیے کہ اللہ کے دشمنوں سے نفرت کرنا اور اس کے دوستوں سے محبت کرنا اللہ تعالیٰ کی ولایت کا حصہ ہے۔

یہی کچھ بیماری اور صحت کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ صحت انسان کو محبوب ہے اور وہ اس کے ساتھ ملائمت رکھتی ہے، اور اس کا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہونا واضح سی بات ہے دوسری طرف اگر چہ بیماری انسان کو ناپسند ہے، مگر وہ اس کے باوجود اسے واقع کرتا ہے؛ اس لیے کہ اس میں بڑی بڑی مصلحتیں پنہاں ہوتی ہیں۔

کتنے ہی انسان ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مال، اولاد، گھر بار اور جسمانی صحت کے حوالے سے بھر پور نعمتوں سے نواز رکھا ہوتا ہے جن کی وجہ سے وہ احساس برتری کا شکار ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری سے بے نیاز ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (الروم: ٤١)

''لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا؛ تاکہ اللہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، تاکہ وہ لوٹ آئیں۔''

اے انسان! جب تو اللہ تعالیٰ کی تقدیرات کے بارے میں صحیح سوچ اپنائے گا تو پھر تو تقدیر کی اچھائی اور برائی کی حکمت سے بھی آگاہ ہو جائے گا، اور اس بات سے بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی ناپسندیدہ چیزوں کو پیدا کرتا اور انہیں مقدر کرتا ہے، اس لیے کہ اس میں ایسی بڑی بڑی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں، جن کا تو احاطہ کر سکتا ہے اور نہ تیرے علاوہ کوئی اور، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کا تو بھی احاطہ کر سکتا ہے، نہ تو اور کوئی دوسرا بھی۔

سوال: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز اللہ کو ناپسند بھی ہو اور اس کی مراد بھی؟

جواب: اس میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک مریض بد ذائقہ اور کڑوی دوائی استعمال کرتا ہے۔ مگر وہ اس سے خوش ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اس پر شفاء کی مصلحت مرتب ہوتی ہے۔ باپ اپنے بیمار بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے پکڑتا ہے تاکہ ڈاکٹر اس کا آپریشن کر سکے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ باپ اپنے بیٹے کا خود آپریشن کر لیتا ہے، حالانکہ سرجری کا عمل انتہائی غیر پسندیدہ ہوتا ہے۔

انسانی افعال کا خالق اللہ اور فاعل انسان ہیں

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَالْعِبَادُ فَاعِلُوْنَ حَقِيْقَةً ، وَاللّٰهُ خَالِقُ اَفْعَالِهِمْ .))

''بندے حقیقتاً فاعل ہیں، اور اللہ ان کے افعال کا خالق ہے۔''

شرح: ......مؤلف رحمہ اللہ کا یہ قول صحیح ہے۔ بندہ اپنے فعل کو حقیقتاً سرانجام دینے والا ہے جبکہ اللہ اس کے فعل کا حقیقتاً خالق ہے۔ یہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ جس کی دلائل کے ساتھ تقریر و توثیق پہلے گزر چکی ہے۔

اہل سنت کے اس اصولی عقیدہ میں دو گروہ ان کے مخالف ہیں:

پہلا گروہ: معتزلہ وغیرہم سے قدریہ کا ہے، جن کا یہ کہنا ہے کہ بندے اپنے افعال کے حقیقتاً فاعل ہیں، ان کے افعال کا خالق اللہ نہیں ہے۔



دوسرا گروہ: جہمیہ وغیرہم سے جبریہ کا ہے، جن کے نزدیک بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بندے حقیقتاً اس کے فاعل نہیں ہیں، ان کی طرف افعال کو ازراہ تجوز مضاف کیا گیا ہے۔ وگرنہ فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔
جبریہ کے اس قول کا نتیجہ وحدۃ الوجود کی صورت میں سامنے آتا ہے اور یہ کہ مخلوق ہی اَصلاً اللّٰہ ہے۔ اس قول کا یہ بدترین نتیجہ بھی نکلے گا کہ زنا، سرقہ، شراب نوشی اور ظلم و اعتداء جیسے افعال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا پڑے گا۔ والعیاذ باللّٰه .
مؤلف رحمہ اللہ کے قول: ((والعباد فاعلون حقیقةً والله خالق أفعالهم)) سے جبریہ اور قدریہ کی تردید کرنا مقصود ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
((وَالعَبْدُ هُوَ الْمُؤْمِنُ وَالْكَافِرُ، وَالْبَرُّ وَالْفَاجِرُ، وَالْمُصَلِّيْ وَالصَّائِمُ .))
''بندہ مومن بھی ہوتا ہے اور کافر بھی، نیک بھی ہوتا ہے اور بد بھی، نمازی بھی ہوتا ہے اور روزے دار بھی۔''
شرح: ......یعنی ایمان و کفر، نیکی اور بدی، صلاۃ و صیام جیسے اوصاف کے ساتھ بندے کو موصوف کیا جاتا ہے، کسی اور کو نہیں بندہ ہی مومن ہوتا ہے اور بندہ ہی کافر، وہی نیک ہوتا ہے اور وہی بد، نمازی بھی بندہ ہوتا ہے اور روزے رکھنے کا پابند بھی بندہ ہی ہوتا ہے۔ بندہ ہی زکوٰۃ ادا کرتا، حج و عمرہ کرتا اور دیگر فرائض شرعیہ ادا کرتا ہے اور بندہ ہی ان امور سے انحراف کرتا ہے۔
بندے کو اس فعل سے موصوف نہیں کیا جا سکتا جو حقیقتاً اس کا فعل نہ ہو۔
جملہ: ''جو حقیقتاً اس کا فعل نہ ہو۔''
جبریہ کی تردید کو متضمن ہے۔
اس جگہ عبودیت سے مراد عبودیت عامہ ہے، اس لیے کہ عبودیت کی دو قسمیں ہیں: عبودیت عامہ اور عبودیت خاصہ۔
عبودیت عامہ: یہ اللہ تعالیٰ کے امر کونی کے سامنے سر جھکا دینے سے عبارت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ إِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (مریم : ۹۳)
''زمین و آسمان میں رہنے والے تمام کے تمام اپنے رب کے سامنے بندے بن کر حاضر ہونے والے ہیں۔''
عبودیت خاصہ: یہ اللہ تعالیٰ کے امر شرعی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے سے عبارت ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا:
﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (الفرقان : ٦٣)
''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔''
نیز......﴿تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ (الفرقان : ١)
''بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا۔''



یہ عبودیت پہلی سے بھی زیادہ خاص ہے۔

انسان اور اس کی قدرت کا خالق اللہ ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَلِلْعِبَادِ قُدْرَةٌ عَلٰى اَعْمَالِهِمْ ، وَلَهُمْ اِرَادَةٌ، وَاللّٰهُ خَالِقُهُمْ وَخَالِقُ قُدْرَتِهِمْ وَاِرَادَتِهِمْ .))

''بندوں کو اپنے اعمال پر قدرت حاصل ہے، اور وہ ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کا بھی خالق ہے اور ان کی قدرت وارادہ کا بھی۔''

شرح: ......[وَلِلْعِبَادِ قُدْرَةٌ عَلٰى اَعْمَالِهِمْ ، وَلَهُمْ اِرَادَةٌ] ......جبریہ کو اس سے اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ بندوں کو نہ تو کوئی قدرت حاصل ہے اور نہ ہی ان کا کوئی ارادہ ہے، وہ اپنے اعمال کے لیے مجبور محض ہیں۔

[وَاللّٰهُ خَالِقُهُمْ وَخَالِقُ قُدْرَتِهِمْ وَاِرَادَتِهِمْ] ......اس سے قدریہ کو اختلاف ہے، ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ بندے کے فعل، اس کے ارادہ اور قدرت کا خالق نہیں ہے۔

گویا کہ مؤلف رحمہ اللہ اس عبارت کے ساتھ بندے کے فعل کی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے کی وجہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں؛ اور وہ یہ کہ اس کا فعل قدرت وارادہ سے صادر ہوتا ہے، اور قدرت وارادہ کا خالق اللہ ہے اور جو کچھ مخلوق سے صادر ہوگا وہ بھی مخلوق ہوگا۔

وہ اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ بندے کا فعل اجباری نہیں بلکہ اختیاری ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ قدرت وارادہ سے صادر ہوتا ہے، اگر قدرت وارادہ نہ ہوتے تو اس سے فعل صادر نہ ہوتا، اور اگر صرف ارادہ ہی نہ ہوتا، تو بھی اس سے فعل کا صدور نہ ہوتا۔ اور اگر اس کا فعل اجباری ہوتا تو اس کے لیے قدرت اور ارادہ شرط نہ ہوتے۔

❑ پھر اس کے لیے استدلال کرتے ہوئے مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

(التکویر: ۲۹۔۲۸)

''اس کے لیے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے، اور تم نہیں چاہ سکتے ہو مگر صرف اس صورت میں کہ اللہ رب العالمین چاہے۔''

[لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ .] ......اس سے جبریہ کا ردّ ہوتا ہے۔

اور [وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ] ......سے قدریہ کا۔

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهٰـذِهِ الـدَّرَجَةُ مِنَ الْقَدْرِ يُكَذِّبُ بِهَا عَامَّةُ الْقَدْرِيَّةِ ، الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ مَجُوْسَ هٰذِهِ الاُمَّةِ .))

''مشیت اور خلق کے اس درجہ کا اکثر قدریہ انکار کرتے ہیں، جنہیں نبی کریم ﷺ نے اس امت کے مجوسی قرار دیا ہے۔''[1]

[وَهٰـذِهِ الـدَّرَجَةُ مِـنَ الْقَدْرِ يُكَذِّبُ بِهَا عَامَّةُ الْقَدْرِيَّةِ، الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ مَجُوْسَ هٰذِهِ الاُمَّةِ.] .....

[عَـامَّةُ الْـقَدْرِيَّةِ] ..... یعنی اکثر قدریہ اس درجہ کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے فعل کا پورا اختیار رکھتا ہے، اس میں اللہ کی مشیت اور خلق کارگر نہیں ہوتی۔

[سَمَّاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ مَجُوْسَ هٰذِهِ الاُمَّةِ.] ..... اس لیے کہ مجوسیوں کے نزدیک حوادث کے دو خالق ہیں، ایک خیر کا خالق اور دوسرا شر کا، خیر کا خالق نور ہے اور شر کا خالق تاریکی۔ قدریہ مجوسیوں کے ساتھ یہ مشابہت رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک حوادث کی دو قسمیں ہیں: اللہ کے فعل سے وقوع پذیر ہونے والے حوادث؛ یہ اللہ کی مخلوق ہیں، اور بندوں کے فعل سے وقوع پذیر ہونے والے حوادث؛ جو کہ صرف بندوں کا فعل ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا تخلیقی عمل دخل نہیں ہوتا۔

اہل اثبات کا بندے کی قدرت واختیار کو سلب اور اللہ کے افعال واحکام کو حکمت سے خارج کرنا

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَيَـغْـلُوْا فِيْهَا قَوْمٌ مِنْ اَهْلِ الْاِثْبَاتِ ، حَتّٰى سَلَبُوا الْعَبْدَ قُدْرَتَهُ وَاخْتِيَارَهُ ، وَيُخْرِجُوْنَ عَنْ اَفْعَالِ اللّٰهِ وَاَحْكَامِهِ حِكَمَهَا وَمَصَالِحَهَا .))

''اس میں اہل اثبات کی ایک جماعت نے غلو سے کام لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے بندے سے اس کی قدرت اور اختیار کو سلب کر لیا، وہ اللہ کے افعال اور اس کے احکام سے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو خارج کرتے ہیں۔''

شرح: ..... [وَيَغْلُوْا فِيْهَا] ..... یعنی اس کے درجہ میں۔

[قَوْمٌ مِنْ اَهْلِ الْاِثْبَاتِ] ..... یعنی اہل قدر۔

اس قوم سے مراد جبریہ ہیں، انہوں نے بندے سے اس کی قدرت اور اختیار کو سلب کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ

[1] اسے امام احمد نے (۲/۸۶)، ابوداؤد نے (۴۶۹۱)، لالکائی نے شرح اصول اعتقاد اهل السنة: (۲/۶٤۱)، اور ابن ابی عاصم نے السنہ: ۱٤۵ میں روایت کیا۔ جس میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر امت کے مجوسی ہوتے ہیں اور میری امت کے مجوسی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ تقدیر کا کوئی وجود نہیں'' اسے اجری نے ''الشريعة'' (۱۹۰) اور طبرانی نے ''الاوسط'' میں نکالا۔ جیسا کہ ''مجمع الزوائد'' (۷/۲۰۷) میں ہے۔ اس حدیث کو البانی نے اس کی تمام سندوں کے ساتھ ابن أبی عاصم کی السنہ: ۱٤۵ میں حسن کہا ہے۔

انسان اپنے لیے مجبور محض ہے۔ اس لیے کہ وہ اس پر لکھا جا چکا ہے۔

[يُخْرِجُوْنَ عَنْ اَفْعَالِ اللّٰهِ وَاَحْكَامِهِ حِكَمَهَا وَمَصَالِحَهَا] ..... "یخرجون" مؤلف رحمہ اللہ کے قول "یغلو" پر معطوف ہے۔ جبریہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے افعال و احکام سے حکم و مصالح کو نکالنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی حکمت و مصلحت کا اثبات نہیں کرتے۔

ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا ہر فعل اور حکم مجرد مشیت کے تابع ہوتا ہے، اسی لیے وہ اطاعت گزار کو اجر و ثواب سے نوازتا ہے اگر چہ وہ اس فعل کے لیے مجبور ہوتا ہے، اور نافرمان کو سزا دیتا ہے اگر چہ وہ بھی اس کے لیے مجبور ہوتا ہے۔

جبریہ کے اس مسئلہ سے اکثر نافرمان حجت لیا کرتے ہیں؛ اگر آپ ان کی کسی برائی پر انہیں ٹوکیں تو وہ جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ اسے اللہ نے میرے مقدر میں کیا ہے، تم اللہ پر اعتراض کرتے ہو؟ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت پر تقدیر سے حجت لیتا ہے۔ نیز وہ اس حدیث سے بھی احتجاج کرتا ہے کہ: ''آدم و موسیٰ کا جھگڑا ہو گیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: آپ ہمارے باپ ہیں، آپ نے ہمیں نامراد کر دیا اور جنت سے نکلوا دیا۔ اس پر حضرت آدم کہنے لگے: آپ موسیٰ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے کلام کے ساتھ منتخب فرمایا، اور تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے کتاب لکھی۔ کیا آپ مجھے اس کام کے لیے ملامت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا؟ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: ''اس طرح آدم موسیٰ پر غالب آ گئے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین دفعہ فرمائی، [1] مسند احمد میں ہے: "فَحَجه آدمُ" ''آدم ان پر غالب آ گئے۔'' [2]

ان الفاظ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر دلیل سے غالب آئے۔ معاصی کا مرتکب کہتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا تو انہوں نے تقدیر سے حجت لی۔ جس پر حضرت موسیٰ خاموش ہو گئے تو تم مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہو؟

حدیث آدم کا جواب

اس حدیث کا قدریہ کی رائے کے مطابق تو جواب یہ ہے کہ ان کے نزدیک اخبار احاد موجب یقین نہیں ہوتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اخبار احاد عقل سے متعارض ہوں تو انہیں رد کر دینا واجب ہوگا۔ اس بناء پر ان کا کہنا ہے کہ حدیث آدم صحیح نہیں ہے، ہم نہ اسے قبول کرتے ہیں اور نہ تسلیم۔

جبکہ جبریہ کا کہنا ہے کہ یہ اصل دلیل ہے۔ اور اس کی دلالت برحق ہے۔ بندے کی تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا گیا اس پر اسے ملامت نہیں کی جا سکتی۔

رہے اہل السنہ والجماعہ، تو وہ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے گناہ کا ارتکاب کیا جو ان کے جنت سے نکلنے کا سبب بن گیا، مگر

---

[1] اسے بخاری (٦٦١٤)، اور مسلم (٢٦٥٢) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] اسے امام احمد نے مسند (٢/٢٦٨) میں روایت کیا۔

انہوں نے اس گناہ سے توبہ کر لی جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا، اور ان کی توبہ قبول فرمائی۔ اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس آدمی جیسا ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کا شمار اولوا العزم رسولوں میں ہوتا ہے، ان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی اس گناہ پر ملامت کریں جس سے انہوں نے توبہ کر لی ہو اور پھر اللہ نے ان کی وہ توبہ قبول کر کے انہیں منتخب بھی فرما لیا ہو۔ انہوں نے ملامت اس مصیبت پر کی تھی جو ان کے اس فعل کی وجہ سے آئی تھی، اور وہ ہے خود انہیں اور ان کی اولاد کو جنت سے نکالا جانا؛ اس لیے کہ اس اخراج کا سبب آدم علیہ السلام کی معصیت تھی۔

جب آدم علیہ السلام نے یہ کام اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ جنت سے نکل جائیں، اور جس پر انہیں ملامت کی جائے۔ تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر ان کی ملامت کس طرح کر سکتے ہیں؟

ہم اسے قبول کرتے ہیں، اور قدریہ کی طرح اس سے انکار نہیں کرتے، مگر ہم جبریہ کی طرح اسے معصیت کی دلیل بھی نہیں بناتے، اس کا ایک دوسرا بھی جواب ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب انسان معصیت سے توبہ کرنے کے بعد اس کی دلیل کے طور پر تقدیر کو پیش کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ کو کوئی شخص گناہ سے توبہ کرنے کے بعد اس کے ارتکاب پر ملامت کرے اور اس کے جواب میں آپ یہ کہیں کہ ایسا اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر کی وجہ سے ہوا، اور میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں ...... اور اس جیسے دیگر الفاظ۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آدم علیہ السلام نے معصیت سے توبہ کرنے کے بعد تقدیر سے دلیل پیش کی تھی۔

یقیناً یہ خوب صورت توجیہ ہے مگر اسے قبول کرنا اس لیے مشکل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے آدم علیہ السلام کی اس معصیت پر ملامت کرنا ممکن نہیں ہے جس سے انہوں نے توبہ کر لی تھی۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنے اس قول کو اس واقعہ سے ترجیح دی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، تو ان سے فرمایا: ''کیا تم دونوں نماز نہیں پڑھو گے؟'' اس پر علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یا رسول اللہ! ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب ہمیں اٹھانا چاہے گا اٹھا دے گا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ران پر ہاتھ مارتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ گئے:

﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الكهف: ٥٤) [1] ''اور انسان ہر شی سے زیادہ جھگڑالو ہے۔''

مگر میرے نزدیک اس حدیث سے استدلال کرنا محل نظر ہے، اس لیے کہ علی رضی اللہ عنہ نے اپنی نیند کے لیے تقدیر سے استدلال کیا تھا، اور سونے والے کو اس کا حق حاصل ہے، اس لیے کہ اس کے فعل کو اس کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (الكهف: ١٨)

---

[1] اسے بخاری (١١٢٧)، اور مسلم (٧٧٥) نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

''اور ہم ان کو کروٹ بدلاتے رہتے تھے دائیں جانب اور بائیں جانب۔''

اللہ تعالیٰ نے کروٹ بدلانے کو اپنی طرف منسوب کیا، حالانکہ وہ ایسا خود کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ ان کے ارادے کے بغیر ہوتا تھا لہٰذا اسے ان کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔

حدیث آدم وموسیٰ علیہما السلام کے جواب میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پہلی وجہ کی طرف گئے ہیں اور وہی صواب ہے۔

دریں صورت نہ تو اس حدیث میں جبریہ کے لیے کوئی دلیل ہے اور نہ ان نافرمان قسم کے لوگوں کے لیے جو اپنے گناہوں کا جواز پیش کرنے کے لیے اس حدیث کے حوالے سے تقدیر سے استدلال کرتے ہیں۔

معاصی پر تقدیر سے استدلال کو نقل، عقل اور واقع باطل قرار دیتے ہیں۔

جہاں تک نقلی اور سمعی دلائل کا تعلق ہے تو ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا﴾ (الانعام: ١٤٨)

''عنقریب مشرک لوگ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے آباء واجداد ہی، اور نہ حرام کرتے ہم کسی چیز کو، ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسے ہی جھٹلایا تھا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔''

مشرکین نے یہ بات اپنی معصیت کے لیے تقدیر کو وجہ جواز قرار دیتے ہوئے کہی تھی جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ یعنی اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی اور تقدیر سے دلیل پیش کی۔ ﴿حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا﴾ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حجت سراسر باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ قابل قبول ہوتی تو وہ اللہ کے عذاب کا مزہ نہ چکھتے۔

دوسری سمعی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾

(النساء: ١٦٣ـ١٦٥)

''میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یقیناً ہم نے وحی کی آپ کی طرف جس طرح وحی کی ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف، اور وحی کی ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف۔ اور ہم نے داؤد کو زبور دی، اور کچھ رسول ایسے ہیں کہ ہم نے اس سے

قبل ان کے واقعات آپ کے سامنے بیان کر دیئے ہیں، اور کچھ رسول ایسے ہیں کہ ہم نے آپ کے سامنے ان کے واقعات بیان نہیں کیے، اور اللہ نے موسیٰ سے صاف صاف کلام کیا۔ ہم نے بھیجا انہیں رسول بنا کر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ پر کسی الزام کا موقع نہ ملے۔''

اس آیت کریمہ میں وجہ دلالت یہ ہے کہ اگر معاصی پر تقدیر حجت ہوتی تو وہ رسولوں کی آمد پر باطل قرار نہ پاتی، وہ تو ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ تمہاری پہلی دلیل کی تردید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

﴿وَ لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ﴾

(الانعام : ۱۰۷)

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے، اور ہم نے آپ کو ان پر نگران نہیں بنایا، اور نہ آپ ان پر داروغہ ہیں۔''

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے۔'' اس کے جواب میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ کفار کے بارے میں کسی کا یہ کہنا کہ ''اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے'' صحیح اور جائز ہے۔ مگر مشرک کا خود یہ کہنا کہ ''اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے'' جس سے وہ معصیت پر تقدیر سے دلیل لانا چاہتا ہو، باطل ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بات اپنے رسول ﷺ کو تسلی دینے اور یہ بات واضح کر دینے کے لیے فرمائی تھی کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی معصیت پر تقدیر سے استدلال کے بطلان کی عقلی دلیل کے طور پر ہم اس شخص سے یہ کہنا چاہیں گے کہ ارتکاب معصیت سے قبل آپ کو یہ کس نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ معصیت آپ کے مقدر میں کر رکھی ہے؟ ہم سب کو تو اس کے واقع ہونے کے بعد ہی اس کا علم ہوتا ہے۔ ہم عاصی سے یہ دریافت کریں گے کہ کیا معصیت کے ارتکاب سے قبل تجھے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے مقدر میں معصیت لکھ دی ہے؟ یقیناً وہ اس کا جواب نفی میں دے گا۔ اس پر ہم اس سے یہ کہیں گے: تو یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے مقدر میں اطاعت گزاری رکھی ہے تا کہ تو اس کی ہر اطاعت کرے۔ تیرے سامنے دروازہ کھلا ہے، تو اس دروازے سے داخل کیوں نہیں ہوتا جس میں تجھے اپنا فائدہ نظر آتا ہو، اس لیے کہ تجھے نہیں معلوم کہ تیرے مقدر میں کیا ہے۔

ہم اس شخص سے یہ بھی کہنا چاہیں گے کہ اگر آپ کو یہ بتایا جائے کہ مکہ مکرمہ کی طرف دو راستے جاتے ہیں ان میں سے ایک راستہ پختہ اور پرامن ہے جبکہ دوسرا مشکل اور خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ کیا آپ پرامن راستے کا انتخاب نہیں کریں گے؟ اس کا جواب وہ یقیناً ہاں میں دے گا۔ اب ہم اس سے یہ سوال کریں گے: جب دنیوی راستے کی صورت حال یہ ہے تو آپ اپنی عبادت کے دوران خوفناک اور خطرات سے گھرے راستے پر کیوں چلتے ہیں؟ اور وہ پرامن راستہ کیوں چھوڑ دیتے ہیں جس پر چلنے والے کے لیے امن کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے؟

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ﴾ (الانعام : ۸۲)



''جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہ ملایا تو ان کے لیے امن ہے۔''

ہم اس سے یہ بھی کہیں گے کہ اگر حکومت دو انعام دینے کا اعلان کرے جن میں سے ایک بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا، تو آپ کون سا انعام حاصل کرنا پسند کریں گے؟ ظاہر ہے آپ بڑا انعام لینا ہی پسند کریں گے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اپنے دنیوی معاملات میں بہتر سے بہتر کا انتخاب کرتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ آپ دینی امور میں ایسا کیوں نہیں کرتے؟ کیا آپ کہیں تضادات کا شکار تو نہیں ہیں؟

ہماری اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بندہ عاصی کے لیے معصیت باری تعالیٰ پر تقدیر سے دلیل لانے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔



فصل:

ایمان کے بارے میں

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَمِنْ اُصُوْلِ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ اَنَّ الدِّيْنَ وَالْاِيْمَانَ قَوْلٌ وَ عَمَلٌ .))

ایمان کی تعریف لغوی اور شرعی اعتبار سے

''اہل السنہ والجماعہ کا ایک اصول یہ ہے کہ دین اور ایمان قول وعمل کا نام ہے۔''

شرح: ...... [الدِّیْنَ] ...... وہ چیز جس کے ساتھ انسان کو بدلہ دیا جائے یا جس کے ساتھ وہ بدلہ دے۔ اس کا اطلاق عمل پر بھی ہوتا ہے اور جزا پر بھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ (الانفطار: ۱۸) ''پھر تجھے کیا معلوم کہ کیا ہے دن جزا وسزا کا۔'' میں دین سے مراد جزا ہے اور ﴿وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ: ۳) ''اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کرلیا۔'' میں دین سے مراد ایسا عمل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے: كما تدين تدان، ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔''

اس جگہ مؤلف رحمہ اللہ کے کلام میں دین سے مراد عمل ہے۔

"الایمان" اکثر علماء کے نزدیک لغت میں ایمان تصدیق سے عبارت ہے۔

مگر ان کا یہ قول محل نظر ہے اور یہ اس لیے کہ (تصدیق) متعدی بنفسہ ہوتا ہے، جبکہ (ایمان) متعدی بنفسہ نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ صدقته کہہ سکتے ہیں مگر آمنته نہیں کہہ سکتے، بلکہ آپ کہیں گے: آمنت به، یا آمنت له اس بنا پر ہم ایسے فعل لازم کی جو صرف حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہو، اس متعدی فعل کے ساتھ تفسیر نہیں کر سکتے جو بنفسہ مفعول بہ کو نصب دیتا ہو۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ لفظ (صدقت) لفظ (آمنت) کا معنی نہیں دیتا اس لیے کہ (آمنت) (صدقت) سے زیادہ طمانیت کا فائدہ دیتا ہے۔

لہٰذا اگر ایمان کی تفسیر اقرار کے ساتھ کی جائے تو یہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اس بناء پر ہم کہیں گے: ایمان اقرار سے عبارت ہے۔ اور تصدیق کے بغیر اقرار نہیں ہوتا۔ ہم کہتے ہیں: اقربه وآمن به اسی طرح اقرله وآمن له۔ یہ بات تو تھی لغت کے اعتبار سے۔

جہاں تک اس کے شرعی معنی کا تعلق ہے، تو اس بارے میں مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

[قَوْلٌ وَ عَمَلٌ.] ...... یہ ایمان کی مجمل تعریف ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((قول القلب واللّسان وعمل القلب واللّسان والجوارح .))

"دل اور زبان کے قول، دل، زبان اور اعضاء کے عمل کا نام ایمان ہے۔"

مؤلف رحمہ اللہ نے دل کے لیے بھی قول وعمل قرار دیا ہے اور زبان کے لیے بھی۔

جہاں تک زبان کے قول کا تعلق ہے تو اس سے مراد نطق اور اس کے عمل سے مراد اس کی حرکات ہیں۔ زبان کی حرکات نطق نہیں، بلکہ نطق ان حرکات سے پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ گونگے پن سے محفوظ ہوں۔

دل کے قول سے مراد اس کا اعتراف اور تصدیق ہے، جبکہ اس کا عمل اس کی حرکت وارادہ سے عبارت ہے۔ مثلاً عمل میں اخلاص کا ہونا، دل کا عمل ہے، اسی طرح توکل، رجاء اور خوف۔ عمل صرف اطمینانِ قلب کا نام نہیں ہے، بلکہ دل میں حرکت بھی ہوا کرتی ہے۔

اعضاء کا عمل بالکل واضح ہے، یعنی رکوع، سجدہ، قیام اور قعدہ، پس جوارح کا عمل شرعاً ایمان قرار پائے گا، اس لیے کہ اس عمل کا حامل ایمان ہے۔

سوال: اس بات کی کیا دلیل ہے کہ ایمان ان اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے؟

جواب: اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

"ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے۔" ❶

یہ دل کا قول ہے۔ جبکہ دل، زبان اور اعضاء کے عمل کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے: "ایمان کی ستر سے کچھ زائد شاخیں ہیں، سب سے اعلیٰ شاخ لا الہ الا اللہ کی شہادت دینا، اور سب سے ادنیٰ شاخ تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینا ہے اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔" ❷

یہ زبان کا قول وعمل اور اعضاء کا عمل ہے اور حیا قلبی عمل ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ ایمان شرعی اعتبار سے ان تمام اشیاء کو شامل ہے۔

اس پر یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی دلالت کرتا ہے:

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ (البقرة: ١٤٣)

"اور نہیں ہے اللہ کہ ضائع کر دے تمہارے ایمان کو۔"

مفسرین کے نزدیک ❸ اس سے مراد بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی گئی نمازیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کو ایمان کا نام دیا، نماز دل اور اعضاء کا عمل بھی ہے اور زبان کا قول بھی۔

یہ اہل السنہ والجماعہ کا مذہب ہے۔

---

❶ صحیح مسلم (٨)

❷ اسے مسلم (٣٥) نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔ جبکہ بخاری نے اسے ان لفظوں سے روایت کیا: "ایمان کی ستر سے کچھ زائد شاخیں ہیں، اور حیاء ایمان کی شاخ ہے۔"

❸ ملاحظہ فرمائیں: تفسیر ابن کثیر: (١/١٦٧) در منثور (١/١٦٨)



ایمان کے ان چار چیزوں پر مشتمل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان چار چیزوں کے ساتھ ہی مکمل ہوجائے گا بلکہ انسان ان میں سے بعض اعمال کے غیر موجود ہونے سے بھی مومن ہوسکتا ہے مگر اس کے عمل میں کمی کے تناسب سے اس کے ایمان میں کمی واقع ہوجائے گی۔

اس میں دو انتہاء پسند بدعتی گروہ اہل سنت کے مخالف ہیں:

پہلا گروہ مرجیہ کا ہے، جن کے نزدیک ایمان اقرار بالقلب کا نام ہے اور بس۔ اس کے علاوہ کوئی بھی چیز ان کے نزدیک ایمان کا حصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان کے نزدیک ایمان دل کے اقرار کا نام ہے، اور اس میں سب لوگ برابر ہیں۔ اس اعتبار سے شب وروز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا انسان شب وروز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے انسان جیسا ہے۔ بشرطیکہ اس کی معصیت اسے دین سے خارج نہ کردے۔

اگر ایک انسان زنا کرتا، شراب نوشی کرتا، چوری کرتا اور لوگوں پر مظالم ڈھاتا ہے اور دوسرا متقی اور ان تمام برے اعمال سے کوسوں دور ہے، تو مرجیہ کے نزدیک یہ دونوں ایمان ورجاء میں برابر ہیں، ان میں سے کسی کو بھی عذاب نہیں ہوگا، اس لیے کہ اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔

دوسرا گروہ خوارج اور معتزلہ کا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل اور اس کی بقاء کے لیے شرط ہیں۔ ان کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب ایمان سے خارج ہوجاتا ہے۔ لیکن خوارج اسے کافر بتاتے ہیں، جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ دو منزلوں کے درمیان والی منزل میں ہے، ہم اسے نہ تو کافر کہتے ہیں اور نہ ہی مومن، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ایمان سے نکل گیا مگر کفر میں داخل نہیں ہوا، اور اس طرح دو منزلوں کے درمیان والی منزل میں جا ٹھہرا۔

ایمان کے بارے میں یہ تھے مختلف لوگوں کے اقوال۔

ایمان کے اطاعت گزاری سے بڑھنے اور معصیت سے کم ہونے کا اثبات

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَ اَنَّ الْاِیْمَانَ یَزِیْدُ بِالطَّاعَةِ وَیَنْقُصُ بِالْمَعْصِیَةِ .))

''ایمان اطاعت گزاری سے بڑھتا اور معصیت سے کم ہوتا ہے۔''

یہ عبارت مؤلف کے قول ''ان الدین ...... الخ'' پر معطوف ہے، یعنی اہل سنت کے اصول میں سے یہ بات بھی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

اس کے لیے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ (التوبة : ١٢٤)

''پھر وہ لوگ جو ایمان لائے تو وہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔''



اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِيمَانًا﴾ (المدثر: ۳۱)

"تا کہ یقین کرلیں وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی اور تا کہ ایمان والوں کے ایمان میں اضافہ ہو جائے۔"

یہ ارشاد ربانی ایمان میں زیادتی کا واضح ثبوت ہے۔

جہاں تک ایمان میں کمی آنے کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو وعظ کرتے ہوئے فرمایا: "میں نے ناقص دین اور ناقص عقل والیوں میں عقل مند آدمی کی عقل کو کھونے والیاں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔" [1]

اس سے دین میں نقص کا اثبات ہوتا ہے۔

پھر اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ایمان میں کمی آنے کی کوئی نص موجود نہیں ہے تو زیادتی کا اثبات کمی کو مستلزم ہے، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ نص جو ایمان کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے وہ اس میں کمی آنے کی دلالت کو بھی متضمن ہوتی ہے۔

ایمان میں اضافہ کے اسباب

ایمان میں زیادتی کے چار اسباب ہیں:

پہلا سبب: اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت، جس قدر اللہ تعالیٰ کی معرفت میں اضافہ ہوگا اسی قدر انسان کے ایمان میں بھی اضافہ ہوگا۔

دوسرا سبب: آیات کونیہ وشرعیہ میں غور وفکر کرنا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ○ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ○ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ○ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ○﴾ (الغاشية: ۱۷-۲۰)

"کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسا عجیب پیدا کیا گیا؟ اور آسمان کی طرف کہ اسے کس طرح بلند کیا گیا؟ اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کس طرح گاڑ دیا گیا؟ اور زمین کی طرف کہ اسے کس طرح بچھایا گیا؟"

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَن قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ﴾ (يونس: ۱۰۱)

"کہہ دو! کہ دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں، جبکہ نہیں کام آتیں نشانیاں اور ڈرانے والے اس قوم کے جو ایمان نہیں رکھتی۔"

جس طرح عجائبات قدرت میں غور وفکر کرنے سے انسان کے اللہ تعالیٰ پر ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ رب

[1] بخاری (۳۰٤)، مسلم (۷۹) عن ابن عمر رضی اللہ عنہ.



کائنات کی آیات شرعیہ میں تفکر وتدبر سے ایمان باللہ میں زیادتی ہوتی ہے، جب آپ آیات شرعیہ یعنی ان الوہی احکام کے بارے میں غور وفکر سے کام لیں گے جو انبیاء ورسل کی وساطت سے انسان تک پہنچے تو آپ ان میں محیر العقول اسرار وحکم سے آگاہ ہوں گے اور آپ اس امر سے بھی آگاہ ہو جائیں گے کہ یہ شریعت منزل من اللہ اور عدل ورحمت پر مبنی ہے، تو اس سے آپ کے ایمان میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

تیسرا سبب: مخلصانہ انداز میں کثرت کے ساتھ اطاعت گزاری، چونکہ اعمال ایمان میں داخل ہیں، لہٰذا ان کی کثرت سے ایمان میں اضافہ ہونا لازمی ہے۔

چوتھا سبب: اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ترک معصیت: سے بھی انسان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایمان میں کمی کے اسباب

ایمان میں کمی کے چار اسباب ہیں:

پہلا: اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے اسماء وصفات سے اعراض کرنا۔

دوسرا: آیات کونیہ وشرعیہ میں فکر ونظر سے اعراض کرنا، یہ چیز غفلت اور قساوت قلبی کو واجب ٹھہراتی ہے۔

تیسرا: اعمال صالحہ کی قلت، اس کی دلیل عورتوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''میں نے ناقص دین اور ناقص عقل والیوں میں عقل مند آدمی کی عقل کو کھونے والیاں تم سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا'' لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! اس کے دین میں کمی کیسے ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ حیض کے ایام میں نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزے رکھتی ہے؟'' [1]

چوتھا: ارتکاب معاصی، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (المطففین: ١٤)

''ہرگز نہیں، بلکہ ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں۔''

ایمان میں کمی وبیشی کے بارے میں اہل سنت کے مذہب کے دو گروہ مخالف ہیں، ان میں سے پہلا گروہ مرجیہ کا ہے اور دوسرا خوارج ومعتزلہ کا۔

پہلا گروہ مرجیہ کہتے ہیں ایمان میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ اس میں کمی آتی ہے، اس لیے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ تاکہ اعمال میں اضافہ سے ایمان میں اضافہ ہو اور ان میں کمی آنے سے ایمان میں کمی آ جائے، ایمان دل کے اقرار کا نام ہے، اور اقرار میں کمی وبیشی نہیں ہوا کرتی۔

ہم ان کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اوّلاً: تمہاری طرف سے اعمال کو ایمان سے خارج کرنا صحیح نہیں ہے یقیناً اعمال ایمان میں داخل ہیں۔ اس کی دلیل

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔



پہلے گزر چکی ہے۔

ثانیاً: تمہارا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ اقرار بالقلب میں کمی وبیشی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ کسی شخص کے لیے بھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ میرا ایمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان جیسا ہے۔

ہم یہ بھی کہیں گے کہ اقرار بالقلب کمی وبیشی کو قبول کرتا ہے۔ خبر واحد پر دل کا اقرار دو آدمیوں کی خبر پر اقرار جیسا نہیں ہوتا، سنی سنائی بات پر دل کا اقرار اس بات پر دل کے اقرار جیسا نہیں ہوتا جس کا انسان خود مشاہدہ کرے۔ کیا تم نے حضرت ابراہیم کا یہ ارشاد نہیں سنا؟

﴿رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ (البقرۃ: ۲۶۰)

''میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرے گا؟ اللہ نے فرمایا: کیا تجھے یقین نہیں ہے؟ انہوں نے کہا، کیوں نہیں۔ لیکن یہ اس لیے ہے کہ میرا دل مزید مطمئن ہو جائے۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دل میں موجود ایمان زیادت ونقص کو قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے علمائے کرام یقین کو تین درجات میں تقسیم کرتے ہیں: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ ٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ٥ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ ٥﴾ (التکاثر: ۵۔۷)

''یوں نہیں اگر تم یقینی طور پر جان لو۔ تو پھر یقیناً تم جہنم دیکھ لو گے، پھر تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔''

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ﴾ (الحاقۃ: ۵۱) ''اور یقیناً وہ قابل قبول حق ہے۔''

دوسرا گروہ وعیدیہ کا ہے، اور وہ ہیں خوارج اور معتزلہ۔ انہیں وعیدیہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ وعدہ کے احکام سے صرف نظر کرتے ہوئے وعید کے احکام کو اختیار کرتے ہیں۔ یعنی وعید کی نصوص کو وعدے کی نصوص پر غالب کرتے ہوئے گناہ کبیرہ کے فاعل کو ایمان سے خارج کر دیتے ہیں۔ پھر خوارج کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ دائرۂ ایمان سے نکل کر دائرۂ کفر میں داخل ہو گیا، جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ ایمان سے خارج ہو گیا مگر کفر میں داخل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ دونوں منزلوں کے درمیان والی منزل میں ہے۔

اہل قبلہ گناہ گار ہونے کے باوجود مسلمان ہیں

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَهُمْ مَعَ ذٰلِكَ لَا یُكَفِّرُوْنَ اَهْلَ الْقِبْلَةِ بِمُطْلَقِ الْمَعَاصِیْ وَالْكَبَائِرِ كَمَا یَفْعَلُهُ الْخَوَارِجِ بل الاخوة الایمانیة ثابتة مع المعاصی.))

''مگر وہ اس کے باوجود اہل قبلہ کو خوارج کی طرح مطلق معاصی اور کبائر کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیتے، بلکہ معاصی کے باوجود بھی ان کی ایمانی اخوت ثابت رہتی ہے۔''



شرح:.....[وَهُمْ مَعَ ذٰلِكَ] .....یعنی ان کے اس قول کے باوجود کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے۔

[لَا يُكَفِّرُوْنَ اَهْلَ الْقِبْلَةِ بِمُطْلَقِ الْمَعَاصِيْ وَالْكَبَائِرِ] ..... اہل قبلہ گناہ گار ہونے کے باوجود مسلمان ہیں، اس لیے کہ وہ ایک ہی قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز ادا کرتے ہیں، اور وہ قبلہ ہے: کعبہ مشرفہ۔

اہل سنت کے نزدیک مطلق معاصی اور کبائر کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مؤلف رحمہ اللہ کا قول: "بمطلق المعاصی" قابل غور ہے۔ انہوں نے "بالمعاصی والکبائر" نہیں فرمایا، اس لیے کہ بعض معاصی کفر ہوا کرتے ہیں۔ جبکہ مطلق معصیت کفر نہیں ہوتی۔

الشي المطلق اور مطلق شي میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر سے مراد کمال ہوتا ہے، جبکہ ثانی الذکر سے مراد اصل چیز ہوا کرتی ہے۔ کبیرہ گناہ کے فاعل کے پاس مطلق ایمان تو موجود ہوتا ہے، جبکہ اس کا کمال مفقود ہوتا ہے۔

اس بنا پر کلام مؤلف بڑا دقیق ہے۔

[كَمَا يَفْعَلُهُ الْخَوَارِجِ] ..... جن کا قول ہے کہ کبیرہ گناہ کا فاعل کافر ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے ہی مسلمانوں کے خلاف خروج کیا، اور ان کے خونوں اور مالوں کو مباح قرار دیا۔

[بل الاخوة الایمانية ثابتة مع المعاصي.] ..... یعنی "مومنوں کے درمیان اخوت معصیت کے باوجود بھی ثابت رہتی ہے۔" زانی شخص پاکدامن کا بھائی ہے، قاتل مقتول کا بھائی ہے، اور چور اس کا بھائی ہے جس کی اس نے چوری کی۔

- پھر مؤلف اس کا استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((كَمَا قَالَ سُبْحَانَهُ فِيْ آيَةِ الْقِصَاصِ: ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة: ١٧٨)......))

جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آیت قصاص میں فرمایا: "پھر جس شخص کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کردیا جائے تو اسے معروف طریقہ کی اتباع کرنا ہے۔"

شرح:......آیت قصاص یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ ......﴾ (البقرة: ١٧٨)

"اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کردیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلہ میں آزاد اور غلام کے بدلہ میں غلام، اور عورت کے بدلہ میں عورت، ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہوجائے تو اسے معروف طریقہ کی اتباع کرنا ہے۔"

(اخیـــــہ) سے مراد مقتول ہے۔ اس آیت کریمہ میں وجہ دلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقتول کو قاتل کے بھائی سے موسوم کیا ہے، حالانکہ مومن کو قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا۔



دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَاءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات: ۹۔۱۰)

''اگر مومنوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو، پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے فریق سے لڑو حتی کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کی پسند کرتا ہے، مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لیے اپنے بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔''

یہ اہل سنت کے اس قول کی دوسری دلیل ہے کہ کبیرہ گناہ کا فاعل ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔

[اقْتَتَلُوْا] ..... جمع کا صیغہ ہے، بَيْنَهُمَا اور [طَائِفَتَانِ مثنی ہے جبکہ ان کا مرجع ایک ہے۔

اس لیے کہ طائفہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو کہتے ہیں، لہٰذا اس اعتبار سے ان کے لیے ''واقتتلوا'' کہنا درست ہے۔

اس کا شاہد یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ﴾ (النساء: ۱۰۲)

''چاہیے کہ دوسری جماعت آئے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھ لیں۔''

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ''لم تصل'' نہیں فرمایا۔ چونکہ طائفہ ایک بڑی جماعت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف جمع کی ضمیر کا لوٹانا صحیح ہے۔ (اقتتلوا) میں تو ضمیر معنی کی طرف لوٹتی ہے، اور (بینھما) میں لفظ کی طرف۔

مومنوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں اور آپس میں ہتھیار اٹھا لیے۔ جبکہ مومن کا مومن کے ساتھ لڑائی کرنا کفر ہے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے جنگ میں حصہ نہ لینے والی تیسری جماعت کو ان کے درمیان صلح کروانے کا حکم دینے کے بعد اس کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے صلح کروانے والی جماعت کو باہم لڑنے والی دونوں جماعتوں کا بھائی قرار دیا۔

اس بنا پر یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب ایمان سے خارج نہیں کرتا۔

لہٰذا اگر میں کبیرہ گناہ کے مرتکب کسی مسلمان کے پاس سے گزروں گا تو اسے سلام کہوں گا، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''جب تیری اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کہنا۔''[1] جب تک یہ شخص مسلمان ہے میں اسے سلام کہتا رہوں گا، بجز اس صورت کے کہ اسے سلام نہ کہنے میں کوئی مصلحت ہو۔ جس طرح کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے ان دو ساتھیوں کے ساتھ ہوا جو غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ

[1] اسے بخاری: ۱۲۴۰، اور مسلم (۲۱۶۲) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ یہ لفظ مسلم کے ہیں۔

کے حکم سے مسلمانوں نے پچاس دنوں تک ان سے قطع تعلقی اختیار کیے رکھی یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ ❶

کیا ہم علی سبیل الاطلاق اس سے محبت کریں گے یا علی سبیل الاطلاق اس سے کراہت کریں گے؟

اس بارے میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ ہم علی سبیل الاطلاق ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کریں گے۔ بلکہ اس کے ایمان کی وجہ سے اس کے ساتھ پیار کریں گے اور اس کی معاصی کی وجہ سے اسے کراہت کی نگاہ سے دیکھیں گے، عدل کا تقاضا یہی ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ولا یسلبون الفاسق المِلِّی الاسلام بالکلیة ولا یُخلِّدونه فی النار، بل الفاسق یدخل فی اسم الایمان المطلق کما فی قوله: ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ (النساء:۹۲)......))

''اہل سنت ملت کی طرف منسوب فاسق سے کلیتًا اسلام سلب نہیں کرتے اور نہ اسے جہنم میں ہمیشہ رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک فاسق ایمان مطلق کے نام میں داخل ہے، جس طرح کہ اس ارشادِ باری تعالیٰ میں ہے:

''پس آزاد کرنا ہے مومن گردن کا۔''

شرح:......[الفاسق]......اطاعت سے خروج کرنے والا۔

جیسا کہ ہم نے قبل ازیں اشارہ کیا۔ فسق کی دو قسمیں ہیں، فسق اکبر اور فسق اصغر۔ فسق اکبر انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے، اسی لیے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ﴾ (السجدة: ۲۰) ''رہے فاسق تو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

جبکہ فسق اصغر اسلام سے خارج نہیں کرتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ﴾ (الحجرات: ٦)

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو۔ کہیں نادانی سے کسی قوم کو نقصان نہ پہنچا بیٹھنا۔''

جو فاسق دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، وہ ملّی فاسق ہے، اور یہ ایسا شخص ہے جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے یا گناہ صغیرہ پر اصرار۔

[المِلِّی]......یعنی ملت کی طرف منسوب فاسق جو اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

اہل السنہ والجماعہ ملّی فاسق سے بالکلیہ اسلام سلب نہیں کرتے، ان کے لیے اسے غیر مسلم کہنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اسے ناقص الاسلام یا ناقص الایمان کہا جاسکتا ہے۔

[ولا یُخلِّدونه فی النار] ..... مؤلف کا یہ قول، ان کے قول "ولا یسلبون" پر معطوف ہے، اس بنا پر ان کا قول "کما تقول المعتزلة" دونوں چیزوں کی طرف لوٹتا ہے۔ اس لیے کہ معتزلہ اس سے اسلام بھی سلب کرتے ہیں اور

❶ کعب بن مالک کے قصہ کو بخاری (٤٤١٨) اور مسلم (٢٧٦٩) نے روایت کیا ہے۔



اسے جہنم میں بھی ہمیشہ رکھتے ہیں۔ اگر چہ وہ اس پر کفر کا اطلاق نہیں کرتے۔

[المطلق] .....اس سے مؤلف رحمہ اللہ کی اس جگہ مراد یہ ہے کہ جب مطلق ایمان کی بات ہوگی تو وصف اسم کی طرف لوٹے گا نہ کہ ایمان کی طرف، جس طرح کہ عنقریب مؤلف کے کلام سے ظاہر ہوگا۔ لہٰذا اس سے مراد مطلق ایمان ہوگا جو کہ فسق اور عدل کو شامل ہے۔

[تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ] .....اس جگہ (مومنۃ) میں فاسق بھی داخل ہے۔

اگر کسی نے فاسق غلام خرید کر اسے کفارہ میں آزاد کردیا، تو یہ اسے کفایت کر جائے گا، حالانکہ حکم یہ دیا گیا ہے: [فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ] اور یہ اس لیے کہ کلمہ (مومنۃ) فاسق اور غیر فاسق دونوں کو شامل ہے۔

فاسق، ایمان مطلق میں داخل نہیں

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقد لا یدخل فی اسم الایمان المطلق.)) ''وہ کبھی ایمان مطلق کے نام میں داخل نہیں ہوتا۔''

شرح:.....یعنی فاسق کبھی اسم ایمان کے مطلق میں داخل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ (الانفال: ۲)

''صرف اور صرف مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔''

[اِنَّمَا] ..... اداۃ حصر ہے۔ یعنی مومن تو صرف یہ لوگ ہیں، اور مومنین سے مراد کامل ایمان والے ہیں، اس جگہ مومنین میں فاسق داخل نہیں ہیں، اس لیے کہ اگر اس پر آیات اللہ پڑھی جائیں تو وہ اس کے ایمان میں اضافہ نہیں کرتیں، اور اگر اس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس کا دل ڈرتا نہیں۔

مؤلف نے یہ بات واضح فرمادی ہے کہ کبھی ایمان سے مراد مطلق ایمان ہوتا ہے اور کبھی ایمان مطلق۔

جب ہم کسی ایسے آدمی کو دیکھیں کہ اللہ کا ذکر سن کر اس کا دل نہیں ڈرتا، اور جب اس پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو اس کے ایمان میں اضافہ نہیں ہوتا، تو اسے مومن کہنا بھی صحیح ہوگا اور غیر مومن بھی۔ مومن اس لیے کہ اس کے پاس اصل ایمان موجود ہے اور غیر مومن اس لیے کہ اس کے پاس کامل ایمان موجود نہیں ہے۔

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:



((لا یـزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ، ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن ، ولا یشـرب الـخـمر حین یشربھا وھو مومن، ولا ینھب نھبة ذات شرف یرفع الناس إلیه فیھا أبصارھم حین ینتھبھا وھو مومن .)) ❶

''زانی زنا کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، چور چوری کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، شرابی شراب نوشی کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، اور لوٹنے والا جب کوئی ایسی قیمتی چیز لوٹتا ہے جس کی طرف لوگ نظریں اٹھا کر دیکھتے ہوں تو اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا۔''

شرح: ...... یہ ایمان مطلق یعنی کامل ایمان کی دوسری مثال ہے۔

[لا یـزنـی الـزانـی حـین یزنی وھو مومن] ...... اس جگہ زانی سے زنا کرتے وقت ایمان کامل کی نفی کی گئی ہے۔ مگر زنا کاری سے فراغت کے بعد وہ کامل الایمان ہوسکتا ہے، وہ اس طرح کہ وہ اللہ سے ڈر کر اس کے حضور توبہ کرے۔ لیکن زنا کاری کی طرف پیش قدمی کرتے وقت اگر اس کے پاس کامل ایمان ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتا۔ زنا کی طرف پیش قدمی کرتے وقت زانی کا ایمان انتہائی کمزور ہوتا ہے۔

[ولا یسـرق السارق حین یسرق وھو مومن] ...... مومن سے مراد کامل الایمان ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ کامل ایمان کا حامل ہوتا تو وہ اسے سرقہ سے باز رکھتا۔

[ولا یشرب الخمر حین یشربھا وھو مومن] ...... یعنی اس وقت وہ کامل الایمان نہیں ہوتا۔

[ذات شـرف] ...... یعنی لوگوں کے نزدیک بڑی قدر و قیمت والی، اسی لیے تو وہ اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ ڈاکو ڈاکہ زنی کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، یعنی کامل مومن نہیں ہوتا۔

زنا کاری، سرقہ، شراب نوشی اور ڈاکہ زنی، یہ چار کام کرتے وقت کوئی بھی شخص مومن نہیں ہوتا۔ اس جگہ ایمان کی نفی سے مراد کامل ایمان کی نفی ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

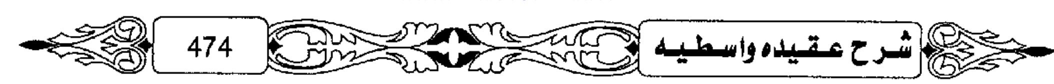
((ونقول ھو مومن ناقص الایمان ، أو مومن بایمانه فاسق بکبیرته ، فلا یعطی الاسم المطلق ، ولا یسلب مطلق الاسم .))

''کبائر کا ارتکاب کرنے والا مومن ہے مگر اس کا ایمان ناقص ہے یا وہ اپنے ایمان کے ساتھ مومن اور کبیرہ گناہ کے ساتھ فاسق ہے، اسے اسم مطلق دیا نہیں جائے گا اور اس سے مطلق اسم سلب نہیں کیا جائے گا۔''

شرح: ...... جبکہ اہل سنت کے نزدیک ملی فاسق اس وصف کا استحقاق رکھتا ہے۔

---

❶ اسے بخاری (۲٤٦٥) اور مسلم (٥٧) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔



مطلق شے اور شے مطلق میں فرق یہ ہے کہ شے مطلق، کامل شے ہوا کرتی ہے، جبکہ مطلق شے سے مراد اصل شے ہوتی ہے اگرچہ وہ ناقص ہی کیوں نہ ہو۔

ملّی فاسق کو نہ تو ایمان میں اسم مطلق دیا جاسکتا ہے جو کہ اسم کامل سے عبارت ہے اور نہ اس سے مطلق اسم سلب کیا جاسکتا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مومن نہیں ہے یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ناقص الایمان مومن ہے، یا اپنے ایمان کے ساتھ مومن کبیرہ گناہ کے ساتھ فاسق ہے۔

یہ اہل السنہ والجماعہ کا مذہب ہے اور یہی سلطانی عادلانہ مذہب ہے۔

اس بارے میں کچھ گروہ ان کے مخالف ہیں:

مرجیہ کے نزدیک ایسا شخص کامل الایمان ہے۔

خوارج کے نزدیک ایسا شخص کامل الایمان ہے۔

خوارج کے نزدیک وہ کافر ہے۔

اور معتزلہ کے نزدیک وہ دو منزلوں کی درمیانی منزل میں ہے۔



فصل:

اصحاب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اہل سنت کا موقف

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ومن اصول اهل السنة والجماعة سلامة قلوبهم وألسنتهم لاصحاب رسول الله ﷺ.))

''اہل سنت کے عقیدہ کی بنیادی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے دل اور زبانیں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حوالے سے سلامت ہیں۔''

شرح:......مؤلف رحمہ اللہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کا ایک عقدی اصول یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں ان کے دل بغض وعداوت اور نفرت سے پاک اور ان کی زبانیں ایسی بات سے محفوظ ہیں جو ان کے شایان شان نہ ہو۔

اہل سنت کے صحابہ سے محبت کے اسباب

اہل سنت اصحاب نبی ﷺ سے محبت کرتے اور انھیں ساری مخلوق پر فضیلت دیتے ہیں اور یہ اس لیے کہ ان کے ساتھ محبت کرنا رسول کریم ﷺ سے محبت کرنا اور رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہے، اسی طرح ان کی زبانیں اصحاب رسول ﷺ کے حوالے سے سب وشتم یعنی اور تکفیر اور اس قسم کی ان دوسری باتوں سے محفوظ ہیں جو اہل بدعت کا وطیرہ ہیں۔

جب آپ ان مقدس ہستیوں کے بارے میں اس قسم کی باتوں سے محفوظ و سالم رہیں گے تو آپ ان کی تعریف و توصیف بھی کریں گے، ان سے راضی بھی ہوں گے، اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت اور مغفرت کی درخواست بھی کریں گے۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

اولاً: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام امتوں میں خیر القرون کے لوگ ہیں۔ اس کی صراحت آنحضرت ﷺ نے اس طرح فرمائی ہے: ''بہترین لوگ میرے دور کے لوگ ہیں۔ پھر ان کے بعد آنے والے اور پھر ان کے بعد آنے والے۔ [1]

ثانیاً: ان کے ہاتھوں بڑی بڑی اسلامی فتوحات حاصل ہوئیں۔

ثالثاً: امت میں صدق و وفا اور خیر خواہی جیسے فضائل اور ایسے اخلاق و آداب کی ترویج و اشاعت ہوئی جو ان کے

---

[1] اسے بخاری: ۳٦٥١، اور مسلم: ۲٥۳۲ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



علاوہ کسی دوسری اُمت میں نہیں پائے جاتے۔ اس حوالے سے ان کے درخشندہ کردار سے وہی لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں جو ان کی تاریخ میں زندہ رہے اور ان کے فضائل ومناقب، ایثار وترجیح اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے کما حقہ آگاہ ہوئے۔

ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے، ان کے استحقاق کے مطابق ان کی تعریف وتوصیف کرتے افراط وتفریط کے رسیا اور دو گمراہ فرقوں کے مذموم طریقوں سے براءت ولاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

رافضیوں کے طریقہ سے جو اصحاب رسول ﷺ کو سب وشتم کرتے اور آلِ رسول ﷺ کی محبت میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ اور ناصبیوں کے طریقہ سے بھی جو اہل بیت سے بغض وعداوت رکھتے ہیں۔

[**لاصحاب رسول اللہ ﷺ**.] ..... قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ صحابی اس سعادت مند شخص کو کہتے ہیں جسے ایمان کی حالت میں آنحضرت ﷺ کی رفاقت حاصل ہوئی اور پھر ایمان کی حالت میں ہی وفات پائی، اسے اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اسے ایمان کی حالت میں آپ ﷺ کی رفاقت میسر آئی تو یقیناً اس نے آپ ﷺ کی اتباع کا بھی التزام کیا۔ یہ بات نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ آپ ﷺ کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی کا صاحب نہیں بن سکتا جب تک وہ عرصہ دراز تک اس کی رفاقت اختیار نہ کر لے۔

اہل سنت والجماعت کے دلائل

❑ اس کے بعد مؤلف رحمہ اللہ اہل سنت کے موقف کے لیے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر: ۱۰)

''اور جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے وہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے ان بھائیوں کے گناہ معاف کر دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے، اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کینہ پیدا نہ کر، ہمارے رب! یقیناً تو بہت شفقت والا، بڑا رحم والا ہے۔''

شرح:..... قرآن مجید کی یہ آیت ان دو آیتوں کے بعد آئی ہے:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ (الحشر: ۸)

''اور فقراء مہاجرین کے لیے بھی جنھیں نکال دیا گیا ان کے گھروں سے اور ان کے مالوں سے، وہ تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی اور مدد کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی یہی لوگ سچے ہیں۔''

ان مہاجرین میں سے سرکردہ لوگ چار ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ارشاد باری تعالیٰ ﴿يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾ ان کے اخلاص نیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ﴿يَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ ان کے تحقیق عمل کی شہادت دیتا ہے۔ اور ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا خلوص نیت سے کیا ریاکاری اور دکھلاوے کے لیے نہیں کیا۔ پھر انصار کے بارے میں فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾ (الحشر: ۹)

''اور ان لوگوں کے لیے بھی جو دارالسلام اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتے ہیں اور انھیں جو کچھ دیا گیا ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتے اور وہ دوسروں کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود فاقہ میں ہی مبتلا ہوں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انصار کے تین اوصاف بیان فرمائے ہیں:

۱۔ وہ اپنے پاس ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔

۲۔ جو کچھ مل جائے اس کی وجہ سے دلوں میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتے۔

۳۔ خود کو لاحق ضرورت کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں۔

پھر اس بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ ....﴾ (الحشر: ۱۰) اور وہ ہیں روز قیامت تک احسان و اخلاص کے ساتھ ان کی اتباع کرنے والے۔ وہ انھیں اخوت سے یاد کرتے، انھیں سابق الایمان بتاتے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے بارے میں ان کے دلوں میں کینہ پیدا نہ فرمائے۔ اب جو شخص بھی اس بارے میں ان کے ساتھ اس سے مختلف رویہ اختیار کرے گا، ان پر کیچڑ اچھالے گا، اور اپنے اوپر عائد ان کے حقوق ادا نہیں کرے گا، تو اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوگا، جن کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا....﴾ (الحشر: ۱۰)

جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب وشتم کرنے والے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا: اس میں تعجب والی کوئی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی وفات کی وجہ سے ان کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اللہ نے چاہا کہ ان کی موت کے بعد بھی ان کے اجر کا سلسلہ جاری رکھے۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے ﴿وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا﴾ فرمایا: یہ نہیں فرمایا: للذین سبقونا بالایمان۔ ''جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔'' تاکہ سابقین اور قیامت تک آنے والے دوسرے اہل ایمان کو بھی شامل ہو جائے۔

[1] ملاحظہ فرمائیں: ''جامع الاصول'' از ابن الاثیر: ۸۱۰۵٤ انہوں نے اسے رزین کی طرف منسوب کیا۔



﴿رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ ہم تیری رأفت ورحمت کی وجہ سے تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ہماری اور ہم سے پہلے ایمان لانے والے ہمارے بھائیوں کی مغفرت فرما۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب وشتم کرنے کی ممانعت

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَطَاعَةُ النَّبِيِّ ﷺ فِیْ قَوْلِهِ: لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ ؛ فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِیَدِهِ ؛ لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا ؛ مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِیْفِهِ .)) ❶

''اوراس ارشاد میں نبی ﷺ کی اطاعت کرنا ''میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ ان کے ایک مدّ بلکہ نصف مدّ کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

شرح: ......[طَاعَةُ] ..... اس کا مؤلف رحمہ اللہ کے قول: ﴿سلامة﴾ پر عطف ہے۔ یعنی اہل سنت کا ایک اصول نبی کریم ﷺ کی اطاعت کرنا ہے...... الخ۔

اَلسَّبّ: برا بھلا کہنا۔ اگر ایسا کسی کی عدم موجودگی میں ہو تو اسے غیبت کہا جاتا ہے۔

[اَصْحَابِیْ] ..... اصحاب: آپ ﷺ کی رفاقت اختیار کرنے والے نبی کریم ﷺ کی محبت کے مختلف مدارج ہیں: جو فتح مکہ سے قبل محبت قدیمہ اور بعد از فتح محبت متاخرہ کہلاتی ہے۔

جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مابین بنی جذیمہ کے بارے میں تنازع اٹھ کھڑا ہوا تو آپ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''میرے اصحاب کو برا بھلا مت کہا کرو۔'' اگرچہ اس کے مخاطب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے مگر اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے۔

اگر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دیگر لوگوں کی نسبت سے یہ حکم ہے تو بعد کے لوگوں کی نسبت سے آپ کا کیا خیال ہے؟

[فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهِ ؛ لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا ..... الخ] ..... صادق ومصدوق نبی قسم اٹھا کر فرما رہے ہیں کہ ''اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی ایک کے ایک مدّ بلکہ نصف مدّ کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

[وَلَا نَصِیْفِهِ.] ..... یعنی اس کا نصف، بعض کے نزدیک ان سے خوراک کی اشیاء کا نصف صاع مراد ہے۔ اس لیے کہ مدّ یا نصف مدّ کے ساتھ خوراک کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ سونے کا وزن کیا جاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد سونا ہے۔ اس قول کا قرینہ عبارت کا سیاق ہے۔

❶ اسے بخاری: ۳٦۷۳، اور مسلم: ۲٥٤۱ نے ابوسعید رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

بہر حال اس سے مراد خوراک ہو تو بھی درست ہے اور اگر اس سے مراد سونا ہو تو بھی درست ہے۔ مدّ یا نصف مدّ سونے کی بھی سونے کے جبل احد کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اگر ہم میں سے کوئی شخص جبل احد کے برابر سونا بھی خرچ کرے تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے خرچ کیے گئے نہ مد کے برابر ہو سکتا ہے اور نہ نصف مدّ کے۔ انفاق بھی ایک ہے۔ خرچ کرنے والا بھی انسان ہے اور جس پر خرچ کیا گیا وہ بھی انسان ہے۔ مگر سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جو فضائل و مناقب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہیں وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہیں۔ وہ انفاق فی سبیل اللہ میں اپنے انتہائی خلوص اور شدید اتباع کی وجہ سے دوسروں سے کہیں افضل ہیں۔

صحابہ کرام کو سب وشتم کرنے کی یہ نہی تحریم کی متقاضی ہے، کسی شخص کے لیے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علی العموم گالی دینا جائز نہیں ہے اور نہ کسی کو علی الخصوص گالی دینا جائز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علی العموم گالی دینے والا کافر ہے، بلکہ اس کے کفر میں شک کرنے والے کے کفر میں بھی کوئی شک نہیں ہے، اور اگر کوئی انھیں علی سبیل الخصوص گالی دیتا ہے تو اس کا سبب دیکھا جائے گا، کوئی بدنصیب انھیں اپنے خیال میں بعض خلقی، خلقی یا دینی امور کی وجہ سے بھی گالی دے سکتا ہے، ان میں سے ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ويقبلون ماجاء به الكتاب والسنة والاجماع من فضائلهم و مراتبهم.))

''اور وہ ان کے فضائل و مراتب کے بارے میں کتاب وسنت اور اجماع کی تصریحات کو قبول کرتے ہیں۔''

شرح:......[يقبلون] ..... یعنی اہل سنت۔

الفضائل: یہ فضیلۃ کی جمع ہے، وہ خوبی جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے بڑھ جاتا ہے۔ اور جو چیز اس کی عمدہ خصلت شمار ہوتی ہے۔

المراتب: درجات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف مراتب اور درجات ہیں۔ جن کا ذکر مولف آگے چل کر کریں گے۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل اور درجات و مراتب کو اہل سنت قبول کرتے ہیں۔

مثلاً اہل سنت ان کی طرف سے کثرت صوم وصلاۃ، کثرت صدقہ، کثرت حج، کثرت جہاد یا اس قسم کے دیگر فضائل کو قبول کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس فضیلت کو قبول وتسلیم کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی ترغیب دلائی تو انہوں نے سارا مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ [1]

---

[1] اسے ابوداود: ۱۶۷۸ اور ترمذی: ۳۶۷۵ نے روایت کیا، اور کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے شیخ البانی نے ''المشکاۃ'' میں اسے حسن کہا ہے۔ (۳/۱۷۰۰)

وہ کتاب و سنت میں وارد اس بات کو بھی قبول کرتے ہیں کہ سفر ہجرت کے دوران ابو بکر رضی اللہ عنہ غار ثور میں اکیلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی تھے۔

وہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی تسلیم و قبول کرتے ہیں کہ ''اپنے مال اور رفاقت میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مجھ پر سب لوگوں سے زیادہ احسانات ہیں'' [1]

اسی طرح اہل السنہ والجماعہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابو طالب اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل ومناقب کو بھی قبول کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مراتب کو بھی قبول کرتے ہیں، خلفاء راشدین اس امت میں بلند ترین مرتبہ پر فائز ہیں، پھر ان میں سے بلند ترین مرتبہ کے حامل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ، پھر عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور پھر علی رضی اللہ عنہ، جیسا کہ مؤلف آگے چل کر ذکر کریں گے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویفضلون من انفق من قبل الفتح۔ وهو صلح الحديبية۔ وقاتل: على من انفق من بعد وقاتل.))

''اہل سنت صلح حدیبیہ سے قبل خرچ کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں کو اس کے بعد خرچ کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں پر فضیلت دیتے ہیں۔''

شرح:......اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ (الحدید: ۱۰)

''نہیں برابر ہے تم میں سے وہ جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا، یہ لوگ ان لوگوں سے درجے میں بڑے ہیں جنہوں نے اس کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔ ویسے اللہ نے سب سے اچھائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔''

صلح حدیبیہ ذوالقعدہ میں ٦ ہجری کو ہوئی، جو لوگ اس سے پہلے مسلمان ہوئے، اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا وہ اس کے بعد خرچ کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں سے افضل ہیں۔

سوال: ہم اس سے کس طرح آگاہ ہوں گے؟

جواب: اس سے آگاہی ان کے اسلام قبول کرنے کی تاریخ سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی "الاصابة في تمييز الصحابة" ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی "الاستيعاب في معرفة الأصحاب" اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

[1] اسے بخاری: ۳۹۰٤، اور مسلم: ۲۸۳۲ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



کے بارے میں تالیف کردہ دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ فلاں صحابی فتح سے قبل مسلمان ہوا، اور فلاں اس کے بعد۔ "وھو صلح الحدیبیة" یہ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول ہے، اور یہی صحیح ہے، اس کی دلیل خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ، نیز براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے: تم لوگ فتح مکہ کو فتح شمار کرتے ہو، یقیناً فتح مکہ بھی ایک فتح تھی مگر ہم تو حدیبیہ میں ہونے والی بیعت رضوان کو فتح تسلیم کرتے ہیں۔ ❶

دوسرے قول کی رو سے اس فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ زیادہ تر مفسرین کا یہی قول ہے۔ ❷

مہاجرین کی انصار پر فضیلت

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویقدمون المهاجرین علی الانصار.)) "اور وہ مہاجرین کو انصار پر مقدم رکھتے ہیں۔"

شرح: ......**مہاجرین**: وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فتح مکہ سے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، جبکہ انصار وہ لوگ ہیں جن کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت فرمائی۔

اہل سنت مہاجرین کو انصار پر مقدم رکھتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے ہجرت بھی کی اور نصرت بھی، جبکہ انصار صرف نصرت اسلام سے مشرف ہوئے۔

مہاجرین نے اپنے اہل وعیال کو بھی چھوڑا اور مال واسباب کو بھی، اور اپنے وطن کو چھوڑ کر اپنی زمین میں جا بسے جس میں وہ غریب الدیار تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کے لیے اور ان کی نصرت ومعاونت کے لیے کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب انصار کے ملک میں مہاجر بن کر تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا فریضہ سرانجام دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اس چیز کے ساتھ دفاع کیا جس کے ساتھ وہ اپنے بچوں اور عورتوں کا تحفظ کیا کرتے تھے۔

مہاجرین کو مقدم کرنے کی دلیل یہ قرآنی آیت ہے:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبہ: ۱۰۰)

"اور پہلے پہل ایمان لانے میں سبقت لے جانے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور جنہوں نے احسان کے ساتھ ان کی اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔"

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو انصار پر مقدم رکھا ہے۔ دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

---

❶ اسے بخاری (۴۱۵۰) نے روایت کیا۔

❷ ملاحظہ فرمائیں: تفسیر درمنثور: ٦١٥٨۔



﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ (التوبة: ۱۱۷)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے نبی، مہاجرین اور انصار پر رحمت سے توجہ فرمائی۔''

اور مال فے کی تقسیم کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ (الحشر: ۸)

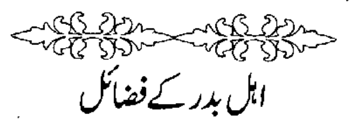
''فقراء مہاجرین کے لیے جنہیں نکال دیا گیا ان کے گھروں سے اور ان کے مالوں سے۔''

پھر فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (الحشر: ۹)

''اور ان لوگوں کا بھی حق ہے جو دار السلام اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں۔''

اس جگہ پہلے مہاجرین کا ذکر کیا گیا اور پھر انصار کا۔



اہل بدر کے فضائل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویومنون بان الله قال لا هل بدر۔ وکانوا ثلاث مائة و بضعة عشر۔ اعملوا ما شئتم: فقد غفرت لکم .))

''اور ان کا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر سے فرمایا۔ ان کی تعداد تین سو دس سے کچھ زائد تھی۔ تم جو چاہو عمل کرو، یقیناً میں نے تمہیں معاف کر دیا۔''

شرح:...... جنگ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مرتبہ دیگر تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا ہے۔ بدر ایک مشہور جگہ کا نام ہے جہاں مشہور جنگ بدر لڑی گئی۔ یہ جنگ ۲ ہجری کو رمضان المبارک کے مہینے میں ہوئی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان کے نام سے موسوم فرمایا۔

غزوہ بدر کا سبب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ ابوسفیان قریش کے تجارتی قافلہ کے ساتھ شام سے واپس مکہ جا رہا ہے، تو آپ نے اس قافلہ کا تعاقب کرنے کے لیے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے اس کے لیے مشورہ کیا۔ مسلمانوں کا جو گروہ اس قافلہ کے تعاقب کے لیے نکلا اس کی تعداد مشہور روایت کے مطابق صرف تین سو تیرہ تھی، جن کے پاس ستر اونٹ دو گھوڑے اور چند تلواریں تھیں، جب یہ لوگ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو ان کا ارادہ جنگ کرنے کا قطعاً نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ انہیں اور ان کے دشمنوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کرے۔

جب ابوسفیان کو مسلمانوں کے تعاقب کا علم ہوا تو گھبرا گیا اور ایک آدمی کو فوراً مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش کو صورت حال سے آگاہ کرے اور ان سے مدد طلب کرے۔ جب انہیں صورت حال کا علم ہوا تو تمام روساء مکہ اور سردار ان قریش بڑے



کروفر کے ساتھ آمادۂ جنگ ہو کر نکل کھڑے ہوئے جس کی قرآن نے اس طرح عکاسی کی ہے:

﴿بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (الانفال: ۴۷)

(جو اپنے گھروں سے) ''تکبر کرتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے نکلے، وہ اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔''

اس دوران جب قریش مکہ کو یہ خبر ملی کہ ابو سفیان مسلمانوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو وہ واپس جانے کے لیے مشورہ کرنے لگے۔ مگر ابو جہل نے واپس جانے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اور کہنے لگا کہ اب ہم بدر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ ہم وہاں قیام کے دوران شراب نوشی کریں گے۔ اونٹ نحر کریں گے۔ رقص و سرود کی محفلیں سجائیں گے، پھر جب عربوں کو اس کا علم ہو گا تو ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی، اور وہ ہم سے ہمیشہ خائف رہا کریں گے۔

یہ چیز ان کے فخر و غرور اور طاقت کے نشہ میں چور ہونے پر دلالت کرتی ہے، مگر بحمد اللہ تعالیٰ معاملہ اس کے الٹ ہوا، جب عربوں کو ان کی بدترین شکست کا علم ہوا تو وہ ان کی نظروں میں بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ آخر کار جب دونوں جماعتیں بدر کے مقام پر ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ٥ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ٥ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ﴾

(الانفال: ۱۲۔۱۴)

''جس وقت آپ کا پروردگار فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، سو تم ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور پر ضرب لگاؤ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ سو یہ سزا چکھو اور جان لو کہ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔''

اس جنگ میں کفار و مشرکین کو بدترین قسم کی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے۔ جبکہ بحمد اللہ اہل ایمان کو نصرت ایزدی سے نوازا گیا۔ انہوں نے مشرکین مکہ کے ستر لوگوں کو قیدی بنا لیا، جبکہ ستر لوگ مارے گئے۔ مرنے والوں میں چوبیس آدمی ایسے تھے جن کا شمار سرداران قریش میں ہوتا تھا، انھیں گھسیٹ کر بدر کے پرانے اور غیر آباد کنویں میں پھینک دیا گیا۔

جنگ کے تین دن بعد نبی کریم ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر ان پر کھڑے ہوئے، آپ ان کے اور ان کے باپوں کے نام لے کر انہیں آوازیں دیتے ہوئے فرماتے تھے: ''اے فلاں بن فلاں! کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تم اللہ اور اس رسول کی اطاعت کر لیتے؟ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا اسے ہم نے سچا پایا، کیا تم سے تمہارے رب نے جو وعدہ کیا تھا تم نے بھی اسے سچا پایا؟'' لوگ کہنے لگے: یا رسول اللہ! کیا آپ بے روح جسموں سے بات کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ان سے جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اسے ان سے زیادہ

نہیں سن رہے ہو۔" ❶

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو سچا ہی پایا تھا، نبی علیہ السلام انہیں شرم دلانے اور ڈانٹ پلانے کے لیے ان سے یہ کچھ فرما رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ﴾ (الانفال: ١٤)

"اس عذاب کا مزہ چکھو، اور بیشک کافروں کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔"

ان کے مرنے کے بعد آگ ان کے سامنے کھڑی تھی، جس سے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا یقین ہو گیا۔ مگر اب بات بہت دور جا پہنچی تھی۔ اہل بدر کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جس عظیم فتح و نصرت سے نوازا اس کی وجہ عرب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سہم گئے اور اس کے بعد انہیں بڑی قدر و منزلت حاصل ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جھانک کر فرمایا: "تم جو چاہو عمل کرو یقیناً میں نے تمہاری مغفرت فرما دی ہے۔" ❷

اب ان سے جن گناہوں کا بھی صدور ہو گا انہیں معاف کر دیا جائے گا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگ بدر میں ان کے عظیم کردار کی وجہ سے ان سے جس قدر بھی کبیرہ گناہ سرزد ہوں گے وہ قابل معافی ہوں گے۔ اس حدیث میں اس بات کی بھی بشارت موجود ہے کہ انہیں کفر کی حالت میں موت نہیں آئے گی، اس لیے کہ ان کی مغفرت فرما دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ دو چیزوں کا متقاضی ہے:

یا تو اس کے بعد ان سے کفر کا صدور ممکن ہی نہیں ہے۔

اگر کسی کے مقدر میں کفر ہوا بھی تو اللہ تعالیٰ اسے توبہ کرنے اور اسلام کی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا صورت حال جو بھی ہو، اس میں ان کے لیے بہت بڑی بشارت ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان میں سے کسی نے اس کے بعد کفر کیا ہو۔

اصحاب الشجرہ کے فضائل

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وبأنه لا يدخل النار احد بايع تحت الشجرة، كما اخبره النبى صلى الله عليه وسلم، ❸ بل لقد رضى الله عنهم و رضوا عنه وكانوا اكثر من الف و اربع مائة.)) ❹

"اور یہ کہ درخت کے نیچے بیعت (الرضوان) کرنے والا کوئی ایک صحابی بھی جہنم میں نہیں جائے گا جس طرح

---

❶ اسے بخاری: ٣٩٨٦ اور مسلم: ٢٨٧٤ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

❷ اسے بخاری: ٣٠٠٧ اور مسلم ٢٤٩٤ نے روایت کیا۔

❸ صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ مجھے ام مبشر نے خبر دی اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس فرما رہے تھے: "ان شاء اللہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں سے ایک شخص بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔

❹ اسے بخاری: ٤١٥٤ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اسے ابو داؤد: ٤٦٥٣ اور ترمذی: ٣٨٥٩ نے بھی اسی طرح روایت کیا۔



کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی خبر دی ہے۔ بلکہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور ان کی تعداد چودہ سو سے زائد تھی۔''

شرح:...... **اصحاب شجرہ** (درخت والوں) سے مراد بیعت الرضوان میں شریک ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔

اس بیعت کی وجہ یہ تھی کہ نبی ﷺ عمرہ کرنے کی غرض سے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہوئے، انہوں نے قربانی کے جانور بھی اپنے ساتھ لے رکھے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً چودہ سو تھی، جب آپ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے۔ حدیبیہ مکہ مکرمہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے جو آج کل جدہ کے راستے پر واقع ہے، اس کا کچھ حصہ حدود حرم میں ہے اور کچھ حدود حرم سے باہر۔ اور آپ کی آمد کا مشرکین مکہ کو علم ہوا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بیت اللہ کے مجاور اور اس کے محافظ سمجھتے تھے۔

﴿وَ مَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الانفال: ۳٤)

''اور وہ اس کے متولی نہیں ہیں، اس کے متولی تو صرف متقی (شر سے بچنے والے) ہی ہو سکتے ہیں۔''

اس کے بعد مسلمانوں اور مشرکین میں مذاکرات شروع ہو گئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر آپ ﷺ کے اپنے موقف سے درست بردار ہونے میں بڑی خیر اور مصلحت پنہاں تھی۔ جب نبی کریم ﷺ کی اونٹنی اچانک بیٹھ گئی اور اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، تو لوگ کہنے لگے: قصواء نافرمان ہو گئی۔ جس پر آپ ﷺ نے اس کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا: ''واللہ! قصواء نافرمان نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ اس کی عادت ہے۔ اصل میں اسے اس اللہ نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کفار مکہ مجھ سے جس بھی ایسی بات کا مطالبہ کریں گے جس سے ان کے پیش نظر حرمات اللہ کی تعظیم کرنا ہوگا تو میں ضرور ان کا وہ مطالبہ پورا کروں گا۔''[1]

مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تاکہ وہ مشرکین مکہ کو اس بات سے آگاہ کریں کہ نبی کریم ﷺ صرف عمرہ ادا کرنے کی غرض سے آئے ہیں، اس کے علاوہ ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جب مشرکین نے انہیں واپس جانے سے روک لیا تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے یہ خبر مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھی لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اسی وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ان سے بیعت لی کہ وہ قاصد رسول ﷺ کے قاتلین سے لڑائی کریں گے، مر جائیں گے مگر ہم میں سے کوئی بھی شخص راہ فرار اختیار نہیں کرے گا، نبی کریم ﷺ درخت کے نیچے لوگوں سے وہ بابرکت بیعت لے رہے تھے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] اسے بخاری: ۲۷۳۲، ۲۷۳۱ نے مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت کیا، ''فتح الباری'': ۵/۳۳۳ میں حافظ فرماتے ہیں: یہ روایت مروان کی نسبت سے مرسل ہے۔ اس لیے کہ وہ صحابی نہیں ہے اسی طرح یہ مسور کی نسبت سے بھی مرسل ہے۔ اس لیے کہ وہ موقع پر موجود نہیں تھے۔ مسور اور مروان نے بات ان متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سنی جو موقع پر موجود تھے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (الفتح: ۱۰)

''یقیناً وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے تھے وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کر رہے تھے، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔''

چونکہ اس وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں تھے، لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ کی طرف سے اپنے ہاتھ سے بیعت لی، اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا: ''یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔''

بعدازاں یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر غلط ہے بعدازاں وہ صحیح وسلامت واپس حدیبیہ میں تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان آتے جاتے رہے جس کا نتیجہ اس صلح کی صورت میں سامنے آیا جو رسول علیہ الصلاۃ والسلام کے لیے فتح مبین قرار پائی۔ بیعت رضوان کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝﴾ (الفتح: ۱۸-۱۹)

''یقیناً اللہ راضی ہوگیا ایمان والوں سے جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، پس اس نے معلوم کرلیا جو ان کے دلوں میں تھا، تو اس نے ان پر سکینت اتاری اور انھیں قریب کی فتح عطا فرمائی اور بہت ساری غنیمتیں بھی جنھیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔''

ان بیعت کرنے والوں میں خلفاء اربعہ ابوبکر وعمر، عثمان وعلی بھی شامل تھے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان سے موصوف کیا جو اس کی طرف سے اس بات کی شہادت ہے کہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والا ہر شخص مومن ہے اور اس کا اللہ اس سے راضی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''درخت کے نیچے بیعت کرنے والا کوئی ایک شخص بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔''[1]

ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول قرآن سے ثابت ہے اور دخول نار کا انتفاء سنت سے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اور اس ارشاد باری تعالیٰ میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا﴾ (مریم: ۷۱)

''تم میں سے ہر شخص کو اس پر سے گزرنا ہے، یہ بات تیرے رب پر حتمی اور مقرر شدہ ہے۔''

ان میں تطبیق دو طرح سے ممکن ہے:

اولاً: اس جگہ ورود سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک اس سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے۔ اس لیے کہ گزرنا بھی ورود کی ایک قسم ہے جس طرح کہ اس ارشاد باری میں ہے:

﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِنَ النَّاسِ﴾ (القصص: ۲۳)

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

''اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچا تو اس پر لوگوں کی ایک جماعت پائی جو پانی پلوا رہی تھی۔''

یہ ہمارے علم میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پانی کے اندر نہیں اترے تھے، بلکہ وہ اس کے آس پاس اور قریب رہ رہے تھے۔ اس بناء پر نہ تو کوئی اشکال پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی معارض۔

ثانیاً: جن مفسرین کے نزدیک ورود سے مراد داخل ہونا ہے اور یہ کہ ہر انسان کو جہنم میں داخل ہونا ہے۔ تو اس قول کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ وہ ازراہ عذاب اور اہانت اس میں داخل نہیں ہوں گے بلکہ تنفیذ قسم کے لیے ہوں گے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ورود سے بیعت رضوان کرنے والے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں۔

[**الشجرة**] ..... یہ درخت بیری کا تھا یا ببول کا۔ مگر یہ اختلاف بلا مقصد ہے۔ وہ ایک سایہ دار درخت تھا جس کے نیچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے بیعت لی، یہ درخت خلافت فاروقی کے آغاز تک موجود تھا، جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ بتایا گیا کہ لوگ وہاں جا کر اس کے قریب نماز پڑھتے ہیں تو انہوں نے اسے کاٹ دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے کاٹ دیا گیا۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''میں نے یہ بات صحیح سند کے ساتھ ابن سعد کے ہاں پائی لیکن ''صحیح بخاری'' [2] میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ ہم آئندہ سال جب ادھر آئے تو جس درخت کے نیچے ہم نے بیعت کی تھی ہم میں سے دو آدمی بھی اس کے پاس اکٹھے نہ ہوئے، یہ اللہ کی رحمت تھی۔ حضرت سعید کے والد حضرت مسیب فرماتے ہیں: جب ہم آئندہ سال ادھر گئے تو اس درخت کو بھول گئے اور اسے تلاش نہ کر سکے۔

حضرت مسیب کا یہ قول ابن سعد کے حوالے سے ابن حجر رحمہ اللہ کے ذکر کے منافی نہیں ہے؛ اس لیے کہ اسے بھول جانا اس کے عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے۔ اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ لوگ اس کے بعد بھی اسے بھولے رہے۔ واللہ اعلم۔

اس بات کا شمار عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حسنات میں ہوتا ہے اس لیے کہ ہمارے خیال میں اگر یہ درخت آج تک موجود رہتا تو اس کی اللہ کے سوا پرستش کی جاتی۔

اہل سنت کا جنتی ہونے کی گواہی دینا جس کے جنتی ہونے کی گواہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویشهدون بالجنة لمن شهد له رسول الله ﷺ کالعشرة وثابت بن قیس بن شماس، وغیرهم من الصحابة.))

''اہل سنت اس شخص کے لیے جنت کی گواہی دیتے ہیں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی گواہی دی۔ جس طرح کہ عشرہ مبشرہ، ثابت بن قیس بن شماس اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔''

---

[1] فتح الباری: ۷/۴۴۸.

[2] اسے بخاری: ۲۹۵۸، ۴۱۶۲، ۴۱۶۳ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ مزید اسے سعید بن مسیب کے والد سے بھی روایت کیا: ۴۱۶۳، ۴۱۶۲



شرح:......[یشهدون] ......یعنی اہل السنہ والجماعہ گواہی دیتے ہیں۔

جنت کی شہادت کی دو قسمیں ہیں: کسی وصف سے متعلقہ شہادت اور کسی شخص سے معلقہ شہادت، کسی وصف سے متعلقہ شہادت کے حوالے سے ہم کسی شخص یا اشخاص کی تعیین کیے بغیر ہر مومن اور ہر متقی کے لیے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ شہادت عام ہے، اور اس کی گواہی دینا ہم سب پر واجب ہے اس لیے کہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِیْمِo خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُo﴾ (لقمان: ۹-۸)

''بے شک جو لوگ ایمان لانے اور نیک اعمال کیے ان کے لیے نعمتوں والے باغات ہیں۔ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾

(آل عمران: ۱۳۳)

''اور دوڑو مغفرت کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور جنت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیز گاروں کے لیے۔''

رہی کسی معین شخص سے متعلقہ شہادت، تو یہ شہادت خاصہ ہے، جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جنت کی گواہی دی تو اس کے لیے یہ شہادت ہم بھی دیں گے۔ وہ ایک معین شخص کے لیے ہو یا کئی معینہ اشخاص کے لیے۔

اس کی مثال مؤلف نے: ''کالعشرہ'' کہہ کر دی ہے۔ یعنی وہ دس لوگ جنہیں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ انہیں عشرہ مبشرہ کے نام سے ملقب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں ان کا ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے: اور وہ ہیں: خلفاء اربعہ: ابو بکر، عمر، عثمان، علی، اور سعید بن زید، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام اور ابو عبیدہ عامر بن جراح رضی اللہ عنہم اجمعین۔

خلفائے اربعہ کے علاوہ باقی چھ نام ایک شعر میں جمع کر دیئے گئے ہیں، اسے یاد کریں:

سَعِیْدٌ وَسَعْدٌ وَابْنُ عَوْفٍ وَطَلْحَةٌ   وَعَامِرُ فِهْرٍ وَالزُّبَیْرُ الْمُمَدَّحُ

نبی مکرم علیہ الصلاۃ والسلام نے ان لوگوں کو جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

((ابو بکر فی الجنة، و عمر فی الجنة......))[1]

چونکہ آپ ﷺ نے عشرہ مبشرہ کے لیے جنت کی شہادت دی، لہٰذا ان کے جنتی ہونے کی شہادت دینا ہم پر بھی واجب ہے۔

---

[1] اسے احمد: ۱۶۹، ۱۸۸، ۱/۱۸۷، ابو داؤد: ۴۶۴۹، ترمذی: ۳۷۴۸، ابن ماجہ: ۱۳۴، ابن حبان نے اپنی ''صحیح'': ۶۹۹۶/ ۱۰ حاکم نے ''مستدرك'': ۴۵۰/ ۳ میں روایت کیا اور البانی نے ''الصحیحة: ۸۷۵'' میں اسے صحیح کہا۔



[وثابت بن قیس بن شماس] ..... ان کا شمار نبی کریم ﷺ کے خطباء میں ہوتا ہے۔ آپ بڑے بلند آواز تھے، جب اس ارشاد ربانی کا نزول ہوا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴾ (الحجرات : ۲)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے اونچا مت کرو، اور ان سے اس طرح زور سے بات نہیں کرو جیسے ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تم کو شعور بھی نہ ہو۔''

تو وہ گھر میں چھپ گئے انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں میرے اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے انہیں گم پایا تو ان کی طرف ایک آدمی کو بھیجا کہ ان سے یوں چھپ جانے کے بارے میں دریافت کرے۔ اس پر وہ یہ آیت پڑھتے ہوئے کہنے لگے۔ میری آواز نبی کریم ﷺ کی آواز سے اونچی ہو جائے گی۔ میرے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ میں جہنم میں چلا جاؤں گا، وہ آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو حضرت ثابت کی بات سے مطلع کیا۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: اس کے پاس جا کر اسے بتا دو کہ تو جہنمی نہیں بلکہ جنتی ہے۔''[1]

اس طرح آپ ﷺ نے اسے جنت کی خوشخبری سنا دی۔

[وغیرهم من الصحابة.] ..... مثلاً امہات المومنینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ جن میں بلال، عبداللہ بن سلام عکاشہ بن محصن اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں۔[2]

اُمت کے بہترین افراد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ويقرون بما تواتر به النقل عن أمير المومنين علي بن ابي طالب رضی اللہ عنہ وغيره، من ان خير هذه الامة بعد نبيتها ابو بكر رضی اللہ عنہ ثم عمر رضی اللہ عنہ .))

---

[1] اسے بخاری: ۳۶۱۳، اور مسلم: ۱۱۹ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] بلال رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحیح مسلم: ۲٤٥۷ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے جنت دکھائی گئی تو میں نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی کو دیکھا پھر میں نے اپنے آگے قدموں کی چاپ سنی تو معلوم ہوا کہ وہ بلال رضی اللہ عنہ ہے۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے روئے زمین پر چلنے والے کسی بھی انسان کے بارے میں نبی ﷺ سے یہ نہیں سنا کہ یہ جنتی ہے بجز عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے۔ رہے عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ، تو ان کے لیے آپ نے دعا فرمائی کہ وہ ان ستر ہزار لوگوں میں شامل ہوں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔

ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ٤٥٤١۔ صحیح مسلم: ۲۲۰۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بخاری: ۳۸۰۲، اور مسلم: ۲٤٦۸ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک ریشمی حلہ تحفتاً پیش کیا گیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم اسے دیکھنے اور اس کی ملائمی سے تعجب کرنے لگے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم اس کی ملائمی سے تعجب کرتے ہو۔ جنت میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے رومال اس سے بھی بہتر اور نرم ہوں گے۔''

''اور وہ امیر المومنین علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تواتر کے ساتھ منقول اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اس امت کے بہترین فرد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

شرح: ...... **تواتر** علم یقینی کا فائدہ دینے والی خبر۔ اور یہ ایسی خبر ہوتی ہے جسے ایک ایسی جماعت نقل کرے جس کا کذب پر موافقت کرنا ممکن نہ ہو۔ [1]

دیگر کتب حدیث میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فضیلت دیتے، پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور پھر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو۔ [2]

اسی میں ہی مروی ہے کہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اپنے باپ سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ میں نے کہا: ان کے بعد؟ انہوں نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ۔ میں ڈرا کہ اس کے بعد وہ عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیں گے۔ لہٰذا میں نے خود ہی کہہ ڈالا: پھر آپ؟ انہوں نے فرمایا: میں تو مسلمانوں میں سے ایک عام سا آدمی ہوں۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود اپنے زمانہ خلافت میں فرمائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے بہترین فرد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں، تو اس سے رافضہ کی دلیل باطل قرار پاتی ہے وہ انہیں ان دونوں پر فضیلت دیتے ہیں۔

[وغیرہ] ...... یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ صحابہ اور تابعین میں سے، یہ ائمہ اُمت میں متفق علیہ بات ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحابہ اور تابعین نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم میں اختلاف نہیں کیا۔ جس نے اس اجماع سے خروج کیا اس نے مومنوں کے راستے سے ہٹ کر کسی اور راستے کی اتباع کی۔

اہل سنت کا عقیدہ کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ اور سیّدنا علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ ہیں

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویثلثون بعثمان رضی اللہ عنہ ویربعون بعلی رضی اللہ عنہ کمادلت علیه الأ ثار .))

''وہ عثمان رضی اللہ عنہ کو تیسرے اور علی رضی اللہ عنہ کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں۔''

شرح: ...... [یثلثون] ...... یعنی اہل سنت عثمان رضی اللہ عنہ کو تیسرے نمبر پر رکھتے ہیں۔

[ویربّعون بعلی] ...... اور علی رضی اللہ عنہ چوتھے نمبر پر۔

اس بنا پر اس اُمت کے افضل ترین یہ چار لوگ ہیں: ابوبکر، پھر عمر، اس پر امت کا اجماع ہے پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم

پھر مؤلف رحمہ اللہ نے اس ترتیب کے لیے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے۔

پہلی چیز: ''کما دلت علیه الآثار'' ''جس طرح کہ اس پر آثار دلالت کرتے ہیں۔'' جن میں سے کچھ کا ذکر

[1] صحیح بخاری: ٣٦٥٥۔
[2] صحیح بخاری: ٣٦٧١۔



کیا جا چکا ہے۔

دوسری چیز: "وکما اجمع الصحابة علی تقدیم عثمان فی البیعة ."

''اور جس طرح کہ بیعت کرتے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمانؓ کی تقدیم پر اجماع کیا۔''

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مقدم کرنے کے نقلی آثار بھی وارد ہیں، اور اس بارے ایک عقلی دلیل بھی ہے۔ اور وہ ہے اس پر اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی افضلیت کو مستلزم ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ خیر القرون پر افضل کی موجودگی میں مفضول کو والی مقرر کرے۔ جس طرح کہ ایک اثر میں وارد ہے: ''تمہارے حکمران بھی تم جیسے ہی ہوں گے'' خیر القرون کا حاکم بھی اسے ہی بنایا جا سکتا تھا جو ان سب سے بہتر ہو۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((مع ان بعض اهل السنة کانوا قد اختلفوا فی عثمان وعلی بعد اتفاقهم علی تقدیم ابی بکر و عمر: ایهما افضل؟ فقدم قوم عثمان و سکتوا ، أو ربعوا بعلی .))

''یہ اس امر کے باوجود ہے کہ اہل سنت نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم پر اتفاق کرنے کے بعد عثمان وعلی رضی اللہ عنہما میں اختلاف کیا ہے کہ ان میں سے افضل کون ہے؟ کچھ لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم رکھنے کے بعد خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا پھر علی رضی اللہ عنہ کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں۔''

شرح: ......لہٰذا وہ کہتے ہیں: ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم، پھر خاموش ہو جاتے ہیں یا پھر علی رضی اللہ عنہ کا نام لیتے ہیں۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقدم قوم علیاً و قوم تو قفوا .))

''کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مقدم کرتے جبکہ کچھ توقف اختیار کرتے ہیں۔''

شرح: ......یعنی وہ کہتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ، پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر علی رضی اللہ عنہ اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ۔ یہ اہل سنت کی آراء میں سے ایک رائے ہے جبکہ کچھ توقف اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ پھر عمر رضی اللہ عنہ پھر اس بارے میں توقف اختیار کرتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ میں سے افضل کون ہے؟ یہ رائے پہلی رائے سے مختلف ہے۔

اس طرح اس بارے میں چار آراء ہیں:

پہلی اور مشہور رائے: ......ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

دوسری رائے: ......ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم اور پھر سکوت۔



تیسری رائے:......ابو بکر، پھر عمر، پھر علی اور پھر عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین۔

چوتھی رائے:......ابو بکر، پھر عمر رضی اللہ عنہما، پھر اس بات میں توقف کہ عثمان رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا علی رضی اللہ عنہ، اس رائے کے حاملین کا کہنا ہے کہ ہم نہ تو یہ کہتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور نہ یہ کہ علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ مگر ہم ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کسی اور کو ان دونوں پر مقدم تسلیم نہیں کرتے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لكن استقر أمر أهل السنة على تقديم عثمان على عليٍّ .))

''مگر اہل سنت عثمان رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ پر مقدم قرار دیتے ہیں۔''

شرح:......اس طرح اہل سنت و جماعت کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے سب سے افضل فرد ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم اجمعین یعنی خلافت میں ان کی ترتیب کے مطابق اور یہی بات درست ہے۔ اس کی دلیل گزر چکی ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وان كانت هذه المسئلة مسئلة عثمان وعلى ليست من الاصول التى يضلّل المخالف فيها عند جمهور اهل السنة .))

''اگر چہ یہ مسئلہ۔ عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ کا مسئلہ۔ ان اصولوں میں سے نہیں ہے جن کے مخالفین کو جمہور اہل سنت کے نزدیک گمراہ کہا جا سکتا ہے۔''

شرح:......یعنی عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ کے درمیان مفاضلت کا شمار اہل سنت کے ان اصولوں میں نہیں ہوتا جن کے سبب مخالفین پر گمراہی کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل بتاتا ہے تو ہم اسے گمراہ نہیں کہتے، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی اہل سنت کی ایک رائے ہے۔ ہمارے پاس اس سے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لكن التى يضلّل فيها مسألة الخلافة .))

''مگر جس مسئلہ کے بارے میں کسی کو گمراہ کہا جا سکتا ہے وہ مسئلہ خلاف ہے۔''

شرح:......لہٰذا ہمارے لیے یہ کہنا واجب ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت میں پہلے خلیفہ ابو بکر ہیں پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ان تینوں کے علاوہ خلیفہ المسلمین صرف علی رضی اللہ عنہ ہیں، تو یہ شخص



یقیناً گمراہ ہے، اسی طرح وہ شخص بھی گمراہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ابوبکرؓ وعمرؓ کے بعد خلافت علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔ اس لیے کہ وہ اجماع صحابہ کا مخالف ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وذلك انهم يومنون أن الخليفة بعد رسول الله ﷺ ابو بكر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم على رضي الله عنهم.))

''اہل سنت کا اس بات پر ایمان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم اجمعین مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔''

شرح: ......مسئلہ خلافت کے بارے میں اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے۔

خلافت میں اختلاف کرنے والا گدھے سے بڑھ کر گمراہ ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ومن طعن فى خلافة احد من هولاء، فهو أضل من حمار اهله.))

''ان میں سے کسی ایک کی خلافت میں طعنہ زنی کرنے والا اپنے گھر والوں کے گدھے سے بھی بڑھ کر گمراہ ہے۔''

شرح: ......ان خلفائے اربعہ میں سے کسی ایک کی خلافت میں طعنہ زنی کرتے ہوتے ہیں اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ خلافت کا مستحق نہیں تھا یا وہ اپنے سے پہلے خلیفہ سے زیادہ اس کا استحقاق رکھتا تھا تو ایسا شخص اپنے گھر والوں کے گدھے سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے یہ تعبیر اس لیے اختیار فرمائی کہ یہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی تعبیر ہے۔ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ایسا شخص اپنے گھر کے گدھے سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہے۔ گدھے کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر کند ذہن اور غبی ہوا کرتا ہے، خلفاء راشدین میں سے کسی ایک کی خلافت میں طعنہ زنی کرنا یا اس کی ترتیب میں طعنہ کرنا تمام صحابہ کرام پر طعنہ زنی کرنے کے مترادف ہے۔

ہم پر یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم، اور یہ کہ وہ اسی ترتیب کے مطابق خلافت کے حقدار تھے۔ اور ہمیں یہ کہنے کا قطعاً کوئی حق نہیں کہ خلافت میں ظلم روا رکھا گیا، جس طرح کہ شیعہ کا دعویٰ ہے، جن کے نزدیک پہلے تینوں خلفاء معاذ اللہ ظالم اور غاصب تھے، انہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے خلافت غصب کرتے ہوئے ان پر ظلم ڈھایا۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے خلفاء کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کو لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے



خلیفہ بنایا تھا۔ اور یہ کہ وہ دوسروں سے زیادہ خلافت کا حق دار تھا، اس لیے کہ وہ لوگ خیر القرون کے لوگ نہیں تھے، ان سے ظلم و زیادتی کا صدور بھی ہوا، اسلامی تعلیمات سے انحراف کا بھی، اور فسق و فجور کا بھی، جس کی وجہ سے دوسرے لوگ ان سے زیادہ خلافت کا استحقاق رکھتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (الانعام: ۱۲۹)

''اور کسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ برے اعمال کیا کرتے تھے۔''

یہ بات آپ کے علم میں رہے کہ افضلیت کی گزشتہ ترتیب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان میں سے کسی غیر کو اگر کسی چیز میں اس پر فضیلت حاصل ہے تو اسے ہر چیز میں اس پر فضیلت حاصل ہے، بلکہ مفضول کو کوئی ایسی فضیلت بھی حاصل ہو سکتی ہے جس میں کوئی بھی اس کا شراکت دار نہیں ہو سکتا، خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم یا کسی اور کا کسی ایسی خوبی کے ساتھ ممتاز ہونا جس کے ساتھ وہ کسی دوسرے پر فضیلت رکھتا ہو افضلیت مطلقہ پر دلالت نہیں کرتا: لہٰذا اطلاق اور تقیید میں فرق ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

اہل سنت کی اہل بیت سے محبت

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَيُحِبُّوْنَ اَهْلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَيَتَوَلَّوْنَهُمْ .))

''اہل سنت اہل بیت سے محبت کرتے اور انہیں اپنے اولیاء گردانتے ہیں۔''

شرح: ......یعنی اہل سنت اہل بیت النبی ﷺ سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس محبت کی بنیاد دو چیزیں ہیں۔ ایمان اور ان کی نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرابت داری۔ اہل سنت ان سے کبھی بھی کراہت نہیں کرتے، مگر وہ شیعہ کی طرح یہ بھی نہیں کہتے کہ جو شخص ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے محبت کرتا ہے وہ علی رضی اللہ عنہ سے نفرت کرتا ہے اس بناء پر ہمارے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے نفرت کی بنیاد پر علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان دونوں کو علی رضی اللہ عنہ کا دشمن تسلیم کرنا ممکن ہے۔ اور یہ ہو بھی کس طرح سکتا ہے جبکہ وہ خود منبر پر تشریف فرما ہو کر ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ ہم اہل سنت اہل بیت کی محبت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے ہیں۔ ہم ان سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔

یاد رہے قرآنی نص کی بنیاد پر ازواج مطہرات بھی آپ ﷺ کے اہل بیت میں داخل ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ٥ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَوٰةَ وَآتِينَ الزَّكَوٰةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ٥﴾ (الاحزاب: ۳۳-۲۸)

''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اوراس کی زینت کا ارادہ رکھتی ہوتو آؤ میں تمھیں کچھ سامان دے دوں اور تمھیں رخصت کر دوں، اچھے طریقے سے رخصت کرنا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخری گھر کا ارادہ رکھتی ہوتو بے شک اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی بے حیائی (عمل میں) لائے گی اس کے لیے عذاب دوگنا بڑھایا جائے گا اور یہ بات اللہ پر سے آسان ہے۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی اسے ہم اس کا اجر دو بار دیں گے اور ہم نے اس کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم عورتوں میں سے کسی ایک جیسی نہیں ہو، اگر تقویٰ اختیار کرو تو بات کرنے میں نرمی نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کر بیٹھے اور وہ بات کہو جو اچھی ہو۔ اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو اور پہلی جاہلیت کے زینت ظاہر کرنے کی طرح زینت ظاہر نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے گھر والو! اور تمھیں پاک کر دے، خوب پاک کرنا۔''

یقیناً اس جگہ اہل بیت میں ازواج الرسول علیہ الصلاۃ والسلام بھی داخل ہیں۔

اسی طرح اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار بھی داخل ہیں، مثلاً فاطمہ، علی، حسن، حسین، عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم اوران جیسے دوسرے لوگ۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قرابت داری اور ان کے ایمان باللہ کی وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں مگر ان میں سے جو لوگ کافر رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قرابت داری کے باوجود ان سے محبت نہیں کریں گے۔ مثلاً ابولہب آپ علیہ الصلاۃ والسلام کا حقیقی چچا ہے۔ مگر ہمارے لیے کسی بھی حالت میں اس کے ساتھ محبت کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے کفر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں دینے کی وجہ سے اس سے نفرت کرنا واجب ہے۔ اسی طرح ابو طالب سے ان کے کفر کی وجہ سے نفرت کریں گے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وحمایت کی وجہ سے ان سے محبت کریں گے۔

"ویتـــو لـو نهـم" یعنی اہل سنت اہل بیت کو اپنے اَولیاء قرار دیتے ہیں۔ ولی کا اطلاق متعدد معانی پر ہوتا ہے، مثلاً: صدیق، قرابت دار، نصرت وموالات وغیرہا، اس جگہ اس سے مراد نصرت وصداقت اور محبت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ويحفظون فيهم وصية رسول الله ﷺ حيث قال يوم غدير خم: "اذكركم الله في



اهل بيتي .)) ❶

''اور وہ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی وصیت کا خیال رکھتے ہیں کہ آپ نے غدیر خم کے دن فرمایا۔

''میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرواتا ہوں۔''

شرح: ......[وصية رسول الله ﷺ]......یعنی آپ ﷺ کی وہ وصیت و تلقین جو آپ ﷺ نے اپنی امت کو فرمائی۔

[**يوم غدير خم**] ...... اس دن ذی الحجہ کی اٹھارہ تاریخ تھی۔ غدیر خم، خم نامی آدمی کی طرف منسوب ہے۔ جو کہ جحفہ کے قریب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپس مدینہ منورہ تشریف لاتے ہوئے اس جگہ پڑاؤ کیا اور لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد کراتا ہوں'' آپ نے یہ بات تین دفعہ دہرائی، یعنی اگر تم نے ان کے حقوق کو پامال کیا تو اس کے انتقام کو مت بھولنا اور اگر ان کے حقوق کی پاسداری کی تو پھر اس کی رحمت اور ثواب کو یاد رکھنا۔

بنی ہاشم سے رسول اللہ ﷺ کا انتخاب

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقال ايضاً للعباس عمه وقداشتكى اليه أن بعض قريش يجفو بني هاشم، فقال:

"والذي نفسي بيده، لا يؤمنون حتى يحبوكم لله ولقرابتي.)) ❷

''جب آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے یہ شکایت کی کہ بعض قریش بنو ہاشم کو ناپسند کرتے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم! جس کی ہاتھ میں میری جان ہے، وہ مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ اللہ تعالیٰ اور میری قرابت داری کی وجہ سے تم سے محبت نہیں کرتے۔''

شرح: ......[ايضًا] ...... یہ أض یئیض بمعنی واپس لوٹنا سے فعل محذوف کا مصدر ہے۔ اور اس کا مطلب ہے: گزشتہ پر اعادہ کرتے ہوئے۔

[**يجفو**] ...... بڑا بنتا اور ناپسند کرتا ہے۔

[**هاشم**] ...... رسول کریم ﷺ کے والد گرامی کے دادا۔

نبی کریم ﷺ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ ان لوگوں کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک یہ کہ وہ اللہ کے لیے تم سے محبت نہ

---

❶ اسے مسلم: ۲٤۰۸ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

❷ اسے احمد نے مسند: ۱/۲۰۷ اور فضائل الصحابۃ: ۱۷۵۷ میں عباس عن یزید بن ابی زیاد سے روایت کیا، اور وہ ضعیف ہے، اسے احمد نے فضائل الصحابۃ میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، اسے طراد زینبی نے اپنی امالی: ۸۸ ب میں متصلاً روایت کیا، جس طرح کہ فضائل الصحابۃ کے محقق وصی اللہ عباس نے نقل کیا۔ ۱۷۵٦۔

کریں، اس محبت میں دوسرے مومن بھی ان کے شراکت دار ہیں، اس لیے کہ ہر انسان پر اللہ تعالیٰ کے لیے ہر مومن کے ساتھ محبت کرنا واجب ہے۔

[ولقرابتی.] ...... یہ محبت اللہ تعالیٰ کے لیے محبت سے زائد ہے جس کے ساتھ اہل بیت، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے قرابت دار خاص ہیں۔

[أن بعض قریش یجفو بنی هاشم] ...... حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس بات کی دلیل ہے کہ اہل بیت کے ساتھ جفا پر مبنی رویہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی موجود تھا، اور یہ اس لیے کہ حسد انسانی طبائع میں داخل ہے مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، قریشی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے حسد کرتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار تھے۔ وہ ان کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا اظہار کرتے اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے احتراز کرتے تھے۔

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقال ان اللّٰه اصطفی بنی اسماعیل، وا صطفی من بنی اسماعیل کنانة، واصطفی من کنانةقریشاً، واصطفی من قریش بنی هاشم، واصطفانی من بنی هاشم.)) [1]

''اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو منتخب فرمایا، بنی اسماعیل سے کنانہ کو، کنانہ سے قریش کو، قریش سے بنی ہاشم کو۔ اور بنی ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔''

شرح: ...... آپ علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ بنی ہاشم عنداللہ منتخب شدہ اور اس کی مخلوق سے اس کے پسندیدہ لوگ ہیں۔

اہل بیت کی نسبت سے اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ان سے محبت کرتے۔ ان کی نصرت کرتے اور ان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کا احترام کرتے ہیں: وہ انہیں ان کے مقام و مرتبہ سے اوپر نہیں اٹھاتے، جو لوگ ان کے بارے میں غلو سے کام لیتے حتیٰ کہ انہیں مقام الوہیت پر لا کھڑا کرتے ہیں اہل سنت ان سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں: جس طرح کہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ عبداللہ بن سبأ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: اَنْتَ اللّٰه! اللہ تو آپ ہیں۔

[اسماعیل] ...... خلیل الرحمٰن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے۔ یہ وہی اسماعیل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ واقعہ سورۃ الصافات میں مذکور ہے۔

[کنانة] ...... کنانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چوتھے باپ ہیں۔

[قریش] ...... قریش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گیارہویں باپ ہیں، جن کا نام فہر بن مالک ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے قریش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہویں باپ ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو پھر ان کا نام نضر بن کنانہ ہے۔

[1] اسے مسلم: ۲۲۷٦، اور ترمذی: ۳٦۱۲، ۳٦۰۹ نے واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔



[هاشم] ..... ہاشم رسول اللہ ﷺ کے تیسرے باپ ہیں۔

موالات اُمہات المؤمنین

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویتولون أزواج رسول الله ﷺ امهات المومنين .))

''اہل سنت رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات امہات المومنین سے بھی محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔''

شرح: ......[امهات المومنين.] ..... مؤلف کا یہ قول ''ازواج'' کی صفت ہے، نبی کریم ﷺ کی بیویاں اکرام واحترام اور صلہ وسلوک میں ہماری مائیں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ (الاحزاب: ٦)

''نبی ﷺ مومنوں پر ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں اور ان کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔''

اہل سنت ان سے محبت وعقیدت رکھتے، اور ان کا دفاع کرتے ہیں۔ اور اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ روئے زمین کی تمام بیویوں سے افضل ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی بیویاں ہیں۔

سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے فضائل

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویـومنون بانهن أزواجه في الآخرة خصوصاً خديجة رضي الله عنها أم اكثر أولاده و أوّل من أمن به و عاضده على أمره وكان لها منه المنزلة العالية .))

''اور ان کا ایمان ہے کہ وہ آخرت میں بھی آپ ﷺ کی بیویاں ہوں گی، خاص طور پر خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی زیادہ تر اولاد کی ماں ہیں، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائیں اور آپ کے معاملے میں آپ ﷺ کو تقویت دی۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ کے نزدیک بڑا بلند مقام ومرتبہ حاصل تھا۔

شرح: ......[خصوصاً خديجة رضي الله عنها] ..... یہ مصدر ہے اور اس کا عامل محذوف ہے۔ یعنی: أخص خصوصاً۔

خديجة بنت خويلد رضی اللہ عنہا: نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے ان سے شادی کی۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔ آپ بڑی دانا اور عقل مند خاتون تھیں۔ آپ ﷺ نے ان سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا، اور ان کی موجودگی میں کسی دوسری خاتون سے شادی نہیں فرمائی۔ اور جس طرح کہ مؤلف نے فرمایا وہ ''أم أكثر اولاده'' آپ علیہ السلام کی زیادہ تر اولاد کی ماں تھیں، وہ بچے ہوں یا بچیاں۔

مؤلف رحمہ اللہ نے ''آپ ﷺ کی اولاد کی ماں'' نہیں کہا! اس لیے کہ آپ ﷺ کے فرزند ارجمند ابراہیم ان کے بطن اطہر سے متولد نہیں ہوئے تھے، ان کی ماں ماریہ قبطیہ تھیں۔



سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں: آپ کے دو بیٹے قاسم اور عبداللہ تھے، عبداللہ کو طیب اور طاہر بھی کہا جاتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کے نام اس طرح سے ہیں: زینب، ام کلثوم، فاطمہ اور رقیہ، رضی اللہ عنہم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے بیٹے قاسم جبکہ سب سے بڑی بیٹی زینب ہیں۔

[وأوّل من أمن به وعاضده علی أمرہ] ..... بلاشک سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائیں، پہلی وحی کے نزول کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور انہیں غار حراء میں پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کیا، تو وہ کہنے لگیں: ''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا'' وہ آپ پر ایمان لائیں، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، اور انہیں واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کیا، جس پر ورقہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا: یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا کرتا تھا۔[1]

ناموس: راز دان۔

اس طرح ورقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عورتوں میں سب سے پہلے خدیجہ رضی اللہ عنہا اور مردوں میں ورقہ بن نوفل ایمان لائے۔

[وعاضدہ علی أمرہ] ..... یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصرہ مور مدد کی۔ سیرت نبوی کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ام المومنین خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر مدد کی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی دوسری بیوی کا مقدر نہ بن سکی۔

[وکان لها منه المنزلة العالية.] ..... یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ان کی موت کے بعد بھی یاد کیا کرتے، اور ان کی سہیلیوں کے پاس کوئی نہ کوئی چیز بھجوایا کرتے اور پھر فرماتے: ''خدیجہ ایسی تھیں، ایسی تھیں، اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی۔''[2]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زوجہ محترمہ سیدہ خدیجہ کی تعریف فرماتے اور انہیں اچھے لفظوں سے یاد فرماتے جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کے عظیم مقام ومرتبہ کی دلیل ہے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فضائل

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والصديقة بنت الصديق التي قال فيها النبي ﷺ: فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام.))

''اور صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کو وہی فضیلت حاصل ہے جو ثرید کو دیگر کھانوں پر۔''

[1] اسے بخاری: ۳، اور مسلم: ۱۰۶ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔

[2] اسے بخاری: ۳۸۱۸ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔

شرح: ......سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے صدیقہ ہونے کی وجہ ان کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درجہ کمال کی تصدیق، ان کے ساتھ صدق و وفا اور واقعہ افک کے دوران منافقین کی طرف سے ایذاء رسانیوں پر صبر جمیل ہے، ان کے صدق شعار ہونے اور اللہ تعالیٰ پر ان کے ایمان کی سچائی پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ جب ان کی برأت کے اعلان پر مشتمل قرآنی آیات کا نزول ہوا تو وہ کہنے لگیں: میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی تعریف نہیں کروں گی۔ یہ چیز ان کے ایمان وصدق کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔

رہا ان کا بنت صدیق ہونا، تو یہ بھی ایسی ہی حقیقت ہے۔ اس لیے کہ ان کے باپ اس امت کے ہی نہیں بلکہ تمام امتوں کے صدیق ہیں، یہ امت تمام امتوں سے افضل ہے، اور اس امت کے صدیق دیگر تمام امتوں کے صدیق ہیں "علی النساء" اس کا ظاہر عموم ہے۔ یعنی تمام عورتوں پر۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اس وقت موجود ازواج مطہرات ہیں۔ لہٰذا اس حکم میں خدیجہ داخل نہیں ہے۔

لیکن حدیث کا ظاہر عموم ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مردوں میں سے تو بہت سارے لوگ کامل ہوئے مگر عورتوں میں سے بجز فرعون کی بیوی آسیہ، مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد کے کوئی بھی کامل نہیں ہوئی، اور عورتوں پر عائشہ کو وہی فضیلت حاصل ہے جو ثرید کو دیگر تمام کھانوں پر۔'' اس حدیث کو شیخین [1] نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ذکر کے بغیر روایت کیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مطلقاً تمام عورتوں سے افضل ہیں۔

مگر یہ بات یاد رہے کہ وہ نسب کے اعتبار سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل نہیں ہیں۔ وہ نسب کے اعتبار سے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اشرف و افضل ہیں۔

علاوہ ازیں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس قدر عظیم فضائل ومناقب سے متصف ہیں کہ کوئی بھی دوسری عورت انہیں حاصل کرنے سے قاصر ہے مولف کے کلام سے بظاہر یوں لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں بیویاں ایک ہی مقام و مرتبہ پر فائز ہیں۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور خدیجہ رضی اللہ عنہا میں سے افضل کون؟

علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک خدیجہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں، اس لیے کہ انہیں کچھ ایسی خوبیوں سے نوازا گیا تھا جو عائشہ رضی اللہ عنہا میں موجود نہیں تھیں۔

جبکہ بعض دوسرے علماء عائشہ رضی اللہ عنہا کو افضل قرار دیتے ہیں، جس کی ایک دلیل تو یہ حدیث ہے، نیز اس لیے بھی کہ ان کی بعض خصوصیات میں خدیجہ رضی اللہ عنہا ان کی شراکت دار نہیں ہیں۔

علماء کی ایک تیسری جماعت تفصیل بیان کرتے ہوئی کہتی ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں ایسی خوبیاں ودیعت کی گئی تھیں کہ ان میں دوسری اس کا جواب نہیں رکھتی، آغاز رسالت میں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو عظیم کردار ادا کیا عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے

---

[1] اسے بخاری: ۳۷۶۹ اور مسلم: ۲۴۳۱ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ خدیجہ کی زیادتی کو حافظ نے "فتح الباری": ۶/۴۴۷ میں طبرانی اور "الحلیۃ" میں اُبونعیم کی طرف منسوب کیا ہے۔



ایسا کردار ادا کرنا ممکن نہیں تھا، پھر اس کے بعد اور خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد عائشہ رضی اللہ عنہا نے علم اور سنت کی نشر و اشاعت اور اُمت کی راہنمائی کے لیے جو گراں قدر خدمات سرانجام دیں وہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نصیب میں نہ ہو سکیں۔ لہٰذا کسی ایک کو دوسری پر مطلق طور پر فضیلت دینا درست نہیں ہوگا۔ ہاں ہمارا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ اس اعتبار سے افضل ہے اور یہ اس اعتبار سے، اس طرح ہم انصاف کی راہ پر گامزن رہیں گے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کے اعزازات کو فراموش کرنے کی جسارت ناروا کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور آپ ﷺ کی دیگر تمام ازواج مطہرات جنت میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔

اہل سنت کا رافضیوں سے براءت کا اظہار

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویتبرؤن من طریقة الروافض الذین یبغضون الصحابة و یسبونهم .))

''اہل سنت ان ارفضی شیعوں کے طریقہ سے براءت کا اظہار کرتے ہیں جو صحابہ کرام سے نفرت کرتے اور انہیں سب وشتم کرتے ہیں۔''

شرح: ......الروافض: حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے بارے میں غالی قسم کا فرقہ، یہ لوگ بدترین قسم کے بدعتی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی گمراہی سے آگاہ ہونا چاہتا ہو تو وہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرے نیز ان کتابوں کا بھی جو ان کے ردّ میں تحریر کی گئیں۔

انہیں اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت زید بن علی بن حسین بن علی بن ابو طالب کو اس وقت ردّ کر دیا جب لوگوں نے ان سے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: وہ میرے جدامجد کے وزیر تھے۔

ان کے برعکس نواصب ہیں، یہ لوگ اہل بیت سے عداوت رکھتے، انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے اور ان پر سب وشتم کرتے ہیں۔

رافضی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے اور انہیں کراہت کی نظروں سے دیکھتے ہیں بجز ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جن کا تعلق اہل بیت کے ساتھ ہے اور جنہیں انہوں نے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کا ذریعہ بنا رکھا ہے، اور جن کے بارے میں وہ غلو سے کام لیتے ہیں۔ یہ بد باطن لوگ ان نفوس قدسیہ کو سب وشتم کرتے اور ان پر لعن طعن کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہ ظالم تھے اور چند کے علاوہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کی ہرزہ سرائیوں کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی گلوچ کرنا صرف ان پر جرح کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی زد میں خود نبی

کریم ﷺ کی ذات اقدس بھی آتی ہے۔ رب تعالیٰ کی شریعت بھی آتی ہے اور خود ذات باری تعالیٰ بھی۔

اصحاب رسول ﷺ پر قدح و جرح کا معاملہ تو واضح ہی ہے۔

جہاں تک اس سے رسول اللہ ﷺ پر قدح و اعتراض کا تعلق ہے تو وہ اس طرح کہ معاذ اللہ آپ ﷺ کے اصحاب وامناء اور خلفاء اس امت کے بدترین قسم کے لوگ تھے، اس سے رسول علیہ الصلاۃ والسلام کی ذات مبارکہ ایک دوسری حیثیت سے بھی ردّ وقدح کی زد میں آتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس سے ان اُمور میں آپ کی تکذیب لازم آتی ہے جن میں آپ نے ان کے فضائل ومناقب کی خبر دی ہے۔

اس سے اللہ تعالیٰ کی شریعت پر اس لیے اعتراض ہوتا ہے کہ نقل شریعت میں ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان واسطہ صحابہ کرام ہیں، جب ان کی عدالت ساقط ہو جائے گی تو شریعت از خود غیر معتبر ہو کر رہ جائے گی۔

اس سے ذات باری تعالیٰ اس طرح متاثر ہوتی ہے کہ اس نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو مخلوق کے بدترین لوگوں میں مبعوث کیا، انہیں ان کی رفاقت وصحبت کے لیے منتخب کیا، اور انہیں اپنی شریعت کے حامل اور امت رسول تک اس کے ناقلین بنایا۔

اس سے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب وشتم کرنے پر کتنی بڑی بڑی آفتیں ٹوٹتی ہیں۔ اور اس کا سلسلہ کہاں کہاں تک پہنچتا ہے۔

لہٰذا ہم رافضیوں کے بغض صحابہ رضی اللہ عنہم پر مبنی رویے سے براءت کا اظہار کرتے ہیں اور یہ پختہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان سے محبت وعقیدت رکھنا ہم سب پر فرض ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ ہمارے دل ان نفوس قدسیہ کے ساتھ محبت سے لبریز ہیں جس کی وجہ ان کا تقوی وایمان علم۔ دین کی نشر واشاعت اور نبی کریم ﷺ کی نصرت ومعاونت ہے۔

اہل سنت کا ناصبیوں سے براءت کا اظہار

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وطريقة النواصب الذين يؤذون أهل البيت بقول أوعمل .))

''اور وہ ناصبیوں کے طریقہ سے بھی براءت کا اظہار کرتے ہیں جو کہ اپنے قول یا عمل سے اہل بیت کو اذیت دیتے ہیں۔''

شرح: ......یعنی اہل السنہ والجماعہ ناصبیوں کے طریقہ سے بھی براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ رافضی اہل بیت کی محبت میں اس قدر غلو سے کام لیتے ہیں کہ انہیں دائرۂ بشریت سے نکال کر عصمت وولایت کے دائرے میں داخل کر دیتے ہیں، جبکہ ناصبی ان کے بالکل برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں، انہوں نے جب رافضیوں کو اہل بیت کی محبت میں غلو اختیار کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ اگر تم ان کی محبت میں یہ کچھ کرتے ہو تو ہم ان سے نفرت کریں گے۔ مگر بدعت کا بدعت کے ساتھ مقابلہ کرنا اسے مزید تقویت دینے کا باعث بنتا ہے۔ میانہ روی بہترین معاملہ ہوا کرتا ہے۔



اہل سنت کا مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں سکوت اختیار کرنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویمسکون عما شجر بین الصحابة .))

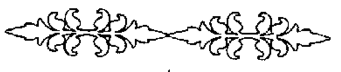
''اور وہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں لب کشائی سے باز رہتے ہیں۔''

شرح: ......حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کئی تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے، اور یہ معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد زیادہ سنگین شکل اختیار کر گیا۔ اور بات بڑھتے بڑھتے قتل وقتال تک جا پہنچی۔ اس حوالے سے بعض واقعات بڑی شہرت کے حامل ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ان کے درمیان جو کچھ بھی ہوا وہ تاویل اور اجتہاد کی بنیاد پر ہوا، ان میں سے ہر گروہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا، ہمارے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے انہیں حق پر سمجھتے ہوئے اور اپنے آپ کو باطل پر سمجھتے ہوئے قتال کیا تھا۔ ان کے اپنے آپ کے حق پر ہونے کے اعتقاد سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی حق تک رسائی بھی تھی۔

لیکن اگر وہ غلطی پر تھے، جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا یہ اقدام اجتہاد پر مبنی تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے: ''جب حاکم کوئی فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرتا ہے اور پھر وہ درست فیصلہ کرتا ہے تو اسے دوہرا اجر ملتا ہے۔''[1] لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے اجتہاد کیا مگر ان سے غلطی ہوئی لہٰذا وہ ایک اجر کے مستحق ہیں۔

مشاجرات صحابہ کرام کے بارے میں ہمارے موقف کی دو جہتیں ہیں: فاعل پر حکم لگانا اور اس کے بارے میں ہمارا موقف۔ جہاں تک فاعل پر حکم لگانے کا تعلق ہے تو وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان کے باہمی تنازعات اجتہاد کی بنیاد پر صادر ہوئے، اور اگر اجتہاد میں کوئی غلطی ہو جائے تو مجتہد معذور ہوا کرتا ہے، اور اس کی یہ غلطی معاف کر دی جاتی ہے۔ رہا فاعل کے بارے میں ہمارا موقف، تو ہمارے لیے ان کے مشاجرات کے بارے میں لب کشائی سے گریز کرنا ضروری ہے، ہمیں ان کے باہمی تنازعات کو ان پر سب وشتم کرنے اور آپس میں نفرت پیدا کرنے کا جواز نہیں بنانا چاہیے، اگر ہم ایسا کریں گے تو گناہ گار ہوں گے، یا کم از کم گناہ سے تو محفوظ رہیں گے۔ مگر اس سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

لہٰذا ہماری ذمہ داری یہی قرار پاتی ہے کہ ہم ان امور کے بارے میں خاموش رہیں۔ اور اس حوالے سے صرف ضرورت کے تحت ہی تاریخ کا مطالعہ کریں۔



صحابہ کے مساوی کے متعلق وارد آثار کا جھوٹا ہونا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویقولون ان هذه الأثار المروية فی مساویهم منها ما هو كذب ومنها ما قد زيد و

---

[1] اسے بخاری: ۷۳۵۲، اور مسلم: ۱۷۱٦ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



نقص وغير عن وجهه الصحيح .))

''وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مساوی کے بارے میں مروی آثار میں سے بعض تو سراسر جھوٹ ہیں، بعض میں کمی بیشی کر دی گئی جبکہ کئی ایک کو ان کے صحیح رخ سے ہٹا دیا گیا۔''

شرح: ......مؤلف رحمہ اللہ نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی آثار کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱: ایسے آثار جو کذب محض ہیں اور ان کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں ہے۔اس قسم کے آثار اہل بیت کے بارے میں ناصبیوں کی روایات میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

۲: ان میں سے کچھ آثار کی کوئی نہ کوئی اصل ہوتی ہے، مگر ان میں کمی بیشی کر دی گئی یا انہیں ان کے صحیح رخ سے ہٹا دیا گیا۔ ان دونوں قسم کے آثار کو رد کر دینا واجب ہے۔

۳: تیسری قسم صحیح آثار پر مشتمل ہے۔اس کے بارے میں ہمارا کیا موقف ہے؟

☐ اس کی مؤلف یوں وضاحت فرماتے ہیں:

((والصحيح منه هم فيه معذورون: إما مجتهدون مصيبون، واما مجتهدون مخطئون .))

''رہے ان میں سے آثار صحیحہ، تو وہ اس بات میں معذور ہیں۔انہوں نے اجتہاد کیا، اب یا تو وہ صحیح نتیجہ پر پہنچے یا پھر ان سے غلطی ہوگئی۔''

شرح: ......مجتہد شخص اگر صحیح نتیجے پر پہنچے تو اسے دوہرے اجر سے نوازا جاتا ہے اور اگر اس سے غلطی ہو جائے تو وہ ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے۔اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا ارشاد ہے۔[1]

امیر معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان جو کچھ ہوا وہ اجتہاد اور تاویل کی بنیاد پر ہوا، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس میں علی رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے اقرب الی الصواب تھے، بلکہ ہم ان کے صائب ہونے کا قطعی فیصلہ بھی دے سکتے ہیں، مگر یہ بات یاد رہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقرب الی الصواب ہونے کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ارشاد ہے: ''ہائے افسوس! عمار کو باغی گروہ قتل کر ڈالے گا''[2] اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جماعت خلیفہ وقت کے خلاف خروج کرنے والی باغی جماعت تھی، مگر وہ لوگ تاویل کرنے والے تھے، حق علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، قطعی طور پر یا پھر ظنی طور پر۔

علاوہ ازیں ایک چوتھی قسم بھی ہے، اور وہ یہ کہ ان سے کچھ ایسی چیزوں کا بھی صدور ہوا، جن کی بنیاد نہ تو اجتہاد تھا اور نہ ہی تاویل۔

---

[1] صحیحین میں مروی اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے۔ [2] اسے بخاری: ٤٤٧، اور مسلم: ٢٩١٥ نے ابوسعید رضی اللہ عنہ خدری سے روایت کیا۔



❑ اس کی مؤلف رحمہ اللہ یوں وضاحت فرماتے ہیں:

((وهم مع ذلك لا يعتقدون ان كل واحد من الصحابة معصوم عن كبائر الا ثم وصغائره .))

''اس کے باوجود اہل سنت کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ صحابہ کرام میں سے ہر ایک کبیرہ اور صغیرہ گناہوں سے معصوم تھا۔''

اور یہ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آدم کا ہر بیٹا گناہ گار ہے اور بہترین گناہ گار توبہ کرنے والا ہے۔'' ❶

لیکن ان کا کسی کبیرہ یا صغیرہ گناہ پر اجماع کرتے ہوئے اسے جائز قرار دینا یا اس کا ارتکاب کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ان میں سے کوئی ایک کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرسکتا ہے، جس طرح کہ مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش سے واقعہ إفک کے بارے میں ہوا۔ ❷ لیکن چونکہ ان پر شرعی حد کا نفاذ کر دیا گیا تھا لہٰذا وہ اس گناہ سے پاک ہو گئے تھے۔

اہل سنت کا صحابہ رضی اللہ عنہم کی مغفرت کو واجب سمجھنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((بل يجوز عليهم الذنوب فى الجملة ، وانهم من السوابق والفضائل مايوجب مغفرةً ما يصدر منهم ان صدر .))

''فی الجملہ صحابہ کرام سے گناہوں کا صدور ممکن ہے، مگر وہ سبقت الی الاسلام اور کچھ ایسے دیگر فضائل کے حامل ہیں کہ اگر ان سے کسی گناہ کا صدور ہو بھی جائے تو وہ ان کی مغفرت کو واجب قرار دے دیتے ہیں۔''

شرح: ......یعنی گناہوں کے ارتکاب کے حوالے سے وہ دیگر لوگوں جیسے ہیں۔ مگر انہیں کچھ امور کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے جن کی بناء پر اللہ تعالیٰ ان کے کبیرہ یا صغیرہ گناہوں کی مغفرت فرما دیتا ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت ومعاونت کی اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کیا۔ اور اعلاء کلمة اللّٰه کے لیے اپنی گردنیں کٹوادیں، اور یہ ایسی امتیازی خوبیاں ہیں جو ان سے صادر ہونے والے گناہوں کی مغفرت کو واجب قرار دیتی ہیں، وہ گناہ جتنا بھی بڑا ہو۔ بشرطیکہ وہ کفر تک نہ پہنچے۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ اسی قبیل سے ہے۔ جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قریش مکہ کی طرف روانگی سے مطلع کرنے کے لیے ان کی طرف پیغام بھیجا، جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو مطلع فرما دیا۔ اور وہ پیغام

❶ اسے امام احمد نے مسند: ۳/۱۹۷، ترمذی: ۲٤۹۹، دارمی: ۲٦۲۷، ابن ماجہ: ٤۲۵۱، اور حاکم: ٤/۲٤٤ نے روایت کیا۔ اور البانی رحمہ اللہ نے ''مشکوٰۃ'': ۲۳٤۱ میں اسے حسن کیا۔

❷ ملاحظہ ہو: بخاری (٤۷۵۷)، مسلم (۲۷۷۰) عن عائشة رضي الله عنها.



ان تک نہ پہنچ سکا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی گردن اڑانے کے لیے آپ ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جنگ بدر میں شریک ہوا تھا، اور تجھے نہیں معلوم کہ شاید اللہ تعالیٰ نے بدر والوں کی طرف دیکھا، اور فرمایا: اب تم جیسے چاہو اعمال کرو، میں تمہاری مغفرت فرما چکا۔'' ❶

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((حتی إنہ یغفر لھم من السیآت مالا یغفر لمن بعد ھم، لان لھم من الحسنات التی تمحوا السیأت مالیس لمن بعد ھم، وقد ثبت بقول رسول اللہ ﷺ: انھم خیر القرون، وان المدّ من احدھم اذاتصدق بہ، کان أفضل من جبل أحد ذھباً من بعد ھم.))

''یہاں تک کہ ان کے وہ گناہ بھی معاف کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے بعد آنے والوں کے معاف نہیں کیے جاتے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے کہ وہ بہترین زمانہ کے لوگ ہیں، اور یہ کہ ان میں سے کسی ایک کا مد یا نصف مد بھر صدقہ بعد میں آنے والوں کے اُحد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرنے سے افضل ہے۔''

شرح: ......اس کا ذکر نبی ﷺ کے اس ارشاد میں ہے: ''سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں۔'' ❷ نیز آپ ﷺ کے اس ارشاد میں: ''میرے صحابہ کو سب و شتم نہیں کرو، مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تمہارا کوئی ایک جبل احد کے برابر سونا خرچ کرے تو وہ ان کے کسی ایک کے مدّ کو پہنچ سکتا ہے اور نہ نصف مدّ کو۔'' ❸

اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف کر دیا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثم اذا کان قد صدر من أحد ھم ذنب، فیکون قد تاب منہ.))

''پھر جب ان میں سے کسی ایک سے کوئی گناہ صادر ہوا، تو ہوسکتا ہے کہ اس نے اس سے توبہ کر لی ہو۔''

شرح: ......یعنی جب اس نے اس سے توبہ کر لی، تو اس کی یہ لغزش معاف ہوگئی اور اس کا وبال ختم ہوگیا۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ○ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○﴾

(الفرقان: ۷۰۔۶۸)

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ ❷ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ ❸ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔



''اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے اسے قتل نہیں کرتے بجز حق کے، اور نہ زنا کرتے ہیں، اور جو شخص یہ کچھ کرے گا اسے سزا سے سابقہ پڑے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا، اور اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر پڑا رہے گا۔ مگر جو شخص توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کی بدیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا، اور اللہ بڑا مغفرت والا، بڑا رحمت والا ہے۔''

شرح: ......گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ لہٰذا توبہ کرنے والے کا گناہ اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((أو اتى بحسنات تمحوه .))

''یا اس نے ایسی نیکیاں کیں جنہوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔''

شرح: ......اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (هود: ١١٤) ''یقیناً نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔''

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((أو غفر له بفضل سابقته .)) ''یا اسے اس کی کسی سابقہ فضیلت کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔''

شرح: ......جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قدسی حدیث میں اہل بدر کے بارے میں فرمایا: ''آئندہ کے لیے جو چاہو عمل کرو میں نے تمہاری مغفرت فرما دی ہے۔''

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((أو بشفاعة محمد ﷺ الذى هم أحق الناس بشفاعته .))

''یا انہیں محمد کریم ﷺ کی شفاعت نصیب ہو جائے جن کی شفاعت کے وہ سب لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں۔''

شرح: ......قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کی شفاعت کریں گے جس کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں۔



❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((أو ابتلی ببلاء فی الدنیا کفر به عنه .))

''یا دنیا میں اس کی کوئی ایسی آزمائش کی گئی جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن گئی۔''

شرح: ......اور یہ اس لیے کہ دنیا میں کسی آزمائش کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ برائیوں کا خاتمہ فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس بھی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، وہ بیماری ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی برائیوں کو اس طرح ختم کرتا ہے جس طرح درخت اپنے پتے گرایا کرتا ہے۔''[1] اس بارے میں احادیث بڑی مشہور اور کثرت کے ساتھ وارد ہیں۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فاذا کان هذا فی الذنوب المحققة، فکیف الامور التی کانوا فیها۔ مجتهدون: ان أصابوا فلهم أجران وإن أخطؤوا فلهم أجر و احدٌ والخطأ مغفور .))

''جب ثابت شدہ گناہوں کے بارے میں یہ صورت حال ہے تو پھر ان امور کے بارے میں کیا کہا جائے گا، جن میں اگر وہ صحیح فیصلہ کریں تو دوہرے اجر کے مستحق ٹھہریں اور اگر غلطی کے مرتکب ہوں تو بھی ایک اجر پائیں، اور غلطی معاف کر دی جائے۔''

شرح: ......مگر اس قسم کے حقدار انتہائی کم ہے۔ اور جس کی ان کے فضائل ومحاسن کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض لوگوں سے سرقہ، شراب نوشی اور زنا جیسے اُمور کا ارتکاب ہوا، مگر یہ تمام اشیاء ان کے فضائل ومحاسن کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر بعض امور میں تو حدود کا قیام بھی عمل لایا گیا ہے، جس سے گناہ یقینی طور پر ساقط ہو جاتا ہے۔

صحابہ کے فضائل ومحاسن

❑ پھر مؤلف رحمہ اللہ ان کے فضائل ومحاسن میں سے بعض امور کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((من الایمان باللّٰه ورسوله والجهاد فی سبیله والهجرة والنصرة والعلم النافع و العمل الصالح .))

''مثلاً ان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، فی سبیل اللہ جہاد اور ہجرت کرنا۔ دین اسلام کی نصرت و معاونت کرنا، علم نافع اور عمل صالح۔''

[1] اسے بخاری: ۵٦٦۰، اور مسلم: ۲۵۷۱ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



شرح: ......حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ تمام فضائل ومناقب بڑی شہرت کے حامل اور ہر ایک کے علم میں ہیں جنہوں نے ان کی ثابت شدہ لغزشوں کو ڈھانپ رکھا ہے اور انہوں نے ان کی غیر ثابت شدہ لغزشوں یا جن کا صدور اجتہاد اور تأویل کی بنیاد پر ہوا، بطریق اولیٰ ڈھانپ دیا ہے۔

انبیاء کے بعد افضل صحابہ ہیں

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ومن نظر فی سیرة القوم بعلم وبصیرة وما منّ الله علیهم به من الفضائل، علم یقینا انهم خیرا لخلق بعد الانبیاء.))

''جو شخص صحابہ کرام کی سیرت کا علم وبصیرت کے ساتھ جائزہ لے گا۔ اور ان کے فضائل ومناقب کو پیش نظر رکھے گا تو اسے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ وہ انبیاء کرام کے بعد بہترین قسم کے لوگ ہیں۔''

شرح: ......اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے علاوہ ہے: ''بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے۔''[1]

اس بنا پر انبیاء سابقین کے پیروکاروں پر ان کی افضلیت نص اور ان کے احوال کا بنظر غائر جائزہ لینے سے ثابت ہوتی ہے۔

اگر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومحاسن اور مناقب کا علم وبصیرت اور انصاف سے جائزہ لیں گے تو آپ کو اس بات کا یقینی علم حاصل ہو جائے گا کہ وہ انبیاء کرام کے بعد مخلوق کے بہترین افراد ہیں، وہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے اصحاب حواریوں سے افضل ہیں، ان کے ان نقباء سے افضل ہیں جنہیں موسیٰ کے اصحاب بننے کا شرف حاصل ہوا، اور وہ ان لوگوں سے بھی بہتر ہیں جو حضرت نوح، حضرت ہود اور دیگر انبیائے کرام پر ایمان لائے، اور ان انبیاء کے پیروکاروں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو نبی رحمت علیہ الصلاۃ والسلام کے پیروکاروں سے افضل ہو۔ یہ بات بالکل واضح اور سبھی کے علم میں ہے۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

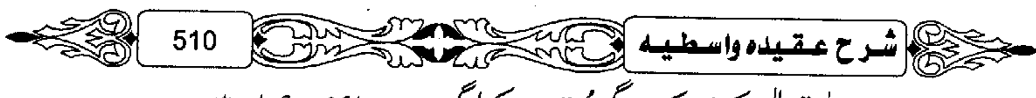
''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا۔''

ہم میں سے بہترین لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق سے افضل ہیں لہٰذا آپ کے اُصحاب دیگر تمام انبیاء کے اصحاب سے افضل ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ جبکہ رافضیوں کے نزدیک وہ بدترین قسم کے لوگ ہیں۔ والعیاذ باللہ بجز چندان افراد کے جنہیں وہ ان سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔

---

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔



اللہ تعالیٰ کے نزدیک دیگر اُمتوں کے لوگوں سے باعزت صحابہ ہیں

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وأنهم هم الصفوة من قرون هذه الأمة التي هي خير الامم واكرمها على الله عزوجلّ .))

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس اُمت کے بہترین لوگ ہیں، وہ امت جو کہ دیگر تمام امتوں سے بہترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت اُمت ہے۔''

شرح: ......اس امت کا تمام امتوں سے بہتر ہونا، اس ارشاد باری تعالیٰ کی وجہ سے ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا، تم نیکی کا حکم کرتے اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرة: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو بہتر امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔''

پھر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر الرسل ہیں لہٰذا اس سے آپ کی امت کا خیر الامم ہونا ضروری ٹھہرتا ہے۔ رہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس اُمت کے بہترین لوگ ہونا، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: ''بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں۔''[1] ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: ((خير أمتي قرني))...... ''میری امت کے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں۔''[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، ان کے بعد کے لوگوں سے مراد تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں سے مراد تبع تابعین ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرون ثلاثہ کا اعتبار اہل قرن کے جمہور کے اعتبار سے ہوگا۔ اور وہی اس قرن کے بہترین لوگ ہوں۔ خلفائے اربعہ کی خلافت کے اختتام کے ساتھ ہی جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختتام ہو گیا تھا، یہاں تک کہ اہل بدر میں سے چند لوگ ہی باقی رہ گئے تھے، جمہور تابعین کا اختتام ابن زبیر اور عبدالملک کی امارت میں اصاغر صحابہ کے زمانے کے اواخر میں ہوا، جبکہ جمہور تبع تابعین دولت امویہ کے اواخر اور دولت عباسیہ کے اوائل میں ختم ہو گئے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے آخر میں فوت ہونے والے ابو طفیل عامر بن واثلہ لیثی رضی اللہ عنہ ہیں جن کا سن وفات ۱۰۰ھ یا ۱۱۰ھ ہے ''فتح الباری'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے آخری آدمی ۲۲۰ھ تک زندہ رہا۔[3]

---

[1] گزشتہ حوالہ۔ [2] اسے بخاری: ۳۶۵۰ نے عمران بن حصین سے روایت کیا۔ [3] فتح الباری: ۷۱۶.



فصل:

کرامات اولیاء کے بارے میں

کرامات اولیاء بڑا اہم مسئلہ ہے۔ لہٰذا ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس بارے میں حق کیا ہے اور باطل کیا؟ کیا یہ حقیقت ثابتہ ہیں یا ان کا شمار باب تخیلات میں ہوتا ہے؟

☐ اس بارے میں مؤلف رحمہ اللہ اہل سنت کا موقف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((ومن أصول اهل السنة: ألتصديق بكرامات الأولياء .))

''اہل سنت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ کرامات اولیاء کی تصدیق کرتے ہیں۔''

شرح:......اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اولیاء کون ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح واضح فرمایا ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَo الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَo﴾

(یونس: ٦٣-٦٢)

''خبردار! اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے یعنی وہ جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہر متقی مومن اللہ کا ولی ہوتا ہے۔''[1]

ولایت دعویٰ وتمنا سے نہیں بلکہ ایمان وتقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے بارے میں ولی ہونے کا دعویٰ کرے مگر وہ تقویٰ وطہارت سے عاری ہو تو اس کا یہ دعویٰ ردّ کر دیا جائے گا۔

کرامت کی تعریف

کرامات: کرامة کی جمع ہے، اور یہ خارق عادت چیز سے عبارت ہے جس کا اللہ تعالیٰ ولی کے ہاتھ پر اجرا فرماتا ہے جس سے مقصود اس کی تائید ہوتی ہے، یا اعانت یا تثبیت یا پھر دین کی نصرت واعانت۔

صلہ بن اَشیم نام کے جس آدمی کا گھوڑا اس کے مرنے کے بعد اللہ نے زندہ کر دیا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر پہنچ گیا اور گھر آنے پر اپنے بیٹے سے کہنے لگا: گھوڑے سے زین اتار دیں، جب اس نے زین اتار کر رکھ دی تو وہ گر کر مر گیا۔[2] یہ اس شخص کی اطانت کے لیے اس کی کرامت تھی۔

جس کرامت کا اظہار نصرت اسلام کے لیے ہوتا ہے، اس کی مثال حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والا دریا عبور کرنے کا واقعہ ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ دریائے نیل کو عبور کرتے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی

---

[1] مجموع الفتاوی: ٢٨/٥٧٠، ٢٥/٣١٦، ٢٨/٥٧٠.

[2] صفة الصفوة: ٣/٢١٧ - الزهد، لابن المبارك: ٢٩٥، انہوں نے گھوڑے کے مرنے کا نہیں بلکہ اس کے بھاگ جانے کا ذکر کیا ہے۔



پیش آیا تھا۔ یہ دونوں واقعات تاریخ میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

پس کرامت، خارق عادت واقعہ سے عبارت ہے مگر جس چیز کا اظہار عادت کے مطابق ہوا اسے کرامت نہیں کہا جاتا۔ اللہ تعالیٰ اس چیز کو ولی کے ہاتھ پر جاری کرتا ہے تاکہ جادو اور شعبدہ بازی کے امور سے احتراز کیا جا سکے جو لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے اور ان کی عقول وافکار سے کھیلتے ہیں۔ کرامت قرآن وسنت اور واقع سے ثابت ہے۔ اس کا اظہار پہلے بھی ہوتا رہا اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

قرآن وسنت سے ثابت شدہ کرامات

قرآن وسنت میں گزشتہ لوگوں کی کرامات میں اصحاب کہف کا واقعہ سرفہرست ہے۔ یہ لوگ مشرک لوگوں میں رہتے تھے، مگر جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔ اور انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ ہمیں بے بس کر دیا جائے گا تو وہ اللہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے بستی سے باہر نکل گئے اور چلتے چلتے پہاڑ کی ایک ایسی غار میں پناہ گزیں ہو گئے جس کا منہ شمال کی طرف کھلتا تھا جس کی وجہ سے سورج کی شعاعیں ان پر نہ پڑتیں، جب سورج طلوع ہوتا تو وہ ان کے غار سے دائیں طرف بچ کر نکل جاتا اور جب غروب ہونے کو آتا تو بائیں طرف کترا جاتا، اور وہ اس کے کشادہ حصے میں موجود تھے، یعنی دھوپ نہ ان پر سورج چڑھتے وقت پڑتی اور نہ ڈھلتے وقت۔ یہ اہل توحید اس غار میں تین سو نو سال تک سوئے رہے، اور اللہ تعالیٰ دائیں طرف اور بائیں طرف انہیں کروٹ دلاتا رہا، ایسا موسم گرما میں بھی ہوتا رہا اور موسم سرما میں بھی، نہ تو گرمی نے انہیں پریشان کیا اور نہ سردی نے انہیں کوئی تکلیف دی، انہیں بھوک لگی نہ پیاس۔ اور نہ ہی وہ نیند سے اکتائے۔ وہ غار میں اسی طرح سوئے رہے، یہاں تک کہ جب ان کی بستی شرک سے پاک ہو گئی تو اللہ نے انہیں طویل نیند سے بیدار کر دیا اور اس طرح وہ بستی والوں کی شر سے محفوظ رہے۔ یقیناً یہ ان لوگوں کی کرامت تھی۔ سیدہ مریم کا واقعہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس وقت عزت دی جب وہ دردزہ کی وجہ سے کھجور کے تنے کے پاس پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسے ہلانے کا حکم دیا تاکہ وہ ان پر تروتازہ کھجوریں گرا دے۔

جہاں تک سنت میں کرامات کے ذکر کا تعلق ہے تو اس میں ان کا ذکر بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہے اس کے لیے ملاحظہ فرمائیں: "صحیح بخاری" (کتاب الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل)، اور کتاب "الفرقان بین اولیاء الرحمن واولیاء الشیطن" از شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔

جہاں تک کرامات اولیاء کے ثبوت کے لیے واقعاتی شہادت کا تعلق ہے، تو انسان اپنی زندگی میں اس کا کئی بار مشاہدہ بھی کرتا ہے یا اخبار صادقہ کے ذریعے ان سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔

الغرض! اہل سنت کرامات اولیاء کی واقعیت کی تصدیق کرتے ہیں۔

کرامات میں معتزلہ کا موقف اہل سنت والجماعت کے برعکس ہے

مگر اس حوالے سے معتزلہ اور ان کے پیروکاروں کا مذہب اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے، وہ کرامات کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کرامات کے اثبات سے جادوگر، ولی اور نبی کے مشابہہ ہو جائے گا، اس لیے کہ ان سب سے ہی



خارق عادت چیزوں کا صدور ہوتا ہے۔

نبی اور ولی میں فرق

مگر ان سے یہ کہا جائے گا کہ التباس کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، اس لیے کہ کرامت کا اظہار ولی کے ہاتھ پر ہوتا ہے، اور ولی کے لیے نبوت کا دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے، اور اگر وہ اس کا دعویٰ کرے گا تو ولی نہیں ہوگا، نبوت کی نشانی کا ظہور نبی کے ہاتھوں ہوتا ہے، جبکہ شعبدہ بازی اور جادو کا اظہار اللہ کی ولایت سے دور اس کے دشمن شخص کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اس کا صدور شیطانوں سے استعانت اور اس کے ذاتی فعل سے ہوتا ہے اور جسے وہ اپنی کاوش سے حاصل کرتے ہیں، جبکہ کرامت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے ولی خود اس کا مطالبہ نہیں کیا کرتا۔ علماء فرماتے ہیں: ولی کی ہر کرامت اس کے نبی کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے جس کی وہ اتباع کرتا ہے، اس لیے کہ کرامت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی شہادت ہوتی ہے کہ اس ولی کا راستہ صحیح راستہ ہے۔

اس بنا پر اس اُمت کے اولیاء کے ہاتھوں ظاہر ہونے والی کرامات، رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی نشانیاں ہیں اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں: انبیاء سابقین میں سے جس جس نبی کو جو جو معجزہ عطا ہوا، اس جیسا ہر معجزہ نبی کریم ﷺ کو بھی عطا کیا گیا۔

سابقہ انبیاء کی کرامات جو آپ ﷺ اور آپ کی اُمت میں بھی ہیں

مگر ان لوگوں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرح نہ آگ میں پھینکا گیا اور نہ آپ اس سے صحیح وسلامت باہر تشریف لائے۔

مگر اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگر یہ معاملہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ پیش نہیں آیا تو آپ کے پیروکاروں کے ساتھ ضرور پیش آیا، جیسا کہ مورخین نے ابومسلم خولانی کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ [1] جب اس قسم کے خارق عادت امر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پیروکاروں کی تکریم کی گئی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کا دین حق ہے۔ اس لیے کہ اس کی بھی اسی آیت قدرت سے تائید ہوتی ہے جس کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کی ہوئی تھی۔

ان علماء پر یہ اعتراض بھی وارد کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے لیے سمندر نہیں پھاڑا گیا جبکہ اسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے پھاڑا گیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندر کے حوالے سے جو کچھ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوا اس سے کہیں بڑھ کر اس اُمت کے افراد کو حاصل ہوا۔

جیسا کہ علاء بن حضرمی کے قصہ میں وارد ہوا ہے۔ [2] وہ خود اور ان کے ساتھی سطح آب پر چلتے ہوئے سمندر عبور کر گئے۔

---

[1] صفة الصفوة: ٤/٢٠٨ لابن الجوزی۔ فرماتے ہیں: متنبی أسود عنسی نے ابومسلم خولانی کو آگ میں پھینک دیا مگر اس نے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا، انہیں خلیل علیہ السلام سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

[2] "الحلية": ١/٧ میں ابونعیم سہم بن منجاب سے ان کا یہ قول روایت کرتے ہیں کہ ہم نے علاء بن حضرمی کے ساتھ جنگ کی، جب ہم دارین کے مقام پر پہنچے تو ہمارے اور دشمن کے درمیان سمندر حائل ہوگیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ کہنے لگے: علم وحلم اور علو وعظمت سے متصف ہمارے اللہ! ہم تیرے بندے ہیں، ہم تیری راہ میں تیرے دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں، یا اللہ! ہمیں ان تک رسائی کا راستہ دے دے تاکہ ہم سمندر عبور کر سکیں۔ اس کے بعد ہم سمندر میں داخل ہوگئے۔



یہ چیز موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہونے والی چیز سے زیادہ باعظمت ہے۔ اس لیے کہ وہ خشک زمین پر چل رہے تھے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی پانی کی سطح پر چل کر دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔

ان پر یہ اعتراض بھی وارد کیا گیا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو احیاء موتی کا معجزہ عطا کیا گیا جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا نہیں کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کے ساتھ پیش آیا، جس طرح کہ اس آدمی کے قصہ میں وارد ہے جس کا گدھا راستے میں مر گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے اسے زندہ کرنے کی دعا کی اس نے اس کی دعا کو قبول فرمایا اور گدھا زندہ ہو گیا۔

ان علماء پر مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کرنے کا بھی اعتراض کیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جب حضرت قتادہ بن نعمان جنگ احد کے موقع پر زخمی ہوئے تو ان کی آنکھ لڑھک کر ان کے رخسار پر آ گئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اسے اپنے دست مبارک سے پکڑ کر اس کی جگہ میں رکھ دیا اور وہ پہلے کی طرح خوبصورت نظر آنے لگی۔ [1]

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: "البداية والنهاية" لابن کثیر۔

تنبیہ:...... جیسا کہ ہم نے بتایا کہ کرامات کسی شخص کی تائید و تثبیت یا اعانت کے لیے ہوتی ہیں یا حق کی نصرت و معاونت کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ کرامات کا اظہار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ تابعین کے ہاتھوں پر ہوا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ صحابہ کرام اپنے اندر پائی جانے والی تثبیت و تائید اور نصرت حق کی وجہ سے کرامات سے بے نیاز تھے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس ان میں تشریف فرما تھے، اور چونکہ تابعینؒ اس سے کم درجے کے حامل تھے۔ لہٰذا ان کے زمانے میں کرامات کا کثرت سے ظہور ہوا جس سے مقصود ان کی تائید و تثبیت اور اس حق کی نصرت و ممادنت تھی جس پر وہ کار فرما تھے۔

کرامات پر چار دلائل

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وما يجرى الله على أيديهم من خوارق العادات .))

"اور اہل سنت ان خوارق عادات امور کی بھی تصدیق کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اولیاء کے ہاتھوں پر جاری فرماتا ہے۔"

شرح:...... [خوارق]...... خارق کی جمع ہے۔

[**العادات**]...... عادۃ کی جمع ہے۔ اور [**خوارق العادات**] سے مراد وہ امور ہیں جو عادت کونیہ کے خلاف ظاہر

[1] اس کی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الاصابة" میں تخریج کی ہے (۳/۲۱۷) اور اسے بغوی، أبو یعلی، دار قطنی اور "دلائل النبوۃ" میں بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے۔ جبکہ ہیثمی نے "المجمع" : ۸/۲۹۸ میں اسے طبرانی اور ابو یعلیٰ کی طرف منسوب کیا، اور کہا: طبرانی کی سند میں کچھ ایسے راوی ہیں جنہیں میں نہیں جانتا۔ اور ابو یعلی کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن عبدالحمید صحانی ہے، جو کہ ضعیف ہے۔



ہوں۔ کرامات کے چار مقاصد ہیں:

اولاً: اللہ عزوجل کی کمال قدرت کا بیان، اس لیے کہ خارق عادت چیز کا حصول اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔

ثانیاً: یہ عقیدہ رکھنے والوں کی تکذیب کہ جملہ امور طبیعی اور جبلی طور پر سرانجام پاتے ہیں، اس لیے کہ اگر طبیعت و جبلت ہی سب کچھ کرتی ہوتی تو جبلت تو ایک ہی انداز کی ہوتی ہے اس میں تغیر نہیں آیا کرتا۔ عادات اور طبیعت میں تغیر آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کا کوئی خالق و مدبر بھی ہے۔

ثالثاً: کرامات متبوع نبی کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہوتی ہیں، جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا۔

رابعاً: ان میں ولی کی کرامت وعزت اور تثبیت کا سامان ہوتا ہے۔

کرامت کی اقسام

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فی انواع العلوم و المکاشفات و انواع القدرۃ و التاثیرات .))

''علوم و مکاشفات اور قدرت و تاثیرات کی مختلف قسموں میں۔''

شرح: ......یعنی کرامت کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم کا تعلق علوم و مکاشفات کے ساتھ ہے اور دوسری کا قدرت و تاثیرات کے ساتھ۔

۱۔ جہاں تک علوم و مکاشفات کا تعلق ہے تو ایک انسان ایسے علوم حاصل کر سکتا ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں ہوتے۔

۲۔ رہے مکاشفات، تو کسی انسان پر کچھ ایسی چیزیں منکشف کر دی جاتی ہیں جو دوسرے کے لیے منکشف نہیں کی جائیں۔

علوم کی مثال: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی بیوی کے حمل کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے بتایا کہ وہ لڑکی ہے۔

مکاشفات کی مثال: امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن منبر پر کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس دوران لوگوں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ساریہ! پہاڑ کی اوٹ میں ہو جائیں۔ لوگ ان کی اس بات سے بڑے متعجب ہوئے اور پھر ان سے اس بارے میں دریافت کیا؟ تو انہوں نے فرمایا: مجھ پر ساریہ بن زنیم کی صورت حال منکشف کی گئی۔ ساریہ عراق میں ان کے کمانڈر تھے، جنہیں دشمن نے گھیرے میں لے لیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں پہاڑ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: ساریہ! پہاڑ کی اوٹ میں چلے جاؤ، جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سنی تو پہاڑ کی اوٹ میں جا کر اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا۔ [1]

---

[1] اسے بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں اور ابن کثیر نے ''البدایۃ'' : ۷/۱۳۱ میں ذکر کیا اور فرمایا: اس کی سند حسن جید ہے۔ شیخ البانی نے ''السلسلۃ الصحیحۃ'': ۱۱۱۰ میں اسے حسن کہا۔

اس قسم کی باتیں مکاشفات کے زمرے میں آتی ہیں، اس لیے کہ یہ امر واقع ہے لیکن بعید ہے۔

جہاں تک قدرت وتاثیرات کا تعلق ہے تو اس کی مثال سیدہ مریم کا واقعہ ہے جب انہوں نے کھجور کے تنے کو جھنجھوڑا تو ان پر تروتازہ کھجوریں گرنے لگیں، اس کی مثال اس شخص کا واقعہ بھی ہے جو کتاب کا علم رکھتا تھا وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہنے لگا: میں تخت تیرے پاس لے آؤں گا قبل اس کے کہ تیری پلک جھپکے۔

سابقہ اُمتوں کی کرامات اس اُمت میں قیامت تک رہیں گی

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والماثور عن سالف الامم فی سورة الكهف وغيرها، وعن صدر هذه الأمة من الصّحابة و التابعين وسائر فرق الأُمة.))

''وہ سورۂ کہف اور دیگر سورتوں میں مذکور گزشتہ امتوں کے بارے میں، صحابہ تابعین اور امت کے دیگر تمام گروہوں کے بارے میں ماثور کرامات پر یقین رکھتے ہیں۔''

شرح:......کرامات کا سلسلہ گزشتہ امتوں میں بھی موجود رہا، مثلاً ان غار والوں کا واقعہ جن کا راستہ چٹان نے بند کر دیا تھا۔ ❶ یہ سلسلہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں بھی جاری رہا۔ جیسا کہ اُسید بن حضیر ❷ کا قصہ، اور بعض صحابہ کرام کے کھانے میں اضافہ ہونے کے واقعات۔ ❸ اور ان کا اظہار تابعین کے ہاتھوں بھی ہوتا رہا۔ اس کی مثال صلہ بن اشیم کا قصہ ہے جس کا گھوڑا اللہ نے زندہ فرما دیا تھا۔ ❹

شیخ الاسلام کتاب ''الفرقان'' میں رقمطراز ہیں: یہ بڑا وسیع باب ہے کرامات اولیاء کے بارے میں متعدد مقامات پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ جن کرامات کا ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور جن کے بارے میں ہم عصر حاضر میں آگاہ ہوئے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔''

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وهی موجودة فيها الى يوم القيامة.)) ''اور یہ قیامت تک جاری رہیں گی۔''

شرح:......کرامات اولیاء کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اس کی دلیل سمعی بھی ہے اور عقلی بھی۔

دلیل سمعی: رسول اللہ ﷺ نے دجال کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں کو اس امر سے آگاہ فرمایا کہ وہ ایک

---

❶ غار والوں کے قصہ کو بخاری: ٣٤٦٥، اور مسلم: ٢٧٤٣ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

❷ اُسید بن حضیر کے واقعہ کو بخاری: ٥٠١٨، اور مسلم: ٧٩٥ نے روایت کیا۔

❸ اسے بخاری: ٦٠٢، اور مسلم: ٢٠٥٧ نے روایت کیا۔

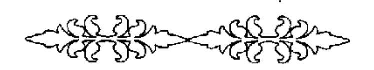
❹ صفة الصفوة: ٣/٢١٧، ''الزهد'' لابن المبارك: ٢٩٥



نوجوان آدمی کو بلائے گا۔ وہ آئے گا اور دجال سے کہے گا: تو جھوٹ بولتا ہے، تو تو وہی دجال ہے جس کے بارے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خبر دے رکھی ہے۔ اس پر دجال آگے بڑھے گا اور اسے قتل کر کے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گا، ایک ٹکڑے کو ادھر اور دوسرے کو ادھر پھینک کر دونوں کے درمیان چلنے لگے گا۔ پھر اسے بلائے گا تو وہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ پھر دجال اس سے اپنی عبودیت کا اقرار کروانے کے لیے بلائے گا، تو وہ کہے گا: آج مجھے تیرے بارے میں بڑی بصیرت حاصل ہو چکی ہے۔ اس پر دجال اسے پھر قتل کرنا چاہے گا۔ مگر اسے اس پر تسلط حاصل نہیں ہو سکے گا۔ [1]

دجال کا اس نوجوان کو قتل کرنے سے قاصر رہنا۔ یقیناً اس کا شمار کرامات اولیاء میں ہوتا ہے۔

دلیل عقلی: کہا جا سکتا ہے کہ کرامت کا سبب ولایت ہے۔ اور چونکہ ولایت قیامت تک جاری رہے گی لہٰذا کرامات بھی قیامت کے قائم ہونے تک جاری رہیں گی۔



[1] اسے بخاری: ۷۱۳۲، اور مسلم: ۲۹۳۸ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



فصل:

اہل سنت کا عملی طریقہ

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثم طریقة اهل السنة و الجماعة اتباع آثار رسول الله ﷺ باطناً و ظاهراً.))

''اہل سنت کا عملی طریقہ باطنی اور ظاہری طور پر آثار رسول ﷺ کی اتباع کرتا ہے۔''

آثارِ رسول کی ظاہری و باطنی اتباع

شرح: ......مؤلف رحمہ اللہ نے اہل سنت کے عقدی طریقہ سے ذکر سے فارغ ہونے کے بعد ان کے عملی طریقہ کے ذکر کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔

[اتباع آثار] ...... اتباع صرف علم کے ساتھ ہی ممکن ہے، لہٰذا اہل سنت طلب علم کے حریص ہیں، تا کہ وہ آثار رسول علیہ الصلاۃ والسلام سے آگاہ ہوکر ان کی اتباع کر سکیں۔

اہل سنت عقیدہ، عبادت، اخلاق اور دعوت الی اللہ میں آپ ﷺ کے آثار کی اتباع کرتے ہیں۔ وہ موقعہ ومحل کے مناسب اللہ کے بندوں کو اللہ کی شریعت کی طرف بلاتے اور اس کے لیے حکمت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت آثار رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے نرمی اور ملائمت کا مظاہرہ کرتے اور ہر انسان کو اس کے مقام و مرتبہ پر اتارتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھر والوں کے بارے میں آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی پیروی کرتے ہیں، اور اس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ سب لوگوں سے اچھا سلوک کریں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔''[1]

ہمارے لیے آثار رسول ﷺ کو حصر میں لانا تو ممکن نہیں ہے، لیکن ہم علی سبیل الاجمال کہہ سکتے ہیں کہ اہل سنت عقیدہ، عبادت، اخلاق اور دعوت میں آپ ﷺ کے آثار کی اتباع کرتے ہیں، عبادت میں تشدد سے بھی کام نہیں لیتے اور سستی کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے، اور ہمیشہ افضل کی اتباع کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مصلحت کی خاطر عبادت سے ہٹ کر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس وفود آتے تو وہ آپ کو نماز سے ہٹا کر دوسری باتوں میں مصروف کر دیتے۔ اور آپ بعد ازاں اس کی ادائیگی فرما لیتے۔

---

[1] اسے ترمذی: ۳۸۹۵، دارمی: ۲۱۷۷، ابن ماجہ: ۱۹۱۷ اور ابن حبان: ٤١٧٧ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔ اور شیخ البانی نے ''الصحیحہ: ۲۸۵'' میں اسے صحیح کہا۔



[ظَاهِرًا وَبَاطِنًا] ..... ظہور وبطون امر نسبی ہے۔

لوگوں کے لیے ظاہری امور میں ظاہر، اوران امور میں جو وہ اپنے جی میں چھپاتے ہیں باطن۔ اعمال ظاہرہ میں ظاہر اور اعمال قلوب میں باطن۔

مثلاً: توکل، خوف، رجاء، انابت، محبت اور ان جیسے دیگر امور کا شمار اعمال قلوب میں ہوتا ہے، جن کی ادائیگی وہ مطلوب انداز میں کرتے ہیں، ارکان نماز، قیام، قعود، رکوع، سجود، اور صدقہ، حج اور صیام اعمال جوارح میں سے ہیں، یہ اور ظاہری اعمال ہیں۔

آثارِ رسول کی اقسام

آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ آثار رسول ﷺ کی تین یا ان سے زیادہ قسمیں ہیں۔

اولاً: وہ امور جو آپ ﷺ نے علی سبیل التعبد سرانجام دیئے۔ ایسے امور کی اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔''

ہر وہ کام جس میں یہ ظاہر نہ ہو کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے یہ کام عادت کے طور پر کیا، یا جبلت اور فطرت کے تقاضوں کے تحت کیا یا اتفاقاً ایسا ہو گیا، تو وہ علی سبیل التعبد ہوا، اور ہم اس کی ادائیگی کے لیے بھی مامور ہیں۔

ثانیاً: وہ کام جو آپ نے اتفاقاً کیا: اس کی اتباع ہمارے لیے مشروع نہیں ہے، اس لیے کہ وہ غیر مقصود ہے، جس طرح کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے ہمیں ذی الحجہ کے چوتھے روز مکہ مکرمہ آنا چاہیے، اس لیے کہ آپ ﷺ اس تاریخ کو مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے۔ [1] مگر ہم کہیں گے کہ یہ کام غیر مشروع ہے، اس لیے کہ اس روز آپ ﷺ کی تشریف آوری اتفاقاً ہوئی تھی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عرفات سے واپسی کے موقعہ پر جب ہم اس گھاٹی میں پہنچیں جس میں آپ ﷺ نے سواری سے اتر کر پیشاب کیا، تو ہمیں اس جگہ اتر کر پیشاب کرنا اور پھر وضو کرنا چاہیے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ امر غیر مشروع ہے۔ آپ ﷺ کا یہ عمل محض اتفاق تھا۔

اسی طرح وہ تمام افعال جو آپ سے اتفاقاً واقع ہوئے ہمارے لیے ان کی اتباع کرنا غیر مشروع ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے وہ کام عبادت کے ارادے سے نہیں کیے تھے۔

ثالثاً: وہ کام جو آپ ﷺ نے حسب عادت کیے کیا ہمارے لیے ان کی اتباع کرنا مشروع ہے؟

جواب: جی ہاں: ہمیں ان کی اتباع کرنی چاہیے، لیکن جنس کے اعتبار سے نہ کہ نوع کے اعتبار سے۔

بجز اس صورت کے کہ کوئی شرعی مانع اس سے روک دے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: مسند احمد: ۳/۳۶٦، ''الکبیر'' للطبرانی: ۷/۱۲۳ یہ حدیث صحیح ہے۔ اصل حدیث ''صحیح مسلم'' میں ہے۔



رابعاً: وہ کام جو آپ ﷺ نے جبلت کے تقاضے کے تحت کیا، تو اس کا شمار قطعی طور پر عبادات میں نہیں ہوتا، مگر کبھی یہ کام من وجہ عبادت ہو بھی سکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ اسے مخصوص انداز میں سرانجام دینا عبادت قرار پائے۔

مثلاً نیند، ایک جبلی تقاضا ہے، مگر دائیں طرف سونا مسنون ہے، اکل وشرب جبلت وطبیعت ہے۔ لیکن یہ عمل ایک اعتبار سے عبادت بھی ہوسکتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ انسان کھانا کھاتے اور پانی پیتے وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کرے، بدن کی حفاظت اور عبادت گزاری کے لیے قوت کے حصول کو پیش نظر رکھے۔ پھر اسے معین انداز میں سرانجام دینا بھی عبادت ہوسکتا ہے۔ مثلاً دائیں ہاتھ سے کھانا۔ شروع میں بسم اللہ اور فراغت پر الحمدللہ پڑھنا۔

سوال: بال رکھنا عادت ہے یا عبادت؟

جواب: بعض علماء کے نزدیک بال رکھنا عبادات اور مسنون عمل ہے۔ جبکہ بعض کے نزدیک اس کا شمار امور عادیہ میں ہوتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جس نے اپنے سر کا کچھ حصہ منڈا رکھا اور کچھ چھوڑ دیا تھا، تو آپ نے اسے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''سارا سر منڈا دو یا سارا چھوڑ دو۔''[1] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بال رکھنا عبادت نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ اسے سر کے سارے بال باقی رکھنے کا حکم دیتے۔

اسی مسئلہ میں جلد بازی سے کام لینا ناروا ہے، بدون دلیل کسی چیز پر عبادت کا حکم نہیں لگانا چاہیے اس لیے کہ عبادت میں اصل منع ہے، بجز اس عمل کے جس کی مشروعیت کی کوئی دلیل موجود ہو۔

سابقین الاولین مہاجرین وانصار کے راستے کی پیروی

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((واتباع سبیل السابقین الاولین من المهاجرین والانصار.))

''اور مہاجرین وانصار میں سے پہلے پہلے سبقت لے جانے والوں کی راہ کی پیروی کرنا۔''

شرح:.....یعنی اہل سنت کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ مہاجرین وانصار میں سے ان لوگوں کی اتباع کرتے ہیں جو اس امت کے اولین اور سبقت لے جانے والے ہیں۔

[السابقين] ..... یعنی اعمال صالحہ کی طرف سبقت لے جانے والے۔

[الاولين] ..... یعنی اس امت سے۔

[المهاجرون] ..... مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے والے۔

[الانصار.] ..... نبی کریم کے عہد مبارک میں اہل مدینہ۔

---

[1] مسلم: ۲۱۲۰، مصنف عبدالرزاق: ۱۹۵٦٤، سنن ابی داؤد: ٤۱۹۵، سنن نسائی: ۸/۱۳۰۔ مسند احمد: ۲/۸۸ نیز ملاحظہ ہو: جامع الاصول: ٤/۷۵۳.



ان لوگوں کی راہ کی اتباع کرنا اہل سنت کا منہج اس لیے ہے کہ وہ بعد کے لوگوں کے مقابلے میں حق وصواب کے زیادہ قریب ہیں۔ لوگ جس قدر عہد نبی ﷺ سے دور ہوتے چلے گئے حق سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔ اور جس قدر اس کے قریب تھے اسی قدر حق کے بھی قریب تھے۔ انسان جس قدر نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء راشدین کی سیرت سے آگاہ ہونے پر حریص ہوگا اتنا حق کے قریب ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے زمانے کے بعد امت میں اختلاف پیدا ہوا اور اس کا دائرہ تمام امور تک وسیع ہو گیا۔ جبکہ یہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں محصور ومحدود تھا۔

اہل سنت کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ مہاجرین وانصار میں سے السابقون الاوّلون کی راہ کی اتباع کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کی اتباع سے ان کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ وہ لوگ حق وثواب کے زیادہ قریب بھی ہیں۔ وہ ان لوگوں جیسے نہیں ہیں جو اس طریقہ سے بے رغبتی دکھاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہ بھی لوگ تھے اور ہم بھی لوگ ہیں۔ اور انہیں ان کی مخالفت کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ گویا کہ ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال اس امت کے آخر میں آنے والے فلاں اور فلاں کے اقوال جیسے ہو گئے۔ یہ سوچ سراسر غلط اور گمراہی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اقرب الی الصواب ہیں۔ اور ان کے اقوال دوسروں کے اقوال پر مقدم، اس لیے کہ ان کے پاس علم وایمان تھا، تقویٰ وامانت اور فہم سلیم تھا اور وہ صحبت رسول ﷺ کے اعزاز گراں قدر کے حامل تھے۔

خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((واتباع وصية رسول الله، حيث قال، عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي، تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ، وإياكم و محدثات الامور، فان كل بدعة ضلالة.)) ❶

''اور وہ رسول اللہ ﷺ کی اس وصیت پر عمل کرتے ہیں: ''میرے اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑے رہنا، اس کے ساتھ تمسک کرنا اور اسے مضبوطی سے تھامے رہنا، اور اپنے آپ کو بدعات سے بچا کر رکھنا، اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔''

شرح: ......[اتباع] ...... یہ ''اتباع الأثار'' پر معطوف ہے۔

---

❶ اسے احمد: ٤/١٢٦، ابو داؤد: ٤٦٠٧، ترمذی: ٢٦٧٦، ابن ماجہ: ٤٤-٤٣، حاکم: ٩٦-١/٩٥ اور ابن حبان نے (١٨٧) نے روایت کیا، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا، حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں کوئی علت نہیں، اور ذہبی نے ان سے موافقت کی۔ البانی نے ''ارواء الغلیل'': ٨/١٠٧ میں اہل علم کی ایک جماعت کی طرف سے اس کی تصحیح نقل کی ہے۔



[الوصية] ..... کسی کو اہم کام کی تلقین کرنا۔

[عليكم بسنتي ..... الخ] ..... سے مقصود تمسک بالسنۃ کی ترغیب دینا ہے۔ اور اسے "عضوا عليها بالنواجذ" کے ساتھ موکد کیا گیا، سنت کو ہاتھوں کے ساتھ تھامنے اور اسے داڑھوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دینے سے مقصود تمسك بالسنه میں مبالغہ پیدا کرنا ہے۔

[السنة] ..... طریقہ سے عبادت ہے۔ ظاہراً بھی اور باطناً بھی۔

[خلفاء الراشدين] ..... یہ وہ لوگ ہیں جو نبی ﷺ کی امت میں علمی، عملی اور دعوتی اعتبار سے ان کے خلیفہ بنے۔ اس وصف میں سب سے پہلے داخل ہونے والے اور اس میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ استحقاق رکھنے والے خلفاء اربعہ ہیں، یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اب اگر علم سے تہی دست کوئی شخص اس زمانے میں کھڑا ہو کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جمعہ کی پہلی اذان بدعت ہے، اس لیے کہ یہ رسول ﷺ کے عہد مبارک میں مروج نہیں تھی۔ لہٰذا دوسری اذان پر ہی اکتفاء کرنا واجب ہے۔ [1]

تو اس شخص سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی سنت لائق اتباع سنت ہے، جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مخالف نہ ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو تجھ سے کہیں بڑے عالم اور اللہ کے دین کے لیے غیرت مند تھے، ان میں سے تو کسی ایک شخص نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت نہیں کی، ان کا شمار تو ان ہدایت یافتہ خلفاء راشدین میں ہوتا ہے جن کی اتباع کرنے کا حکم خود رسول اللہ ﷺ نے جاری فرمایا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے ایک اصل پر اعتماد کیا، اور وہ یہ کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں فجر سے پہلے اذان دیا کرتے تھے جسے وہ نماز فجر کے لیے نہیں بلکہ اس لیے دیتے تھے کہ قیام کرنے والوں کو واپس لوٹا دیں، اور سونے والوں کو جگا دیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا اسی بنیاد پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی جمعہ کے دن پہلی اذان کا حکم دیا یہ اذان امام کی آمد کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی آمد کے لیے دی جاتی تھی، اور یہ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے خلافت میں مدینہ منورہ بہت بڑا شہر بن گیا تھا اور لوگوں کو اس بات کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی کہ امام کے آنے سے پہلے انہیں جمعہ کی ادائیگی کے وقت کا علم ہو جائے اور وہ بر وقت مسجد میں پہنچ کر اطمینان سے نماز جمعہ ادا کر سکیں۔

الغرض! اہل سنت نبی کریم ﷺ کی اس وصیت کی اتباع کرتے ہیں جس میں آپ نے اپنی اور اپنے بعد ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کی ترغیب دلائی تھی جن میں خلفاء اربعہ سرفہرست ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین اِلاَّ یہ کہ اس سے آپ ﷺ کے حکم کی صراحتاً مخالفت لازم آتی ہو، ایسی صورت میں ہم پر آپ ﷺ

---

[1] سائب بن یزید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن تیسری اذان کا اضافہ عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا اسے بخاری نے نکالا (۹۱۳-۹۱۲)

کے حکم پر عمل کرنا واجب ہوگا، اور ہم صحابہ کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ یہ باب اجتہاد سے ہے جس میں وہ معذور ہیں۔

دین میں بدعت ایجاد کرنے سے بچو

[**وایاکم و محدثات الامور**] ..... نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد تحذیر کے لیے ہے، یعنی میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔

[**الامـــور**] سے مراد دینی امور ہیں۔ رہے امور دنیا، تو وہ اس حدیث میں داخل نہیں ہیں، اس لیے کہ دنیوی امور میں اصل حلت ہے، لہٰذا اس کا ایجاد کردہ ہر نیا کام حلال ہوگا، الا یہ کہ کوئی شرعی دلیل اسے حرام قرار دے دے۔ جبکہ دینی امور میں اصل منع ہے، اس میں ایجاد کردہ ہر چیز بدعت اور حرام ہوگی، مگر یہ کہ کتاب وسنت کی کوئی دلیل اسے مشروع قرار دے دے۔

نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے: ((فـان كل بدعة ضلالة)) اس جملہ کی تفریع جملہ تحذیریہ پر ہے، جس سے اس جگہ مراد تحذیر کی توکید اور بدعت کے حکم کا بیان ہے۔

"كل بدعة ضلالة" یہ کلام عام ہے جسے عموم پر دلالت کرنے والے انتہائی قوی لفظ (کلّ) کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔ پھر یہ ایسی محکم تعمیم ہے جس کا صدور نبی کریم ﷺ سے ہوا جو کہ ساری مخلوق سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے عالم، ساری مخلوق سے زیادہ اللہ کے بندوں کے خیر خواہ، سب سے زیادہ فصیح البیان اور صادق الکلام ہیں۔ ان کا ارشاد مبارک ہے۔ "كل بدعة ضلالة" کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

جہمیہ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرتے اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کرتے ہیں، معتزلہ بھی ایسا ہی کرتے اور کہتے ہیں۔ اسی طرح اشاعرہ نے جو باطل عقیدہ اپنا رکھا ہے وہ اس کے مطابق عبادت کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے مخصوص قسم کے اذکار ایجاد کر رکھے ہیں، وہ ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے اور اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ انہیں اس پر اجر وثواب سے نوازا جائے گا۔

کچھ لوگوں نے بعض ایسے افعال ایجاد کر رکھے ہیں جن کے ساتھ وہ عبادت کرتے اور ان پر اجر وثواب کے حصول کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

یہ تینوں قسم کے لوگ جنہوں نے خود ساختہ عقائد، افعال یا اقوال اپنا رکھے ہیں، اور اس حوالے سے کئی قسم کی بدعات جاری کر رکھی ہیں، تو ان کی ایک ایک بدعت گمراہی ہے، اور اسے گمراہی سے خود رسول ﷺ نے موصوف گردانا ہے، کیونکہ وہ خود ساختہ، ایجاد بندہ اور حق سے انحراف ہے۔

بدعت کی خوفناک تباہیاں اور خرابیاں

بدعت متعدد خوفناک خرابیوں کو مستلزم ہے:

اولاً: بدعت اس ارشاد باری کی تکذیب کو مستلزم ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ (المائدة: ٣) "آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔"



ثانیاً: یہ شریعت کو معیوب اور ناقص قرار دینے کو مستلزم ہے۔ جسے گویا اس بدعتی نے مکمل کیا۔

ثالثاً: یہ ان مسلمانوں کو لعن وطعن کرنے کو مستلزم ہے جنہوں نے یہ کام نہیں کیا، اور یہ کہ ان بدعات سے پہلے کے لوگوں کا دین ناقص اور غیر مکمل تھا۔ اور یہ بات انتہائی خطرناک ہے۔

رابعاً: بدعات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عام طور پر بدعت کا دلدادہ سنت سے غافل ہو جاتا ہے۔ بعض علماء سلف کا قول ہے: جس قوم نے کوئی بدعت جاری کی اس نے اس جیسی سنت گنوا دی۔

بدعت کی مختلف اقسام بنانے والا غلطی پر ہے

خامساً: بدعات امت میں تفرقہ بازی کا سبب بنتی ہیں: اس لیے کہ بدعتی لوگ اپنے آپ کو حق پر اور دوسروں کو گمراہ خیال کرتے ہیں جبکہ پیروانِ حق انہیں گمراہ بتاتے ہیں۔ اس طرح ان کے دلوں میں بعد پیدا ہو جاتا اور امت تقسیم ہو جاتی ہے۔

یہ بڑے بڑے مفاسد ہیں جو کہ بدعت پر اس کے بدعت ہونے کی وجہ سے مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کسی نے بدعت کو تین، پانچ یا سات قسموں میں تقسیم کیا ہے، اس نے یقیناً غلط کیا ہے۔

جب نبی کریم ﷺ "کل بدعة ضلالة" فرما کر ہر بدعت کو گمراہی قرار دے رہے ہیں، تو "کلٌ" کے اس مضبوط حصار کو توڑ کر ہمیں کون سی چیز اس سے باہر نکالے گی، حتی کہ ہم بدعت کو کئی قسموں میں تقسیم کرنے کی جرأت کرنے لگیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول نعمت البدعه هذه کی وضاحت

سوال: آپ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس قول کے بارے میں کیا کہیں گے کہ جب انہوں نے لوگوں کو رمضان المبارک میں امام کی اقتداء میں نماز تراویح پڑھتے دیکھا، تو فرمایا: نعمت البدعة هذه "یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔" آپ نے اس عمل کی تعریف فرمائی اور اسے بدعت سے موسوم کیا؟ [1]

جواب: سائل نے جس بدعت کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں دیکھنا پڑے گا کہ کیا اس پر بدعت شرعیہ کے وصف کا انطباق ہوتا ہے یا نہیں؟ جب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بدعت شرعیہ کے وصف کا انطباق نہیں ہوتا، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ماہ رمضان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تین راتیں نماز پڑھائی پھر اسے اس خوف کے پیش نظر ترک کر دیا کہ وہ ان پر فرض قرار دے دی جائے گی، اس طرح اس نماز کی مشروعیت ثابت ہوگئی اور اس کے بدعت ہونے کی نفی ہوگئی۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نماز خود پڑھی اور دوسروں کو پڑھائی۔ لہٰذا ہمارے لیے اسے بدعت کہنا ممکن نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اگر بدعت سے موسوم کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے اسے ترک کر رکھا تھا، وہ اسے کسی ایک امام کی اقتداء میں نہیں بلکہ الگ الگ ادا کرتے تھے، کہیں کوئی آدمی اکیلا ہی پڑھ رہا ہوتا، کہیں دو آدمی اور کہیں تین، زیادہ سے زیادہ چند لوگ مل کر پڑھ لیتے۔ پھر جب انہوں نے لوگوں کو نماز تراویح کی ادائیگی کے لیے ایک امام پر جمع کرایا تو ان کا یہ اجتماع اس نسبت سے بدعت قرار پایا کہ وہ اس سے قبل یہ نماز جدا جدا ادا کرتے تھے۔

---

[1] اسے بخاری نے روایت کیا (۲۰۱۰)



اس واقعہ کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ ایک رات باہر تشریف لائے اور لوگوں کو الگ الگ نماز ادا کرتے دیکھا تو کہنے لگے کہ اگر میں لوگوں کو ایک امام پر جمع کر دوں تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اُبی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت نماز پڑھایا کریں۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے اس حکم کی تعمیل میں لوگوں کو گیارہ رکعت نماز پڑھانا شروع کر دی۔ پھر جب وہ ایک رات مسجد میں تشریف لائے اور لوگوں کو ایک امام کی اقتدا میں نماز پڑھتے دیکھا، تو فرمانے لگے: یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔

اس پس منظر میں یہ نماز اس اعتبار سے بدعت ہے کہ اسے ترک کیے جانے کے بعد دوبارہ وجود میں لایا گیا تھا۔

یہ ہے اسے بدعت کے نام سے موسوم کرنے کی اصل وجہ۔

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ یہ بدعت شرعیہ تھی جس کی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تعریف کر رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان من سن فی الاسلام سنة حسنة کی صحیح توجیہ

اگر آپ یہ کہیں کہ اس میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں تطبیق کی کیا صورت ہے:

((من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها الی یوم القیامة .))[1]

''جو شخص اسلام میں کسی اچھے طریقہ کو رواج دے گا تو اسے اس کا اجر بھی ملے گا اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والوں کا بھی۔''

اس حوالے سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں وہ باہم متناقض نہیں ہوا کرتے، سنت حسنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سنت مشروعہ ہے، جب کہ اسے رواج دینے سے مراد اس پر عمل کرنا ہے۔ اس امر سے آگاہی اس حدیث کا پس منظر معلوم کرنے پر ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی جب ایک انصاری مسلمان نے دراہموں سے بھری تھیلی لا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی، اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مضر قبیلہ کے کچھ لوگوں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر ان سے مالی تعاون کرنے کی دعوت دی۔ اس قبیلہ کا شمار کبار عرب میں ہوتا تھا، جب یہ لوگ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی حالت زار کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور متغیر ہو گیا، اس پر آپ نے لوگوں کو ان سے مالی تعاون کرنے کی ترغیب دلائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جب اس شخص نے سب سے پہلے یہ تھیلی پیش کی تو آپ نے فرمایا:

((من سنَّ فی الاسلام سنَّة حسنةً ، فله أجرها و أجر من عمل بها إلی یوم القیامة .))

''یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سنت حسنہ سے مراد ایسی چیز ہے جسے کوئی انسان اس لیے ایجاد کرتا ہے تاکہ وہ کسی شروع چیز کا ذریعہ ثابت ہو سکے۔''

---

[1] اسے مسلم (۱۰۱۷) نے جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



مثلاً تصنیف کتب، تعمیر مدارس، اوران جیسے دیگر کام، اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے اقوال و فرامین متناقض نہیں بلکہ متفق ہوا کرتے ہیں، اس لیے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ذاتی خواہشات سے نہیں بولا کرتے۔

اہل سنت والجماعت کا اس بات پر ایمان ہے کہ سب سے سچا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویعملون ان أصدق الکلام کلام اللہ .))

''اور وہ جانتے ہیں کہ سب سے سچا کلام، اللہ کا کلام ہے۔''

شرح:......اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ کلام اللہ میں کذب کی آمیزش نہیں ہے بلکہ یہ سب سے سچا کلام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے موجود ہونے کی خبر دے تو وہ یقیناً موجود ہے۔ جب وہ کسی چیز کے آئندہ چل کر معرض وجود میں آنے کی خبر دے تو ایسا ہوکر رہے گا۔ اور جب وہ کسی چیز کے بارے اس امر سے آگاہ کرے کہ اس کی صفت اس اس طرح سے ہے تو وہ ایسی ہی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا اس سے تبدیل ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرتا ہے تو اس کا یہ خیال غلط ہے، ایسا شخص یا تو حقیقت تک رسائی سے قاصر ہے یا پھر وہ اس سے سمجھنے کے حوالے سے کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ زمین کو بچھایا گیا ہے:

﴿وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ﴾ (الغاشیۃ : ۲۰) ''اور زمین کی طرف کہ اسے کس طرح بچھایا گیا۔''

جبکہ ہمارے مشاہدہ یہ ہے کہ زمین گول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خبر خلاف واقع کس طرح ہوسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیت خلاف واقع نہیں ہے۔ غلطی اس کے فہم میں ہے۔ زمین کی سطح گولائی ہے۔ اور یہ اس طرح کہ کہ زمین تو گول ہے مگر چونکہ اس کا حجم بہت بڑا ہے۔ لہٰذا اس کی گولائی صرف ایسے وسیع وعریض رقبے میں ظاہر ہوگی جس کی وجہ سے وہ سطح معلوم ہوتی ہو۔ اس صورت میں غلطی اس کے فہم میں ہے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ زمین کا مسطح ہونا اس کے گول ہونے کے خلاف ہے۔

جب ہمارا کلام اللہ کے اصدق الکلام ہونے پر ایمان ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم پر ہر اس چیز کی تصدیق کرنا واجب ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں خبر دی ہے۔ وہ خبر اس نے اپنی ذات کے بارے میں دی ہو یا اپنی مخلوق کے بارے میں۔

ہمارا اس پر ایمان ہے کہ سب سے بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وخیر الھدی ھدی محمد ﷺ .))



''اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے۔''

شرح:......[الهدی] ..... وہ راستہ جس پر سالک گامزن رہتا ہے۔

راستے بے شمار ہیں مگر بہترین راستہ وطریقہ محمد ﷺ کا ہے۔ہمیں اس کا علم بھی ہے اور اس پر ہمارا ایمان بھی۔ ہمیں علم ہے کہ عقائد وعبادات اور اخلاق ومعاملات میں محمد ﷺ کا راستہ بہترین راستہ ہے، اور یہ کہ اس میں کسی طرح کا کوئی نقص نہیں ہے، نہ اس کے حسن وکمال میں، نہ تمام وانتظام میں، نہ مخلوق کے مصالح کے ساتھ موافقت میں، اور نہ ہی ان حوادث کے احکام میں جو اس وقت ہو رہے ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ محمد ﷺ کا طریقہ تمام طریقوں سے کامل ومکمل ہے، وہ تورات، انجیل، زبور کی شریعت، ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کی شریعت اور تمام راستوں سے بہترین ہے۔

اگر ہمارا اس پر اعتقاد ہے تو واللہ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ اس عقیدہ کی بناء پر ہمیں فرمان رسول ﷺ کا کسی بھی شخص کے قول کے ساتھ معارضہ کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے وہ کوئی بھی ہو۔حتی کہ اگر خیر الامۃ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ایک طرف ہو اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کا قول ہو، تو ہم آپ ﷺ کے قول پر عمل کریں گے۔

اہل سنت کا یہ اعتقاد کتاب وسنت پر مبنی ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء: ٨٧) ''اور اللہ سے بڑھ کر کسی کی بات سچی ہو سکتی ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے منبر پر لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "خير الحديث كتاب الله و خير الهدى هدى محمد ﷺ" [1] ''بہترین بات کتاب اللہ ہے، اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے۔''

اللہ اور اس کے رسول کا کلام دوسرے کلاموں پر مقدم ہے

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ويوثرون كلام الله على كلام غيره من كلام أصناف الناس .))

''اور وہ کلام اللہ کو مختلف قسم کے لوگوں کے کلام پر ترجیح دیتے ہیں۔''

شرح:......[ويوثرون] ..... یعنی مقدم رکھتے ہیں۔

[كلام الله على كلام غيره] ..... یعنی خبر وحکم میں تمام قسم کے لوگوں کے کلام پر کلام اللہ کو مقدم رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ کی اخبار ہر شخص کی خبر پر مقدم ہیں۔

اگر گزشتہ امتوں کی طرف سے ہمارے پاس کوئی ایسی خبر آئے جس کی قرآن تکذیب کرتا ہو تو اس کی ہم بھی تکذیب کریں گے۔

مثلاً: اکثر مورخین میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت ادریس حضرت نوح سے قبل ہو گزرے تھے۔ مگر یہ بات غلط ہے،

---

[1] اسے مسلم (٧٦٧) نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



اس لیے کہ قرآن اسے غلط بتاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ﴾ (النساء: ١٦٣)

''یقیناً ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے جس طرح ہم نے وحی کی تھی نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف۔''

جبکہ ادریس علیہ السلام کا شمار نبیوں میں ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ (مریم: ٥٦)

''اور ذکر کریں کتاب (قرآن) میں ادریس کا، یقیناً وہ بہت سچے نبی تھے۔''

اور آگے چل کر فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ﴾ (مریم: ٥٨)

''یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، اولاد آدم میں سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا۔''

مزید فرمایا گیا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ (الحدید: ٢٦)

''اور یقیناً ہم نے بھیجا تھا نوح اور ابراہیم کو، اور ہم نے ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری رکھا۔''

نوح علیہ السلام سے پہلے صرف آدم علیہ السلام ہی نبی تھے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویقدمون هدی محمد ﷺ علی هدی کل أحد.))

''اور وہ محمد ﷺ کے طریقہ کو ہر ایک کے طریقہ پر مقدم رکھتے ہیں۔''

شرح:...... [**ویقدمون هدی محمد** ﷺ] ..... یعنی وہ آپ کے طریقہ اور سنت کو مقدم رکھتے ہیں۔

[**علی هدی کل أحد.**] ..... یعنی عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات، جملہ احوال اور ہر چیز میں۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ (الانعام: ١٥٣)

''اور یقیناً میرا یہ راستہ سیدھا ہے، پس تم اس کی اتباع کرو، اور مختلف راستوں کی اتباع نہ کرو، وہ تمہیں اس کے صحیح راستے سے الگ کر دیں گے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

(آل عمران: ٣١)



''کہہ دو! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

اہل کتاب والسنہ والجماعہ کی وجہ تسمیہ

"ولهذا" اس میں لام تفصیل کا ہے۔ یعنی چونکہ وہ کلام اللہ کو ترجیح دیتے اور رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کو مقدم رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہیں "سموا أهل الكتاب و السنة" انہیں اہل کتاب وسنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جو شخص کتاب وسنت کا تو مخالف ہو اور دعویٰ یہ کرے کہ وہ کتاب وسنت والوں میں سے ہے، تو وہ جھوٹا ہے، اس لیے کہ جو شخص کسی چیز والوں میں سے ہوا، وہ اسے لازم بھی پکڑتا اور اس کا التزام بھی کرتا ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وان كان لفظ الجماعة قد صار إسمًا لنفس القوم المجتمعين .))

''اگر چہ لفظ جماعت مجتمع قوم کا نام بن گیا ہے۔''

شرح: ...... یہ اس لفظ کا دوسرا استعمال ہے، وہ اس طرح کہ لفظ جماعۃ ایک اعتبار سے مجتمع قوم کا نام بھی بن گیا ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ کی اس تقریر کی بنیاد پر ہمارے قول: "اهل السنة و الجماعة" میں لفظ (الجماعة)، (السنة) پر معطوف ہوگا، اور اسی لیے مؤلف رحمہ اللہ نے اسے "سموا اهل الجماعة" سے تعبیر کیا، اور "سموا جماعة" نہیں فرمایا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ جماعت ہیں تو پھر اہل جماعت کس طرح ہوئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جماعت اصل میں اجتماع سے عبارت ہے، اس طرح اہل الجماعۃ کا معنی ہوگا: اہل الاجتماع مگر اسم جماعت کو نقل عرفی کے اعتبار سے مجتمع قوم کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

اصل ثالث: اجماع

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والاجماع هو الاصل الثالث الذى يعتمد عليه فى العلم والدين .))

''اجماع تیسرا اصول ہے جس پر علم اور دین میں اعتماد کیا جاتا ہے۔''

شرح: ......اس سے مراد تیسری دلیل ہے، اس لیے کہ ادلۂ احکام کے اس حیثیت سے احکام کے اصول ہیں کہ وہ ان پر مبنی ہیں۔ اصل اول کتاب اور اصل ثانی سنت ہے، جبکہ اجماع اصل ثالث ہے۔ یہی وہ ہے کہ انہیں "اهل الكتاب و السنة و الجماعة" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

گویا کتاب وسنت اور اجماع وہ تین اصول ہیں جن پر علم اور دین میں اعتماد کیا جاتا ہے۔

کتاب وسنت تو ذاتی اصول ہیں جبکہ اجماع اپنے غیر پر مبنی ہوتا ہے۔اس لیے کہ کتاب یا سنت کے بغیر اجماع کا کوئی وجود نہیں۔

کتاب وسنت کے اصل ہونے کے بہت سارے دلائل ہیں، جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (النساء: ۵۹)

''پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔''

﴿وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (المائدہ: ۹۲)

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔''

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: ۷)

''جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔''

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''جو رسول کی اطاعت کرے گا یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

ادلۂ شرعیہ میں سنت کو اصل تسلیم کرنے سے انکار کرنے والا قرآن کو اصل تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ احکام شرعیہ میں سنت کو مرجع قرار نہ دینے والا کافر مرتد ہے، اس لیے کہ وہ قرآن کا منکر اور اس کی تکذیب کرنے والا ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر سنت کو احکام شرعیہ کا اصل مرجع قرار دیا ہے۔

کیا اجماع موجود ہے یا نہیں اور حجیت اجماع کے دلائل

اجماع کے اصل ہونے کی دلیل کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے:

اولاً: کیا اجماع موجود ہے یا غیر موجود؟

بعض علماء کہتے ہیں: اجماع کا کوئی وجود نہیں ہے مگر اس مسئلہ میں جس کی کوئی نص موجود ہو۔ اس صورت میں نص اجماع سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اسلام میں پانچ نمازیں فرض ہیں، تو اس کا یہ کہنا درست ہے، لیکن ان کی فرضیت نص سے ثابت ہے نہ کہ اجماع سے۔

علماء کا زنا کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے، لیکن اس کی تحریم نص سے ثابت ہے نہ کہ اجماع سے۔

علماء کا ذوات المحارم کے ساتھ نکاح کی حرمت پر اجماع ہے۔ یہ بھی صحیح ہے، لیکن یہ حرمت بھی نص سے ثابت ہے۔

اسی لیے امام احمد فرماتے ہیں: اجماع کا مدعی کاذب ہے۔ اسے کیا معلوم؟ شاید انہوں نے اختلاف کیا ہو۔ [1]

اس کے برعکس اکثر علماء کے نزدیک اجماع موجود ہے، اور اس کا شرعی دلیل ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ مثلاً:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (النساء: ۵۹)

[1] اسے عبداللہ بن امام احمد نے "مسائله عن أبيه" میں روایت کیا (۳۷)۔ ملاحظہ ہو: "اعلام الموقعین" لا بن القیم (۱/۳۰)



''پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔''

یہ ارشاد مبارک اس بات کی دلیل ہے کہ جس چیز پر ہمارا اجماع ہو جائے تو اجماع پر اکتفا کرتے ہوئے اسے کتاب و سنت کی طرف لوٹانا واجب نہیں ہے۔ مگر یہ استدلال محل نظر ہے۔ دوسری آیت:

﴿وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)

''اور جو شخص سیدھا راستہ واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستہ کے علاوہ کی پیروی کرے تو ہم اسے ادھر پھیر دیتے ہیں جدھر وہ چاہتا ہے اور اسے داخل کرتے ہیں جہنم میں، اور وہ بہت بری جگہ ہے۔''

اس کے لیے انہوں نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے: ''لا تجتمع امتی علی ضلالة'' [1] میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔''

اس حدیث کو بعض علماء حسن اور بعض دوسرے ضعیف قرار دیتے ہیں، مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر چہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن مذکورہ بالا قرآنی نص اس کے متن کی صحت کی شہادت دیتی ہے۔

جمہور امت کے نزدیک اجماع مستقل دلیل ہے، اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آئے جس پر اجماع ہو چکا ہو تو ہم اسے اس اجماع کے ساتھ ثابت کریں گے۔

گویا مؤلف رحمہ اللہ اس جملہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اہل سنت کے نزدیک اجماع شرعی حجت ہے۔

اہل سنت والجماعت لوگوں کے ظاہری و باطنی قول و عمل کا موازنہ تین اُصولوں سے کرتے ہیں

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وهم يزنون بهذه الأصول الثلاثة جميع ماعليه الناس من أقوال و أعمال باطنة أو ظاهرة مما له تعلق بالدّين .))

''وہ لوگوں کے دین سے متعلقہ ہر قول و عمل کا وہ ظاہر ہو یا باطن ان اصول ثلاثہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔''

شرح: ......[أصول الثلاثة] ..... اہل سنت کے تین اصول یہ ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع۔ یعنی اہل سنت لوگوں کے ہر قول و عمل کا وہ ظاہر ہو یا باطن ان اصول ثلاثہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں، وہ جب تک کسی چیز کا کتاب و سنت اور اجماع کے ساتھ موازنہ نہ کر لیں اس وقت تک اسے حق تسلیم نہیں کرتے، اگر ان تین اصولوں سے اس کی

---

[1] اسے ترمذی (۳/۲۰۷)، ابن ماجہ (۲/۱۳۰۳)، اور ''المستدرك'' (۱/۱۵۵) میں حاکم نے روایت کیا۔ اور سخاوی نے اسے المقاصد: (٤٦٠) میں ذکر کیا اور اس کے بارے میں فرمایا: ''اس حدیث کا متن مشہور ہے اس کی بہت سی سندیں اور متعدد شواہد ہیں۔'' ہیثمی نے اسے ''المجمع'' میں ذکر کیا (۵/۱۲۹) اور فرمایا: ''اسے طبرانی نے ۲ سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جن میں سے ایک کے راوی ثقہ اور صحیح کے راوی ہیں۔ بجز مرزوق آل طلحہ کے اور وہ بھی ثقہ ہے۔'' البانی نے ''ظلال الجنة'' میں اسے حسن کہا ہے۔ (۸۰)



دلیل مل جائے تو حق بصورت دیگر وہ باطل ہوگی۔

اجماع صرف سلف صالحین کا ہی منضبط اور معتبر ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والاجماع الذی ینضبط هو ما کان علیه السلف الصالح، اذ بعدهم کثر الاختلاف وانتشرت الأمّة.))

''اجماع صرف سلف صالحین کا ہی منضبط اور معتبر ہے، اس لیے کہ ان کے بعد اختلاف بہت زیادہ ہو گیا اور امت انتشار کا شکار ہو گئی۔''

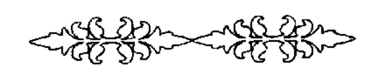
شرح: ......یعنی اجماع صرف سلف صالحین کا معتبر ہوگا، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کا۔ مؤلف رحمہ اللہ اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اذبعدهم کثر الاختلاف و انتشرت الامة" یعنی اس کے بعد نفسانی خواہشات کی طرح لوگوں کے اختلافات میں بھی اضافہ ہو گیا، لوگ کئی گروہوں میں بٹ گئے، اور وہ سارے کے سارے حق کے متلاشی بھی نہیں تھے۔ اس دوران ان کی آراء میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا اور کئی قسم کے اقوال سامنے آ گئے۔

"انتشرت الامة" امت اس طرح منتشر ہو گئی کہ اسے ایک جگہ جمع کرنا دشوار ترین کام بن کر رہ گیا۔

گویا کہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو شخص سلف صالحین کے بعد اجماع کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اجماع صرف سلف صالحین کا معتبر ہے۔

کیا اختلاف کے بعد اجماع کا انعقاد ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گزشتہ اختلاف کی موجودگی میں اجماع کا کوئی وجود نہیں، اور تحقق اجماع کے بعد اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں۔





فصل:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں اہل السنہ والجماعہ کا منہج

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثم هم مع هذه الاصول يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر .))

''پھر وہ ان اصولوں کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی سر انجام دیتے ہیں۔''

شرح:...... [**هم**] ...... یعنی اہل السنہ والجماعہ۔

[**مع هذه الاصول**] ..... جن کا مؤلف رحمہ اللہ نے قبل ازیں ذکر کیا۔ یعنی آثار رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع کرنا، خلفاء راشدین کی اتباع کرنا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکامات کو دوسروں کے اقوال و افعال پر مقدم رکھنا اور مسلمانوں کے اجماع کی اتباع کرنا۔ اہل سنت ان اصولوں کے باوجود۔

معروف ومنکر کی تعریف

[**يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر**] ..... نیکی کا حکم کرتے اور برائی سے منع کرتے ہیں۔

[**المعروف**] ..... ہر وہ چیز جس کا شریعت نے حکم دیا ہے اس کا وہ بھی حکم دیتے ہیں۔

[**المنكر**] ..... ہر وہ چیز جس سے شرع نے منع کیا ہے اس سے وہ بھی منع کرتے ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ اس کا اللہ نے حکم دیا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۰٤)

''تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دیتی رہے، نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے منع کرتی رہے۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً تم نیکی کا حکم کرو گے اور برائی سے منع کرو گے، ظالم کا ہاتھ پکڑ لو گے اور اسے حق کی طرف موڑ دو گے۔''[1]

---

[1] اسے ابو داؤد (٤٣٣٦)، ابن ماجه ٤٠٠٦، ترمذی (٣٠٤٨، ٣٠٤٧) نے روایت کیا، ترمذی فرماتے ہیں: ''یہ حدیث حسن غریب ہے'' فرماتے ہیں: ''یہ حدیث اسی طرح ابو عبیدہ عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ جبکہ بعض اسے مرسل کے طور پر عن ابی عبیدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے روایت کرتے ہیں۔ ہیثمی نے "المجمع" (٧/٢٦٩) میں اسے طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے جو کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور فرماتے ہیں: اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر ''در منثور'' زیر تفسیر آیت: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ....﴾ (المائدہ: ٧٩-٧٨)



اہل سنت نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط

لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی چند شرائط ہیں۔

پہلی شرط: یہ فریضہ سرانجام دینے والا جس چیز کا حکم دے رہا ہو یا جس چیز سے منع کر رہا ہو اس بارے اسے شریعت کے حکم کا علم ہو، وہ اسی چیز کا حکم دے جس کا شریعت نے حکم دیا ہو اور اسی کام سے منع کرے جس سے شریعت نے منع کیا ہو، وہ اس بارے میں ذوق یا عادت پر اعتماد نہ کرے۔ اس لیے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا ہے:

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (المائدہ: ۴۸)

''آپ ان کے درمیان اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جسے اللہ نے اتارا، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا اسے چھوڑ کر جو تمہارے پاس حق آچکا ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾

(الاسراء: ۳۶)

''اور اس کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے، یقیناً کان، آنکھ اور دل یہ سب کے سب وہ اعضاء ہیں جن کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

اور ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ﴾ (النحل: ۱۱۶)

''اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تا کہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو، یقیناً جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔''

اگر وہ کسی شخص کو کوئی ایسا کام کرتے دیکھے جس میں اصل حلت ہو تو اس کے لیے اسے اس کام سے روکنا جائز نہیں ہے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کام حرام ہے یا شریعت میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

اگر وہ کسی شخص کو دیکھے کہ اس نے کوئی ایسا کام ترک کر رکھا ہے جسے وہ عبادت خیال کرتا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اسے اس کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم دے، یہاں تک کہ اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ شرع نے اس کا حکم دے رکھا ہے۔

دوسری شرط: اسے مامور کے بارے میں یہ علم ہونا چاہیے کہ کیا اسے حکم دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا اسے منع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جس کے مکلّف ہونے کے بارے میں اسے شک ہو، تو وہ اسے اس چیز کا حکم نہ دے جس کا حکم اس جیسے کسی دوسرے شخص کو نہیں دیا جا سکتا، جب تک وہ اس بارے مکمل تفصیل حاصل نہ کرے۔



تیسری شرط: اسے مامور کے بارے میں یہ علم ہونا چاہیے کہ اس نے یہ کام کر لیا ہے یا نہیں؟ اگر اس نے دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور پھر بیٹھ گیا، اور اسے شک ہے کہ اس نے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کیں یا نہیں؟ تو وہ تفصیل سے آگاہ ہونے تک اسے ان کی ادائیگی کا حکم دے نہ اسے برا سمجھے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اس دوران ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور پھر بیٹھ گیا۔ اس پر آپ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا: ''کیا تو نے نماز پڑھ لی؟'' اس نے جواب دیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھڑا ہو جا، اور ہلکی سی دو رکعتیں پڑھ لے۔'' [1]

مجھے بتایا گیا ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کی ریکارڈنگ کو حرام قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ ان کے خیال میں اس طرح قرآن کی توہین ہوتی ہے، وہ اپنے غلط خیال کی وجہ سے لوگوں کو قرآن مجید ریکارڈ کرنے سے منع کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ برائی یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس چیز سے منع کرتے ہیں جس کی برائی کا آپ کو علم ہی نہیں ہے۔ عبادات کے علاوہ آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ یہ چیز اللہ کے دین میں منکر ہے۔

چوتھی شرط: وہ بغیر نقصان اٹھائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے پر قادر ہو۔ اور اگر اسے نقصان پہنچے تو اس پر یہ کام واجب نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ صبر کرتے ہوئے یہ فریضہ ادا کرے تو یہ افضل ہے اور یہ اس لیے کہ تمام واجبات کی ادائیگی قدرت و استطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦) ''اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرتے رہو۔''

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ٢٨٦)

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلّف بناتا ہے۔''

اگر اسے یہ ڈر ہو کہ اگر اس نے کسی شخص کو نیکی کا حکم دیا تو وہ اسے قتل کر ڈالے گا، تو اس کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا، بلکہ کبھی اس پر یہ کام کرنا حرام بھی ہو جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس پر نیکی کا حکم دینا بھی واجب ہے اور صبر کرنا بھی۔ بشرطیکہ معاملہ قتل تک نہ پہنچے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اگر نیکی کا حکم دینے والے کو قید وغیرہ کی تکلیف دی جائے گی تو اس کا انجام دیکھ کر دوسرے لوگ اس فریضہ کی ادائیگی سے ہاتھ روک لیں گے، حتی کہ پرامن حالات میں بھی یہ سلسلہ رک جانے کا خدشہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب تک معاملہ اس حد تک نہ پہنچے جب امر بالمعروف کا معاملہ جنس جہاد میں شمار ہونے لگتا ہے۔ مثلاً وہ سنت کا حکم دیتا اور بدعت سے منع کرتا ہو، اگر وہ اب خاموشی اختیار کرے گا تو بدعتی لوگ پیروان سنت کے خلاف چڑھائی کر دیں گے۔ لہٰذا ایسے حالات میں سنت کا اظہار اور بدعت کا بیان واجب ہوگا۔ اس لیے کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ کے قبیل سے ہے اور جہاد پر متعین شخص کو جان کے خوف کی وجہ سے معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔

---

[1] اسے بخاری (۹۳۱) اور مسلم (۸۷۵) نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔

پانچویں شرط: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر سکوت پر زیادہ خرابی مرتب نہ ہوتی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس پر اس فریضہ کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے لیے اس کی ادائیگی جائز ہی نہیں ہوگی۔

اس لیے علماء کرام فرماتے ہیں: برائی کو روکنے سے مندرجہ ذیل چار حالتوں میں سے ایک حالت ضرور پیدا ہوتی ہے:

- یا تو برائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
- یا وہ اپنے سے کم تر برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
- یا اس جیسی کوئی اور برائی جنم لے لیتی ہے۔
- یا اس سے بھی بڑی برائی سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔

پہلی اور دوسری صورت میں انکار واجب ہے۔

تیسری صورت میں محل نظر ہے۔

اور چوتھی صورت میں انکار منکر جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ انکار منکر سے مقصود اس کا خاتمہ یا اس میں کمی کرنا ہوتا ہے جس کا اس جگہ فقدان ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کوئی اچھا کام کرنے کی تلقین کرنا چاہتا ہے مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ باجماعت نماز نہیں پڑے گا، تو اس صورت میں نیکی کا حکم دینا جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس کا یہ حکم مستحب فعل کی وجہ سے ترک واجب پر منتج ہوگا۔

اس طرح اگر کسی برائی سے منع کرنے کی صورت میں اس برائی کا ارتکاب کرنے والا اس سے بھی برا فعل کرنا شروع کر دے تو اس حالت میں بھی اسے اس برائی سے روکنا جائز نہیں ہوگا۔

اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (الانعام: ۱۰۸)

''اور ان کے ان بتوں کو گالی نہ دیں جنہیں وہ اللہ کے علاوہ بلاتے ہیں، مبادا وہ گالیاں دیں اللہ کو حد سے گزرتے ہوئے بغیر علم کے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرکین کے جھوٹے خداؤں کے نقائص و عیوب بیان کرنا امر مطلوب ہے۔ مگر چونکہ اس کا نتیجہ اس میں پنہاں مصلحت سے زیادہ سنگین امر ممنوع کی صورت میں سامنے آتا ہے، لہٰذا اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خداؤں پر تنقید کرنے سے منع فرما دیا۔

اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا ہے۔ اگر ہم اسے شراب نوشی سے منع کریں اور وہ لوگوں کے مال چرانا اور ان کی عزتوں سے کھیلنا شروع کر دے تو اس حالت میں بھی ہم اسے شراب نوشی سے نہیں رکیں گے۔ اس لیے کہ اس پر پہلے سے بھی بڑی خرابی مرتب ہوتی ہے۔



چھٹی شرط: نیکی کا حکم دینے والا اور برائی سے منع کرنے والا خود بھی اس چیز پر عمل کرے جس کی وہ دوسروں کو تلقین کرتا ہے اور ان امور سے باز رہے جن سے دوسروں کو منع کرتا ہے۔ اور اگر وہ خود اس پر عامل نہیں ہے تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرہ: ٤٤)

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم اپنی کتاب کی تلاوت بھی کرتے رہتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

جو شخص خود نماز نہیں پڑھتا وہ دوسروں کو نماز پڑھنے کا حکم مت دے، اور اگر وہ خود شرب نوشی کرتا ہے تو دوسروں کو اس سے منع نہ کرے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

لَاتَنْـهَ عَـنْ خُـلُقٍ وَتَأْتِيَ مِثْلَـهُ … عَـارٌ عَـلَيْكَ إِذَافَعَـلْـتَ عَظِيْمْ

''جو کام تو خود کرتا ہے اس سے دوسروں کو مت روک۔ اگر تو یہ کرے گا تو یہ تیرے لیے بڑا معیوب ہے۔''

یہ علماء کی ایک جماعت کی رائے ہے، جس کے لیے انہوں نے اثر اور نظر سے استدلال کیا ہے۔

لیکن جمہور کی رائے اس کے برعکس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا واجب ہے چاہے ایسا کرنے والا خود اس پر عمل نہ بھی کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نیکی کی تلقین کرنے پر ڈانٹ نہیں پلائی بلکہ اس کی وجہ ان کا امر بالمعروف اور نسیان نفس کو ایک ساتھ جمع کرنا تھا۔

علماء کا یہ قول ہی صحیح ہے۔

یہ شرط نہیں لگائی جا سکتی کہ متعلقہ فریق نیکی کا حکم کرنے والے یا برائی سے منع کرنے والے کے اصول میں سے نہ ہو، جیسا کہ اس کا باپ، ماں، دادا یا دادی، بلکہ اگر یہ کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، اس لیے کہ اس کی زیادہ تاکید ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ انہیں معاصی کے ارتکاب سے روکا جائے اور اطاعت گزاری کی تلقین کی جائے۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر میں اپنے باپ کو کسی برائی سے روکوں گا تو وہ مجھ سے ناراض ہو کر مجھ سے قطع تعلقی اختیار کرے گا۔ ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اس حوالے سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ آپ کو باپ کی ناراضی اور قطع تعلقی پر صبر کرنا چاہیے، اس کا انجام یقیناً اچھا ہوگا۔ آپ اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی اتباع کریں۔ انہوں نے ارتکاب شرک پر اپنے باپ کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

﴿يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ٥ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ٥ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ



لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّاo يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّاo﴾

(مریم: ٤٢-٤٥)

''میرے ابا جان! تم اس کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا اور نہ تمہارے کسی کام آتا ہے، ابا جان! یقیناً میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا، اس لیے میری اتباع کریں، میں تمہیں سیدھا راستہ دکھادوں گا، ابا جان! شیطان کی عبادت نہ کریں، یقیناً شیطان رحمان کا نافرمان ہے ابا جان! یقیناً میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ رب رحمان کی طرف سے تمہیں عذاب پہنچے گا۔ پھر تم شیطان کے دوست ہو جاؤ گے۔''

اس پر ان کا باپ کہنے لگا:

﴿اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّاo﴾ (مریم: ٤٦)

''ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے بے رغبت ہے، اگر تو اس سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگ سار کردوں گا، تو ایک مدت کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔''

خلیل الرحمٰن نے اپنے باپ سے مزید فرمایا:

﴿اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍo﴾ (الانعام: ٧٤)

''کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے، بلاشک میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔''

امراء نیک وبد کے ساتھ نیک اعمال کی ادائیگی کرنا

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویرون اقامة الحج والجهاد والجمع والاعیاد مع الامراء، ابرارًا کانوا اَو فجاراً.))

''اہل سنت امراء کے ساتھ وہ نیک ہوں یا بد، حج، جہاد، جمعہ اور عیدوں کی ادائیگی کو درست خیال کرتے ہیں۔''

شرح: ......[ابرارًا] ...... یہ بَرّ کی جمع ہے، بہت زیادہ اطاعت گزار اور ''الفجار'' فاجر کی جمع ہے۔ بہت زیادہ گناہ گار۔ اہل سنت، اہل بدعت کے برعکس امیر کے ساتھ حج کی ادائیگی درست خیال کرتے ہیں، اگرچہ وہ پرلے درجے کا فاسق ہی کیوں نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ نے ۹ھ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا، اس دن سے لے کر آج تک مسلمانوں کا معمول رہا ہے کہ وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے ایک امیر الحج مقرر کرتے ہیں، اور یہی امر مشروع ہے، اس لیے کہ اس دوران انہیں ایسے امیر کی ضرورت ہوتی ہے جس کی اقتدا میں وہ فریضہ حج ادا کرسکیں۔ بصورت دیگر عازمین حج میں اختلاف پیدا ہوگا اور وہ بدنظمی کا شکار ہوجائیں گے۔

وہ فاسق امراء کے ساتھ بھی فریضہ حج کی ادائیگی کو درست خیال کرتے ہیں، یہاں تک کہ اگر وہ اس دوران شراب نوشی

بھی کریں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ چونکہ یہ امام فاجر ہے لہٰذا ہم اس کی امامت کو قبول نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اولی الامر کی اطاعت کرنا واجب ہے، اگرچہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ اس کا فسق اسے ایسے کفر صریح تک نہ پہنچادے جس بارے ہمارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی برہان موجود ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس قسم کے امیر کی اطاعت نہیں کی جائے گی، بلکہ اسے مسلمانوں کے امور سرانجام دینے کے منصب سے معزول کر دینا واجب ہوگا۔ لیکن فسق سے کم درجہ کا فجور جس قدر بھی زیادہ ہو اس کی وجہ سے اس کی ولایت سے معزولی درست نہیں ہوگی بلکہ وہ ثابت رہے گی، ولی الامر کی اطاعت غیر معصیت میں واجب ہے، جبکہ خوارج اسے تسلیم نہیں کرتے، ان کے نزدیک ایسے ولی الامر کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ ان کا قاعدہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہ ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ بات رافضیوں کے بھی خلاف ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ امام صرف معصوم ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہ کہ امت اسلامیہ اس دن سے لے کر آج تک امام سے محروم ہے جب وہ غائب ہو گئے تھے اور جنہیں وہ امام منتظر خیال کرتے ہیں۔ اور چونکہ امت اسلامیہ امام سے محروم ہے، لہٰذا وہ امام کی عدم موجودگی میں جہالت کی موت مر رہی ہے، رافضیوں کے نزدیک صرف معصوم ہی امام ہوسکتا ہے ان کے نزدیک کسی بھی امیر کے ساتھ نہ تو حج ہوسکتا ہے اور نہ جہاد اس لیے کہ امام کا ابھی ظہور نہیں ہوا، لیکن اہل سنت کے نزدیک فریضہ حج کی ادائیگی نیک یا بد امراء کے ساتھ درست ہے، اسی طرح فاسق امیر کے ساتھ جہاد کرنا بھی درست ہے، وہ اس امیر کے ساتھ بھی فریضہ جہاد کی ادائیگی کو درست سمجھتے ہیں جو ان کے ساتھ باجماعت نماز نہیں پڑھتا بلکہ اپنی اقامت گاہ میں ہی پڑھ لیتا ہے۔

اس حوالے سے وہ دور بینی سے کام لیتے ہیں، اس لیے کہ ان امور میں امراء کے ساتھ اختلاف سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی معصیت لازم آتی ہے اور اس سے بڑے بڑے فتنے جنم لیتے ہیں۔

یہ ائمہ کے خلاف خروج کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں فتنوں کا دروازہ کھل گیا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔

اسی لیے اہل سنت کے نزدیک فریضہ حج و جہاد کی ادائیگی امراء کے ساتھ واجب ہے اگرچہ وہ فسق و فجور کے ہی مرتکب ہوتے ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اہل سنت والجماعت امیر کے اس فعل کو قابل انکار نہیں سمجھتے، وہ ان کے نزدیک فعل منکر ہی ہے، اور یہ کہ امیر کی طرف سے منکر کا ارتکاب عام لوگوں کے ارتکاب منکر سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ فاسق وفاجر امراء کے ساتھ نماز جمعہ بھی ادا کر لیتے ہیں۔

مثلاً اگر کوئی امیر شراب نوشی کرتا اور لوگوں پر مظالم ڈھاتا ہو تو ہم اس کی اقتدا میں بھی نماز جمعہ ادا کر لیں گے اور ہماری یہ نماز درست ہوگی، حتی کہ اہل سنت کے نزدیک بدعتی اِمام کے پیچھے بھی نماز جمعہ کی ادائیگی درست ہے بشرطیکہ اس کی بدعت کفر تک نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس قسم کے امور میں امام سے اختلاف کرنا تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے پیچھے کس طرح نمازیں پڑھیں؟، حج، جہاد، جمعہ اور عیدین میں ان کی متابعت کیسے کریں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے امام ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل میں ان کی بات سنیں گے بھی اور ان کی اطاعت بھی کریں گے:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

''اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔''

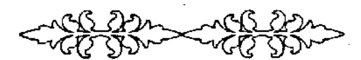
وہ اس حوالے سے نبی کریم ﷺ کے اس حکم کی بھی اتباع کرتے ہیں: ''یقیناً تم میرے بعد اپنی حق تلفی اور ایسے امور دیکھو گے جنہیں تم اچھا نہیں سمجھو گے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم ان کا حق ادا کرو اور اپنے حق کا اللہ سے سوال کرو۔''[1] ان کا حق یہ ہے کہ اللہ کی معصیت کے علاوہ ان کی اطاعت کی جائے۔

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سلمہ بن یزید جعفی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ! اگر ایسے لوگ ہمارے امراء بن جائیں جو ہم سے تو اپنے حق کا مطالبہ کریں جبکہ ہم سے ہمارا حق روک دیں، تو ایسے میں آپ ہمیں کیا حکم دیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سنو اور اطاعت کرو، وہ اپنی ذمہ داری ادا کریں اور تم اپنی ذمہ داری ادا کرو۔''[2]

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے خوشی اور ناخوشی، تکلیف اور آسانی ہر حال میں سمع و طاعت پر آپ ﷺ سے بیعت کی، گو ہماری حق تلفی ہو رہی ہو اور یہ کہ ہم امراء سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: ''مگر یہ کہ تم علانیہ کفر دیکھو جس کے لیے تمہارے پاس اللہ سے کوئی دلیل ہو۔''[3]

نیز اس لیے بھی کہ اگر ہم ان کی متابعت سے ہاتھ کھینچ لیں گے تو طاعت کی لاٹھی پھاڑ ڈالیں گے جس کے نتیجے میں سنگین قسم کے حالات پیدا ہوں گے اور بڑی بھاری مصیبتیں ٹوٹ پڑیں گی۔

رہے علماء کے درمیان اختلافی اور تاویلی امور، تو اگر حکمران ان کا ارتکاب کریں، تو ایسے امور میں ہمارے لیے ان کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہوگا، البتہ غیر اجتہادی امور میں بقدر استطاعت ان کی خیر خواہی کرنا واجب ہے، رہے اجتہادی امور: تو ان کے بارے میں ان سے تقدیر و احترام پر مبنی بحث کی جائے گی، لیکن ایسا حق واضح کرنے کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ ذاتی تسکین اور ان پر محض تنقید کرنے کے لیے۔ رہا ان کو ردّ کرنا اور ان کی اطاعت نہ کرنا تو یہ اہل سنت کا طریقہ نہیں ہے۔



[1] اسے بخاری (۷۰۵۲) اور مسلم (۱۸۷٤) نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] اسے مسلم (۱۸٤٦) نے روایت کیا۔

[3] اسے بخاری (۲۵۰۷) اور مسلم (۱۷۰۹) نے روایت کیا۔



اہل سنت کا فرض نماز کو باجماعت ادا کرنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویحافظون علی الجماعات .)) ''اور وہ جماعتوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔''

شرح: ......یعنی اہل سنت والجماعت پانچوں نمازوں میں اقامت جماعت پر محافظت کرتے ہیں، بایں طور کہ اذان سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ جو شخص پانچ نمازوں پر محافظت نہیں کرتا تو وہ جتنی جماعتوں سے محروم رہے گا اہل سنت کی اتنی ہی صفات سے محروم ہوگا۔

جماعات میں کسی رائے پر اجماع اور اس میں نزاع پیدا نہ کرنا بھی اس میں داخل ہوسکتا ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''آسانیاں پیدا کرنا، مشکلات پیدا نہیں کرنا، خوشخبری دینا اور متنفر نہیں کرنا، ایک دوسرے کی بات ماننا اور باہم اختلاف نہیں کرنا۔''[1]

اُمت کی خیر خواہی کرنا دینی فریضہ ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویدینون بالنصیحة للأمة .)) ''وہ امت کی خیر خواہی کرنے کو دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔''

شرح: ...... [یدینون] ......یعنی وہ امت کی خیر خواہی کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس کے دین ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

امت کی خیر خواہی کا باعث کبھی اللہ کی بندگی کے علاوہ کوئی اور امر بھی ہوتا ہے، انسان کو کبھی اس پر غیرت آمادہ کرتی ہے، کبھی سزا کا خوف، اور کبھی مسلمانوں کو نفع پہنچانے کی خاطر اخلاق فاضلہ سے متصف ہونا اس کا سبب بنتا ہے۔

مگر اہل سنت اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری اور اس کے لیے تدین کی خاطر امت کی خیر خواہی کرتے ہیں، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دین خیر خواہی کا نام ہے، دین خیر خواہی کا نام ہے، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کس کی خیر خواہی؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ کی خیر خواہی، اللہ کے رسول کی خیر خواہی، مسلمانوں کے ائمہ کی خیر خواہی، اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی۔''[2]

اللہ تعالیٰ کی خیر خواہی سے مراد اس تک رسائی کے لیے صدق طلب ہے۔

رسول علیہ الصلاۃ والسلام کی خیر خواہی سے مراد ان کی سچی اتباع ہے جو کہ اس دین کے دفاع کو مستلزم ہے جسے لے کر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ''اور اس کی کتاب کی خیر خواہی۔''

---

[1] اسے بخاری (۴۳۴۲، ۴۳۱۴) اور مسلم (۱۷۳۳) نے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا۔

[2] اسے مسلم (۵۵) نے روایت کیا۔

وہ اس امر کو واضح کر کے قرآن کی خیر خواہی کرتا ہے کہ وہ کلام اللہ ہے، منزل من اللہ ہے، غیر مخلوق ہے، اور یہ کہ اس کی خبر کی تصدیق کرنا، اور اس کے احکام کی تعمیل کرنا واجب ہے۔ اور وہ ان باتوں کا خود بھی اعتقاد رکھتا ہے۔ ائمة المسلمين: ہر وہ شخص جس کے سپرد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا کوئی معاملہ کر دے وہ اس بارے میں ان کا امام ہے، ملک کا سربراہ امام عام ہوتا ہے۔ جبکہ گورنر، وزیر، مدیر، رئیس اور امام مسجد وغیرہم امام خاص کہلاتے ہیں۔ عام مسلمان وہ ہیں جو ان ائمہ کی اتباع کرتے ہیں۔

علمائے کرام کا شمار مسلمانوں کے باعظمت ائمہ میں ہوتا ہے، ان کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے محاسن کو پھیلایا جائے ان کی کوتاہیوں سے صرف نظر کیا جائے، اور ان کی صواب تک رسائی کی حرص کی جائے۔ وہ اس طرح کہ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو ان کی راہنمائی کی جائے، ان کی غلطی کی اس طرح نشاندہی کی جائے جس سے ان کی عزت وکرامت مخدوش نہ ہونے پائے، اور ان کی قدر ومنزلت میں کمی نہ آنے پائے۔

مذکورہ بالا امور کا خیال نہ رکھنے کی صورت میں اسلام کا نقصان ہوگا، عوام الناس جب یہ دیکھتے ہیں کہ علماء ایک دوسرے کو گمراہ بتا رہے ہیں تو وہ ان کی نظروں سے گر جاتے ہیں، اور وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی تردید میں لگے ہوئے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ ان میں سے غلط کون ہے اور صحیح کون؟ اور یہ کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ لہٰذا وہ کسی کی بات پر بھی عمل نہیں کرتے۔ لیکن جب علماء ایک دوسرے کا احترام کریں، اور اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ راز داری کے ساتھ اس کی راہنمائی کریں، اور لوگوں کے سامنے صحیح قول پیش کریں، تو یہ مسلمان علماء کی سب سے بڑی خیر خواہی ہوگی۔ [1]

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ امت کی خیر خواہی کا میزان کیا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میزان کی طرف نبی کریم ﷺ نے یہ فرما کر اشارہ کر دیا ہے: ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ [2]

اپنے ساتھی کے ساتھ کسی قسم کا بھی کوئی معاملہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیا کریں کہ اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو آپ اسے پسند کریں گے؟ اگر نہیں تو پھر آپ بھی کسی کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کریں۔

مومن، مومن کے لیے دیوار کی مانند ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ويعتقدون معنى قوله: "المومن للمومن كالبنيان يشد بعضه بعضا" وشبك بين اصابعه))

''اور وہ آپ ﷺ کے اس ارشاد کے مفہوم پر اعتقاد رکھتے ہیں: مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی مانند ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ آپ نے اپنی انگلیاں ایک دوسری میں داخل کیں۔''

شرح: ...... نبی کریم ﷺ نے مومن کو اپنے مومن بھائی کے لیے دیوار کے ساتھ تشبیہ دی جس کا ایک حصہ دوسرے کو

---

[1] اسے بخاری (٥٧) اور مسلم (٥٦) نے جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] ایضاً



مضبوط بناتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک مضبوط عمارت بن جاتی ہے، پھر آپ نے یہ بات سمجھانے اور اس میں زور پیدا کرنے کی غرض سے اپنی انگلیاں ایک دوسری میں داخل فرمائیں۔

جب تک انگلیاں الگ الگ رہیں ان میں کمزوری رہتی ہے، پھر جب وہ ایک دوسری میں داخل ہو جائیں تو ایک دوسری کو مضبوط بنا دیتی ہیں، پس ایک مومن دوسرے مومن بھائی کے لیے دیوار کی مانند ہوتا ہے جس کی ایک اینٹ دوسری کو مضبوط بناتی ہے، اسی طرح جب مومن اپنے مومن بھائی میں کوئی نقص دیکھتا ہے تو اس کی تکمیل کر دیتا ہے، اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کی مدد کرتا ہے، اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اس کی بیمار پرسی کرتا ہے۔ الغرض! وہ اس کے جملہ احوال میں اس کا دست و بازو بن کر رہتا ہے۔

اہل سنت اس مفہوم پر اعتقاد رکھتے اور عملاً اس کی تطبیق کرتے ہیں۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقوله ﷺ: مثل المومنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد، اذا اشتكى فيه عضو، تداعى له سائر الجسد بالحمى والسهر))[1]

''اور آپ ﷺ کے اس ارشاد پر بھی کہ: مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ دوستی رکھنے، رحم کرنے اور مہربانی برتنے میں ایک جسم کی طرح ہیں، جب جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارے جسم کو بخار چڑھ جاتا ہے اور اسے نیند نہیں آتی۔''

شرح: ...... [**مثل المومنين في توادهم**] ...... یعنی ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرنے میں۔

[**وتراحمهم**] ...... ایک دوسرے پر رحم کرنے میں۔

[**وتعاطفهم**] ...... ایک دوسرے پر مہربانی کرنے میں۔

[**كالجسد الواحد**] ...... یعنی ان کی اُمیدیں، آرزوئیں اور تکلیفیں مشترکہ ہیں، وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اگر کسی کو کوئی ضرورت لاحق ہو تو اس کی ضرورت پوری کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کے لیے بڑے شفیق اور مہربان ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے سے دوستی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کوئی شخص اگر اپنے دل میں اپنے کسی مسلمان بھائی کے بارے میں نفرت اور بغض محسوس کرتا ہے تو اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کے محاسن کو یاد کرتا ہے، جس سے اس بغض و نفرت کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

جب ایک جسم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عضو بھی تکلیف محسوس کرتا ہے تو اس سے سارا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے، سب سے چھوٹی انگلی کو تکلیف، اس سے ہو تو سارا جسم تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے۔

[1] اسے بخاری: ٦٠١١ اور مسلم: ٢٥٨٦ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



کان میں درد ہو یا آنکھ میں تکلیف سارے کا سارے جسم اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بیان کردہ یہ مثال معنی کی صحیح عکاسی کرتی اور اسے انتہائی درجہ اذہان کے قریب کرتی ہے۔

مصیبت کے وقت صبر

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویامرون بالصبر عند البلاء، والشکر عند الرخاء والرضی بمر القضاء.))

''وہ مصیبت کے وقت صبر کرنے خوشحالی ملنے پر شکر ادا کرنے اور کڑوی تقدیر پر راضی رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔''

شرح:...... [یامرون]...... یہ کہنا بھی درست ہے، کہ یہ کلمہ ان کے ذاتی امور کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف: ۵۳) ''اور میں اپنے آپ کو بے قصور نہیں ٹھہراتا، یقیناً نفس برائی کا حکم دیا کرتا ہے۔''

وہ دوسروں کو حکم دینے کے ساتھ اپنے آپ کو بھی اس کا حکم دیتے ہیں، الصبر عند البلاء، الصبر: مصائب وآلام برداشت کرنا، دل، زبان اور جوارح سے نفس کو ناراضی سے روکنا۔

[البلاء]...... مصیبت، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۵-۱۵۶)

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تم کو کچھ خوف اور کچھ بھوک سے، جانوں مالوں اور پھلوں میں کمی سے، اور خوشخبری سنا دو صبر کرنے والوں کو، یعنی ان لوگوں کو کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

صبر مصیبت آنے پر ہوتا ہے، مگر سب سے اعلیٰ اور افضل صبر پہلے صدمہ پر ہوتا ہے اور صبر حقیقی کا یہی عنوان ہے۔ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسی عورت پر سے گزرے جو قبر کے قریب رو رہی تھی، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اللہ سے ڈریں اور صبر کریں'' اس پر وہ کہنے لگی: یہاں سے چلے جائیں، تمہیں میرے جیسی مصیبت نہیں پہنچی، وہ عورت آپ ﷺ کو پہچان نہیں سکی تھی، جب اسے یہ بتایا گیا کہ یہ تو نبی ﷺ تھے، تو وہ آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ حضرت! میں آپ کو پہچان نہیں سکی تھی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''صبر پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے۔''[1] صدمہ ٹھنڈا پڑنے پر صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے، جس کے ساتھ کمال صبر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اہل السنہ والجماعہ مصیبت آنے پر صبر کرنے کا حکم دیتے ہیں، ہر انسان کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو ہی جاتا ہے، کبھی

[1] اسے بخاری: ۱۲۸۳ اور مسلم: ۹۲۹ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



اس کی ذات پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے، کبھی اس کے اہل وعیال پر، کبھی مال پر، کبھی دوستوں پر، کبھی اس کے ملک پر اور کبھی عامۃ المسلمین پر۔ یہ مصیبت دنیا کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہے اور دین کے حوالے سے بھی...... دین کے حوالے سے آنے والی مصیبت دنیا کی مصیبت سے کہیں زیادہ سنگین ہوتی ہے۔

الغرض اہل سنت والجماعت دونوں حوالوں سے مصیبت پر صبر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ جہاں تک دنیوی مصیبت پر صبر کرنے کا تعلق ہے، تو جس طرح کہ ہم نے بتایا اسے برداشت کرنا چاہیے۔

رہا دینی مصیبت پر صبر کرنا، تو انسان کو مشکل حالات میں بھی اپنے دین پر ثابت قدم رہنا چاہیے، اور اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے، اور اسے ان لوگوں کی طرح نہیں ہونا چاہیے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ﴾ (العنکبوت: ۹)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، پھر جب اسے اللہ کے راستے میں کوئی تکلیف آتی ہے تو وہ لوگوں کی تکلیف کو اللہ کے عذاب جیسا بنا لیتا ہے۔''

[ویامرون]...... یعنی اہل السنہ والجماعہ۔

خوش حالی میں شکر ادا کرنا

[الشکر عند الرخاء. الرخاء]...... خوش حالی، وطن میں پر امن ہونا، یعنی اہل سنت امن اور خوشحالی کے دوران شکر ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

مصائب پر صبر کرنا مشکل ہے یا خوش حالی میں شکر ادا کرنا؟ اس بارے علماء کا اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مصیبت آنے پر صبر کرنا مشکل ہے، جب کہ بعض کے نزدیک خوش حالی میسر آنے پر شکر کرنا مشکل کام ہے، امر صائب یہ ہے کہ ہر ایک کی اپنی اپنی مشکل اور مشقت ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ٥ وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ٥﴾ (هود: ۹۔۱۰)

''اگر ہم اپنی طرف سے انسان کو آسائش کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے اسے واپس لے لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا بن جاتا ہے اور اگر اسے تکالیف کے بعد آسائشوں کا مزہ چکھائیں جو اسے پہنچتی ہیں تو وہ کہنے لگتا ہے مجھ سے برائیاں ختم ہو گئیں، یقیناً وہ بڑا خوش اور بڑا فخر کرنے والا ہوتا ہے۔''

مگر قدرے غور وفکر ان دونوں میں سے ہر ایک کو آسان بنا سکتا ہے، اگر مصیبت زدہ شخص یہ سوچ لے کہ اگر میں بے صبری کا مظاہرہ کروں گا تو اس سے یہ مصیبت ٹل تو نہیں جائے گی، اب میرے سامنے دو ہی راستے ہیں، یا تو باعزت لوگوں کی طرح صبر کروں یا پھر (چوپاؤں کی طرح) تھک ہار کر بیٹھ جاؤں، تو اس طرح اس کے لیے صبر کرنا آسان ہو جائے گا، خوشحالی



سے ہمکنار ہونے والا بھی تفکر سے کام لے کر اپنے لیے شکر گزاری کو آسان بنا سکتا ہے۔

الغرض! اہل سنت کلفت وبلاء کے وقت صبر کرنے اور خوشحالی کے وقت شکر گزاری کا حکم دیتے ہیں۔

[یامرون]...... یعنی اہل سنت والجماعت۔

کڑوا فیصلہ

[بالرضی بمر القضاء]...... رضیٰ، صبر سے بالاتر مقام ومرتبہ ہے۔ مر القضا: ایسا فیصلہ جو انسان کی طبیعت سے ملائمت نہ رکھتا ہو، اسے "مر" (کڑوا) سے تعبیر کرنے کی یہی وجہ ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کوئی ایسا فیصلہ صادر کر دے جو انسانی طبیعت سے ہم آہنگ نہ ہو، اور جس کی وجہ سے وہ اذیت میں مبتلا ہو جائے تو اسے مر القضاء (کڑوا فیصلہ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ لذیذ، یا شیریں نہیں ہوتا بلکہ کڑوا ہوتا ہے، اہل سنت کڑوے فیصلوں پر راضی رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

معلوم رہے کہ ہم مر القضاء کو دو اعتبار سے دیکھتے ہیں۔

اس اعتبار سے کہ وہ فعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوا ہے۔

اس اعتبار سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مفعول ہے۔

اس اعتبار سے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے واقع ہونے والا فعل ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس پر راضی ہوں، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر معترض نہ ہوں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر پوری طرح راضی ہونے کے زمرے میں آتا ہے۔

اس اعتبار سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مفعول ہے، اس پر راضی ہونا مسنون اور اس پر صبر کرنا واجب ہے۔ بیماری پر اس اعتبار سے راضی رہنا واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقدر کردہ ہے، اور اس کے بیماری ہونے کے اعتبار سے اس پر راضی ہونا مسنون ہے، مگر اس پر صبر کرنا واجب اور شکر کرنا مستحب ہے۔

مصیبت زدہ لوگوں کی اقسام

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ مصائب کے سامنے مصیبت زدہ لوگوں کے چار مقامات ہوتے ہیں: ناراضی، صبر، رضی اور شکر۔

مقام اول: ناراضی، مصیبت آنے پر ناراضی کا مظاہرہ کرنا حرام ہے، بلکہ اس کا شمار کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے، مثلاً چہرہ پیٹنا، بال نوچنا، کپڑے پھاڑنا، اپنے لیے ہلاکت کی بددعا کرنا اور ان جیسے دیگر اعمال جو ناراضی پر دلالت کرتے ہوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو گریبان چاک کرے اور رخساروں پر تھپڑ مارے۔"

مقام ثانی: صبر، یعنی اپنی زبان اور دل اور جوارح پر قابو رکھنا اور کسی بھی طرح ناراضی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ یہ امر واجب ہے۔

مقام ثالث: رضیٰ، اس میں اور صبر میں فرق یہ ہے کہ صبر کرنے والا کڑوا گھونٹ پیتا ہے، مگر ناراضی کا اظہار نہیں کر پاتا۔ ایک شاعر کہتا ہے ؏

وَالصَّبْرُ مِثْلُ اسْمِهِ مُرٌّ مَذَاقَتُهُ ۔۔۔ لٰكِنْ عَوَاقِبُهُ احلِىٰ مِنَ الْعَسَلِ

''صبر اپنے نام کی طرح ہے کہ اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ مگر اس کا انجام شہد سے بھی میٹھا ہوتا ہے۔''
مگر کڑوی تقدیر پر راضی رہنے والا کڑواہٹ کا مزہ نہیں چکھتا، بلکہ وہ مطمئن رہتا ہے، گویا کہ اس کے نزدیک اس مصیبت کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک تقدیر پر راضی رہنا مستحب ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس قول کو پسند کرتے ہیں، اور یہی صحیح ہے۔

چوتھا مقام: شکر، اور وہ یوں کہ انسان اپنی زبان اور حال سے ''الحمد للہ'' کہتے ہوئے اس مصیبت کو نعمت خیال کرے۔

مگر اس مقام کے بارے میں کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ یہ اس شخص کے لیے ممکن ہے جسے اللہ توفیق عطا فرمائے۔ اس لیے کہ:

اولاً: جب اسے یہ معلوم ہو کہ یہ مصیبت گناہوں کا کفارہ ثابت ہوگی، اور یہ کہ دنیا میں گناہ کی سزا آخرت کی سزا سے بہت آسان ہے، تو یہ مصیبت اس کے نزدیک نعمت قرار پائے گی، جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا۔

ثانیاً: جب وہ اس مصیبت پر صبر کرے گا، تو ثواب سے نوازا جائے گا، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر: ۱۰)

''صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔''

جب انسان کو اس بات کا علم ہوگا تو وہ اس مصیبت پر اللہ کا شکر ادا کرے گا۔

ثالثاً: ارباب سلوک کے نزدیک صبر کا شمار مقامات عالیہ میں ہوتا ہے، جس کا حصول اس کے اسباب کے وجود سے ہی ممکن ہے، لہٰذا وہ اس مقام کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ کسی عبادت گزار خاتون کی انگلی پر زخم آیا تو اس نے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو وہ کہنے لگی: اس کے اجر کی حلاوت نے مجھے اس پر صبر کی کڑواہٹ بھلا دی ہے۔ الغرض اہل سنت مصیبت پر صبر کرنے، خوش حالی پر شکر کرنے اور کڑوی تقدیر پر راضی رہنے کا حکم دیتے ہیں۔

قضاء کے معانی

تتمہ: قضاء کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔

پہلا معنی: اللہ تعالیٰ کا وہ حکم جو اس کی قضاء اور وصف ہے اس پر ہر حالت میں راضی ہونا واجب ہے۔ وہ قضاء دینی ہو یا کونی، اس لیے کہ وہ اللہ کا حکم ہے، اور اس کی ربوبیت پر پورے طور پر راضی ہونے کے قبیل سے ہے۔

دینی قضاء کی مثال اس کا کسی چیز کے بارے میں وجوب، تحریم اور حلت کا فیصلہ ہے، یہ ارشاد باری تعالیٰ اس سے تعلق رکھتا ہے:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ﴾ (الاسراء: ۲۳)

''اور تیرے رب نے فیصلہ کن حکم فرمایا ہے کہ نہ عبادت کرنا مگر صرف اس کی۔''

کونی قضاء کی مثال اس کی طرف سے نرمی، شدت، غنی، فقر، صلاح، فساد، حیات اور موت کا فیصلہ ہے۔



اس سے یہ ارشاد ربانی تعلق رکھتا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ﴾ (سباء: ١٤) ''پھر جب ہم نے اس پر موت کا حکم صادر کیا۔''

نیز:...... ﴿وَ قَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ فِي الْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا﴾ (بنی اسرائیل: ٤)

''اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ ضرور فساد مچاؤ گے اور بڑی بری قسم کی سرکشی کرو گے۔''

دوسرا معنی: مقضی ، یعنی جس چیز کا فیصلہ کیا گیا، اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جس چیز کا شرعاً فیصلہ کیا گیا، اس پر راضی ہونا اور اسے قبول کرنا واجب ہے، انسان مامور بہ پر عمل کرے گا، منع کردہ چیز کو ترک کرے گا، اور حلال سے لطف اندوز ہوگا۔

دوسری قسم: جس چیز کا کونی طور پر فیصلہ کیا گیا۔

اگر وہ اللہ کا فعل ہے، جیسا کہ فقر، بیماری، قحط، ہلاکت وغیرہا، تو قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ صحیح قول کی رو سے اس پر راضی ہونا سنت ہے واجب نہیں ہے۔

اگر وہ بندے کا فعل ہے، تو اس میں پانچ احکام واجب ہوں گے، واجب پر راضی رہنا واجب، مستحب پر مستحب، مباح پر مباح، مکروہ پر مکروہ اور حرام پر حرام ہے۔

اہل السنہ والجماعہ کی صفت کہ لوگوں کو مکارم اخلاق کی دعوت دینا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویدعون الی مکارم الاخلاق ومحاسن الاعمال.))

''وہ لوگوں کو مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی دعوت دیتے ہیں۔''

شرح:......[مکارم الاخلاق]......یعنی پاکیزہ اور عمدہ اخلاق، کریم: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم نوع چیزوں میں سب سے زیادہ عمدہ واشرف ہو۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی قبیل سے ہے: ایاك و كرائم اموالهم. ❶ اپنے آپ کو لوگوں کے عمدہ مال سے بچانا'' یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اہل یمن سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم فرمایا تھا۔

[الاخلاق]......خلق کی جمع ہے، اور یہ انسان کی اندرونی صورت سے عبارت ہے، مثلاً عادات وطبائع۔ اہل سنت اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کا اندرون عمدہ اور پاکیزہ ہو، وہ جود وکرم اور شجاعت ودلیری کو پسند کرے، صبر

❶ اسے بخاری: ٤٣٤٧ اور مسلم: ١٩ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

کرے اور اپنے اندر قوت برداشت پیدا کرے، لوگوں کے ساتھ خندہ روئی، کھلے دل اور اطمینان قلبی سے ملے، یہ سب چیزیں مکارم اخلاق میں شمار ہوتی ہیں۔

محاسن اعمال کی دعوت دینا

رہے "**محاسن الاعمال**" تو ان کا تعلق جوارح کے ساتھ ہوتا ہے، جو کہ اعمال تعبدیہ کو بھی شامل ہیں اور غیر تعبدیہ کو بھی۔ مثلاً بیع وشراء اور اجارہ، اہل سنت لوگوں کو جملہ اعمال میں سچائی اور خیر خواہی اختیار کرنے اور کذب وخیانت سے اجتناب کرنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ ان امور کی طرف صرف دوسروں کو ہی دعوت نہیں دیتے بلکہ خود بھی ان پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

حسن اخلاق کا مالک کامل ایمان والا ہے

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویعتقدون معنی قوله: اکمل المومنین ایمانا احسنهم اخلاقا .))[1]

"اور وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے مفہوم پر اعتقاد رکھتے ہیں: اہل ایمان میں سے سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کا اخلاق ان سب سے اچھا ہے۔"

شرح: ...... نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث ہمیشہ بندہ مومن کے پیش نظر رہنی چاہیے۔ اہل ایمان میں سے سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کا اخلاق ان سب سے اچھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی اور اس کے بندوں کے ساتھ بھی۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن خلق کے مظاہر یہ ہیں کہ اس کے جمیع اوامر کو تسلیم کیا جائے، ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور انہیں کھلے دل سے قبول کیا جائے۔

جہاں تک مخلوق کے ساتھ خوش اخلاقی کا تعلق ہے، تو کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے: جود وکرم کی عادت اپنانا، ایذا رسانی سے باز رہنا اور خندہ پیشانی سے پیش آنا۔

جود وکرم صرف مال کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق مال و جاہ اور نفس کے ساتھ بھی ہے۔

اس طرح بندہ مومن اپنے قول وفعل کے ساتھ بھی کسی کو اذیت نہیں پہنچاتا۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویندبون الی ان تصل من قطعك و تعطی من حرمك ، وتعفو عمن ظلمك .))

"وہ اس بات کی بھی دعوت دیتے ہیں کہ آپ قطع تعلقی کرنے والے کے ساتھ صلہ رحمی کریں، محروم کرنے والے

[1] اسے احمد: ۲/ ۲۵۰۔ ترمذی: ۲۶۱۲۔ ابوداود: ٤٦٨٢۔ حاکم نے المستدرک: ۱/ ۵۳ اور ابن حبان ۲/ ۲۲۷ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، اس حدیث کو شیخ البانی نے الصحیحہ: ۲۸٤ میں حسن کہا ہے۔



کو عطا کریں اور جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دیں۔''

شرح:...... [یندبون]......یعنی وہ دعوت دیتے ہیں۔

[**ان تصل من قطعك**]......یعنی وہ قرابت دار جن کے ساتھ صلہ رحمی کرنا آپ پر واجب ہے اگر وہ آپ کے ساتھ قطع رحمی کریں تو آپ ان کے ساتھ بھی صلہ رحمی کریں، اور صرف صلہ رحمی کرنے والوں کے ساتھ ہی صلہ رحمی نہ کریں، اس لیے کہ یہ صلہ رحمی نہیں ہے۔ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بدلہ لینے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے۔''[1]

ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ! میرے قرابت دار ہیں، میں تو ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں مگر وہ مجھ سے قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، میں ان کے بارے میں بردباری کا مظاہرہ کرتا ہوں جبکہ وہ میرے خلاف جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تیری بات درست ہے تو گویا تو ان کے منہ میں راکھ ڈالتا ہے۔ اور جب تک تو اس حالت پر رہے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا۔''[2]

اہل سنت اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کریں جو آپ کے ساتھ قطع رحمی کرتے ہیں، اور جو آپ سے صلہ رحمی کرے اس کے ساتھ بطریق اولیٰ صلہ رحمی کریں۔ اس لیے کہ جو شخص آپ کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور وہ آپ کا قرابت دار بھی ہے تو اس کے آپ پر دو حق واجب ہو جاتے ہیں: حق قرابت اور حق مکافات اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''جو شخص تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے اسے اس کا بدلہ دیا کرو۔''[3]

[**وتعطی من حرمك**] ...... یعنی جو شخص تجھ سے تیرے حق کی ادائیگی روک دے تو اسے بھی دے، اس کے بدلے کے طور پر تجھے اس کا حق نہیں روکنا چاہیے۔

[**وتعفو عمن ظلمك**] ...... یعنی جو شخص تجھ پر زیادتی کرتے ہوئے یا امر واجب کی ادائیگی نہ کرتے ہوئے تجھ پر ظلم کرے اور تیرا حق دبائے تو تو اسے معاف کر دے۔

ظلم کا دارو مدار دو چیزوں پر ہے، زیادتی اور انکار۔ یعنی وہ تجھے مار پیٹ کر، تجھ سے تیرا مال چھین کر، یا تیری عزت و آبرو پامال کر کے تجھ پر زیادتی کرے، یا تیرے حق سے انکار کرتے ہوئے اس کی ادائیگی روک دے، تو تو اسے معاف کر دے۔ اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کو معاف کرے۔

مگر یہ بات یاد رہے کہ معافی اس وقت ہوتی ہے، جب انسان انتقام لینے پر قادر ہو، اگر آپ انتقام پر قدرت رکھنے کے باوجود کسی کو معاف کرتے ہیں، تو اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔

---

[1] اسے بخاری : ۵۹۹۱ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔
[2] اسے مسلم (۲۵۵۸) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔
[3] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

اولاً: یا تو آپ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اس لیے کہ معاف کرنے والے اور اصلاح کرنے والے کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے۔

ثانیاً: آپ اپنے اور اپنے اس ساتھی کے درمیان دوستی میں بہتری لانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ اگر آپ اس کی برائی کا بدلہ برائی کے ساتھ دیں گے، تو تمہارے درمیان برائی مسلسل جاری رہے گی اور اگر برائی کے بدلے احسان سے کام لیں گے تو وہ شرمسار ہوگا اور پھر آپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے لگے گا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ (فصلت : ٣٤)

''اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں، برائی کو اچھائی سے ٹال دیا کریں، تو پھر یہ ہوگا کہ جس شخص میں اور آپ میں عداوت ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔''

قدرت ہونے کے باوجود معاف کر دینا اہل سنت کی پہچان ہے، بشرطیکہ اس سے اصلاح ہو سکتی ہو اور اگر معافی برائی کو متضمن ہو تو پھر وہ اس کی دعوت نہیں دیتے، اس لیے کہ اس کی شرط خود اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ﴾ (الشوریٰ : ٤٠) ''پس جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے۔''

یعنی اسے معاف کرنے سے اصلاح ہوتی ہو، مگر جس شخص کو معاف کرنے سے برائی پیدا ہوتی ہو یا معافی برائی کا سبب بن سکتی ہو، تو اس صورت میں ہم معاف کرنے کی بات نہیں کرتے، مثلاً اگر مجرم کو معاف کرنا اس کے لیے مجرمانہ زندگی گزارنے کے تسلسل کا سبب بن سکتا ہو، تو ایسے موقع پر معاف نہ کرنا افضل ہے، اس صورت میں کبھی معاف نہ کرنا واجب بھی ہو سکتا ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

- مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویامرون ببر الوالدین .)) ''اور وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں۔''

شرح:......اور یہ اس لیے کہ اولاد پر ان کا بڑا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے بعد والدین کا حق رکھا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (النساء : ٣٦)

''اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔''

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا حق بھی آ جاتا ہے، اس لیے کہ عبادت کی ادائیگی اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی، جب تک نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کر کے اور ان کی اطاعت کر کے اس کا حق ادا نہ کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کے طریقہ سے ہٹ کر اللہ کی عبادت کس طرح ہو سکتی ہے؟ آپ ﷺ کا حق اسی صورت ادا ہوگا، جب



آپ کی شریعت کے تقاضوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اور نبی مکرم ﷺ کے حق کے بعد والدین کا حق ہے، اس لیے کہ والدین ...... اور خصوصاً ماں ...... اپنی اولاد کے لیے بڑی مشقت برداشت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا﴾ (الاعراف: ۱۵)

''اور ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے، اس کی ماں نے اسے بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور اسے بڑی مشقت کے ساتھ جنا۔''

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ وَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ﴾ (لقمان: ٤)

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکیدی حکم دیا، اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا۔''

ماں دوران حمل بھی، وضع حمل کے وقت بھی، اور پھر وضع حمل کے بعد بھی مشقت اٹھاتی ہے، چونکہ ماں باپ کی شفقت سے کہیں زیادہ اپنے بچے پر شفقت کرتی ہے، لہٰذا وہ سب لوگوں سے زیادہ حتیٰ کہ باپ سے بھی زیادہ حسن صحبت اور حسن سلوک کی حقدار ہے۔ ایک آدمی کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میری حسن صحبت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تیری ماں'' وہ کہنے لگا: پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے کہا: پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں'' آپ نے چوتھی دفعہ فرمایا: ''پھر تیرا باپ۔''[1]

باپ بھی اپنی اولاد کے لیے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتا ہے، وہ انہیں پریشان دیکھ کر پریشان ہو جاتا اور انہیں خوش دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے، ان کی راحت و آسائش، اطمینان اور خوشگوار زندگی کے لیے ہر ممکن اسباب اختیار کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے، اپنے اور اپنی اولاد کے لیے روزگار کے حصول کے مقصد کی غرض سے جنگلات اور بیابان تک چھان مارتا ہے۔

اولاد پر ماں کا حق بھی ہے، اور باپ کا بھی، آپ کچھ بھی کریں، ان کا حق کبھی ادا نہیں کر سکیں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ (الاسراء: ٢٤) اور یوں کہتے ہوئے دعا کیا کرو، ہمارے رب! ان پر اس طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے میری پرورش کی جبکہ میں چھوٹا تھا۔''

ان کا تجھ پر گزشتہ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے تجھے تیرے بچپن میں پالا جبکہ تو اپنی جان کے لیے بھی نفع ونقصان کا مالک نہیں تھا، لہٰذا ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا تجھ پر واجب ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا بالاتفاق ہر انسان پر فرض عین ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے اس حق کو جہاد فی سبیل اللہ پر بھی مقدم رکھا جس طرح کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، ان کا بیان ہے کہ میں

[1] اسے بخاری: ٥٩٧١ اور مسلم: ٢٥٤٨ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل زیادہ پسند ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''وقت پر نماز ادا کرنا۔'' میں نے کہا: پھر کون سا عمل؟ آپ نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔'' میں نے کہا: اس کے بعد؟ فرمایا: ''فی سبیل اللہ جہاد کرنا۔'' [1]

والدین سے مراد باپ اور ماں ہے، رہے دادا اور دادی، تو ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا چاہیے، مگر وہ باپ اور ماں کے ساتھ حسن سلوک کے برابر نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ماں باپ نے جو مشقت اٹھائی، اولاد کی جس طرح نگہبانی کی اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھا، یہ کردار صرف انہیں کا ہی ہوسکتا ہے دادا، دادی کا نہیں۔ مگر صلہ رحمی کے حوالے سے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی واجب ہے۔ وہ دوسرے رشتہ داروں کے مقابلے میں صلہ رحمی کے زیادہ حق دار ہیں، مگر بر (حسن سلوک) صرف ماں باپ کا استحقاق ہے، اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ البر (حسن سلوک) کا کیا مطلب ہے؟

البر : بقدر استطاعت خیر و بھلائی کرنا اور برے سلوک سے باز رہنا، کے مفہوم میں ہے۔

والدین پر مال خرچ کرنا، ان کی خدمت کرنا، انہیں خوش رکھنا، خندہ پیشانی سے ملنا، ان سے خوبصورت انداز میں گفتگو کرنا، ان کے ساتھ خوبصورت رویے کا مظاہرہ کرنا، اور ہر وہ کام کرنا جس سے انہیں راحت وسکون حاصل ہو، یہ سب کچھ (البر) کے زمرے میں آتا ہے۔

اسی لیے راجح قول یہ ہے کہ اولاد پر ماں باپ کی خدمت کرنا واجب ہے، مگر یہ اس صورت میں ہے، جب اس سے اولاد کو کوئی ضرر لاحق نہ ہوتا ہو، اس صورت میں اس پر ان کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے، الا یہ کہ اس کی کوئی شدید ضرورت لاحق ہو۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں: والدین کی اطاعت کرنا ان امور میں واجب ہے، جن میں ان کی منفعت ہو، اور اس سے اولاد کو بھی کوئی ضرر لاحق نہ ہوتا ہو۔ اور اگر اسے اس سے کوئی ضرر لاحق ہوتا ہو، وہ بدنی ہو یا دینی، تو پھر ان کی اطاعت کرنا واجب نہیں ہے، مثلاً وہ اسے کسی واجب کے ترک کرنے یا کسی حرام امر کے ارتکاب کا حکم دیں تو اس صورت میں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی، رہا مال کے ساتھ ان سے حسن سلوک کرنا تو اسے ان پر خرچ کرنا واجب ہے، اگرچہ وہ زیادہ ہی کیوں نہ ہو، بشرطیکہ اس سے اسے ضرر نہ پہنچتا ہو، اور اس کے ساتھ اس کی کسی حاجت کا بھی تعلق نہ ہو، اور خاص طور پر باپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اولاد کو نقصان پہنچائے بغیر جس قدر چاہے اس سے اس کا مال لے سکتا ہے۔

اگر ہم آج لوگوں کے حالات کا جائزہ لیں تو اکثر لوگ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ وہ ان کے نافرمان واقع ہوئے ہیں، لوگ اپنے دوستوں کے ساتھ تو حسن سلوک کرتے اور ان کے ساتھ بیٹھنے سے نہیں اکتاتے، مگر اپنے باپ یا ماں کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھنے سے بھی اکتا جاتے ہیں، یوں لگتا ہے، جیسے وہ آگ کے انگارے پر بیٹھے ہوں، یہ شخص ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا نہیں ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا وہ شخص ہے جو اپنے والدین کو مل کر خوش ہو، حتیٰ الامکان ان کی خدمت کرے اور جہاں تک ہو سکے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے۔

---

[1] اسے بخاری: ۵۹۷۰ اور مسلم: ۸۵ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا آخرت میں تو ثواب عظیم سے نوازا ہی جائے گا اسے اس کا صلہ دنیا میں بھی ملا کرتا ہے، اور جس طرح کہ عوام کہتے ہیں حسن سلوک اور نافرمانی ایسا قرضہ ہیں جو جلد ہی واپس مل جاتا ہے، اگر آپ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو آپ کی اولاد آپ کے ساتھ یہی رویہ اختیار کرے گی اور اگر آپ ان کی نافرمانی کریں تو آپ کی اولاد بھی آپ کی نافرمان ہی ثابت ہوگی۔

جس طرح اہل سنت والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم کرتے ہیں۔

صلہ رحمی کا حکم دینا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وکذلك یامرون بصلة الارحام .)) ''اسی طرح وہ صلہ رحمی کا بھی حکم دیتے ہیں۔''

شرح: ......والدین اور دوسرے سے قرابتداروں میں فرق ہے، قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنی چاہیے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک، حسن سلوک صلہ رحمی سے بلند تر حیثیت رکھتا ہے، اور یہ اس لیے کہ حسن سلوک خیر واحسان کی کثرت سے عبارت ہے، جبکہ صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ قطع رحمی نہ کی جائے۔ اسی لیے تارک بر کو نافرمان اور صلہ رحمی نہ کرنے والے کو قطع تعلق کرنے والا کہا جاتا ہے۔ صلہ رحمی کرنا واجب، اور اسے قطع کرنا لعنت اور دخول جنت سے محرومی کا سبب ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ٥ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ٥﴾ (محمد: ٢٢-٢٣)

''آیا تم کو یہ احتمال ہے کہ اگر تم حاکم بن جاؤ یہ کہ تم زمین میں فساد برپا کر دو، اور اپنے رشتے ناطے توڑ ڈالو، یہی تو وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، سو اس نے انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔''

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''[1]

چونکہ قرآن وسنت میں صلہ کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے، لہٰذا اس کے مفہوم کے لیے عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ جس چیز کو لوگ صلہ کے نام سے موسوم کریں گے، وہ صلہ ہوگا اور اس کے برعکس جسے وہ قطیعہ (قطعی رحمی) کا نام دیں گے وہ قطیعہ ہوگا، جو کہ احوال وازمان، مقامات اور لوگوں کے اختلاف سے مختلف ہوسکتا ہے، جب آپ کے قرابت دار فقر وفاقہ سے دوچار ہوں اور آپ مالدار، تو ان حالات میں ان کے ساتھ صلہ رحمی یہ ہے کہ آپ اپنے حالات کے مطابق ان پر خرچ کریں۔

اگر وہ بانصیب اور کھاتے پیتے لوگ ہوں تو ممکن ہے ان سے میل جول رکھنا اور وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات کرتے رہنا صلہ رحمی میں شمار ہو۔

---

[1] اسے بخاری: ٥٩٨٤۔ اور مسلم: ٢٥٥٦ نے جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



ہمارے اس زمانے میں صلہ رحمی کا رجحان کم ہوگیا ہے، لوگ اپنے اپنے کام کاج اور ضروریات میں اس قدر مصروف ہوگئے ہیں کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں، مکمل صلہ رحمی یہ ہے کہ آپ رشتہ داروں کے حالات سے آگاہ ہوں، ان کی اولاد کے امور سے واقف اور ان کی مشکلات سے باخبر ہوں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ مفقود ہے، جس طرح کہ مکمل صلہ رحمی بھی اکثر لوگوں میں مفقود ہے۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وحسن الجوار.)) ''اور وہ اچھی ہمسائیگی کا بھی حکم دیتے ہیں۔''

شـــرح: ......یعنی اہل سنت ہمسائیوں کے ساتھ اچھی ہمسائیگی کا حکم دیتے ہیں، گھر کے قریب رہنے والے ہمسائے ہوتے ہیں، ان میں سے جو جس قدر قریب ہوگا وہ احسان واکرام کا زیادہ حقدار ہوگا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ (النساء: ٣٦)

''اور والدین کے ساتھ احسان کرو، اور قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، قرابت دار پڑوسیوں کے ساتھ اور اجنبی پڑوسیوں کے ساتھ۔''

پڑوسیوں کے حقوق

اللہ تعالیٰ نے قرابت دار پڑوسیوں کے ساتھ بھی اور دور کے پڑوسیوں کے ساتھ بھی احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کی عزت کیا کرے۔''[1]

آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: ''مجھے جبرئیل امین علیہ السلام پڑوسی کے بارے میں وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے سمجھا کہ وہ اسے وارث قرار دے دیں گے۔''[2]

آپ کا فرمان ہے: ''اللہ کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا۔'' کہا گیا: کون اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے ہمسائے اس کی بدسلوکیوں سے محفوظ نہ ہوں۔''[3]

ان کے علاوہ بھی متعدد ایسی نصوص وارد ہیں جو ہمسائے کا خیال رکھنے، اس کے ساتھ احسان کرنے اور اس کی عزت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

پڑوسی اگر قرابت دار اور مسلمان ہو تو اس کے تین حقوق ہوتے ہیں، حق اسلام، حق قرابت اور حق ہمسائیگی۔ اگر وہ

[1] اسے مسلم: ٢٦٢٥ نے روایت کیا۔ [2] اسے بخاری: ٦٠١٤ اور مسلم ٢٦٢٤ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔
[3] اسے بخاری: ٦٠١٦ نے ابوشریح خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

قرابت دار اور ہمسایہ ہے، تو پھر اس کے دو حق ہیں، حق قرابت اور حق ہمسائیگی۔

اور اگر وہ غیر قرابت دار اور مسلمان ہے تو بھی اس کے دو حق ہیں: حق اسلام اور حق ہمسائیگی۔

اہل سنت حسن ہمسائیگی کا حکم مطلقاً دیتے ہیں، ہمسایہ کوئی بھی ہو، البتہ قرابت دار ہمسایہ دوسروں سے زیادہ حق رکھتا ہے۔

یہ بات لائق صد افسوس ہے کہ بعض لوگ غیروں سے زیادہ اپنے ہمسائیوں سے برا سلوک کرتے ہیں، وہ ان پر زیادتی کرتے ہوئے کبھی ان سے ان کی کوئی مملوکہ چیز چھین لیتے ہیں اور کبھی انہیں مختلف طریقوں سے پریشان کرتے ہیں۔

مسلمان فقہائے کرام رحمہم اللہ نے فقہ میں باب الصلح کے آخر میں ہمسائیوں کے کچھ احکام ذکر کیے ہیں، شائقین حضرات ادھر رجوع فرمائیں۔

یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والاحسان الی الیتامی والمساکین وابن السبیل .))

''وہ یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے ساتھ احسان کرنے کا بھی حکم دیتے ہیں۔''

شرح:......یعنی اہل سنت ان تین قسم کے لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

[**الیتامی**] ..... یہ یتیم کی جمع ہے، جس کا باپ قبل از بلوغت فوت ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی یتیموں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے بھی متعدد احادیث میں اس کی ترغیب دلائی ہے۔ [1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ کے سایہ عاطفت سے محرومی کے بعد اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور اس حالت میں اسے توجہ اور شفقت کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

یتامیٰ کے ساتھ احسان حسب حال ہوگا۔

[**المساکین**]..... اس سے مراد فقراء ہیں، اس جگہ یہ لفظ فقیر اور مسکین دونوں کو شامل ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں فقراء و مساکین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مال فے وغیرہ میں ان کے خاص حقوق مقرر فرمائے گئے ہیں۔

مساکین کے ساتھ احسان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فقر انہیں کمزور کر دیتا اور ان کے دلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے، لہٰذا اسلام کے حسن کا تقاضا یہ ٹھہرا کہ ہم ان کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کریں۔

---

[1] ان میں سے سہل بن سعد سے مروی صحیح بخاری: ٦٠٠٥ کی یہ حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، آپ نے یہ انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔''



مساکین کے ساتھ احسان حسب حال ہوا کرتا ہے، اگر اسے کھانے کی ضرورت ہو تو اسے کھانا کھلایا جائے اور اگر لباس کی ضرورت ہو تو لباس پہنایا جائے، اور اگر کسی مجلس میں آئے تو اسے خوش آمدید کہا جانے، تاکہ اس کے احساس کمتری کو دور کیا جا سکے۔

[ابن السبیل]..... مسافر، اس جگہ اس سے وہ مسافر مراد ہے، جس کا زاد سفر ختم ہو گیا ہو یا ختم نہ بھی ہوا ہو، اس لیے کہ مسافر غریب الدیار ہوتا ہے، اور غریب الدیار شخص وحشت محسوس کیا کرتا ہے، اگر آپ اس کے اکرام واحسان کے ساتھ اسے مانوس کریں گے، تو یہ شریعت کا حکم ہے جس کی آپ تعمیل کر رہے ہوں گے۔

جب کوئی مسافر آپ کا مہمان بنے تو اس کا اکرام یہ ہے کہ آپ اس کی مہمان نوازی کریں۔

لیکن بعض علماء کے نزدیک مہمان نوازی کی صورت میں مسافر کے اکرام کا حکم دیہات کے لیے ہے شہروں کے لیے نہیں ہے، مگر ہم کہتے ہیں: ایسا کرنا دیہات میں بھی واجب ہے اور شہروں میں بھی، الا یہ کہ اس پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، مثلاً گھر تنگ ہو، یا کسی اور وجہ سے اسے مہمان کے طور پر ٹھہرانا ممکن نہ ہو، لیکن ہر حالت میں اسے باعزت طریقے سے ہی واپس لوٹانا چاہیے۔

غلام کے ساتھ شفقت برتنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والرفق بالمملوك .)) ''اور مملوک کے ساتھ شفقت کرنے کا حکم دیتے ہیں۔''

شرح: ......یعنی اہل سنت مملوک کے ساتھ شفقت کرنے اور اس کی ضروریات کا خیال رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ حکم انسانوں کے بارے میں بھی ہے اور حیوانات کے بارے میں بھی۔

زیر ملکیت انسانوں کے ساتھ شفقت تو یہ ہے کہ جب خود کھانا کھائیں تو انہیں بھی کھلائیں اور بوقت ضرورت کپڑے بھی پہنائیں، اور اس کی طاقت سے بڑھ کر اسے کسی کام کے لیے مکلف نہیں ٹھہرائیں۔

زیر ملکیت حیوانات، وہ سواری والے ہوں، دودھ دینے والے یا دیگر پالتو قسم کے جانور، تو ان کے ساتھ شفقت ان کی حسب ضرورت مختلف ہوتی ہے، مثلاً اگر وہ سردی برداشت نہ کر سکتے ہوں تو سرد موسم میں انہیں گرم جگہ میں رکھا جائے، اور سردی سے بچایا جائے، اور اگر وہ گرمی برداشت نہ کر سکتے ہوں تو انہیں گرمی سے بچانے کے لیے ٹھنڈی جگہ فراہم کی جائے، ان کے لیے خوراک اور پانی کا بندوبست کیا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ لادا جائے۔

جانوروں تک کے حقوق کی ادائیگی کا یہ حکم کمال شرع پر دلالت کرتا، اور طریقہ اہل سنت کی ہمہ گیری کی عکاسی کرتا ہے۔

فخر، غرور اور ظلم سے روکنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وينهون عن الفخر والخيلاء والبغي والاستطالة على الخلق بحق او بغير حق .))

''وہ فخر و غرور، تکبر ظلم و زیادتی اور مخلوق پر بڑائی سے منع کرتے ہیں، وہ حق کے ساتھ ہو یا بدون حق۔''

شرح: ......فخر قول کے ساتھ ہوتا ہے اور خیلاء فعل کے ساتھ، بغی سے مراد ظلم و زیادتی اور استطالہ سے ترفع اور بڑائی مراد ہے۔

اہل سنت انسان کو دوسرے انسانوں پر فخر کرنے سے منع کرتے ہیں اپنے آپ کو عالم، غنی اور بہادر جتانے سے منع کرتے ہیں اور اگر وہ اس سے آگے بڑھ کر دوسروں پر اپنی بڑائی جتاتے ہوئے یہ کہے کہ میرے نزدیک تمہاری اہمیت ہی کیا ہے؟ تو یہ مخلوق پر ظلم و زیادتی اور اپنی بڑائی کا اظہار ہے۔

خیلاء افعال کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً متکبرانہ چال چلنا، نخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکڑ کر چلنا، سر اور گردن اٹھا کر چلنا۔ گویا کہ وہ آسمان پر چڑھ گیا ہو، متکبرانہ چال چلنے والے کی اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر توبیخ فرمائی ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾

(الاسراء: ٣٧)

''اور زمین میں اکڑ کر مت چل، بیشک تو نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔''

اہل سنت لوگوں کو نخوت و غرور سے منع کرتے ہوئے انہیں اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ قول و عمل میں تواضع اختیار کی جائے۔ فروتنی کا مظاہرہ کیا جائے، یہاں تک کہ اپنی تعریف سے بھی گریز کیا جائے، الا یہ کہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہو، جس طرح کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے، تو میں اونٹ پر سوار ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔'' [1] اس سے ان کے پیش نظر دو باتیں تھیں:

۱۔ لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق دلانا۔

۲۔ انہیں خود اپنی ذات سے کسب فیض کی دعوت دینا۔

صفات حمیدہ سے متصف انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کی خوبیاں لوگوں پر مخفی رہیں گی، وہ لوگوں کے سامنے ان کا ذکر کرے یا نہ کرے، جب کوئی انسان لوگوں کے سامنے اپنی خوبیاں بیان کرتا ہے، تو وہ ان کی نظروں سے گر جاتا اور بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے، لہٰذا اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

[البغی]..... لوگوں پر زیادتی کرنا، اس کے تین مواقع ہوتے ہیں، جن کی رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح وضاحت فرمائی ہے: ''تمہارے خون تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں۔'' [2]

اموال میں زیادتی: مثلاً اس چیز کا دعویٰ کرنا، جو اس کی نہیں ہے یا اپنے ذمہ واجب الاداء امور کا انکار کرنا یا کسی کی چیز پر قبضہ کر لینا، یہ اموال پر زیادتی کی صورتیں ہیں۔

خون میں زیادتی: مثلاً کسی کو قتل کرنا یا زخمی کرنا، وغیرہ۔

---

[1] اسے مسلم (٢٤٦٣) نے روایت کیا۔ [2] اسے بخاری: ١٧٣٩ نے ابن عباس اور مسلم: ١٦٧٩ نے ابوبکرہ سے روایت کیا۔

عزت میں زیادتی: مثلاً کسی کی غیبت کر کے اس کی عزت کو خراب کرنا، زنا کاری یا اس سے کم تر کوئی غیر اخلاقی حرکت کر کے کسی کی عزت گنوانا، اس قسم کی سب چیزیں حرام ہیں۔

اہل سنت مال، خون اور عزت وآبرو کے حوالے سے کسی پر زیادتی کرنے سے منع کرتے ہیں۔

[**الاستطالة علی الخلق**]..... اپنے آپ کو لوگوں پر برتر خیال کرنا، وہ حق کے ساتھ ہو یا حق کے بغیر، اہل سنت اس سے منع کرتے ہیں۔

حقیقت امر یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے دوسروں سے زیادہ مال وجاہ، علم وسیادت یا کسی اور چیز سے نوازا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ کو مزید متواضع ہونا چاہیے تا کہ آپ کی خوبیوں میں نکھار آئے اور لوگ آپ کے قدر دان ہوں، جو شخص رفعت کے موقعہ پر تواضع کا مظاہرہ کرتا ہے تو درحقیقت یہ انسان متواضع کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔

[**بحق**]..... مؤلف رحمہ اللہ کے اس قول کا معنی یہ ہے کہ اگرچہ اسے اپنی برتری جتلانے کا حق پہنچتا ہو مگر اہل سنت پھر بھی ترفع اور استعلاء سے منع کرتے ہیں۔

اس کا یہ معنی بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ برتری جتلانا اس کا حق ہو، بایں طور کہ اس پر کسی نے زیادتی کی، اور یہ اس پر اس سے زیادہ زیادتی کرنے لگے۔

اخلاق عالیہ کا حکم دینا اور اخلاقِ رذیلہ سے روکنا

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویامرون بمعالی الاخلاق وینهون عن سفسافها.))

''وہ اخلاق عالیہ کا حکم دیتے اور گھٹیا اخلاق سے منع کرتے ہیں......''

شرح: ......اخلاق عالیہ، مثلاً سچائی، پاکدامنی، امانت ودیانت، اور اس طرح کے دیگر اخلاق، گھٹیا اور ردی اخلاق، مثلاً کذب بیانی، خیانت، فواحش کا ارتکاب وغیرہ۔

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وكل ما يقولونه ويفعلونه من هذا وغيره، فانما هم فيه متبعون للكتاب والسنة وطريقتهم هي دين الاسلام الذي بعث الله به محمدا ﷺ.))

''وہ جو کچھ بھی کہتے یا کرتے ہیں، وہ اس بارے میں کتاب وسنت کی اتباع کرتے ہیں، اور ان کا طریقہ دین اسلام ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔''

شرح: ......[**کل ما یقولونه**]..... یعنی اہل سنت جو کچھ بھی کہتے ہیں۔



[ویفعلونه]..... اور وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں۔

[فانما هم فيه متبعون للكتاب والسنة]..... اس جگہ ہم اس بات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ بھی کہتے اور جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ سب کچھ کہتے اور کرتے وقت ہمیں یہ شعور ہونا چاہیے کہ ہم اس میں رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص بھی ہونا چاہیے تاکہ ہمارے جملہ اقوال وافعال اللہ رب العزت کی عبادت قرار پائیں، اسی لیے کہا جاتا ہے، غافل لوگوں کی عبادت بھی عادت ہوتی ہے، جبکہ بیدار مغز اور باشعور لوگوں کی عادات بھی عبادت ہوتی ہیں۔

توفیق ایزدی سے نوازے گئے انسان کے لیے تو عادات کو بھی عبادات میں تبدیل کرنا ممکن ہے، جبکہ غافل انسان اپنی عبادت کو بھی عادات میں تبدیل کر ڈالتا ہے۔

بندہ مومن کو اس بات کا حریص ہونا چاہیے کہ وہ اپنے تمام کے تمام اقوال وافعال کو کتاب اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی سنت کے تابع رکھے تاکہ وہ اس سے اجر وثواب حاصل کر سکے، اور کمال ایمان کے ساتھ ساتھ انابت الی اللہ کے اعزاز سے بہرہ مند ہو سکے۔

اُمت محمدیہ ﷺ کے تہتر فرقے ہوں گے

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لكن لما اخبر النبي ﷺ ان امته ستفترق على ثلاث وسبعين فرقة، كلها في النار الا واحدة وهي الجماعة.))❶

"مگر جب نبی کریم ﷺ نے یہ خبر دی کہ آپ ﷺ کی امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور وہ سارے کے سارے جہنم میں جائیں گے بجز ایک کے اور وہ ہے، یہ جماعت۔"

شرح:..... [ان امته]..... یعنی امت اجابت، نہ کہ امت دعوت، اس لیے کہ امت دعوت میں یہود ونصاریٰ بھی داخل ہیں، اور وہ خود کئی کئی فرقوں میں تقسیم ہیں، یہودیوں کے اکہتر اور نصاریٰ کے بہتر فرقے ہیں، جبکہ یہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، وہ سارے کے سارے اپنے آپ کو اسلام اور اتباع رسول کی طرف منسوب کریں گے۔

[وكلها في النار الا واحدة]..... اس سے خلود فی النار لازم نہیں آتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے عمل کی وجہ سے دخول جہنم کے مستحق ہیں۔

❶ اسے احمد: ٤/ ١٠٢۔ ابوداود: ٤٥٩٧۔ ابن ماجه: ٢/ ٤٧٩۔ ابن ابی عاصم نے السنة، میں (١/ ٣٣) آجری نے الشريعة: ١٨۔ لالکائی نے شرح السنة: ١٥٠ اور حاکم نے المستدرك: ١/١٢٨ میں معاویہ بن ابو سفیان کی حدیث سے روایت کیا، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں، یہ حدیث صفوان بن عمرو، از ہر بن عبداللہ الحرازی، ابو عامر عبداللہ بن لحی عن معاویہ سے محفوظ ہے، جسے ان سے کئی لوگوں نے روایت کیا ہے..... ملاحظہ ہو: اقتضاء الصراط: ١/١١٨ اور السلسلة الصحيحه از البانی: ٢٠٤.



کیا یہ تہتر فرقے اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں، اور یہ گنتی پوری ہو چکی ہے، یا ان کا انتظار کیا جا رہا ہے؟

اس حدیث کے بارے میں گفتگو کرنے والے اکثر علماء کے نزدیک فرقوں کی یہ تعداد پوری ہو چکی ہے، وہ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے، اہل بدعت کو پانچ بنیادی فرقوں میں تقسیم کرتے ہیں، جن سے آگے چل کر کئی اور فرقوں نے جنم لیا، یہاں تک انہیں بہتر کی تعداد تک پہنچا دیتے ہیں اور ایک فرقے کو باقی رکھتے ہیں، جو کہ اہل السنہ والجماعہ ہے۔

بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے ان فرقوں کو مبہم رکھا ہے، لہٰذا ہمیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس وقت موجود بدعات کو پانچ اصولوں میں تقسیم کریں، اور پھر ان اصولوں کو کئی فرقوں میں تقسیم کرتے ہوئے بہتر کی تعداد پوری کریں، حتیٰ کہ کبھی کسی فرع کو بھی اس لیے مستقل فرقہ قرار دے ڈالیں کہ وہ ایک فرع میں اس کی مخالفت کرتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہمیں ان فرقوں کا تفصیلاً علم نہیں ہے۔

بلا شک یہ فرقے صراط مستقیم سے خارج ہو گئے، ان میں سے کچھ فرقے تو اس سے بہت دور ہٹ گئے، جبکہ کچھ اس کے قریب رہے اور کچھ متوسط۔ مگر ہم انہیں شمار کرنے کے پابند نہیں ہیں، اس لیے کہ بسا اوقات کچھ ایسے فرقے بھی جنم لے لیتے ہیں جو امت اسلامیہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں، جبکہ وہ علماء کے شمار کردہ فرقوں کے علاوہ ہوتے ہیں، جس طرح کہ ہمارے مشاہدہ میں ہے۔

علی کل حال رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس امر سے آگاہ فرما دیا کہ آپ کی امت...... امت اجابت...... تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، وہ سارے کے سارے گمراہ ہوں گے، جہنم میں جائیں گے، بجز ایک فرقہ کے۔

[وهي الجماعة]..... یعنی وہ جماعت جو حق پر اکٹھی ہوگی۔ اور اس بارے تفرقہ بازی کا شکار نہ ہوئی۔

فرقۂ ناجیہ

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وفي حديث عنه انه قال: "هم من كان على مثل ما انا عليه اليوم واصحابي." [1] صار المتمسكون بالاسلام المحض الخالص عن الشوب هم اهل السنة والجماعة.))

''آپ ﷺ سے مروی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس جیسی چیز پر ہوں گے جس پر میں اور میرے احباب ہیں۔'' اس لیے جن لوگوں نے ہر طرح کی آمیزش سے پاک خالص اسلام کو تھام رکھا ہے وہ اہل سنت والجماعت ہیں۔''

شرح:...... یہی وہ لوگ ہیں جو آپ ﷺ کی شریعت پر مجتمع رہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس تاکیدی حکم کی تعمیل کی:

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔



ہے اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور چیز کی اتباع کرتا ہے، اس کے ہاں نہ تو شرک کا ہی کوئی وجود ہوتا ہے اور نہ بدعت کا۔

وہ اپنے قول میں صادق ہوتا ہے، اس کی زبان پر صدق کے علاوہ کوئی بات نہیں آتی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے "صدق کو لازم پکڑو، اس لیے کہ صدق وسچائی انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ سچ بولتا رہتا اور سچائی کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اسے اللہ کے پاس صدیق لکھ لیا جاتا ہے۔"[1]

صدیق اپنے فعل میں صادق ہوتا ہے، یعنی اس کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہوتا، وہ جو کچھ کہتا ہے، اس پر عمل بھی کرتا ہے اور اس طرح وہ منافقین کے ساتھ مشابہت سے محفوظ رہتا ہے، جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور۔

یہی وجہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص قرار پائے جنہیں اس امت میں صدیق کے نام سے موسوم کیا گیا، جب نبی کریم ﷺ کو معراج کرائی گئی، تو آپ نے لوگوں کو بتایا کہ مجھے بیت المقدس تک سیر کرائی گئی اور آسمانوں کی طرف اوپر اٹھایا گیا تو کفار آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کی تکذیب کرتے ہوئے کہنے لگے: محمد! ہمیں شام جانے کے لیے ایک مہینہ اور واپس آنے کے لیے ایک مہینہ درکار ہوتا ہے، آپ ایک ہی رات میں آسمانوں سے ہو کر واپس آ گئے؟ پھر وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے کہنے لگے، تمہارا ساتھی اس اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے، اگر انہوں نے یہ فرمایا ہے تو پھر سچ ہی فرمایا ہے۔[2] اس دن سے انہیں صدیق کے نام سے یاد کیا جانے لگا، آپ اس امت اور دیگر امتوں میں سے افضل الصدیقین ہیں۔

شہداء کی جماعت

☐ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وفیهم الشهداء.))

شرح: ...... شهداء، شہید کی جمع ہے اور یہ شاہد کے معنی میں ہے۔ شہداء کون ہیں؟

ایک قول کی رو سے اس سے مراد علماء ہیں، اور یہ اس لیے کہ عالم اللہ تعالیٰ کی شریعت کی گواہی دیتا، اور لوگوں پر اتمام حجت کی گواہی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کو اللہ تعالیٰ کی اس شریعت کا مبلغ کہا جاتا ہے جسے اس کے رسول محمد ﷺ لے کر آئے، عالم مبلغ ہونے کے ناطے بھی مخلوق پر حق کا شاہد ہوا کرتا ہے۔ علماء کے دوسرے قول کی رو سے شہید سے مراد مقتول فی سبیل اللہ ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت دونوں کے لیے عام ہے۔

---

[1] اسے بخاری: ٦٠٩٤۔ اور مسلم: ٢٦٠٧ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

[2] اسے حاکم نے المستدرك میں روایت کیا اور اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان سے موافقت کی ابن کثیر نے سورۃ الاسراء کی تفسیر کے شروع میں اسے بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں: السلسلة الصحيحة، از البانی: ٣٠٦.



﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

''یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔''

اہل سنت نے دین میں تفرقہ نہیں ڈالا بلکہ وہ ایک جماعت بن کر رہے۔

[صار المتمسّکون] ...... جملہ ''صار''، ''لکن لما'' میں شرط کا جواب ہے۔

اگر ہم سے کوئی یہ سوال کرے کہ اہل سنت کون ہیں؟ تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ اہل سنت وہ لوگ ہیں جنہوں نے آمیزش سے پاک خالص اسلام کو تھام رکھا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ تعریف اس امر کی متقاضی ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کا شمار اہل سنت میں نہیں ہوتا، اس لیے کہ ان کے عقائد میں بدعات کی آمیزش ہے۔

یہی بات صحیح ہے، اشاعرہ اور ماتریدیہ کا شمار اس موقف کی وجہ سے اہل سنت میں نہیں ہوتا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اس بارے میں ان کی اہل سنت سے مخالفت کے باوجود انہیں اہل سنت میں کس طرح شمار کیا جا سکتا ہے؟

اس بارے میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کا موقف مبنی برحق ہوگا، یا علماء سلف کا۔ اور یہ سبھی کے علم میں ہے کہ علماء سلف کا موقف ہی مبنی برحق ہے، اس لیے کہ وہ صحابہ کرام ہیں، تابعین ہیں اور ان کے بعد کے ائمہ ہدایت ہیں، جب سلف کا موقف مبنی برحق ہے اور یہ لوگ ان کے مخالف ہیں تو پھر وہ اہل السنہ والجماعہ سے نہیں ہیں۔

اہل السنہ والجماعہ کے اوصاف

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وفیھم الصدیقون، وفیھم الشھداء وفیھم الصالحون.))

''اور ان میں صدیقین بھی ہیں، شہداء بھی ہیں اور صالحین بھی۔''

شرح: ...... [وفیھم] ...... یعنی اہل السنہ والجماعہ میں۔

[الصدیقون] ...... یہ صدیق کی جمع ہے اور یہ صدق سے ماخوذ ہے، صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے، اور صدیق وہ شخص ہوتا ہے جو سچائی کے ساتھ آئے اور سچائی کی تصدیق کرے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الزمر: ۳۳)

''اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کی تصدیق کی تو یہی لوگ متقی ہیں۔''

صدیق اپنے قصد وارادہ میں بھی صادق ہوتا ہے اور اپنے قول وفعل میں بھی۔

قصد وارادہ میں اس کی سچائی یہ ہے کہ وہ پورے طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص اور رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کا پورے طور پر متبع ہوتا ہے، اس نے اخلاص اور متابعت کو ہر آمیزش سے پاک کر رکھا ہوتا ہے، وہ نہ تو عمل میں غیر اللہ کی شراکت برداشت کرتا



صالحین کی جماعت

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وفیهم الصالحون .))

شرح: ...... صالح فاسد کی ضد ہے، صالح وہ شخص ہے، جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا التزام کرتا ہو۔ صالح اور مصلح میں بہت فرق ہے۔ اصلاح صلاح پر ایک زائد وصف ہے۔ اس بناء پر ہر صالح مصلح نہیں ہوا کرتا اس لیے کہ صالحین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جس کے پیش نظر صرف اپنی ذات ہوتی ہے اور اسے کسی دوسرے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، صلاح اصلاح کے ساتھ ہی مکمل ہوتی ہے۔

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ومنهم اعلام الهدى ومصابيح الدجى .))

''اور ان میں راہنمایان ہدایت اور اندھیرے کے چراغ ہیں۔''

شرح: ...... [اعلام] ...... علم کی جمع ہے، جس کا اصل معنی پہاڑ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ﴾ (الشوریٰ: ٣٢)

''اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر میں تیرنے والی کشتیاں ہیں جو پہاڑوں جیسی ہوتی ہیں۔''

پہاڑ کو علم سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے راہنمائی حاصل کی جاتی اور دلیل لی جاتی ہے اور ''اعلام الهدى'' وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں لوگ دلیل کے طور پر پیش کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور وہ ہیں علماء حق، یہی لوگ ہدایت دینے والے اور اندھیروں کو اجالوں میں تبدیل کرنے والے ہیں۔

[مصابیح] ...... مصباح کی جمع ہے، بمعنی چراغ، روشنی بہم پہنچانے کا ذریعہ۔

[الدجى] ...... دجية کی جمع ہے، بمعنی تاریکی، یعنی وہ تاریکیوں کے چراغ ہیں، جن کے ساتھ لوگ روشنی حاصل کرتے اور ان کی روشنی میں چلا کرتے ہیں۔

❏ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

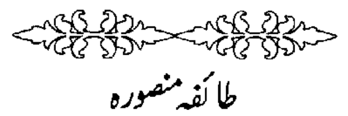
((اولو المناقب المأثورة والفضائل المذكورة .))

''مناقب ماثورہ والے اور فضائل مذکورہ والے۔''

شرح: ...... [المناقب] ...... یہ منقبة کی جمع ہے، جو کہ مرتبہ کے معنی میں ہے، یعنی وہ عز وشرف اور مقام ومرتبہ جس پر انسان فائز ہو۔



[الفضائل]..... یہ فضیلة کی جمع ہے، وہ اعلیٰ خوبیاں جن کے ساتھ انسان متصف ہو، مثلاً علم، عبادت، اور زہد وکرم وغیرہا۔ فضائل عز وشرف کے حصول کا ذریعہ ہوا کرتے ہیں۔



طائفہ منصورہ

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وفیهم الابدال وفیهم ائمة الدین الذین اجمع المسلمون علی هدایتهم وهم الطائفة المنصورة.))

''اور ان میں ابدال بھی ہیں اور ائمہ دین بھی، جن کی ہدایت پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور وہی طائفہ منصورہ ہیں۔''

شرح: ...... [الابدال]..... یہ بدل کی جمع ہے، ابدال وہ لوگ ہوتے ہیں جو علم اور عبادت میں دوسروں سے ممتاز ہوں، انہیں اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان میں سے جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا بدل اس کی جگہ لیتا ہے۔ یا اس لیے کہ وہ اپنی برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کر لیتے ہیں، یا پھر اس لیے کہ وہ لوگوں کے لیے اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں اور جو ان کے غلط اعمال کو صحیح اعمال میں تبدیل کروا دیتے ہیں، یہ بھی کہا جا سکتا کہ انہیں ان تمام خوبیوں اور ان کے علاوہ اس قسم کی دیگر خوبیوں کی وجہ سے اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

[وهم الطائفة المنصورة]..... یعنی اہل سنت والجماعت ہی وہ طائفہ منصورہ ہیں، جس کی اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے، اس لیے کہ وہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ (الغافر: ۵۱)

''بیشک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔''

ان لوگوں کی رب تعالیٰ کی طرف سے مدد کی جاتی ہے اور انجام ان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

مگر نصرت ایزدی کے حصول کے لیے اللہ کی راہ میں مشقتیں برداشت کرنا اور جہاد کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر آپ یہ سمجھیں کہ آغاز کار میں معاملات طے نہیں ہو سکے تو آپ کو بے بسی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ صبر وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے بار بار کوشش کرنی چاہیے اور لوگوں کی طنزیہ باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے، اس لیے کہ دین کے دشمن بہت زیادہ ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ میں میدان میں اکیلا ہی کھڑا ہوں، تو اس سے آپ کے عزم میں کمزوری نہیں کرنی چاہیے، اگرچہ آپ اکیلے ہیں مگر جب تک حق پر ہیں، جماعت ہیں، لہٰذا یقین رکھیں کہ آپ کی مدد ضرور کی جائے گی، دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور کی جائے گی۔

یہ بھی یاد رہے کہ نصرت سے مراد صرف کسی انسان کی نصرت نہیں بلکہ حقیقی نصرت اس حق کی نصرت ہے جس کے آپ داعی ہیں، اگر آپ اس وقت کمزور ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ کے لیے نصرت ایزدی سے محروم رہیں



گے، نبی کریم ﷺ کو کفار و مشرکین کی طرف سے بڑی بڑی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر آخر کار آپ موذی دشمن پر نصرت سے نوازے گئے، ایک وہ وقت تھا کہ آپ ڈرتے ہوئے مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوئے اور پھر وہ دن بھی آیا کہ آپ فاتح بن کر اس میں داخل ہوئے۔

حق پر قائم رہنے والی جماعت

❑ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((الذين قال فيهم النبی ﷺ لا تزال طائفة من امتی علی الحق منصورة لا يضرهم من خالفهم ولا من خذلهم حتى تقوم الساعة .))❶

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں سے ایک جماعت کی ہمیشہ مدد کی جاتی رہے گی، ان کی مخالفت کرنے والے اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑنے والے ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔''

شرح: ......[لاتزال]...... یہ فعل افعال استمرار میں سے ہے جو کہ چار ہیں: فتئی، إنفك، برح اور زال، جب ان پر نفی یا شبہ نفی داخل ہو۔

[لا تزال طائفة من امتی علی الحق] ...... یعنی میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی۔ یہ جماعت نہ تو عدد کے ساتھ محصور ہے اور نہ ہی مکان و زمان کے ساتھ۔ ممکن ہے کہ کسی جگہ اس کی کسی ایک دینی معاملہ میں مدد کی جائے اور دوسری جگہ کسی دوسری جماعت کی۔ اور اس طرح دونوں جماعتوں کی نصرت کی وجہ سے دین باقی رہے۔

[لا يضرهم]...... انہیں ضرر نہیں پہنچائے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: لا يؤذيهم، انہیں اذیت نہیں دے گا، اس لیے کہ اسے اذیت لاحق ہو سکتی ہے، مگر ضرر لاحق نہیں ہو سکتا، ضرر اور اذیت میں نمایاں فرق ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا: ''میرے بندو! تم مجھے ضرر نہیں پہنچا سکتے ہو۔''❷ اور قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (الاحزاب : ٥٧)

''یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان پر اللہ نے دنیا اور آخرت میں لعنت فرما دی ہے۔''

ایک دوسری قدسی حدیث میں وارد ہوا ہے: ''آدم کا بیٹا مجھے اذیت دیتا ہے، وہ زمانے کو گالی دیتا ہے اور زمانہ میں ہوں۔''❸

ان نصوص میں حق تعالیٰ کے لیے اذیت کا اثبات کیا گیا ہے، جبکہ ضرر کی نفی کی گئی ہے۔

---

❶ اسے بخاری: ۷۳۱۱ اور مسلم: ۱۹۲۰ نے روایت کیا۔

❷ اسے مسلم (۲۵۷۷) نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔

❸ اسے بخاری: ۷۴۹۱ اور مسلم: ۲۲۴۶ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔



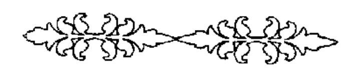
اہل السنہ والجماعہ کی قیامت تک کے لیے مدد

[حتی تقوم الساعة] ......مؤلف کے اس قول کے بارے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمین میں اللہ، اللہ نہیں کہا جائے گا۔'' [1] یعنی اسلام مکمل طور پر مٹ جائے گا، اور اللہ کی عبادت کرنے والا کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، جبکہ اس جگہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت قائم ہونے تک ان کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا؟ علماء نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ یا تو قیامت قائم ہونے سے مراد اس کے قیام کا قرب ہے، جب کوئی چیز بہت زیادہ قریب ہو تو اسے اس طرح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، گویا کہ نصرت ایزدی سے نوازے گئے یہ لوگ جب فوت ہو جائیں گے تو اس کے بعد بہت جلد قیامت قائم ہو جائے گی۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قیامت سے مراد ان کی قیامت (یعنی موت) ہے۔

لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نصرت دنیا کے آخر تک جاری رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب



[1] صحیح مسلم: ۱۴۸۔



خاتمہ

((فنسأل الله ان يجعلنا منهم ، وأن لا يزيغ قلوبنا بعد إذ هدانا ، وأن يهب لنا من لدنه رحمة انه هو الوهاب .

والله اعلم ، وصلى الله على محمد وآله وصحبه وسلم تسليما كثيراً .))

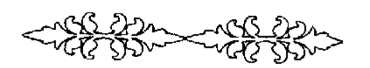
''ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمالے اور یہ کہ ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرے۔ اور یہ کہ وہ ہمیں اپنی طرف سے رحمت عنایت فرمائے، بیشک وہ وہی ہبہ فرمانے والا ہے۔''

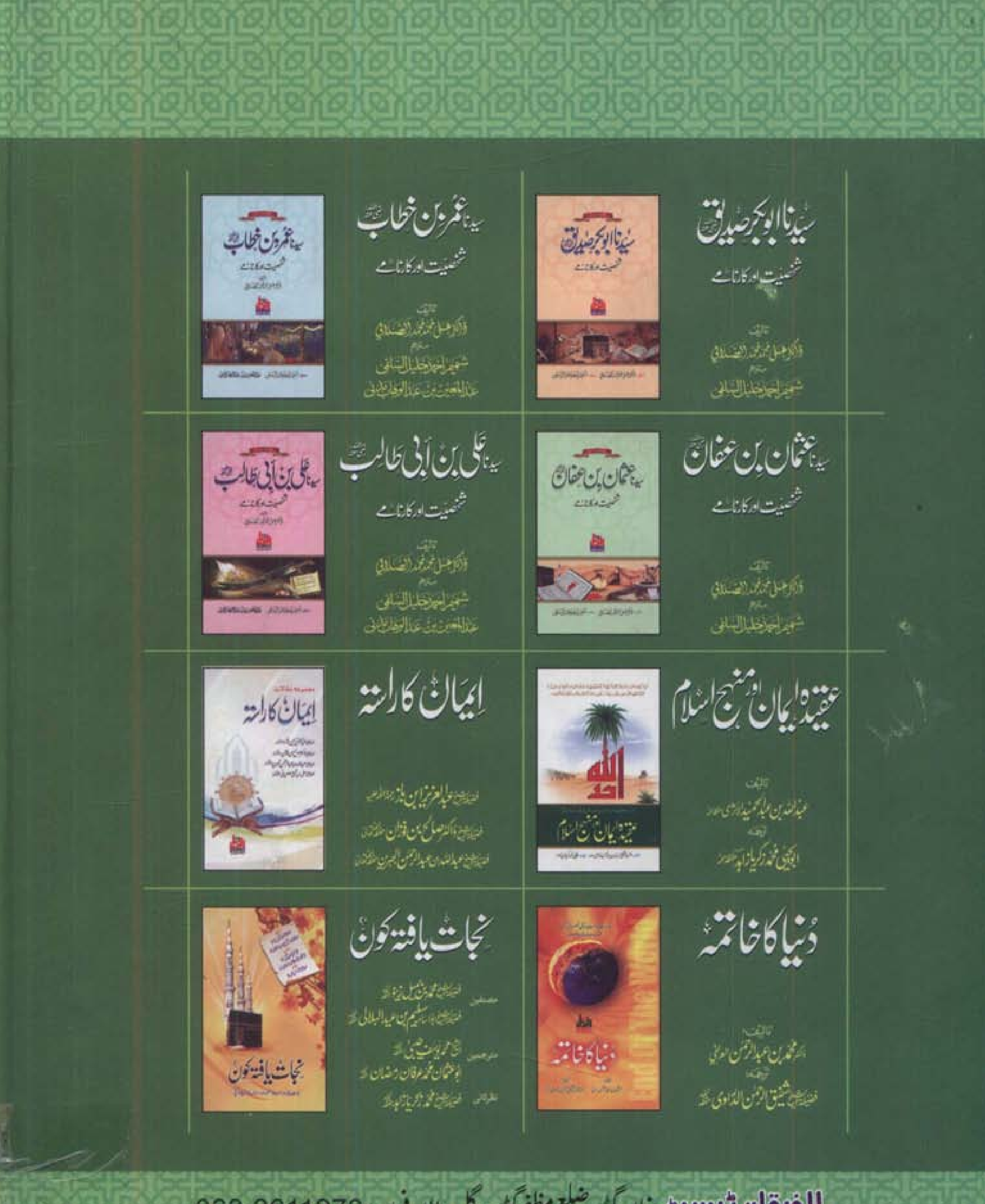
مؤلف رحمہ اللہ نے اس دعائے جلیل کے ساتھ اپنے قلیل اللفظ اور کثیر المعنی رسالہ کو اختتام بخشا، جسے اہل السنہ والجماعہ کے مذہب کا خلاصہ اعتبار کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ بڑے عظیم فوائد پر مشتمل ہے جو کہ متلاشی علم کو یاد رہنے چاہییں۔

والحمد لله رب العالمين على الاتمام

ونسأل الله ان يتمّ ذلك بالقبول والثواب

وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى اله وصحبه اجمعين .





سیدنا ابوبکر صدیق
شخصیت اور کارنامے
سیدنا عمر بن خطاب
شخصیت اور کارنامے
سیدنا عثمان بن عفان
شخصیت اور کارنامے
سیدنا علی بن ابی طالب
شخصیت اور کارنامے
عقیدۂ ایمان اور منہج اسلام
ایمان کا راستہ
دنیا کا خاتمہ
نجات یافتہ کون
الفرقان ٹرسٹ خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ، گل والا فون: 066-2611270
مکتبة الکتاب: حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0321-4210145